WWW.PAKSOCIETY.COM
Uploaded By Muhammad Nadeem

کے فارغ التحصیل ہونے تک اس کا بیٹا بھی اسکول جانے لگا تھا۔ ڈاکٹر نقوی اور اس کی بیوی کا ارادہ تھا کہ عاشی کو سمجھا بجھا کر اس کی دوسری شادی کر دیں گے لیکن کچھ بھی ہونے سے قبل کامران ایک بار پھر منظر پر آگیا۔ اس نے عاشی کو فون کر کے تنگ کرنا شروع کر دیا اور اسے تجدید تعلق پر راضی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ عاشی کے مسلسل انکار پر ایک روز وہ انتقاماً شعیب کو اس کے اسکول سے لے کر غائب ہو گیا اور چند گھنٹے بعد جب عاشی رو رو کر ہلکان ہو چکی تھی، خود ہی اسے واپس بھی چھوڑ کر چلا گیا۔

اس حرکت کے بعد وہ وقتاً فوقتاً عاشی کو فون کر کے اسے دھمکی دیتا رہتا تھا کہ اگر وہ اس کی بات ماننے کے لیے راضی نہ ہوئی تو وہ بچے کو اس سے جدا کر دے گا۔ اس دھمکی سے عاشی بہت گھبرا گئی تھی لیکن ڈاکٹر نقوی نے اسے تسلی دی کہ کامران میں اتنا دم نہیں۔ ایک بار وہ بچے کو اسکول سے بے خبری میں لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا، آئندہ اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔ اس نے اسکول انتظامیہ کو ہدایت کر دی تھی کہ بچے کو اس کے ڈرائیور کے سوا کسی کے حوالے نہ کیا جائے۔ ڈرائیور کو بھی الرٹ رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یوں ان احتیاطی تدابیر کے ساتھ ایک سال کا عرصہ بہ خیر و خوبی گزر گیا تھا، اب جو عاشی نے اسے اطلاع دی کہ شعیب اسکول سے واپس نہیں آیا تو اس کے ذہن میں یہی خیال آیا کہ کامران نے پھر کوئی شرارت کی ہے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ عاشی نے اسے اتنی دیر سے اطلاع کیوں دی ہے؟ شعیب اسکول سے دو بجے تک گھر واپس آجاتا تھا۔

''حوصلہ رکھو بیٹا! میں کچھ کرتا ہوں لیکن تم نے مجھے اطلاع دینے میں اتنی دیر کیوں کی؟ اگر تم پہلے مجھے فون کر دیتیں تو میں اب تک شوبی کو تلاش کروا چکا ہوتا۔'' اس نے پہلے بیٹی کو تسلی دی پھر اسے اس کی کوتاہی کا احساس دلایا۔

''آپ کی بیٹی نے ہمارے کہنے پر آپ کو اطلاع نہیں دی ڈاکٹر صاحب!'' اسے دوسری طرف سے عاشی کے بجائے مردانہ آواز سنائی دی۔

''کون ہو تم اور میرے گھر میں کیا کر رہے ہو؟ میں ابھی پولیس کو فون کر کے اطلاع دیتا ہوں۔'' وہ اب تک اسی گمان میں مبتلا تھا کہ شوبی کو غائب کرنے کی حرکت کامران نے کی ہے اور یہ اس کا ہی کوئی ساتھی ہے جو اس کے گھر بھی پہنچا ہوا ہے اس لیے زیادہ خائف ہوئے بغیر غصیلے لہجے میں اسے دھمکی دی۔

''ایسا کرنے کی غلطی بھی مت کیجیے گا ڈاکٹر صاحب... ورنہ آپ اپنے نواسے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ آپ کے دیش کی پولیس کتنے کام کی ہے، یہ آپ خود بھی جانتے ہیں۔'' اس کی دھمکی کے جواب میں دوسری طرف سے نہایت سنگین لہجے میں جو کچھ کہا گیا، اس نے ڈاکٹر نقوی کو چونکا دیا۔ بولنے والے نے اپنے الفاظ سے اسے یہ جتایا تھا کہ وہ پاکستان کا باشندہ نہیں ہے۔ اس کے لب و لہجے نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ کس ملک کا سپوت ہے لیکن اس کا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایک غیر ملکی کو شوبی کو اغوا کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟

''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' اس کا لہجہ خود بہ خود دھیما ہو گیا۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ اس سے مخاطب شخص کوئی معمولی غنڈا یا بدمعاش نہیں ہے جسے وہ اپنے تعلقات کے بل پر زیر کر لے گا۔ وہ شخص جو بھی تھا، کسی بہت مربوط منصوبے کے تحت کام کر رہا تھا جب ہی تو دوپہر سے اب تک کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد اسے شعیب کے اغوا ہونے کی اطلاع دی گئی تھی... وہ بھی یقیناً اس وقت جب اغوا کاروں نے ایسا چاہا تھا۔ وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اس سے مخاطب شخص اور شاید اس کے کچھ ساتھی پچھلے کئی گھنٹوں سے اس کے گھر پر قابض تھے اور انہوں نے عاشی اور اس کی بیوی کو اس بات کا موقع نہیں دیا تھا کہ وہ اس کو اس حادثے کی اطلاع دے پاتیں۔

''ہمیں اسپیشل روم میں موجود پیشنٹ ورما چاہیے۔'' اس کے سوال کے جواب میں دوسری طرف سے جو مطالبہ کیا گیا، اسے سن کر وہ چونک پڑا۔ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ جن لوگوں سے اس کا واسطہ پڑا تھا، وہ واقعی معمولی غنڈے نہیں تھے۔ ایک غیر ملکی ایجنٹ کا مطالبہ کرنے والے یقینی طور پر اس کے ساتھی ہی ہو سکتے تھے۔

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ سخت سیکیورٹی میں ہے۔ تمہیں وہ شخص چاہیے تھا تو متعلقہ لوگوں سے مطالبہ کرتے۔ میں تو صرف ایک ڈاکٹر ہوں۔ میں بھلا اسے تمہارے حوالے کیسے کر سکتا ہوں؟'' ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔

''تم بہت کچھ کر سکتے ہو اور یقیناً اپنے پیارے نواسے کی زندگی بچانے کے لیے کرو گے بھی۔ کرنا کیا ہے، یہ میں خود تمہیں بتاتا ہوں۔'' دوسری طرف سے اسے جواب دیا گیا اور پھر اس کی رضامندی جانے بغیر ہی وہ بتانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے جو کچھ ڈاکٹر نقوی سے کہا، اسے سن کر اس کے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ وہ لوگ ایک مربوط منصوبے پر کار بند ہیں۔

''اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں تو؟'' اس کے دل میں موجود جذبہ حب الوطنی نے جوش مارنے کی کوشش کی۔

''تو یہ تمہاری اپنی چوائس ہوگی۔ تم کتنے ہی ماہر سرجن سہی مگر یہ تو طے ہے کہ اپنے نواسے کے شریر کے ٹکڑوں کو جوڑ کر اسے دوبارہ زندگی نہیں دے سکتے۔ تمہاری پتنی اور بیٹی کو البتہ میں اور میرے ساتھی جیتا چھوڑ دیں گے، وہ خود شرم کے مارے آتما ہتیا کر لیں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' بہت اطمینان کے ساتھ اسے جو جواب دیا گیا اسے سن کر اس کے مساموں سے پسینا پھوٹ پڑا۔ اس کے پیاروں کی زندگی اور عزت دونوں داؤ پر لگی تھیں۔ اس نے خود کو پل بھر میں ٹٹول لیا۔ وہ اس حد تک محب وطن نہیں تھا جو اتنے بڑے بڑے نقصانات سہہ سکتا۔

''او کے! تم جو کہو، وہ میں کرنے کے لیے راضی ہوں۔'' اسے فیصلہ سنانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ویسے اس نے خود کو یہ تسلی دے لی تھی کہ ورما کی نگرانی پر موجود سیکیورٹی اہلکار خود ہی اس معاملے سے نمٹ لیں گے۔ اسے جو کچھ کرنے کو کہا جا رہا ہے، وہ ایسا بہر حال نہیں کہ وہ خود کو ورما کے فرار میں براہ راست شامل سمجھ سکے۔

''ٹھیک ہے تو پھر تم فوراً اپنے آفس سے نکل کر راؤنڈ کے لیے نکل پڑو۔ پہلے ہی تم دو منٹ لیٹ ہو چکے ہو۔'' اس کے رضامندی ظاہر کرتے ہی دوسری طرف سے حکم سنایا گیا۔ اس نے اس حکم کی تعمیل کی اور خود کو کمپوز کرتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ حسب معمول اس کا اسسٹنٹ ڈاکٹر اس کا منتظر تھا۔

''شاید آج میری گھڑی دو منٹ آگے چل رہی ہے۔'' ڈاکٹر نقوی کو دیکھ کر اس نے خوش گوار لہجے میں تبصرہ کیا۔

''بالکل نہیں، میں دو منٹ لیٹ ہوں۔ اصل میں گھر سے بیگم کا فون آگیا تھا۔ انہیں کچھ سامان منگوانا تھا جس کی وہ مجھے لسٹ بنوانے بیٹھ گئی تھیں اور اس بات کو تو ہر شادی شدہ بندہ سمجھ سکتا ہے کہ جب ہوم منسٹری احکامات جاری کر رہی ہو تو اپنے تمام ذاتی اصول و قواعد کو سائڈ پر رکھ کر اسی کی سننی پڑتی ہے۔'' اس نے بھی اپنے لہجے کو خوش گوار بناتے ہوئے جواب دیا۔ یہ ساری گفتگو ان دونوں نے ایک جگہ کھڑے ہو کر نہیں کی تھی بلکہ اس دوران بالائی منزل پر لے جانے والی لفٹ میں سوار ہو چکے تھے۔ لفٹ سے نکل کر انہوں نے سیدھا ورما کے کمرے کا رخ کیا۔ کمرے کے دروازے پر موجود سیکیورٹی اہلکاروں نے ان دونوں کے اندر جانے سے پہلے میٹل ڈیٹیکٹر سے انہیں چیک کیا پھر وہ اندر داخل ہو سکے۔ اندر بھی ڈیوٹی نرس کے علاوہ ایک سادہ لباس والا سیکیورٹی کا بندہ موجود تھا۔ انہیں دیکھ کر نرس الرٹ ہو گئی اور وہ ورما کے چیک اپ کے دوران اس سے جو سوالات کرتے رہے، وہ ان کے جواب دیتی رہی۔

''کچھ امپروومنٹ آئی تو ہے، یہ پہلے سے کافی بہتر لگ رہا ہے۔ میرے خیال میں ری اسکین کروا لیتے ہیں تاکہ صورت حال مزید واضح ہو جائے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟'' اس نے ورما کے چیک اپ سے فارغ ہو کر اپنی رائے دینے کے ساتھ ساتھ اپنے اسسٹنٹ سے بھی پوچھا۔

''جیسا آپ کہیں سر!'' ڈاکٹر نقوی جیسے سینئر ڈاکٹر کی رائے سے وہ بھلا کیسے اختلاف کر سکتا تھا۔

''آپ اسٹاف کو بلا کر پیشنٹ کو نیچے لیب میں بھجوا دیں۔ صبح میں اسپتال آؤں تو رپورٹس میری ٹیبل پر موجود ہونی چاہئیں۔'' اس نے ڈیوٹی نرس کو حکم دیا اور ورما کے کمرے سے نکل کر دوسرے پرائیویٹ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اپنے روزانہ کے معمول کو دہراتے ہوئے اس نے خود کو اس مہارت سے سنبھال رکھا تھا کہ دیکھنے والوں کے لیے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کسی غیر معمولی صورت حال سے دوچار ہے لیکن یہ تو وہی جانتا تھا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے؟

☆☆☆

''میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے کافی اور چیز سینڈوچ تیار کر دو۔ فارغ بیٹھ کر بوریت ہو رہی ہے۔ کھانے پینے میں کچھ وقت اچھا گزر جائے گا۔'' ایک سنگل صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھے ہوئے پانڈے نے عاشی کی طرف دیکھ کر اس انداز میں فرمائش کی جیسے وہ گھر کا ہی کوئی فرد ہو اور اسے یہ بے تکلفانہ فرمائش کرنے میں کوئی عار محسوس نہ ہو رہا ہو۔

''میں بنا دیتی ہوں۔'' مسز نقوی نے عاشی کے سفید چہرے پر نظر ڈالی اور کہتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔

''جوان خوب صورت کنیا کے ہوتے ہوئے ہم بوڑھے جھری دار ہاتھوں کا تیار کیا بھوجن کھائیں، یہ ہمیں گوارا نہیں۔ ہماری فرمائش تو سندری عاشی کو ہی پوری کرنی ہوگی۔'' پانڈے نے اوباشانہ لہجے میں کہتے ہوئے مسز نقوی کو واپس بیٹھنے کا اشارہ کیا اور عاشی کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے اپنی جانب دیکھتے پا کر عاشی نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور لرزتے قدموں سے کچن کی طرف جانے لگی۔ پانڈے کا ایک مسلح

Scanned and Uploaded By Nadeem
Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM
Uploaded By Muhammad Nadeem

ساتھی نگرانی کے لیے اس کے پیچھے تھا۔ اس کی موجودگی کی پروا کیے بغیر عاشی کچن میں پہنچ گئی اور پانڈے کی فرمائش کے مطابق کافی اور سینڈوچز تیار کرنے کے لیے کیبنٹس سے سامان نکالنے لگی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے ساری چیزیں کچن کاؤنٹر پر رکھنے کے بعد اس نے کچن ہی میں موجود بڑے سے فریج کی طرف رخ کیا اور اس میں سے چیز نکال کر واپس پلٹی۔ اس کی نگرانی کے لیے سر پر مسلط آدمی کی نظریں اس کے ساتھ ساتھ گردش کر رہی تھیں۔ عاشی کی معمولی سے معمولی جنبش بھی اس کی نظروں سے محفوظ نہیں تھی۔ اگر وہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ کرنا چاہتی تو ہرگز نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے عاشی کا ایسا کوئی ارادہ تھا بھی نہیں۔ اپنے بیٹے کی زندگی کے تحفظ کے لیے وہ ایسا کوئی ارادہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اب تک اس کی فیملی کے ساتھ جو کچھ بیتا تھا، اسے سامنے رکھتے ہوئے وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ ان کا جن لوگوں سے واسطہ پڑا ہے، وہ بہت خطرناک ہیں۔ وہ لوگ تقریباً دو بجے نقوی ہاؤس میں داخل ہوئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب صفائی ستھرائی کرنے والی ملازمہ اپنا کام نمٹا کر جا چکی تھی اور گیٹ پر موجود رہنے والے چوکیدار کے سوا گھر پر کوئی ملازم نہیں تھا۔ یوں بھی انہوں نے اپنے گھر میں ملازموں کا ہجوم جمع نہیں کیا تھا۔ مسز نقوی کچن کا کام ہمیشہ خود کرنا پسند کرتی تھیں۔ ڈرائیور اور اوپر کے کام کرنے والی جز وقتی ملازمہ کے علاوہ ان کے ہاں ہفتے میں دو دن لان کی دیکھ بھال کے لیے ایک مالی آتا تھا۔ آج مالی کے آنے کا بھی دن نہیں تھا۔ ڈرائیور شوبی کو لینے اسکول گیا ہوا تھا۔ چنانچہ آنے والوں نے گیٹ پر موجود چوکیدار کو زیر کرنے کے بعد آسانی سے پورے گھر کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ ان کی ٹائمنگ سے ظاہر تھا کہ وہ مکمل معلومات کے بعد یہاں آئے ہیں۔

مسز نقوی اور عاشی جو کہ اس وقت شعیب کی اسکول سے واپسی کی منتظر ہوا کرتی تھیں، مسلح افراد کو اپنے سر پر موجود دیکھ کر سراسیمہ ہو گئی تھیں اور فوری طور پر انہیں یہی خیال آیا تھا کہ وہ ڈاکو ہیں اور انہیں لوٹنے کے لیے آئے ہیں... لیکن چند منٹ کے اندر ہی ان کے لیڈر نے واضح کر دیا تھا کہ وہ ڈاکو نہیں ہیں بلکہ انہوں نے ڈاکٹر نقوی سے اپنا ایک مطالبہ منوانے کے لیے شعیب کو اغوا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے گھر پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ اس نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان کے گھر کی ٹیلی فون لائن کاٹ دی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس نے مسز نقوی اور عاشی کے موبائل فونز بھی اپنے قبضے میں لے لیے تھے۔ اس کے اور اس کے ساتھیوں کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ایک نہایت سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے مسز نقوی کا تیار کردہ لنچ بڑے مزے سے ہڑپ کر لیا تھا۔ مسز نقوی اور عاشی کو بھی اس لنچ میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی لیکن ان کی بھوک پیاس تو شوبی کو اغوا کیے جانے کی خبر سن کر ہی اڑ گئی تھی۔ عاشی نے البتہ ہمت کر کے اتنا مطالبہ ضرور کیا تھا کہ شوبی کے اغوا کو ثابت کرنے کے لیے اس کی ان لوگوں سے بات کروائی جائے۔ جواب میں اس سے کہا گیا کہ وہ صرف دس منٹ انتظار کر لے تو اسے ثبوت پیش کر دیا جائے گا۔ ٹھیک دس منٹ بعد نقوی ہاؤس کی ڈوربیل بجنے کی آواز سنائی دی تو پانڈے نے عاشی سے کہا کہ وہ گیٹ پر جائے اور آنے والا اسے جو پارسل دے، اسے وصول کر کے واپس آ جائے۔ عاشی اس کی ہدایت پر گیٹ تک گئی تو اس نے دیکھا کہ ایک مسلح شخص گیٹ کے اندرونی جانب موجود ہے۔ یقینی طور پر وہ شخص آنے والے پارسل کو خود بھی وصول کر سکتا تھا لیکن عاشی کو وہاں بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ اسے پوری طرح اندازہ ہو جائے کہ ان کا گھر مکمل طور پر ان لوگوں کے قبضے میں ہے۔

عاشی ہیلمٹ پہنے موٹر سائیکل سوار سے پارسل وصول کر کے واپس پلٹی تو اسے ایک دیوار کی جڑ میں پڑے چوکیدار کی پشت نظر آئی۔ اس کے سر اور گردن پر بہہ کر جم جانے والا خون نظر آ رہا تھا۔ عاشی کے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ مر چکا ہے یا صرف بے ہوش ہے۔ وہ کپکپاتی ٹانگوں کے ساتھ پارسل لے کر اندر آئی اور اسے پانڈے کے حوالے کر دیا۔ پانڈے نے اس پارسل کو کھولا تو اس میں سے ایک موبائل فون برآمد ہوا۔ یہ جدید ساخت کا کیمرے والا موبائل تھا۔ پانڈے نے مسز نقوی اور عاشی کو قریب بلایا اور موبائل کے چند بٹن دباتے ہوئے انہیں اس کی اسکرین کی طرف دیکھنے کی ہدایت کی۔ اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے اسکرین پر نظر ڈالی تو سب سے پہلے انہیں شعیب کے اسکول کی عمارت نظر آئی۔ پھر اس عمارت کا گیٹ کھلا اور بچے باہر آنے لگے۔ یہ وہ بچے تھے جن کے گھر سے کوئی انہیں لینے آتا تھا اور گیٹ پر موجود چوکیدار آنے والے کو پہچاننے کے بعد بچے کو گیٹ سے باہر نکلنے کی اجازت دیتا تھا۔ اسکول انتظامیہ نے شہر کے بگڑتے ہوئے حالات کو دیکھ کر چند ماہ پہلے ہی یہ احتیاط برتنی شروع کی تھی۔ اسکول وین سے واپس گھر جانے والے بچوں کو بھی پوری احتیاط کے ساتھ ان کے گھر تک چھوڑا جاتا تھا۔ موبائل کی اسکرین پر نظر آیا کہ ان کے ڈرائیور نے چوکیدار کو اسکول کی طرف سے جاری

Scanned and Uploaded By Nadeem
Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM
Uploaded By Muhammad Nadeem

کر وہ پاس دکھایا تو اس نے اندر سے شوبی کو بلا کر ڈرائیور کے حوالے کر دیا۔

ڈرائیور شوبی کا بیگ ایک ہاتھ میں اٹھا کر اور دوسرے سے اس کی انگلی تھام کر گاڑی تک آیا اور شوبی کو پچھلی نشست پر بٹھانے کے بعد خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اسکرین پر حرکت کرتی ہوئی گاڑی کی بیک سائڈ نظر آئی۔ اس کے بعد جب گاڑی دوبارہ اسکرین پر ظاہر ہوئی تو اس کا فرنٹ ویو نظر آ رہا تھا۔ اس کے بعد جانے کیا ہوا کہ حرکت کرتی ہوئی گاڑی بُری طرح لہرائی اور پھر رک گئی۔ ڈرائیور صورتِ حال جاننے کے لیے نیچے اترا تو اگلے ہی لمحے جھٹکا کھا کر پیچھے گر پڑا۔ اس کی پیشانی پر بننے والے سوراخ سے خارج ہوتے لہو نے واضح کر دیا کہ وہ کسی قاتل گولی کا نشانہ بنا ہے۔ ڈرائیور کے نیچے گرتے ہی دو نقاب پوش منظر میں شامل ہوئے اور پچھلی سیٹ پر حیران پریشان بیٹھے شوبی کو گھسیٹ کر باہر نکال لیا۔ یہ آخری منظر تھا جو مسز نقوی اور عاشی نے موبائل کی اسکرین پر دیکھا تھا اور اس کے بعد انہیں مزید کسی ثبوت کو مانگنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

ویڈیو دیکھنے کے بعد وہ بے چون و چرا... ان لوگوں کا ہر حکم مان رہی تھیں۔ پانڈے کے حکم کے مطابق اس نے ڈاکٹر نقوی کو فون بھی کر دیا تھا۔ اس فون کال سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شعیب کے اغوا کا سبب یہ تھا کہ وہ لوگ ڈاکٹر نقوی سے اپنا مطالبہ منوا سکیں اور ان کا مطالبہ تھا کہ اسپیشل روم میں موجود مریض ورما کو کسی بہانے نیچے گراؤنڈ فلور تک بھیج دیں۔

ڈاکٹر نقوی کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اسپتال کی لیبارٹری گراؤنڈ فلور پر تھی اس لیے ورما کو کسی ٹیسٹ کے بہانے آسانی سے وہاں تک بھیجا جا سکتا تھا۔ نواسے کی سلامتی کی خاطر ڈاکٹر نقوی نے یہ مطالبہ تسلیم کر لیا تھا لیکن ظاہر ہے، معاملہ مریض کو گراؤنڈ فلور تک پہنچانے تک تو محدود نہیں رہتا۔ اس سارے کھٹ راگ کے پیچھے ان لوگوں کا کوئی تو ایسا مقصد تھا جو یقینی طور پر اتنا خاص تھا کہ وہ یوں منظم انداز میں متحرک ہو گئے تھے۔ عاشی کو ان لوگوں کے مقصد سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ وہ بس اتنا چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا صحیح سلامت گھر واپس آ جائے اور اسی وجہ سے وہ ان لوگوں کی ہر بات مانتی جا رہی تھی۔ اس وقت بھی اس نے بے پناہ اعصابی دباؤ کا شکار ہونے کے باوجود بڑی محنت اور توجہ سے کافی اور چند سینڈوچز تیار کیے اور ٹرالی میں سب چیزیں رکھ کر لیونگ روم تک پہنچ گئی۔ وہاں موجود لوگ اسی پوزیشن میں موجود تھے جس میں وہ انہیں چھوڑ کر گئی تھی۔ اس نے ٹرالی پانڈے کے قریب لے جا کر روکی اور خود بھی اپنی سابقہ جگہ پر بیٹھ گئی۔ پانڈے نے ایک نظر ٹرالی پر ڈالی اور اپنے موبائل پر مصروف ہو گیا۔

"ہاں جی تھری! کیا پوزیشن ہے؟" وہ کسی کو کوڈ نیم سے پکارتے ہوئے اس سے رپورٹ لے رہا تھا۔

"ایک ایک لڑکے کو اپنی نظر میں رکھنا۔ سب کا وہاں سے نکلنا ضروری ہے۔ اگر کوئی نکلنے میں ناکام رہے تو تم جانتے ہو کہ اس کے ساتھ کیا کرنا ہے؟" دوسری طرف کا جواب سن کر نئی ہدایات دیتے ہوئے پانڈے کا لہجہ بے حد سرد تھا۔

"کیا کہا... ورما صاحب کو نیچے لایا جا رہا ہے؟ تمہارے کمانڈوز ایکشن میں آنے کے لیے بالکل تیار ہیں؟" بات کرتے کرتے پانڈے کا لہجہ جوشیلا ہو گیا اور اس نے ٹرالی میں سے کافی کا کپ اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا۔

"زبردست!" گھونٹ بھرتے ہی اس کی زبان سے ستائشی لہجے میں یہ لفظ نکلا لیکن سننے والوں کے لیے سمجھنا مشکل تھا کہ یہ ستائش کافی کے لیے تھی یا دوسری طرف سے ملنے والی کسی خبر کا ردِعمل۔

☆☆☆

ورما کو لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر لے جانے والوں میں اسپتال کے عملے کے علاوہ اس کی سیکیورٹی پر مامور اہلکار بھی شامل تھے۔ یہ اہلکار مسلح تھے اور ان کی نگاہیں تیزی سے گردش کرتی اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ورما کی حیثیت کی وجہ سے اس کے ساتھ اسپتال میں بھی ترجیحی سلوک کیا جا رہا تھا اور جن ٹیسٹوں کے لیے ممکن ہوتا تھا، اس سے متعلق مشینری اس کے کمرے میں ہی لے جا کر ٹیسٹ کر لیے جاتے۔ اب تک اسے صرف ایک بار اسکیننگ کے لیے لیب تک لے جایا گیا تھا۔ اس کے پیٹ میں ایک ضرب ایسی لگی تھی جس نے اس کی آنتوں کو کافی متاثر کیا تھا۔ اسی چوٹ کے بارے میں جاننے کے لیے وہ ٹیسٹ کروایا گیا تھا اور اب بھی ڈاکٹر نقوی نے اسی چوٹ کا بہانہ بنا کر اسے ری اسکیننگ کے لیے بھیجا تھا۔

ورما کو لانے والی لفٹ گراؤنڈ فلور پر پہنچی تو اس کا اسٹریچر لفٹ سے باہر لانے سے پہلے سیکیورٹی پر مامور دونوں اہلکار باہر نکلے اور اردگرد کا جائزہ لیا۔ طویل کوریڈور میں دائیں جانب وہ لیبارٹری تھی جہاں ورما کو لے جایا جا رہا تھا۔ کوریڈور کا یہ حصہ بالکل سنسان پڑا تھا جبکہ بائیں جانب استقبالیہ کاؤنٹر تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر قطار میں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ کرسیاں اس مقصد کے لیے رکھی گئی تھیں کہ اسپتال میں آنے والے افراد جو استقبالیہ کاؤنٹر سے کوئی انفارمیشن حاصل کرنا چاہتے ہوں، کاؤنٹر پر رش لگانے کے بجائے وہاں بیٹھ کر انتظار کریں اور اپنی باری آنے پر کاؤنٹر تک جائیں۔ اسپتال میں موجود سیکیورٹی کا عملہ اس بات پر سختی سے عمل کرواتا تھا۔ اس وقت بھی کاؤنٹر پر موجود استقبالیہ کلرک کے دائیں جانب نیلی وردی میں ایک سیکیورٹی گارڈ کھڑا ہوا تھا۔

سادہ لباس میں موجود ورما کی سیکیورٹی پر موجود دونوں اہلکاروں کی نظریں کوریڈور کے بائیں جانب ہی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ یہاں سے اسپتال کی مرکزی عمارت کا دروازہ بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ اس دروازے پر بھی دو باوردی سیکیورٹی گارڈز موجود تھے جو آنے جانے والوں کو سرسری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ گارڈز اسپتال میں آنے والوں کی تلاشی وغیرہ نہیں لیتے تھے۔ ان کا کام صرف ان پر نظر رکھنا اور کسی شخص کے مشکوک محسوس ہونے پر اس سے پوچھ گچھ کرنا تھا... یا ان افراد میں سے اگر کوئی کسی قسم کی ڈسٹربنس پیدا کرتا تھا، تب یہ سیکیورٹی گارڈز حرکت میں آتے تھے۔ ورما کی سیکیورٹی پر مامور اہلکاروں نے ماحول میں کوئی غیر معمولی پن محسوس نہیں کیا تو اسپتال کے عملے کے افراد کو ورما کا اسٹریچر لفٹ سے باہر لانے کی اجازت دے دی۔ جس وقت اسٹریچر لفٹ سے باہر لایا جا رہا تھا، کرسیوں پر بیٹھے افراد میں سے ایک نوعمر لڑکا اچانک اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ لڑکے کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ یہ اسی نوعیت کی عام سی فائل تھی جسے لوگ عموماً کسی قسم کا ریکارڈ رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

لڑکے نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے سادہ لباس سیکیورٹی اہلکاروں کو غور سے دیکھا۔ اہلکاروں میں سے ایک کی نظروں نے اس کا یہ دیکھنا محسوس کر لیا اور الرٹ ہو گیا لیکن لڑکے نے ایک نظر ڈالنے کے بعد دوبارہ اس کی طرف نہیں دیکھا اور کاؤنٹر پر پہنچ کر اپنے ہاتھ میں موجود فائل وہاں رکھ دی اور استقبالیہ کلرک سے کچھ پوچھنے لگا۔ اس کی اس بے نیازی نے سیکیورٹی اہلکار کو مطمئن کر دیا لیکن یہی اس کی غلطی تھی۔ استقبالیہ کلرک سے بات کرتے ہوئے لڑکے نے اچانک ہی فائل کھولی اور درمیان میں رکھا ہوا پسٹل باہر نکال لیا۔ اس کے پسٹل نکالتے ہی کرسیوں پر بیٹھے افراد میں سے ایک فرد اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی ڈھیلی ڈھالی قمیص کے نیچے بندھی بیلٹ سے ریوالور کھینچ کر نکال لیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ورما کا اسٹریچر لفٹ سے باہر نکال کر کوریڈور کے دائیں جانب موڑا جا رہا تھا۔ دونوں مسلح لڑکوں کے ہتھیاروں نے بہ یک وقت شعلے اگل کر سیکیورٹی اہلکاروں کو نشانہ بنایا۔ عین اسی وقت دو ڈھاٹا پوش مرکزی دروازے پر موجود سیکیورٹی گارڈز کو اپنی کلاشنکوفوں سے بھونتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور بھاگتے ہوئے کوریڈور کے اس حصے کی طرف بڑھے جہاں ورما کا اسٹریچر موجود تھا۔ ان کی کلاشنکوفوں نے اس بار استقبالیہ کاؤنٹر کے قریب کھڑے سیکیورٹی گارڈ کو نشانہ بنانے کے ساتھ ساتھ وہاں موجود کلرک کو بھی چاٹ لیا۔ کوریڈور میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی اور عام افراد میں سے بھی کئی لوگ بے تحاشا چلتی گولیوں کی زد میں آ گئے۔ گولیاں چلانے والوں نے البتہ اس بات کا پورا خیال رکھا تھا کہ کوئی گولی ورما کی طرف رخ نہ کر سکے۔ ورما کی سیکیورٹی پر موجود اہلکاروں میں سے ایک اہلکار کو لگنے والی گولی جان لیوا ثابت نہیں ہوئی تھی اور اس نے جوابی فائر کر کے خود کو زخمی کرنے والے نوجوان کو نشانہ بنا لیا تھا۔ اس کی چلائی گئی گولی نوجوان کے پیٹ میں لگی تھی اور وہ کوریڈور کے فرش پر گرا تڑپ رہا تھا۔ اس کے ساتھی نے اس کا یہ حال دیکھا اور اسے فرار کے قابل نہ پا کر ایک گولی اس کے بھیجے میں اتار دی۔ تڑپتا ہوا نوجوان فوراً ہی ساکت ہو گیا۔ باقی حملہ آوروں نے اس طرف دھیان دیے بغیر اپنی کارروائی جاری رکھی۔ بچ جانے والا سیکیورٹی اہلکار پوری کوشش کر رہا تھا کہ ان حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکے لیکن وہ اکیلا کب تک ان کے مقابل ٹھہر سکتا تھا۔ سینے پر گولی کھا کر گرتے ہوئے اس کی یہ امید بھی دم توڑ چکی تھی کہ فائرنگ کی آواز سن کر باہر کہیں پولیس موبائل میں موجود افراد حرکت میں آئیں گے تو ان حملہ آوروں کا راستہ روک لیں گے۔ مرتے مرتے اس کے کانوں نے بیرونی حصے سے آتی فائرنگ کی آوازیں سن لی تھیں۔ ان آوازوں کو سن کر یوں لگتا تھا کہ دو مسلح گروپ آپس میں متصادم ہو گئے ہوں... یعنی اسپتال پر کیا جانے والا حملہ بے حد منظم تھا۔

سادہ لباس سیکیورٹی اہلکار کے دم توڑتے ہی ایک حملہ آور بھاگ کر اسٹریچر تک پہنچا۔ فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوتے ہی ورما اسٹریچر سے اتر گیا تھا اور اسٹریچر کو کھینچ کر اپنے سامنے کرتے ہوئے ایک دیوار سے پشت لگا لی تھی۔ یہ حکمتِ عملی اس نے خود کو فائرنگ کی زد میں آنے سے بچانے کے لیے اختیار کی تھی۔ جب کوریڈور میں پہلا فائر ہوا تو اسے

Scanned and Uploaded By Nadeem
Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM
Uploaded By Muhammad Nadeem

اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب اس کے لیے کیا جارہا ہے لیکن پھر حملہ آوروں کے انداز سے وہ بھانپ گیا کہ آنے والے اس کے لیے آئے ہیں۔ خود کو دی جانے والی اسپیشل ٹریٹ منٹ کی وجہ سے اس کے زخم تیزی سے مندمل ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن ابھی وہ اس قابل نہیں تھا کہ بہت زیادہ بھاگ دوڑ کر سکتا، چنانچہ اسٹریچر کی آڑ میں دبک کر بیٹھا رہا۔ سیکیورٹی اہلکاروں کے مارے جانے کے بعد جب ایک کلاشنکوف بردار بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہوا۔

''یہاں سے نکلیں سر!'' کلاشنکوف بردار نے اسے پکارنے کے ساتھ ہی سہارا بھی دیا۔ ورما نے بڑی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھاگنا شروع کر دیا لیکن فوراً ہی اس کے پیٹ میں درد کی لہریں اٹھنی شروع ہو گئیں۔ اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے کلاشنکوف بردار نے اسے اپنے کاندھے پر ڈالا اور دوڑ پڑا۔ وہ تیم تیم اور طاقتور آدمی تھا چنانچہ اسے ورما کو اٹھا کر بھاگنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ منصوبہ سازوں نے اسے یہ ذمے داری سونپی بھی اس لیے تھی۔ وہ اپنے سورسز استعمال کر کے یہ جاننے میں کامیاب تو ہو گئے تھے کہ ورما اب روبہ صحت ہے اور اسے اسپتال سے نکال لے جانے میں اس کی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا لیکن انہوں نے ساتھ ہی اس بات کا بھی خیال رکھا تھا کہ اگر ورما کو نقل و حرکت میں دشواری پیش آئے تو فوری طور پر اس مسئلے کا تدارک کیا جا سکے۔ ان کی یہ دور اندیشی اس وقت کام آرہی تھی۔ تیم تیم آدمی ورما کو کاندھے پر ڈالے باہر کی طرف بھاگا جارہا تھا جبکہ اس کے مسلح ساتھی انہیں کور دینے کے لیے ساتھ ساتھ تھے۔ وہ لوگ دروازے سے باہر نکلے تو پہلے سے اسٹارٹ ایک گاڑی کھلے دروازوں کے ساتھ ان کی منتظر تھی۔ ورما کو اس گاڑی میں منتقل کرتے ہی گاڑی حرکت میں آگئی اور گولی کی طرح اسپتال کے احاطے سے نکلتی چلی گئی۔

گاڑی کے نکلتے ہی فائرنگ کا سلسلہ بھی زور توڑنے لگا۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد پانڈے کے ماتحت بہت تیزی سے وہاں سے فرار ہونے لگے۔ انہوں نے اپنے فرار کا طریقہ کار بھی پہلے سے طے کر رکھا تھا، چنانچہ جب تک پولیس کی سائرن بجاتی گاڑیاں اسپتال کے سامنے پہنچیں، وہ نکلنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انہوں نے اس ساری کارروائی کے دوران جدید اسلحے کے ساتھ ساتھ بہترین گاڑیاں اور جدید مواصلاتی آلات بھی استعمال کیے تھے اور ایک دوسرے سے مسلسل رابطے میں رہے تھے۔ راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے بھی انہوں نے مرکزی شاہراہوں کے بجائے ذیلی سڑکوں اور گلیوں کا استعمال کیا تھا اور اس طرح منتشر ہو گئے تھے کہ کسی کو ان کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

ورما کو لے جانے والی گاڑی بھی ڈیڑھ دو منٹ کے اندر ہی اسپتال کے سامنے والی شاہراہ کو چھوڑ کر ایک ذیلی سڑک پر مڑی اور پھر وہاں سے ایک گلی میں گھس گئی۔ یہاں ایک گاڑی پہلے سے منتظر کھڑی تھی۔ اسپتال سے فرار کے لیے استعمال کی جانے والی گاڑی کو چھوڑ کر وہ لوگ اس گاڑی میں منتقل ہو گئے۔ شہر میں جابجا نصب کیمروں نے اگر پہلے والی گاڑی کی فلم بنائی بھی تھی تو وہ اس پتلی سی گلی میں اس گاڑی سے نجات حاصل کر چکے تھے اور یہاں بہرحال ایسا کوئی کیمرا موجود ہونے کا امکان نہیں تھا جو اس سارے منظر کو قید کر سکتا۔ ورما کو لے جانے والی یہ دوسری گاڑی گلی چھوڑ کر باہر نکلی تو تیم تیم آدمی نے پانڈے سے رابطہ کیا۔

''مشن کامیاب رہا سر! ورما سر میرے ساتھ ہیں اور ہم پوائنٹ فور کی طرف جارہے ہیں۔''

''بہت خوب!'' اس اطلاع کو سن کر پانڈے نے خوشی سے بھرپور لہجے میں اسے داد دی اور پھر اگلے ہی لمحے تحکمانہ سرد مہری سے بولا۔ ''ڈاکٹر نقوی کے نواسے کو اس کے گھر پہنچا دو۔ ہم نے اسے وچن دیا تھا کہ اسے اس کا نواسا ضرور ملے گا۔''

''او کے سر!'' حکم کے غلام نے تابع داری سے جواب دیا اور اس حکم پر عمل کروانے کے لیے اپنے ہی جیسے ایک دوسرے غلام سے رابطہ کرنے لگا۔

☆☆☆

''آپ نے ورما کو ٹیسٹ کے لیے نیچے لیبارٹری میں کیوں بھجوایا تھا ڈاکٹر نقوی؟'' تفتیشی افسر نے اندر تک اتر جانے والی نظروں سے ڈاکٹر نقوی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں اس کے پیٹ پر لگنے والی ضرب سے متاثر ہونے والی آنتوں کی موجودہ کنڈیشن جاننا چاہتا تھا تاکہ ری اسکیننگ کے ذریعے دواؤں کے اثرات کا جائزہ لے سکوں۔'' ڈاکٹر نقوی نے ذرا تفصیل سے جواب دیتے ہوئے لاشعوری طور پر اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔ گھنٹا بھر قبل جو واقعہ پیش آیا تھا، اس نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ معمول کے مطابق راؤنڈ مکمل کر کے اپنے کمرے میں واپس آنے کے بعد گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا جب اسے گراؤنڈ فلور سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ ان آوازوں کو سن کر اسے احساس ہوا کہ جس مقصد کے تحت شوبی کو اغوا کر کے اسے استعمال کیا گیا ہے، اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا ہے۔ اپنے اندر طاری ہو جانے والے سناٹے کے باوجود وہ صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ بھی اس سے اوروں کی طرح قطعی انجان ہے... اپنے کمرے سے باہر نکل گیا۔

سارے اسپتال میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ خوف زدہ بھی تھے اور حیران بھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کئی افراد نے پولیس کے ایمرجنسی نمبرز پر مدد کے لیے کال بھی کر دی تھی۔ چند منٹوں کی فائرنگ میں لوگوں میں بے پناہ خوف و ہراس اور سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ ڈاکٹر نقوی بھی زرد پڑتے چہرے کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ جب اس واقعے کی تحقیقات ہوں گی تو وہ بھی تفتیش کی زد میں آئے گا لیکن وہ بھی کیا کرتا۔ نواسے کی محبت نے اسے کچھ بھی سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اسے حکم دینے والوں نے اسے اتنی مہلت بھی نہیں دی تھی کہ وہ کچھ غور و خوض کر سکتا لیکن جو کچھ ہو رہا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک بڑی مصیبت کو گلے لگا بیٹھا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پولیس کی سائرن بجاتی گاڑیوں نے اسپتال کا گھیراؤ کرنے کے بعد باہر جانے کے سارے راستے بند کر دیے اور پابندی عائد کر دی کہ ان کی طرف سے اجازت ملنے سے قبل کوئی شخص اسپتال کی عمارت سے باہر نہیں نکل سکتا۔ پولیس کی کارروائی شروع ہوئی تو پہلے مرحلے میں زخمیوں کو طبی امداد پہنچانے کے ساتھ مرنے والوں کی گنتی اور ان کی شناخت کا کام ہونے لگا۔ اسپتال کے عملے کو خوف زدہ ہونے کے باوجود حرکت میں آنا پڑا۔ زخمیوں کی زندگی بچانے کے لیے بھاگ دوڑ کرنے والوں میں ڈاکٹر نقوی بھی شامل تھا۔

اس واقعے میں استقبالیہ کلرک اور سیکیورٹی گارڈز کے علاوہ اسپتال کی عمارت میں موجود پانچ عام شہریوں کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا تھا۔ زخمی افراد کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ ڈاکٹر نقوی ان سب کی اموات اور تکالیف کا بوجھ اپنے دل پر محسوس کر رہا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا، وہ اس کے ضمیر کے لیے بھی بوجھ تھا اور اس کی نیک نامی کو بھی خطرے میں ڈال سکتا تھا۔ وہ پوری طرح شک کی زد میں تھا۔ اس حقیقت کا ادراک اسے تفتیشی افسر کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے بہ خوبی ہو رہا تھا۔

''ایسا کیوں ہوا ڈاکٹر نقوی کہ حملہ آوروں نے ٹھیک اس وقت ایکشن لیا جب ورما کو اسکیننگ کے لیے لیبارٹری کی طرف لے جایا جارہا تھا؟'' اس کی وضاحت کو خاطر میں لائے بغیر تفتیشی افسر نے چبھتے ہوئے لہجے میں ایک اور سوال کیا۔

''اسے ایک اتفاق کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔'' ڈاکٹر نقوی نے اس سے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

''اتفاق...'' تفتیشی افسر نے طنز بھرے لہجے میں یہ لفظ ادا کیا اور پھر سرد مہری سے بولا۔

''آپ جانتے ہیں ڈاکٹر نقوی کہ اس ایک اتفاق کی وجہ سے کتنا بڑا مجرم بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے... اور کتنے بے قصور لوگ اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں؟'' اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر نقوی نے خاموشی اختیار کر لی۔

''خاموش رہنے سے آپ کی جان نہیں چھوٹے گی ڈاکٹر! آپ کو بتانا ہوگا کہ آپ نے حملہ آوروں کا ساتھ کیوں دیا؟ آپ ان کے ساتھی ہیں یا پھر انہوں نے کسی طریقے سے آپ کو اپنا آلۂ کار بنا لیا تھا؟'' تفتیشی افسر اسے کسی طور بخشنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ذرا سی دیر کی تحقیق میں ہی اس کے سامنے یہ بات آگئی تھی کہ ورما کو ڈاکٹر نقوی کے حکم پر نیچے بھجوایا گیا تھا اور اس کے نیچے پہنچتے ہی وہاں کارروائی شروع ہو گئی تھی۔ ایسے میں اس کی ذات کو شک سے کس طرح بری سمجھا جا سکتا تھا؟ ایک نہایت قابل اور معزز ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ اس وقت سب سے زیادہ مشکوک فرد شمار ہو رہا تھا۔

''آپ مجھ پر الزام تراشی کر رہے ہیں آفیسر! میں ایک باعزت ڈاکٹر ہوں اور آپ مجھ سے کسی مجرم کا سا سلوک نہیں کر سکتے۔'' تفتیشی افسر سے یہ سب کہتے ہوئے اس نے چاہا تھا کہ اپنا لہجہ تیز رکھے لیکن اندر موجود احساسِ جرم نے اسے اس خواہش میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔

''آپ بے قصور ثابت ہو گئے تو میں آپ سے اپنے رویے کی معذرت کر لوں گا لیکن آپ کو فی الحال تو اس بات کی وضاحت کرنی ہوگی کہ عین اس وقت جبکہ آپ نے مجرم کو اسکین کے لیے نیچے بھجوایا، اس کے ساتھیوں نے اسے فرار کروانے کے لیے اتنا منظم حملہ کیوں کیا؟'' تفتیشی افسر کی سوئی اپنی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نقوی کو سمجھ نہیں آیا کہ ایسا کیا کہے جو اس افسر کو مطمئن کر سکے۔ وہ اسے کوئی جواب دیتا، اس سے قبل ہی وہاں موبائل کی رنگ ٹون سنائی دینے لگی۔ یہ رنگ ٹون اس کے موبائل کی تھی جو اس وقت تفتیشی افسر کے قبضے میں تھا۔ اس نے موبائل اسکرین پر آنے والا نام دیکھا اور ریسیو کا بٹن پش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا اسپیکر بھی آن کر کے بات کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے موبائل اس کی

Scanned and Uploaded By Nadeem
Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM
Uploaded By Muhammad Nadeem

طرف بڑھا دیا۔ ڈاکٹر نقوی نے بھی اس کے حکم پر عمل کرنے سے پہلے اسکرین پر جگمگاتا نام دیکھا۔ یہ اس کی بیوی کی کال تھی۔ فائرنگ کا سلسلہ شروع ہونے سے قبل وہ کئی بار گھر پر رابطہ کرنے کی کوشش کر چکا تھا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اب اس کی بیوی کا فون آیا بھی تھا تو ایسے وقت جب وہ اپنے گھر کی صورتِ حال جاننے کے لیے بہت بے چین ہونے کے باوجود اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن بات کیے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ اس بند کمرے میں موجود تفتیشی افسر اور اس کے پیچھے کھڑے مسلح اہلکار کی نظریں اس پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

''ہیلو طاہرہ! کہو کیسے فون کیا ہے؟ اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔'' اس نے اپنی سی کوشش کی کہ کسی طرح بیوی کو کچھ ایسا بولنے سے روک سکے جو اس کے لیے مشکل کا باعث بن جائے لیکن دوسری طرف وہ اس کی بات سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

''شوبی گھر واپس آ گیا ہے نقوی۔'' اس نے رُندھی ہوئی آواز میں اطلاع دی تو نواسے کی واپسی کا سن کر دل میں اطمینان محسوس کرنے کے باوجود ڈاکٹر نقوی کو اس کے لہجے پر حیرت ہوئی۔

''شاید خوشی کی شدت نے طاہرہ کی آواز میں آنسوؤں کی نمی پیدا کر دی ہے۔ بہت زیادہ خوشی بھی تو بعض اوقات انسان کو رُلا دیتی ہے۔'' اس نے خود ہی ایک جواز تراش لیا اور گفتگو کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے بولا۔

''یہ تو اچھی خبر ہے طاہرہ! اس سے کہنا سوئے نہیں، میں گھر واپس آتے ہوئے اس کے پسندیدہ ریسٹورنٹ سے پیزا لیتا ہوا آؤں گا۔'' اس نے لہجے میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے ایک بہت ہی حساس معاملے کو ہلکے پھلکے انداز میں ٹالنے کی کوشش کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس ٹیلی فونک گفتگو سے شوبی کے اغوا کا معاملہ تفتیشی افسر کے علم میں آ سکے۔

''شوبی ہمیشہ کے لیے سو گیا ہے نقوی! اب وہ کبھی آپ کا لایا ہوا پیزا نہیں کھا سکے گا۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو طاہرہ؟'' ڈاکٹر نقوی حلق کے بل دہاڑا۔ بیوی کی بات کا جو مفہوم سمجھ آ رہا تھا، وہ اسے سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جذبات کی شدت نے اسے ساری مصلحت پسندی بھی بھلا دی تھی اور وہ تفتیشی افسر کی موجودگی کو فراموش کر کے اصل صورتِ حال جاننے کے لیے بے چین ہو گیا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ وہ ظالم شوبی کی لاش گھر کے سامنے پھینک کر چلے گئے ہیں۔ عاشی کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ آپ فوراً گھر واپس آ جائیں نقوی! میں اکیلی سب کچھ نہیں سنبھال سکتی۔'' وہ روتے ہوئے اسے پکار رہی تھی لیکن ڈاکٹر نقوی تو گویا ہر صدا سننے سے محروم ہو گیا تھا۔ جسے بچانے کے لیے وہ اپنے ضمیر کا سودا کر بیٹھا تھا، وہ انہیں اس حال میں لوٹایا گیا تھا کہ اس کے وجود میں زندگی کی رمق نہیں رہی تھی۔ یہ کیسا ایفائے عہد تھا؟ یہ کیسی سودے بازی تھی؟ یہ کیسا ظلم تھا؟ اپنے ذہن میں ابھرتے ان احتجاجی سوالوں کا جواب ملنے سے قبل ہی اس کا دل ڈوبنے لگا اور وہ سینے پر بائیں جانب ہاتھ رکھتے ہوئے سامنے کی طرف جھکتا چلا گیا۔

☆☆☆

''بہت خوب پانڈے! تم نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس کے لیے تمہیں خصوصی انعام دیا جانا چاہیے۔ میں اوپر بات کروں گا۔ تم دیکھنا، تمہارے فارن اکاؤنٹ میں جلد ہی ایک بڑی رقم ٹرانسفر ہو جائے گی۔'' تکیوں کے سہارے بستر پر نیم دراز ورما نے شیمپین سے بھرا جام ہونٹوں سے جدا کرتے ہوئے پانڈے کو سراہا۔ اسپتال سے فرار ہو کر ایک محفوظ ٹھکانے پر پہنچنے کے بعد سب سے پہلے ورما کا ایک قابل ڈاکٹر سے چیک اپ کروایا گیا تھا۔ ڈاکٹر انہی کا آدمی تھا اور اکثر اس طرح کی خدمات انجام دیتا رہتا تھا۔ اس نے چیک اپ کے بعد یہ تسلی دے دی تھی کہ ورما کا کوئی بھی زخم اب اتنا خطرناک نہیں رہا ہے اور وہ جلد ہی صحت یاب ہو جائے گا لیکن کچھ دن اسے مکمل آرام کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے پیشِ نظر ورما اس وقت بستر پر نظر آ رہا تھا اور بستر ہی پر دراز اپنی آزادی کا جشن منانے کے لیے شراب نوشی کر رہا تھا۔

''آپ کی مہربانی ہے سر! ورنہ میں نے تو اپنی ڈیوٹی پوری کی ہے۔'' عاجزی کا مظاہرہ کرتے پانڈے کا خوشی سے تمتماتا چہرہ بتا رہا تھا کہ ملنے والے انعام کی نوید ہی دراصل اس کی محنت کا اصل ثمر ہے۔

''یہ اچھی بات ہے کہ تم ڈیوٹی کو یاد رکھتے ہو۔ ویسے بھی حالات بتا رہے ہیں کہ آنے والا وقت ہمارے لیے خاصا سخت ثابت ہو سکتا ہے۔ یہاں کی انٹیلی جنس کے ہاتھ میں بہت سی معلومات آ گئی ہیں۔ اب ان کے لیے ہمارے سیٹ اپ کو سمجھنا مشکل نہیں ہوگا۔ اب ہمیں مزید ہاتھ پیر بچا کر کام کرنا ہوگا اور کوئی نیا سیٹ اپ تیار کرنا ہوگا۔ اپنے سارے آدمیوں سے کہہ دو کہ پوری طرح چوکنا رہیں۔'' سنجیدگی سے بولتے ورما کی آنکھوں میں تشویش کی پرچھائیاں لہراتی نظر آ رہی تھیں۔

''آپ چنتا نہ کریں سر! میں پہلے ہی سب کو ہدایت دے چکا ہوں۔ بھگوان نے بڑی کرپا کی کہ جس روز آپ کو اریسٹ کیا گیا، ہمیں فوراً پتا لگ گیا۔ جگدیش آپ کے بلانے پر ہی آپ کے اپارٹمنٹ پر گیا تھا۔ اسے پولیس موبائلز وغیرہ نظر آئیں تو چونک گیا اور پھر اس نے فوراً ہی معلوم کر لیا کہ پولیس نے آپ کے اپارٹمنٹ پر ریڈ کیا ہے۔ اسی نے مجھے انفارم کیا اور میں نے فوراً اپنے سارے بندوں کو انڈر گراؤنڈ ہو جانے کو کہہ دیا۔ بس ہم ڈولی کو نہیں بچا سکے۔ ہمارے ہوشیار کرنے سے پہلے ہی پولیس اسے اریسٹ کر چکی تھی۔ اس کو چھڑانے کے لیے ہم اب بھی کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ میری ساری توجہ آپ کی طرف تھی۔ بڑی مشکل سے معلوم ہو سکا کہ آپ کو کہاں رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ پلان کر کے آپ کو اسپتال سے نکلوایا۔'' وہ تفصیل سے ورما کو بتانے لگا۔

''ڈاکٹر نقوی کی فیملی میں سے کوئی فرد تم لوگوں کو پہچان تو نہیں لے گا؟ اس کے نواسے کی عمر کیا تھی؟ کہیں یہ نہ ہو کہ اس کے ذہن میں کوئی ایسی بات رہ گئی ہو جس کی مدد سے ہمارا کوئی سراغ لگایا جا سکے۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا سر! ہم لوگ بالکل بدلے ہوئے حلیوں میں ڈاکٹر نقوی کے گھر گئے تھے۔ رہی اس کے نواسے کی بات تو اسے ہم نے واپس ضرور بھیجا ہے لیکن مردہ حالت میں۔ ہم نے ڈاکٹر نقوی کو اس کا نواسا پہنچانے کا وچن دیا تھا، یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اسے زندہ بھی دیکھ سکے گا۔'' پانڈے کے چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ تھی۔ اس کا جواب سن کر ورما بھی مطمئن ہو گیا اور نہایت طمانیت سے بولا۔

''اگر تم مطمئن ہو تو اچھی بات ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہمیں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ رہا ڈولی کے گرفتار ہونے کا مسئلہ تو اسے چھوڑ دو۔ ڈولی سے انٹیلی جنس والے اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم کر سکیں گے جتنا وہ ویسے ہی جان گئے ہیں۔ ڈولی اب ہمارے لیے ایک ناکارہ پرزہ ہے۔ اس کا متبادل جلد مل جائے گا۔ جو بیت گیا اسے بھول کر اب نئی پلاننگ کرنی ہوگی اور اس پلاننگ میں شہریار ہماری ہٹ لسٹ میں سب سے اوپر رہے گا۔''

''کون شہریار...؟ کیا وہی جو سجاد رانا کا کزن ہے اور اسسٹنٹ کمشنر کی پوسٹ پر کام کر رہا ہے؟'' پانڈے چونکا۔

''ہاں وہی۔ اس کی وجہ سے پہلے بھی ہم کافی نقصان اٹھا چکے ہیں۔ تمہارے اللہ آباد کے مدرسے والا سیٹ اپ بھی اسی کی وجہ سے خراب ہوا تھا۔ اگر وہ اتنی ایکٹو نہیں دکھاتا تو تم آرام سے شاہنواز کے روپ میں اپنے مشن پر کام کرتے رہتے۔ اس کی وجہ سے پیر آباد کے مدرسے پر سے بھی ہمارا کنٹرول ختم ہوا اور اللہ آباد میں لگایا گیا سرمایہ بھی ڈوب گیا۔ مجھے پھنسوانے والا بھی وہی تھا۔'' ورما پانڈے کو بتانے لگا کہ کس طرح شہریار اس کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور اس کی گرفتاری کا سبب بنا۔

''وہ بالکل بدلے ہوئے روپ میں میرے سامنے آیا تھا۔ اگر وہ سجاد رانا کی بیٹی والے معاملے پر بات نہ کرتا تو میں بہت مشکل سے اسے پہچان پاتا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ میں اسے غور سے تو نہیں دیکھ سکا لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ ماہ بانو نامی وہی لڑکی تھی جس کو پیر آباد کا چودھری ایک عرصے تک تلاش کرتا رہا ہے۔''

''اسے تلاش کیا جا سکتا ہے سر... اور شہریار تو ہے ہی ہمارے سامنے۔ آپ بس حکم دیں کہ کب اس کا کام تمام کرنا ہے۔'' ورما کی بتائی ہوئی تفصیلات سن کر پانڈے نے خوشامدی لہجے میں کہا۔ ورما اس سے بہت سینئر تھا اس لیے اسے اس کی چاپلوسی کرنی پڑ رہی تھی لیکن دل ہی دل میں وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ جیسے ہی موقع ملا، اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر اس طرح اوپر والوں کے سامنے پیش کرے گا کہ وہ ورما کے ناکارہ ہونے پر شواس کر بیٹھیں گے۔

''ہم گولی سے شہریار کا کام تمام نہیں کریں گے۔ اسپتال کے بستر پر لیٹ کر میں نے اس کے بارے میں بہت سوچا تھا اور میں بہت کچھ طے بھی کر چکا ہوں۔ اب بس اس پر عمل ہونا ہے۔ تم دیکھتے جاؤ۔'' ورما کی آنکھوں میں جیسے کوئی شیطانی خواب کروٹیں لے رہا تھا۔

☆☆☆

''آخر یہ ہوا کیسے؟ کیا تم نے ٹھیکیدار پر چیک نہیں رکھا تھا؟'' شہریار نے اپنے سامنے نظریں جھکائے بیٹھے عبدالمنان سے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''سوری سر! میں بس اعتبار کر کے مار کھا گیا۔ ٹھیکیدار سے میری برسوں کی علیک سلیک ہے۔ کئی بار میں نے اس سے چھوٹے موٹے کام بھی کروائے، کبھی اس نے کوئی بے ایمانی نہیں کی۔ اس اعتماد کی وجہ سے ہی میں نے اسے اپنے پروجیکٹ میں شامل کیا تھا۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایسی حرکت کر گزرے گا۔ وہ تو نور پور کے چودھری صاحب کو ہی کچھ شک گزرا تو انہوں نے میری توجہ اس طرف دلوائی اور میں نے چیک کیا تو واقعی کافی گھپلا تھا۔ میں شرمندہ ہوں لیکن

Scanned and Uploaded By Nadeem
Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned and Uploaded By Nadeem

یہ معاملہ آپ کے سامنے لائے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔“ عبدالمنان کے الفاظ اور تاثرات دونوں سے گہری شرمندگی جھلک رہی تھی۔ نور پور میں اسکول اور اسپتال کی تعمیر کا جو پروجیکٹ جاری تھا، اس کے سلسلے میں ٹھیکیدار کی بدعنوانی سامنے آئی تھی۔ ٹھیکیدار کا انتخاب بھی عبدالمنان نے کیا تھا اور اس سے معاملات بھی وہی طے کرتا تھا، اس لیے اس بدعنوانی کے سامنے آنے کے بعد وہی سب سے زیادہ ذمے دار بھی ٹھہرتا تھا۔

”صرف شرمندہ ہونے سے کام نہیں چل سکتا عبدالمنان! ان پروجیکٹس پر جو رقم خرچ ہو رہی ہے، وہ ہمارے پاس امانت ہے۔ سیٹھ مولی والا مرحوم نے اپنی جائداد اگر ہمارے حوالے کی تھی تو صرف اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم اس بات کے اہل ہیں کہ امانت کا حق ادا کر سکتے ہیں اور ان کی رقم اسی طرح خرچ ہوگی جس طرح وہ چاہتے ہیں۔ ہم نے اپنے فرض کی ادائیگی میں جو غفلت کی ہے، وہ ایک مرے ہوئے انسان کے اعتماد کو دھوکا دینے کے زمرے میں ہی آتی ہے۔“

”میں جانتا ہوں سر اور تلافی کی جو بھی صورت نکلے، اس کے لیے تیار ہوں۔“ اس کی بات سن کر عبدالمنان کی شرمندگی اور بھی گہری ہوگئی اور وہ پورے خلوص سے بولا۔

”میں تنہا تمہیں ذمے دار نہیں ٹھہرا رہا ہوں۔ غلطی شاید میری بھی ہے۔ میں اس معاملے کو کلی طور پر تمہارے حوالے کرنے کے بجائے اگر خود بھی مسلسل رابطے میں رہتا تو یہ صورت حال پیش نہیں آتی۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا، اب پہلا کام یہ کرنا ہوگا کہ ٹھیکیدار کو گرفتار کیا جائے اور پھر اس سے ہضم کی گئی ساری رقم نکلوائی جائے۔ اس کے بعد چھان پھٹک کر کسی دوسرے آدمی کو یہ ذمے داری سونپی جائے گی۔ اس سارے عمل سے گزرتے ہوئے جو وقت برباد ہوگا، اس کا البتہ کوئی حل نہیں اور اس کے لیے بہرحال ہمیں ہمیشہ شرمندہ رہنا ہوگا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!“ عبدالمنان نے اس کی تائید کی پھر مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”میں ڈی ایس پی منظور کو ابھی فون کر دیتا ہوں۔ ٹھیکیدار کی گرفتاری کا کام وہ اپنی نگرانی میں کروا دے گا۔“ اس نے سامنے رکھے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن ریسیور اٹھانے سے قبل ہی فون بج اٹھا۔ عبدالمنان نے کال ریسیو کی اور لحہ بہ لحہ گہری ہوتی سنجیدگی کے ساتھ دوسری طرف کی بات سنتا رہا۔ درمیان میں اس نے کچھ سوالات بھی کیے جنہیں سن کر شہریار نے اندازہ لگایا کہ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آ گیا ہے۔ عبدالمنان نے گفتگو مکمل کر کے فون رکھا تو وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”بری خبر ہے سر! تانگے والے اکو کی جنگل سے لاش ملی ہے۔ لاش کی حالت بہت خراب ہے اور ظاہری طور پر تو یہی لگتا ہے کہ اسے جانوروں نے چیر پھاڑ کر مار ڈالا ہو۔ ایک ہاتھ تو سرے سے غائب ہے۔ شاید کسی طاقتور جانور نے اس کے جسم سے اکھاڑ دیا ہے۔ حتمی نتیجہ بہرحال پوسٹ مارٹم کے بعد ہی نکل سکے گا۔“ اس نے دوسری طرف سے ملنے والی رپورٹ اختصار کے ساتھ بیان کی۔

”مجھے اس معاملے میں گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔ اکو کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ اپنی منگیتر رانی کی موت کا ذمے دار چودھری کو سمجھتا تھا اور اس کے خلاف ہمارا ساتھ دینے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ ان حالات میں یہ بھی تو سمجھا جا سکتا ہے کہ اسے ہمیشہ کے لیے خاموش رکھنے کے لیے ٹھکانے لگا دیا گیا ہو۔ ویسے بھی چودھری نے جنگل کو اپنی جاگیر سمجھ کر اپنے مخالفین کے لیے مقتل گاہ بنا ڈالا ہے۔ کتنی لاشیں ہیں جو اب تک جنگل سے دریافت ہوئی ہیں اور یہ سارے وہ لوگ تھے جن سے چودھری کا کچھ نہ کچھ اختلاف تھا۔“

اپنے شکوک کا اظہار کرتے ہوئے شہریار کے لہجے میں غصے کی لہر در آئی تھی۔ ٹھیکیدار کی بدعنوانی والے معاملے نے یوں بھی مزاج مکدر کر رکھا تھا، یہ ایک اور بری خبر سنی تو خود بہ خود ہی غصے میں اضافے کا سبب بن گئی۔ ایسے میں اس کے ذاتی موبائل کی رنگ ٹون بجی تو اس نے قدرے بیزاری سے اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہاں کسی نام کے بجائے ایک نمبر جگمگا رہا تھا۔ وہ اس نمبر کو خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نمبر کی سم اس نے خود ماہ بانو کو خرید کر دی تھی اور احتیاطاً نمبر کو اس کے نام کے ساتھ اپنے موبائل کی فون بک میں ایڈ نہیں کیا تھا۔ ماہ بانو کے نمبر سے کال آتے دیکھ کر وہ چونک گیا اور ایک طرح کی تشویش نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ اس کی طرف سے احتیاط برتنے کی ہدایت کی وجہ سے وہ بلاضرورت اسے فون نہیں کرتی تھی، اب جو اس کی طرف سے فون آیا تو وہ قدرتی طور پر پریشان ہو گیا اور پریشانی کے عالم میں اس کی کال ریسیو کی۔

”السلام علیکم سر!“ اس کی ”ہیلو“ کے جواب میں ماہ بانو نے اسے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام... خیریت؟ کیسے فون کیا؟“ اس کے سلام کا جواب دے کر وہ فوراً ہی پوچھنے لگا۔

”جی خیریت ہے۔ بس دل گھبرا رہا تھا اس لیے آپ کو فون کر لیا۔“ اس نے دھیمی آواز میں بتایا تو جہاں شہریار کو اس کی طرف سے اطمینان ہوا، وہیں غصہ بھی آنے لگا کہ اس نے اس کی ہدایت کے برخلاف بلاوجہ فون کیوں کیا؟ خوش گوار موڈ کے ساتھ شاید اسے ماہ بانو کی یہ نافرمانی اتنی بری نہیں لگتی لیکن اس وقت تو مزاج پہلے ہی سے برہم تھا چنانچہ وہ بے چاری خود بہ خود ہی لپیٹ میں آ گئی اور وہ نہایت روکھے پن سے اجنبی لہجے میں بولا۔

”دیکھو بی بی! میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ بے مقصد باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہوتا۔ اگر کوئی اہم مسئلہ ہو تو مجھے کال کیا کرو۔ یہ بیکار کی باتیں سننے کے لیے میرے پاس فرصت نہیں۔“

”سوری سر!“ اتنی سخت بات سننے کے بعد ظاہر ہے ماہ بانو اس سے مزید کچھ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتی تھی، چنانچہ فوراً ہی فون بند کر دیا۔ شہریار کے عین سامنے بیٹھے عبدالمنان نے بھی اس کا یہ انداز ملاحظہ کیا تھا۔ دوسری طرف سے فون کرنے والی ہستی کون تھی، یہ تو وہ بھی اندازہ نہیں لگا سکا لیکن یہ ضرور سمجھ گیا کہ آج شہریار صاحب خراب موڈ میں ہیں۔

”مجھے اجازت ہے سر... میں اپنی سیٹ پر جاتا ہوں، وہیں سے ڈی ایس پی کو بھی فون کر دوں گا۔“ اس نے منظر سے ہٹ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ شہریار نے سر کے اشارے سے اسے اجازت دے دی۔ عبدالمنان کے باہر جانے کے بعد وہ اپنے رویّے کے بارے میں ٹھنڈے دل سے سوچنے لگا تو ماہ بانو کے ساتھ اپنا رویّہ ضرورت سے زیادہ سخت محسوس ہوا۔ شاید ٹھیکیدار کی بدعنوانی اور اکو کی موت کی خبریں سن کر وہ ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ دوسرے وہ جس راہ پر چل رہا تھا، ڈرتا تھا کہ محبت کے پیچ و خم میں پھنس کر وہ راہ کھوٹی نہ کر بیٹھے۔ اندر کا یہ ڈر اسے محتاط روی پر اکساتا تھا چنانچہ وہ کسی صورت خود کو ماہ بانو کے نزدیک نہیں ہونے دیتا تھا۔

”ڈاکٹر ماریا تشریف لائی ہیں سر! آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ وہ کسی کام میں مصروف ہو کر اپنا دھیان بٹانا چاہتا تھا کہ انٹرکام بج اٹھا اور عبدالمنان نے اسے اطلاع دی۔ عموماً وہ غیر طے شدہ ملاقاتوں سے گریز کرتا تھا لیکن بعض افراد اس پابندی سے مستثنیٰ تھے، خاص طور پر انتظامی امور سے منسلک افراد۔ جن لوگوں کو ٹالنے کی کوشش کی جاتی تھی، وہ ایسے جاگیردار یا عہدے داران ہوتے تھے جو اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے اس سے ربط ضبط بڑھانے کے خواہش مند ہوتے تھے۔ ڈاکٹر ماریا کا معاملہ ہر طرح کے لوگوں سے مختلف تھا۔ وہ اگرچہ چودھری کے جبر سے مجبور ہو کر سہی لیکن اس کے قائم کردہ مرکزِ صحت میں بڑی دل جمعی سے فرائض انجام دے رہی تھی۔ ایک مخلص اور اچھی ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ قابلِ قدر تھی، سو تھی... شہریار کے لیے تو اس لیے بھی بہت اہمیت رکھتی تھی کہ اس نے اس کے لیے ایک محسن کا کردار ادا کیا تھا۔ اگر ڈاکٹر ماریا ساتھ نہ دیتی تو وہ چودھری کی سازش کا شکار ہو کر اپنی قابلِ اعتراض تصویروں کے اسکینڈل میں پھنس چکا ہوتا۔ ڈاکٹر ماریا اگر اس وقت اس سے ملنے کے لیے خود اس کے آفس تک چل کر آئی تھی تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے تمام مصروفیات ترک کر کے فوراً اسے اندر بلوا لیا۔

”ہیلو سر! کہیں میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟ آپ کی مصروفیت کا سوچ کر یہاں آنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی لیکن پھر سوچا کہ ایک بار کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔“ ڈاکٹر ماریا اندر آئی تو اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مسکراتے ہوئے بولنا شروع کر دیا۔

”مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی آپ سے ملنے سے انکار کیا ہو... پھر بھلا ہمت کیوں نہیں ہو رہی تھی؟“ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے شہریار نے جواب دیا اور خوش دلی سے مسکرانے لگا۔

”انکار تو واقعی نہیں کیا لیکن میرا مشاہدہ ہے کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں کبھی بھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب کس طرح سے بی ہیو کریں گے۔“

”ارے نہیں بھئی، اب میں اتنا بھی موڈی یا روڈ انسان نہیں ہوں کہ ایک معزز خاتون اتنی دور سے مجھ سے ملاقات کے لیے آئیں اور میں انکار کر دوں۔“ ڈاکٹر ماریا کے ڈر کی وجہ جان کر وہ دھیرے سے ہنسا اور اسے جواب دیا۔

”یہ تو میرے لیے بڑے آنر کی بات ہے کہ آپ میرا شمار معززین میں کرتے ہیں ورنہ جس طرح چودھری افتخار نے مجھے اپنے جال میں پھنسا رکھا ہے، میں خود اپنے آپ سے گھن محسوس کرنے لگی ہوں۔“ ڈاکٹر ماریا کے لہجے میں اداسی در آئی۔

”اس جال سے تو آپ خود رہائی حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ورنہ میں نے تو آپ کو کئی بار حوصلہ دیا ہے۔ آپ اگر تھوڑی سی ہمت کریں تو چودھری کے چنگل سے نکل سکتی ہیں۔“ شہریار نے اسے اکسایا۔

”اس موضوع پر ہم کئی بار بات کر چکے ہیں اور مجھے افسوس ہے کہ میں کبھی آپ کی باتوں سے قائل نہیں ہو سکی... بہتر ہے کہ ہم یہ بحث ہی چھوڑ دیں۔“ ڈاکٹر ماریا نے

WWW.PAKSOCIETY.COM
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned and Uploaded By Nadeem

جو جواب دیا، اسے سن کر شہریار نے خاموشی اختیار کرلی۔ کچھ دیر ان کے درمیان یہ خاموشی قائم رہی پھر ڈاکٹر ماریا نے اس خاموشی کو توڑا اور ذرا شوخ لہجے میں بولی۔

''آپ کی ایک غلط فہمی دور کرنی تھی۔ آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں صرف آپ سے ملنے کے لیے پیرآباد سے یہاں آئی ہوں تو جناب یہ غلط ہے۔ اصل میں، میں اپنی ایک فرینڈ کی شادی میں شرکت کے لیے لاہور جارہی تھی۔ یہاں پہنچ کر گاڑی خراب ہوگئی۔ لاہور جانے والی دوسری بس ایک گھنٹے بعد نکلے گی اس لیے میں نے سوچا کہ کچھ وقت آپ سے ملاقات کرکے گزار لیا جائے۔'' اس کا جواب سن کر شہریار کو سمجھ آیا کہ آج وہ معمول کے سادہ حلیے کے مقابلے میں نک سک سے کیوں تیار ہے۔

''ایک اسسٹنٹ کمشنر کو وقت گزاری کے لیے استعمال کرنا تو بڑی بُری بات ہے۔'' وہ ماہ بانو کے بعد کسی دوسری خاتون کے ساتھ بداخلاقی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا، چنانچہ بُرا ماننے کے بجائے خود بھی خوش دلی سے جواب دیا۔

''نہیں بھئی، میں ایسی گستاخی ہرگز بھی نہیں کرسکتی کہ آپ کو وقت گزاری کے لیے استعمال کروں۔ میں نے تو صرف یہ سوچا تھا کہ آپ کے ساتھ ہیلتھ یونٹ سے متعلق کچھ ڈسکشن بھی کرلوں گی اور میرا ایک گھنٹا بھی ضائع نہیں ہوگا۔'' شہریار کے لہجے کی خوش گواری کے باوجود اس نے وضاحت دینا ضروری سمجھا۔

''وائے ناٹ... لیکن پہلے میں چائے کے لیے کہہ دوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن کچھ آرڈر کرنے سے قبل ہی عبدالستان دروازے پر دستک دے کر اندر چلا آیا۔

''دخل اندازی کے لیے معذرت چاہتا ہوں سر... لیکن بات ایسی ہے کہ آپ کو بتانے میں دیر نہیں کی جاسکتی تھی۔'' اس نے شہریار کی اپنی طرف اٹھی نظروں کے جواب میں جلدی سے وضاحت پیش کی اور پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''خبر آئی ہے کہ ایم این اے لیاقت رانا کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی ہے۔ فائرنگ کے وقت ان کی فیملی بھی ان کے ساتھ تھی۔ کہا یہی جارہا ہے کہ فائرنگ سے گاڑی میں سوار کسی شخص کو نقصان نہیں پہنچا لیکن رانا صاحب کی اپنی فیملی سمیت اسپتال میں موجود ہونے کی بھی اطلاع ہے۔'' عبدالستان جانتا تھا کہ لیاقت رانا اس کے سگے ماموں ہیں اس لیے خبر اس تک پہنچانے میں بہت پھرتی دکھائی تھی۔ اس خبر کو سن کر شہریار کا پریشان ہونا ایک لازمی بات تھی۔ وہ فوراً ہی اپنا موبائل اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔

عبدالستان سے اس نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس کے پاس اس کے علاوہ مزید کوئی خبر ہوتی تو وہ سوال کیے بغیر ہی سنا چکا ہوتا۔ اس نے لیاقت رانا، آفرین رانا اور مریم تینوں کے نمبر پے در پے ملا کر بات کرنے کی کوشش کی لیکن تینوں ہی نمبر بند جارہے تھے۔ اس طرف سے مایوسی کے بعد اس کے پاس یہی حل رہ جاتا تھا کہ آئی جی مختار مراد سے رابطہ کرے۔ اس سے بہتر پورے لاہور شہر میں کوئی اسے صحیح صورت حال سے آگاہ نہیں کرسکتا تھا۔

''اے سی شہریار عادل... آئی جی صاحب سے بات کروائیں۔'' دوسری طرف سے مختار مراد کے پی اے نے کال ریسیو کی تھی۔ اس نے مختصر تعارف کے ساتھ اسے حکم دیا تو فون فوراً ہی مختار مراد صاحب کے ہاتھ میں منتقل ہوگیا۔ ہر پی اے کی طرح ان کا پی اے بھی جانتا تھا کہ صاحب کن افراد کی کال سننے سے انکار نہیں کرتے۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں انکل! ماموں جان کی گاڑی پر فائرنگ کی گئی ہے؟ سب خیریت تو ہے نا؟'' ان کے ''ہیلو'' کہتے ہی اس نے سوالات کرنے شروع کردیے۔

''پریشان مت ہو بیٹا! الحمدللہ سب ٹھیک ہے۔ گاڑی پر فائرنگ ضرور ہوئی ہے لیکن کوئی بھی فرد اس کی زد میں نہیں آیا ہے۔ ویسے گاڑی کی جو حالت ہے، اسے دیکھ کر تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ کسی معجزے نے ہی ان لوگوں کو زد میں آنے سے بچالیا ہے ورنہ حملہ آوروں نے کسر بالکل نہیں چھوڑی تھی۔'' مختار مراد نے پہلے اسے تسلی دی پھر تفصیلات بتائیں۔

''ماموں جان وغیرہ اسپتال میں کیوں ہیں؟ میں کال کررہا ہوں تو ان لوگوں کے نمبرز بھی بند مل رہے ہیں۔''

''نمبرز لیاقت صاحب نے خود جان بوجھ کر بند کروا دیے ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ایسے حالات میں میڈیا والے کس بُری طرح پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ان کے الٹے سیدھے سوالوں سے بچنے کے لیے انہوں نے ایسا کیا ہے۔ رہی ان لوگوں کے اسپتال میں ہونے کی بات تو اصل میں بھابی صاحبہ نے اس حملے کا بہت اثر لیا ہے اور شاک کی سی کیفیت میں ہیں۔ اس لیے انہیں اسپتال لے جانا پڑا۔ تم فکر مت کرو۔ میں یہاں ہوں، سب کچھ دیکھ لوں گا۔'' وہ اس کی لیاقت رانا اور ان کی فیملی سے شدید وابستگی سے پوری طرح واقف تھا اس لیے کا ہے بہ گاہے تسلی دینے کا فریضہ انجام دیتا جارہا تھا۔

''تھینک یو ویری مچ انکل۔'' اس نے مختار مراد کا شکریہ ادا کیا اور فون بند کرکے عبدالستان کی طرف متوجہ ہوا۔

''گاڑی نکلواؤ۔ میں ابھی لاہور کے لیے روانہ ہونا چاہتا ہوں۔''

''گاڑی ریڈی ہے سر لیکن آپ کا ڈرائیور غائب ہے۔ ڈھائی تین گھنٹے قبل اپنے کسی ذاتی کام سے نکلا تھا، ابھی تک واپس نہیں آیا۔ اگر آپ کہیں تو میں ڈرائیو کرلیتا ہوں۔'' عبدالستان نے جھجکتے ہوئے اسے اطلاع دینے کے ساتھ پیشکش کی تو وہ غصے کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس کی اصول پسند طبیعت کے باوجود عملے کے افراد میں سے کوئی نہ کوئی غفلت دکھا ہی دیتا تھا۔ بے شک آج کے شیڈول میں اس کا آفس سے کہیں باہر جانا طے نہیں تھا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ ڈرائیور اسے مطلع کیے بغیر اپنے ذاتی کام سے نکل کھڑا ہوتا... وہ بھی اتنے طویل دورانیے کے لیے۔ ڈرائیور کی اس غفلت نے اسے مشابرم خان کی یاد دلا دی۔ وہ کتنا ذمے دار اور کام کا آدمی تھا۔ اس نے مختصر عرصے میں ہی شہریار کا دل جیت لیا تھا اور کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ بلتستان کے پہاڑوں میں قائم شدت پسندوں کے ٹھکانے کو دریافت کرکے اسے نیست و نابود کرنے کا سہرا اسی دلیر آدمی کے سر جاتا تھا لیکن چونکہ وہ خود اس ٹھکانے پر زخمی حالت میں پایا گیا تھا، اس لیے ابھی تک آرمی انٹیلی جنس کی کسٹڈی میں تھا۔ اس کی رہائی کے سلسلے میں شہریار مسلسل کوشش کررہا تھا اور امید تھی کہ وہ جلد رہا کردیا جائے گا لیکن اس وقت تو بہرحال وہ نہیں تھا اور اس کی کمی محسوس ہورہی تھی۔

''تم یہیں رہ کر یہاں کے معاملات دیکھو۔ گاڑی میں خود ڈرائیو کرلوں گا۔'' اس نے عبدالستان کی پیشکش مسترد کردی۔ عبدالستان کو خود بھی یہی امید تھی۔ پہلے بھی شہریار کئی بار اکیلے ہی خود ڈرائیو کرکے لاہور جاچکا تھا۔

''آپ چاہیں تو میرے ساتھ چل سکتی ہیں۔ لاہور پہنچ کر کسی ایسی جگہ اتر جائیے گا جہاں سے آپ کو اپنی فرینڈ کی شادی میں پہنچنے کے لیے سہولت سے ٹیکسی مل سکے۔'' وہ لمحوں میں جانے کا فیصلہ کرنے کے بعد منٹوں میں روانگی کے لیے تیار بھی کھڑا تھا لیکن اس ساری صورت حال میں خاموش تماشائی بنی بیٹھی ڈاکٹر ماریا کو فراموش نہیں کیا تھا۔ اس پیشکش کو سن کر وہ فوراً ہی کھڑی ہوگئی۔ وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ رہے تھے تو چپراسی نے ایک بڑا سا بیگ لاکر گاڑی کی پچھلی نشست پر رکھ دیا۔

''اس بیگ میں میرا سامان ہے۔ انچو تلی میں دو تین دن رکنے کے خیال سے لاہور جارہی تھی اس لیے اتنا سامان رکھنا پڑا۔'' ڈاکٹر ماریا نے بیگ کے بارے میں بتایا جس پر شہریار نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا دی۔ وہ خاصی تیز رفتاری سے ڈرائیو کررہا تھا۔

''ریلیکس سر! اس رفتار سے ڈرائیو کریں گے تو کوئی ایکسیڈنٹ بھی ہوسکتا ہے۔'' ڈاکٹر ماریا کچھ دیر خاموش رہی پھر اسٹیئرنگ گھماتے اس کے ہاتھ پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھتے ہوئے نہایت رسان سے بولی تو وہ شرمندہ ہوگیا۔

''سوری... میں جذبات میں اپنے ساتھ ساتھ آپ کی زندگی کو بھی خطرے میں ڈال رہا تھا۔'' گاڑی کی اسپیڈ کم کرتے ہوئے اس نے معذرت کی۔

''میں اپنی وجہ سے نہیں کہہ رہی تھی۔ مجھ سے کہیں زیادہ قیمتی آپ کی زندگی ہے۔ میرا کیا ہے، میری جگہ کوئی بھی دوسرا ڈاکٹر لے سکتا ہے لیکن آپ جیسا مخلص، مستعد اور بہادر اے سی اس علاقے کے لوگوں کو دوبارہ شاید ہی مل سکے۔'' ڈاکٹر ماریا کا ہاتھ اب بھی تسلی آمیز انداز میں اس کے ہاتھ پر دھرا تھا۔

''آپ نے تو میری تعریفوں کے پُل باندھ دیے۔'' اس کے چہرے کے نقوش میں نرمی سی اتری۔

''میں نے تو صرف حقیقت بیان کی ہے۔ آپ کی زندگی ہم سب کے لیے واقعی اہم اور ضروری ہے جسے کسی صورت ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے، آپ کو دوسری طرف سے کوئی بہت بُری خبر سننے کو نہیں ملی۔ اس لیے اس بے احتیاطی کی گنجائش نکلتی نہیں ہے۔'' اس کے انداز میں خلوص ہی خلوص بھرا تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن شاید میں ایک ہی دن میں کئی بُری خبریں سن کر ٹینس ہوگیا ہوں اس لیے اس طرح بی ہیو کررہا تھا۔'' شہریار نے وضاحت دی۔

''کوئی بات نہیں، کبھی کبھی ایسا ہوجاتا ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ کافی پیتے ہیں۔ میرے ہاتھ کی بنی کافی پی کر آپ اچھا فیل کریں گے۔'' اس نے جھک کر عقبی نشست پر موجود بیگ اٹھایا اور اس میں سے پلاسٹک کی تھیلی میں احتیاط سے رکھا چھوٹا سا تھرماس اور دو پیپر کپ نکالے۔

''لانگ روٹ پر سفر کرتے ہوئے مجھے کافی پینا اچھا لگتا ہے۔ اس لیے میں ہمیشہ اپنے ساتھ تھرماس میں کافی لے کر چلتی ہوں۔'' کپ بھر کر شہریار کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے بتایا۔

''تھینکس... آپ کی یہ عادت اس وقت میرے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM
Uploaded By Muhammad Nadeem

نعمت ثابت ہوئی ہے۔ میں خود بھی طلب محسوس کر رہا تھا۔'' شہریار نے اس کا بڑھایا ہوا کپ تھاما اور ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا۔

''زبردست... آپ تو بہت اچھی کافی بناتی ہیں۔'' پہلا گھونٹ پیتے ہی اس نے بے ساختہ داد دی تو ماریا کے ہونٹوں پر بڑی جان دار سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ کہتے ہیں کہ سفر میں لوگ ایک دوسرے پر کھلتے ہیں تو ان کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ وہ اپنے اپنے پیشوں کو بھول کر ہلکی پھلکی گفتگو کرتے ہوئے لاہور کی طرف عازم سفر تھے۔ ماریا کا دلچسپ انداز گفتگو شہریار پر اثر انداز ہو رہا تھا اور وہ جس ٹینشن کے ساتھ دفتر سے نکلا تھا، وہ آہستہ آہستہ ریلیز ہوتی جا رہی تھی۔ خوش گوار ماحول میں سفر کرتے ہوئے وہ کافی آگے نکل آئے۔ تب شہریار نے محسوس کیا کہ ماریا نے گفتگو میں حصہ لینا کم کر دیا ہے اور اس کے چہرے پر تکلیف بھرے تاثرات نظر آ رہے ہیں۔

''از ایوری تھنگ آل رائٹ؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''میرے پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے۔'' ڈاکٹر ماریا نے ہونٹ بھینچتے ہوئے بتایا۔

''تو کوئی میڈیسن لے لیں نا۔''

''ہوں... دیکھتی ہوں۔'' شہریار کے مشورے پر وہ اپنا ہینڈ بیگ ٹٹولنے لگی۔ پانچ منٹ کے بعد اس نے تلاش کا سلسلہ روک دیا اور مایوسی کے عالم میں نفی میں سر ہلایا۔ یعنی اس کے بیگ میں ایسی کوئی دوا موجود نہیں تھی جو اس کے درد کا درماں بن سکتی۔

''آپ اپنا میڈیکل باکس ساتھ نہیں رکھتیں؟'' شہریار حیرت اور جھنجلاہٹ دونوں کا شکار ہوا۔ جواباً ماریا کے چہرے پر شرمندگی نظر آنے لگی اور اس نے زبان سے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔

''آگے ایک ہوٹل پڑتا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ وہاں سے کچھ مل جائے۔'' شہریار نے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پا کر ایک امکان پیش کیا۔ انسانی ہمدردی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ایک تکلیف میں مبتلا شخص کو مزید شرمندہ کرنے کے بجائے اسے تسلی دی جائے۔ اس بار ماریا نے کوئی بھی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ بہت تکلیف میں ہے اور ابھی لاہور بہت دور تھا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے یقیناً اس کی حالت خراب ہو جاتی۔ وہ فکرمند سا ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے اب وہ ہوٹل زیادہ دور نہیں رہا تھا جس کا اس نے ذکر کیا تھا۔ یہ کوئی بہت عمدہ ہوٹل نہیں تھا۔ ہائی وے پر سفر کرنے والے عموماً تھوڑی دیر کے لیے یہاں رک کر کھاتے پیتے تھے اور آگے بڑھ جاتے تھے۔ لمبے وقت کے لیے صرف وہی لوگ رکتے تھے جن کے ساتھ گاڑی کی خرابی یا کسی دوسری نوعیت کا مسئلہ پیش آ جاتا تھا۔ شہریار کو امید تھی کہ ہوٹل کے ساتھ بنے پان کے کیبن سے وہ ماریا کے لیے کوئی پین کلر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ پان سگریٹ کے کیبن پر سونف سپاری، ٹافیوں اور بسکٹس جیسی چیزوں کے علاوہ عموماً چھوٹی موٹی دوائیں بھی بکنا ایک عام معمول ہے کیونکہ ان انگوٹھا چھاپ پنواڑی سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا کہ کون سا قانون آپ کو اس طرح دوائیں بیچنے کی اجازت دیتا ہے؟

''کون سی ٹیبلٹ لے کر آؤں آپ کے لیے؟'' گاڑی ہوٹل کے سامنے روک کر اس نے ماریا سے پوچھا۔ انگوٹھا چھاپ پنواڑی بے شک پورے اعتماد سے مختلف امراض کی دوائیں بیچتا ہو لیکن وہ ایک ڈاکٹر کی موجودگی میں اس کے لیے نسخہ تجویز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ جواباً ماریا نے اسے ایک ایسی ٹیبلٹ کا نام بتایا جو اس کے لیے قطعی نامانوس تھا۔

''یہاں تو عام سی دوائیں ہی مل سکیں گی۔ آپ جو نام لے رہی ہیں، وہ دوا ملنا تو مشکل ہے۔'' اس نے کچھ بے بسی سے ماریا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کسی عام پین کلر سے یہ درد ٹھیک ہونا ممکن نہیں۔'' ماریا نے کراہتے ہوئے بتایا۔

''او کے... میں کوشش کرتا ہوں۔'' اسے امید نہیں تھی لیکن پھر بھی دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکلنے لگا۔

''ایکسکیوزمی شہریار!'' ماریا نے اسے پکارا تو وہ ہینڈل پر جما اپنا ہاتھ ہٹا کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہاں واش روم کی سہولت تو ہوگی؟'' اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔ اس سوال پر شہریار کے حلق سے کراہ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ خاتون کو اپنے ساتھ سفر کی دعوت دینا مہنگا پڑا تھا۔ وہ جس ہوٹل کے سامنے رکے تھے، وہ بہت معمولی تھا اور اس کا کسی ہوٹل میں خاتون کے ساتھ جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اب بھی اسے یہ سوچ کر کوفت ہو رہی تھی کہ وہ ماریا کو اس ابتر حالت میں لے کر اندر جائے گا تو بھانت بھانت کے لوگوں کی نظروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

''میں معلوم کرتا ہوں۔'' خود پر بے پناہ ضبط کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ اس کا مزاج اور عادت اپنی جگہ۔ لیکن اتنا تو وہ سمجھ ہی سکتا تھا کہ فطری ضروریات کے آگے انسان مجبور ہوتا ہے۔ ہوٹل کے اندر جانے اور آنے میں اسے صرف پانچ منٹ لگے تھے۔

''ٹیبلٹ یہاں نہیں ملی۔ ہوٹل کے مالک نے بتایا ہے کہ بیس منٹ کی ڈرائیو پر ایک آبادی ہے جہاں میڈیکل اسٹور موجود ہے وہاں سے ٹیبلٹ مل جائے گی۔ آنے جانے کا وقت ملا کر چالیس منٹ بنتے ہیں۔ ہوٹل والا اپنے ایک ملازم کو موٹر سائیکل پر بھیج کر دوا منگوانے پر تیار ہے۔ ہمیں یہ وقت ہوٹل میں ہی گزارنا ہوگا۔ آپ گاڑی سے باہر آ جائیں، ہم ہوٹل کے اندر چلتے ہیں۔'' واپس آ کر شہریار نے اسے اطلاع دیتے ہوئے کہا تو وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی لیکن اس کی دگرگوں حالت سے ظاہر تھا کہ اس کے لیے بغیر سہارے کے چلنا مشکل ہے۔ اس نے خود ہی سہارے کے لیے شہریار کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تو وہ پیچھے نہیں ہٹ سکا۔ وہ دونوں اس طرح ہوٹل کی عمارت کی طرف بڑھے کہ ماریا نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا ہوا تھا اور اس کے بازو سے بالکل چپٹ کر چل رہی تھی۔ ایک جوان اور خوب صورت عورت کی اس قدر قربت نے شہریار کو بے چین سا کر دیا اور وہ اپنی کیفیات میں عجیب سی تبدیلی محسوس کرنے لگا۔ خواتین سے آزادانہ میل جول اس کی کلاس میں ایک عام سی بات تھی لیکن اس وقت وہ خود کو جس قدر وحشت زدہ محسوس کرنے لگا تھا، ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ماریا کے جسم سے کوئی برقی رو نکل رہی ہے جو اس کے ایک ایک عضو میں دوڑتی جا رہی ہے۔ کمال یہ تھا کہ اسے اپنی یہ کیفیت بری بھی نہیں لگ رہی تھی اور وہ ماریا کی اس قربت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''مجھے باہر موجود عجیب و غریب افراد کے درمیان آپ کے ساتھ بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا اس لیے میں نے تھوڑی دیر کے لیے یہ کمرا بک کروا لیا ہے۔ کمرے میں اٹیچ باتھ ہے۔ آپ اسے استعمال کرنے کے علاوہ ٹیبلٹ آنے تک تھوڑی دیر آرام بھی کر سکتی ہیں۔'' انہیں اندر آتا دیکھ کر ہوٹل کا ایک ملازم راہنمائی کے لیے ساتھ ہو لیا تھا۔ اس کی معیت میں ایک کمرے تک پہنچ کر شہریار نے وضاحت پیش کی۔

''تھینک یو ویری مچ۔ یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ میں خود بھی آپ سے یہی درخواست کرنے والی تھی۔ باہر جس کیٹیگری کے لوگ موجود ہیں، مجھے خود بھی وہاں بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔'' ماریا نے اسے جواب دیا اور پھر اس کا سہارا چھوڑ کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جس انداز میں چل رہی تھی، اسے دیکھ کر شہریار کو ڈر محسوس ہوا کہ کہیں وہ گر ہی نہ جائے۔

''دروازہ اندر سے بولٹ مت کیجیے گا۔'' اس نے کوئی خدشہ سا محسوس کرتے ہوئے ماریا کو ہدایت کی جس پر اس نے عمل بھی کیا۔ شہریار ایک کرسی پر بیٹھ کر اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرتے ہوئے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس کی دیواروں کا رنگ و روغن خاصی خراب حالت میں تھا۔ فرنیچر کے نام پر اس کمرے میں دو کرسیاں، ایک میز اور ایک بیڈ موجود تھا۔ بیڈ پر دھلی ہوئی لیکن خاصی پرانی چادر بچھی ہوئی تھی۔ عام حالات میں شہریار کبھی ایسی کسی جگہ قیام کرنا پسند نہیں کرتا لیکن ماریا کی حالت کی وجہ سے مجبور ہو گیا تھا اور اب کرسی پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ عورت، آدمی کو کتنی بے بسی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ باہر کھڑی گاڑی سے اس کمرے تک پہنچنے میں انہیں ایک ڈیڑھ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا لیکن ڈیڑھ منٹ میں ہی اسے اچھی خاصی آزمائش سے گزرنا پڑا تھا اور اب بھی وہ محسوس کر رہا تھا کہ جسم کا جو جو حصہ ماریا سے مس ہوا ہے، وہاں ایک سرور بھری آگ بھڑک اٹھی ہے۔ اپنی اس کیفیت سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے میز پر پڑا اخبار اٹھا کر دھیان اس کی طرف لگانا چاہا لیکن پھر واش روم سے سنائی دینے والی ''دھم'' کی زوردار آواز پر بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔

''آر یو آل رائٹ ماریا؟'' واش روم کے دروازے کے قریب جا کر اس نے ماریا کو پکارا، جواب میں اندر سے اس کی کراہیں سنائی دیں۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ دروازہ کھول کر صورتِ حال معلوم کرے۔ جھجکتے ہوئے اس نے دروازے کے پٹ پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے ہی ماریا فرش پر گری ہوئی تھی اور اس کا لباس خاصا بے ترتیب تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ ماریا ایک ہوشربا جسم کی مالک ہے۔ اس ہوشربا جسم کی مالک عورت کو فی الحال اس کی مدد کی ضرورت تھی۔ شہریار آگے بڑھا اور اسے اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ ماریا دھیمی آواز میں مسلسل کراہے جا رہی تھی۔ وہ اسے اٹھا کر بیڈ تک لے گیا اور جھک کر اسے اس پر لٹا کر سیدھا ہونا چاہا لیکن اپنی قمیص کا کالر ماریا کی گرفت میں ہونے کی وجہ سے سیدھا نہ ہو سکا۔ اس نے شاید گرنے کے خدشے کے باعث اس کا کالر اپنی مٹھی میں بھینچ لیا تھا اور اب نیم بے ہوش سی پڑی اس کے لیے آزمائش بنی ہوئی تھی۔ شہریار نے اس کے وجود میں بے بس کر دینے والی کشش محسوس کی۔ اس کی قربت مسلسل اس کے جذبات کو

Scanned and Uploaded By Nadeem
Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM
Uploaded By Muhammad Nadeem

بھڑکا رہی تھی۔ اسے لگا کہ اس کے ضبط کی حدیں ٹوٹنے لگی ہیں اور پورے جسم میں ایک وحشت سی بھر گئی ہے۔ یہ وہ وحشت تھی جو آدمی سے اس کا سیلف کنٹرول چھین لیتی ہے۔ وہ بھی بے قابو ہو گیا اور اپنے اندر بھڑکنے والی آگ کو بجھانے کے لیے ماریا کے آنچ دیتے وجود میں ضم ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

رات کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔ یہ رات ماہ بانو کی آنکھوں کے آنسو چرا کر بھیگی بھیگی سی تھی۔ شام سے شروع ہونے والی برسات کا یہ عالم تھا کہ کسی صورت رکنے کو تیار نہیں تھی اور ابھی ٹن ٹن ٹن ٹن پھوار کا سلسلہ جاری تھا۔ خود ماہ بانو کا بھی یہی حال تھا۔ جب سے شہریار سے فون پر بات ہوئی تھی، اس کی آنکھیں مسلسل برس رہی تھیں۔ اسے شہریار سے اتنی بے رخی اور روکھائی کی امید نہیں تھی۔ وہ تسلیم کرتی تھی کہ اس سے غلطی سرزد ہوئی تھی۔ شہریار جیسے معروف بندے کو اسے اس طرح بلاوجہ فون نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اس سے یہ غلطی بے اختیاری میں ہوئی تھی۔ جب سے اس نے چودھری کے کارندے کو کراچی میں دیکھا تھا، دل پر گھبراہٹ سی طاری تھی۔ اس نے راحیلہ کے سامنے بھی اپنی اس کیفیت کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ اسے بہت دیر تک تسلیاں دیتی رہی تھی لیکن اس پر طاری ہونے والی گھبراہٹ ختم نہیں ہو سکی تھی۔ ایسے میں اس کا دھیان خود بہ خود شہریار کی طرف چلا گیا۔ وہ دنیا کا واحد فرد تھا جس کا حرفِ تسلی اس کے دل کو قرار دے سکتا تھا لیکن اس نے اطمینان سے اس کی پوری بات سننے کے بجائے جس طرح کا ردعمل ظاہر کیا تھا، اس نے ماہ بانو کے دل کو بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ دل جنہیں زیادہ عزیز رکھے، ان کی پہنچائی ہوئی معمولی سی ٹھیس پر بھی کسی آبلے کی طرح پھوٹ پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ اپنا گھر، رشتے ناتے، دوست احباب اور آزادی گنوا کر اس کے پاس جو واحد جذباتی سہارا باقی رہ گیا تھا، اس کا نام شہریار تھا۔

اگرچہ شہریار نے اس سے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی جس سے وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوتی لیکن اس کی نرم خوئی اور مہربان رویے کی تو عادی تھی، اب جو اس نے بیگانگی برتی تو برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ حالانکہ وہ خود بھی اپنے آپ کو شہریار کی طرف سے صفائی پیش کر چکی تھی۔ اس کی مصروفیات، مسائل اور پریشانیوں میں سے کچھ بھی اس کے اس رویے کا سبب ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی وہ اداس تھی اور اس اداسی نے اس کی نیند چھین لی تھی۔ اسے یہ بھی خیال آیا تھا کہ کہیں شہریار کا مزاج بدلنے تو نہیں لگا ہے۔ ورما کے ساتھ اس نے شہریار کو جس سفاکی سے پیش آتے دیکھا تھا، اسے وہ اب تک بھولی نہیں تھی۔ شہریار کا وہ روپ اس کے لیے انجانا تھا تو آج کا رویہ بھی قطعی اجنبی... اور بے شک وہ شہریار کو اپنا بنانے کا خواب نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اس کا اجنبی بننا بھی منظور نہیں تھا۔ اس کی اجنبیت و بیگانگی اس کی آنکھوں میں آنسو لے آئی تھی۔

"اب تو سو جاؤ یار! کب تک اس طرح روتی رہو گی۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے مسلسل رو رہی ہو اور رونے کی وجہ بھی نہیں بتاتیں۔" اس کی روم میٹ جو کافی دیر پہلے اسے چپ کروانے میں ناکام ہو کر سو چکی تھی، اچانک آنکھ کھلنے پر جاگی تو اسے اسی طرح روتے دیکھ کر قدرے ناراضی سے بولی۔

"سوری... میری وجہ سے تم ڈسٹرب ہو رہی ہو۔" ماہ بانو نے اس سے معذرت کی اور اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر کر اس طرح لیٹ گئی کہ وہ اس کے آنسو نہ دیکھ سکے۔

"یہ لو... یہ گولی کھا لو۔ تمہیں نیند آ جائے گی تو پُرسکون ہو جاؤ گی۔" اسے اپنے پیچھے ہلکی ہلکی کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں اور پھر اس کی روم میٹ پانی کا گلاس اور ایک ٹیبلٹ لے کر اس کے سر پر آ کھڑی ہوئی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر بستر پر اٹھ بیٹھی۔

"ٹرنکولائزر لے لینا ہی اس وقت میرے لیے سب سے بہترین ہے۔ کچھ دیر سو جاؤں گی تو اس کیفیت سے باہر آ جاؤں گی۔" اس نے یہ سوچتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور گولی منہ میں رکھ کر پانی کا پورا گلاس پی گئی۔

"اب آرام سے لیٹ جاؤ۔" اس کی روم میٹ نے اسے مشورہ دیا۔ اس نے خاموشی سے اس مشورے پر عمل کیا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ آہستہ آہستہ ٹرنکولائزر نے اثر دکھانا شروع کر دیا اور اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ نیند کی وادی میں اترتے ہوئے اسے قطعی معلوم نہیں تھا کہ جو اس نے اپنے لیے سب سے بہترین سمجھا ہے، وہ بدترین ثابت ہونے والا ہے۔ گرداب میں پھنسے انسان کے لیے بچ نکلنا یوں بھی آسان نہیں ہوتا لیکن بے خبری تو انسان کو ہاتھ پیر مارنے کی بھی مہلت نہیں دیتی۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

Scanned and Uploaded By

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ بے حد شرمندہ اور پشیمان بیٹھا تھا۔ جو شرمندگی آج اس کے حصے میں آئی تھی، اس سے ساری عمر بھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اسے اپنے کردار کی بلندی پر جو فخر تھا، آج وہ فخر بُری طرح ٹوٹا تھا اور وہ خود کو اتنی پستی میں پا رہا تھا کہ اسے لگتا تھا اب جتنی ہی کوشش کر لے، اس پستی سے کبھی نہیں نکل سکے گا۔ اس کے احساسِ گناہ کو سامنے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی ڈاکٹر ماریا کے آنسو دو چند کیے دے رہے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان آنسوؤں کا مداوا کس طرح کرے۔ جرم اتنا بڑا سرزد ہوا تھا کہ اس کے سامنے معافی کے تمام الفاظ ہیچ تھے لیکن خاموش رہ کر اپنے جرم سے نظر بھی تو نہیں چرائی جا سکتی تھی۔ کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ کچھ ایسا جس سے سامنے بیٹھ کر آنسو بہاتی ڈاکٹر ماریا کو اس کی شرمندگی کا احساس ہو سکے۔ بڑی مشکل سے اپنی تمام تر ہمت کو مجتمع کر کے آخر کار اس نے اسے پکار ہی لیا۔

"ماریا......" اس کی دھیمی، ندامت سے بوجھل آواز ماریا کی سماعتوں سے ٹکرائی تو اس نے نظر اٹھا کر شہریار کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں درد اور شکوہ بھرا ہوا تھا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں، ڈاکٹر ماریا! میری سمجھ میں خود نہیں آ رہا کہ یہ سب کیسے ہو گیا؟ میں نے تو کبھی خواب میں بھی ایسی گری ہوئی حرکت کا تصور نہیں کیا تھا۔ آپ ہمیشہ میرے لیے بہت قابلِ احترام رہی ہیں بلکہ میں ہر عورت کا بہت احترام کرتا ہوں۔ آپ کے ساتھ تو کیا، میں کبھی کسی کے ساتھ بھی یہ سب کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا... لیکن رات جانے کیا ہوا کہ میں اپنے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھا۔" وہ بے حد الجھا ہوا تھا۔ گزشتہ شب اس نے جس طرح اپنے سارے اختیار کھوئے تھے، وہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ساری عمر کی پارسائی داغ دار ہو کر رہ گئی تھی۔ اپنی اس بے اختیاری کی وجہ اسے کسی طور سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ڈاکٹر ماریا کوئی ایسی غیر معمولی عورت بھی نہیں تھی کہ وہ اپنے حواس ہی کھو بیٹھتا۔ اس کی کلاس فیلوز، فرینڈز، رشتے دار خواتین میں سے کئی ایسی تھیں جن کے حسن کے چرچے تھے اور ان میں سے کئی اس پر بُری طرح فدا بھی تھیں لیکن کبھی کسی کی ترغیب نے اس کے قدم نہیں ڈگمگائے تھے... اور اب وہ بُری طرح گر پڑا تھا۔ وہ بھی ایک ایسی عورت کی خاطر جسے وہ بارہا دیکھ چکا تھا اور کبھی اس کے لیے اپنے دل میں کوئی جذبہ محسوس نہیں کیا تھا لیکن گزشتہ روز جانے ایک دم ہی اسے اس میں ایسی کیا کشش محسوس ہوئی کہ اپنے حواس گنوا بیٹھا۔ وہ تو اپنے ماموں لیاقت راٹھور کی گاڑی پر فائرنگ کی خبر سن کر بہت جذبات میں لاہور کے لیے نکلا تھا پھر جانے کیسے جذبات کا رخ بدل گیا؟ پھر وہ سب ہو گیا جس کے بعد اس کے ہوش و حواس ہی اڑ گئے۔ اب ہوش آیا تھا تو صبح ہونے والی تھی۔

آنکھ کھولنے کے بعد اس کی نظروں نے جو سب سے پہلی چیز دیکھی تھی، وہ آنسو بہاتی ڈاکٹر ماریا تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج چکی تھیں اور چہرہ بُری طرح سرخ ہو رہا تھا۔ گزشتہ شام کیلی کی شادی میں شرکت کے لیے پہنا گیا نفیس سوٹ اپنی ابتر حالت کے ساتھ گواہی دے رہا تھا کہ سوٹ پہننے والی کے ساتھ کیا کچھ بیتا ہے۔ شہریار کو اپنی مدہوشی میں پیش آنے والے واقعات بس دھندلے سے ہی یاد تھے۔ اس کے آؤٹ آف کنٹرول ہونے کے بعد شاید ماریا نے کچھ مزاحمت کی تھی لیکن وہ اس کے لیے اپنے اندر اتنی بے پناہ کشش محسوس کر رہا تھا کہ لگتا تھا اگر طلب پوری نہیں ہوئی تو شاید موت ہی واقع ہو جائے گی۔ وہ صحرا میں پیاس سے مرتا مسافر بن گیا تھا جس کے سامنے جیسے ہی پانی کا پیالہ آیا، وہ غٹاغٹ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر اسے چڑھا گیا اور پھر یوں بے دم ہو کر سویا کہ صبح کے قریب ہی آنکھ کھل سکی۔ مدہوشی میں حیا کھو دینے والی آنکھ، ہوش آیا تھا تو اٹھنے میں دقت محسوس کر رہی تھی لیکن بہر حال اس نے کسی نہ کسی طرح ہمت کی اور ڈاکٹر ماریا سے مخاطب ہوا تاکہ اس صورتِ حال سے نکلا جا سکے۔ اپنے تمام تر احساسِ شرمندگی کے باوجود وہ جانتا تھا کہ جو کچھ پیش آ چکا ہے، اسے خود اس کو ہی فیس کرنا ہے چنانچہ ڈاکٹر ماریا سے سلسلہ جنبانی شروع کر دیا۔

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں سر! آپ واقعی بہت باکردار انسان ہیں اور عورتوں کا بہت احترام بھی کرتے ہیں لیکن شاید میں بہ طور ڈاکٹر تو آپ کے لیے قابلِ احترام تھی، بطور عورت نہیں۔ آپ جن عورتوں کا احترام کرتے ہیں، وہ آپ کی نظر میں باعزت اور پارسا ہوتی ہوں گی لیکن میرے بارے میں تو آپ جانتے ہیں کہ میں ایک پارسا عورت نہیں ہوں۔ میری پارسائی کو چودھری افتخار داغ دار کر چکا ہے۔ اس داغ دار دامن پر اگر ایک داغ آپ نے بھی لگا دیا تو کیا فرق پڑتا ہے؟ گندگی کے ڈھیر پر تھوڑی سی گندگی اور پھینک دو تو کسی کو کیا معلوم ہوگا لیکن آپ کو اپنے بارے میں کچھ تو سوچنا چاہیے تھا۔ آپ کا مقام بہت بلند تھا میری نظروں میں لیکن اب......" ڈاکٹر ماریا نے اپنا جملہ مکمل نہیں کیا اور سسکنے لگی۔ اس کی باتیں سن کر شہریار کا جھکا ہوا سر مزید جھک گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوا تو بہت دکھ کے ساتھ بولا۔

"مجھے علم ہے کہ میں آپ کی نظروں میں اپنا کھویا ہوا

WWW.PAKSOCIETY.COM

مقام دوبارہ کبھی حاصل نہیں کر سکتا لیکن آپ نے اپنے بارے میں جو کچھ کہا، میں اس سے قطعی متفق نہیں ہوں۔ اگر میں یہ جانتا ہوں کہ چودھری نے آپ کی عزت کو داغ دار کر دیا ہے تو یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کس طرح اس شیطان کے شکنجے میں پھنس کر بے بس ہو گئی تھیں اور بخدا آپ کی بے بسی پر غصہ آنے کے باوجود میں نے کبھی آپ کو بُری عورت نہیں سمجھا۔ اگر آپ بُری عورت ہوتیں تو بھی میں آپ کے ساتھ بُرا نہیں کر سکتا تھا... لیکن اصل بات تو یہی ہے کہ میں نے آپ کو ہمیشہ بہت شریف اور محترم تصور کیا ہے۔" اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اپنی صفائی پیش کرے؟

"رہنے دیں شہریار صاحب! یہ سب زبانی باتیں ہیں۔ حقیقت وہی ہے جو آپ اپنے عمل سے ثابت کر چکے ہیں۔" اس کی کوئی بھی بات ماننے سے انکار کرتے ہوئے ڈاکٹر ماریا تلخی سے بولی۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں... لیکن ظاہر ہے جو کچھ پیش آ چکا ہے، اس کے بعد آپ کے لیے میری کسی بات پر یقین کرنا ممکن بھی تو نہیں ہوگا۔ میری وجہ سے آپ کا اتنا شدید نقصان ہو گیا ہے کہ اس کا مداوا بھی ممکن نہیں۔" شہریار نے بے بسی سے اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر دائیں ہاتھ کا مکا مارا۔

"اگر مداوا ممکن ہوتا تو کیا آپ کرتے؟" ڈاکٹر ماریا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

"بالکل۔" اس نے ایک لمحے کا بھی توقف کیے بغیر جواب دیا۔

"تو پھر مجھ سے شادی کر لیں۔" ڈاکٹر ماریا کا یہ مطالبہ اتنا اچانک تھا کہ وہ ہڑبڑا کر رہ گیا۔

"کیوں... نہیں کر سکتے نا؟ اپنی لائف پارٹنر کے طور پر تو آپ کسی اعلیٰ خاندان کی خوب صورت، پڑھی لکھی اور پارسا عورت کا انتخاب کریں گے۔" اس نے طنز سے کہتے ہوئے لفظ "پارسا" پر خاص طور پر زور دیا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ میرے اور آپ کے درمیان موجود مذہب کے فرق نے مجھے اس رخ پر نہیں سوچنے دیا تھا، ورنہ شاید میں خود آپ کو یہ آفر کرتا۔" شہریار نے خود کو سنبھالتے ہوئے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔

"مذہب کے فرق سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کے مذہب میں مرد کو اہلِ کتاب عورت سے شادی کرنے کی اجازت ہے اور میں اہلِ کتاب ہوں۔" ماریا کا لہجہ بدستور طنزیہ تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہ شہریار کو چیلنج کر رہی ہو۔

"اگر مداوے کی یہی واحد صورت ہے تو پھر مجھے قبول ہے۔ میں آپ سے شادی کروں گا۔" شہریار نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"کیسی شادی.....؟ وہی جو آپ جیسے امیر زادے ہماری کلاس کی عورتوں سے کیا کرتے ہیں؟ شادی کے نام پر کاغذ کا ایک ٹکڑا پکڑا کر عورت کو ایک طرف بٹھا دیتے ہیں اور پھر وہ عورت اس کاغذ کو ہاتھ میں پکڑ کر اپنے شوہر کو اس کی ہم پلہ کسی عورت کے ساتھ فخر سے گھومتا دیکھتی رہتی ہے۔ معاف کیجیے گا شہریار صاحب! میں باز آئی ایسی نام نہاد شادی سے۔ ایسی شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں چودھری کی رکھیل بنی رہوں۔ وہ شخص جیسا ہے، کم از کم ویسا نظر تو آتا ہے۔" ڈاکٹر ماریا کی تلخی کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے آخری جملے نے تو شہریار کو سرتاپا جھلسا کر رکھ دیا۔ یعنی اب وہ اتنا گیا گزرا ہو گیا تھا کہ چودھری اختر جیسے رذیل شخص کو بھی اس پر ترجیح دی جائے۔

"بس کرو ماریا! تم جو کچھ کہہ رہی ہو، اپنے اندازوں اور مفروضوں کی بنیاد پر کہہ رہی ہو۔ میں نے اگر تم سے شادی کے لیے ہامی بھری ہے تو پھر تمہیں پوری عزت اور مقام بھی دوں گا۔ اگر یقین نہیں آتا تو ابھی میرے ساتھ لاہور چلو۔ میں تمہیں اپنے ماموں اور ممانی سے ملواؤں گا اور انہیں بتاؤں گا کہ اس لڑکی کو میں نے اپنی لائف پارٹنر چنا ہے۔" وہ بہت جوش سے کھڑا ہو گیا۔

"کیا میں اسی حال میں آپ کے ساتھ چلوں؟" ڈاکٹر ماریا نے اس کی توجہ اپنے حلیے کی طرف کروائی۔ وہ ٹھٹکا۔ چند گھنٹوں کے لیے ساتھی عورت کی خرابیِ طبیعت کا بتا کر کمرا کرائے پر لینے کے بعد وہ رات بھر کے لیے یہاں ٹکے تھے تو اس صورتِ حال پر ہی جانے ہوٹل کے ملازمین میں کتنی چہ میگوئیاں ہوئی ہوں... اب اگر وہ ماریا کو اس حلیے میں لے کر باہر نکل جاتا تو سونے پر سہاگا ہو جاتا۔

"آپ کی گاڑی میں میرا بیگ رکھا ہے۔ وہ لے آئیں۔ اس میں میرے کپڑے ہیں۔" آخر ماریا نے ہی حل پیش کیا تو وہ جھنجلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اسے خود اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ جانے اس کے دماغ کو کیا ہو گیا ہے جو بالکل سامنے کی باتیں بھی سمجھ نہیں آ رہیں۔ ہوٹل کے استقبالیے کے سامنے سے گزر کر وہ اپنی گاڑی کی طرف گیا تو اسے لگا کہ استقبالیہ پر بیٹھا ہوٹل کا مالک اور گاہکوں کو آرڈر سرو کرتے ملازمین اسے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ان نظروں کی زبان کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہوا وہ باہر نکل گیا اور گاڑی کی پچھلی نشست پر رکھا ڈاکٹر ماریا کا بیگ نکال کر ہوٹل کے اندر آیا۔

"سر! ناشتا بھجوا دوں آپ کے کمرے میں؟" وہ استقبالیہ کاؤنٹر کے سامنے سے گزر رہا تھا جب ہوٹل کے مالک نے اسے پکار کر سوال کیا۔ سوال سے زیادہ اس کے چہرے پر موجود معنی خیز مسکراہٹ نے شہریار کو چڑا دیا۔ اس مسکراہٹ کے ذریعے گویا وہ اسے جتا رہا تھا کہ ساتھی خاتون کی بیماری کا بہانہ کر کے چند گھنٹوں کے لیے کمرا کرائے پر لینے والے نے رات وہاں کیوں گزاری... میں جانتا ہوں۔

"تھینکس... ناشتے کی ضرورت نہیں ہے۔" شہریار نے سرد مہری سے جواب دے کر آگے بڑھ جانا چاہا۔

"اچھا جی، جیسی آپ کی مرضی... پر یہ دو، تو لیتے جائیں۔ کل میرا آدمی وقت پر لے آیا تھا۔ میں آپ کے کمرے میں دینے بھی گیا تھا لیکن جناب نے دستک پر دروازہ ہی نہیں کھولا۔ میں نے بھی سوچا کہ آپ لوگوں کے آرام میں دخل نہ دوں... اگر ضرورت ہوئی تو آپ خود ہی کسی وقت دوا مانگ لو گے۔ پر شاید ضرورت نہیں رہی تھی۔" وہ دو ٹکے کا شخص باتوں باتوں میں اسے بہت کچھ کہے جا رہا تھا اور اس کی مجبوری تھی کہ اسے وہ سب کچھ سننا پڑ رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی ٹھوکر کھائی تھی اور اس ٹھوکر نے اسے ذلت کے ایسے گڑھے میں گرا دیا تھا جس سے نکلنے کا طریقہ اسے خود بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

"ہم تھوڑی دیر میں یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں۔ آپ بل بنا کر بھیج دیں، میں پے کر دوں گا۔" ہوٹل مالک کی ساری بکواس کے جواب میں اس نے صرف ایک بات کہی اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ کمرے میں موجود ماریا نے اس کی عدم موجودگی میں خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔ شہریار نے اسے بیگ تھمایا تو وہ اس میں سے اپنے کپڑے نکال کر غسل خانے میں چلی گئی۔ اس کے فارغ ہو کر باہر نکلنے تک ہوٹل کا ایک ملازم بل لے آیا تھا۔ اسے بل کی ادائیگی کر کے وہ لوگ فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ لاہور تک کا باقی سفر انہوں نے بے حد خاموشی سے گزارا۔ ماریا نے کئی بار نظر اٹھا کر شہریار کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور وہ اس سے قطعی بے نیاز ڈرائیونگ میں مصروف تھا۔ اس کے ہونٹوں پر لگا چپ کا تالا اتنا مضبوط تھا کہ وہ اپنے موبائل پر آنے والی کالز بھی ریسیو کرنے کی زحمت نہیں کر رہا تھا۔ وہ ایک مکمل طور پر گونگے بہرے شخص کی طرح برتاؤ کر رہا تھا۔ لاہور کی حدود میں داخل ہونے کے بعد صرف چند لمحوں کے لیے اس کی خاموشی ٹوٹی تھی۔ اس نے خود اپنے موبائل سے کال کر کے یہ معلوم کیا تھا کہ مسز آفرین رانا اب بھی اسپتال میں ہی ہیں یا گھر شفٹ ہو چکی ہیں۔ دوسری طرف سے اسے کیا جواب دیا گیا، ماریا نہیں جان سکی لیکن جب سفر کے اختتام پر وہ ایک کوٹھی کے سامنے جا کر رکے تو اس نے جان لیا کہ وہ شہریار کے ماموں ... ایم این اے لیاقت رانا کی رہائش گاہ پر پہنچ چکے ہیں۔

گیٹ کے سامنے پہنچ کر شہریار نے ہارن دیا تو چوکیدار نے جھانک کر دیکھا اور اسے پہچان کر ہاتھ کے اشارے سے زوردار سلام کرتے ہوئے مستعدی سے پورا گیٹ کھول دیا۔ شہریار تیزی سے گاڑی اندر لے گیا۔

"آئیں میرے ساتھ۔" پورٹیکو میں گاڑی روک کر اترتے ہوئے اس نے ماریا سے یہ چند لفظی جملہ کہا اور اس کی طرف منتظر نظروں سے دیکھنے لگا۔ ماریا دروازہ کھول کر آہستگی سے باہر نکل آئی۔ اس کے بشرے سے ظاہر تھا کہ وہ اب تک بے یقینی کا شکار ہے اور یہاں تک پہنچ جانے کے باوجود امید نہیں رکھتی کہ شہریار نے جو کچھ ہوٹل میں اس سے کہا تھا، اس پر عمل بھی کر گزرے گا۔ اس کے تاثرات سے بے نیاز شہریار اسے اپنے ساتھ لے کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا رخ اپنے ماموں ممانی کے بیڈ روم کی طرف تھا۔ بیڈ روم کے دروازے پر پہنچ کر اس نے آہستہ سے دستک دی۔

"یس کم ان۔" اندر سے مسز آفرین رانا کی بوجھل سی آواز آئی۔ وہ دروازہ بے آواز کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ ماریا بھی خودکار انداز میں اس کے ساتھ تھی۔

"شیری.....!" آفرین رانا جو شاید کسی ملازم کی آمد کی توقع کر رہی تھیں، اسے اچانک سامنے پا کر خوشی سے چیخ پڑیں اور فوراً ہی بستر سے اٹھتے ہوئے اس کے لیے اپنی بانہیں وا کر دیں۔ شہریار نے آگے بڑھ کر انہیں خود سے لپٹا لیا۔ اس کے سینے سے لگتے ہی وہ سسکنے لگیں۔

"پتا نہیں کون ہے جو ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔ پہلے شینا گئی پھر سجاد اور اب جانے کس کو نشانہ بنانا چاہا تھا دشمنوں نے۔ پوری گاڑی گولیوں سے چھلنی ہو گئی ہے۔ دیکھو شیری! میں بتا رہی ہوں کہ اگر اب کسی کو کچھ ہوا تو مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔" وہ روتے ہوئے مسلسل بول رہی تھیں۔ یہ ایک ایسی عورت کے جذبات تھے جس نے ابھی نوعمر پوتی اور اکلوتے بیٹے کی موت کا دکھ سہا تھا۔ اس شکستہ دل عورت کے لیے واقعی اب مزید کچھ اور برداشت کرنا مشکل تھا۔ شہریار دھیرے دھیرے ان کی پشت سہلاتا انہیں چپ کروانے کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کوشش کرتا رہا۔

"ٹیک اٹ ایزی ممانی جان! اگر آپ اس طرح روتی رہیں تو آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

"ہونے دو میری طبیعت خراب۔ اپنے بچوں کے بعد اب میں جی کر کروں گی بھی کیا؟" وہ بہت زیادہ اعصابی تناؤ کا شکار تھیں۔

"کیوں، میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں کیا؟ آپ میری خاطر جینے کا کیوں نہیں سوچتیں؟" شہریار نے شکوہ کیا۔

"تم تو میری جان ہو۔ اگر تم نہیں ہوتے تو میں سجاد کے بعد ایک سانس بھی نہیں لے سکتی تھی۔ تم ہی تو ہو جس کی خاطر میرے اندر تھوڑی سی زندگی باقی ہے۔" انہوں نے شہریار کے شکوے کے جواب میں اس کی بلائیں لیتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے ان سے شکوہ کیا ہی اس لیے تھا کہ ان کا دھیان بٹ سکے اور وہ اعصابی تناؤ سے تھوڑا سا باہر آ جائیں۔ اس کی یہ ترکیب کارگر رہی تھی اور وہ رونا دھونا بھول کر اس کی فکر میں مبتلا ہو گئیں۔

"میں بھی بیوقوف ہوں۔ تم اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہو، بجائے تمہاری خاطر مدارات کرنے کے رونے دھونے بیٹھ گئی۔ آؤ یہاں بیٹھو، میں تمہارے لیے چائے کے ساتھ کچھ کھانے کو منگواتی ہوں۔" انہوں نے گویا تلافی کی کوشش کی۔ وہ شہریار میں اتنی بری طرح الجھی ہوئی تھیں کہ اب تک انہوں نے کمرے میں ماریا کی موجودگی کا نوٹس بھی نہیں لیا تھا۔

"یہ سب کرتی رہیے گا لیکن پہلے ان سے تو ملیں۔ یہ ڈاکٹر ماریا جوزف ہیں۔" شہریار نے خود ہی انہیں ماریا کی طرف متوجہ کیا۔

"مجھے کسی ڈاکٹر واکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے ماموں جان بھی مجھے اسپتال میں ایڈمٹ کروانے پر تلے ہوئے تھے۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ میں ہرگز اسپتال میں نہیں رہوں گی۔ آپ کو شوق ہے تو آپ خود رہیں۔" ماریا کے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا لفظ سن کر انہوں نے یہی گمان کیا کہ شہریار اسے ان کے علاج کے لیے لے کر آیا ہے اس لیے فوراً احتجاج کرنے لگیں۔

"اس ڈاکٹر کو تو اب آپ کو ساری زندگی برداشت کرنا پڑے گا۔" ان کی جھنجلاہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے شہریار نے انہیں جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکیں۔

"پہلے آپ یہ بتائیں کہ ماموں جان کہاں ہیں؟" ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے ان سے پوچھا۔

"وہ مختار بھائی سے ملنے گئے ہیں۔" انہوں نے اس کے سوال کا جواب تو دے دیا لیکن ماریا پر ٹکی الجھی ہوئی نظریں بتا رہی تھیں کہ ان کا ذہن شہریار کی بات میں ہی اٹکا ہوا ہے۔

"ادھر آ جائیں، یہاں بیٹھیں۔" شہریار ان کے گلے میں ہاتھ ڈال کر انہیں ایک تو سیٹر تک لے گیا۔ ماریا کو بھی اس نے اشارے سے ایک سنگل صوفے پر بیٹھنے کا کہہ دیا تھا۔ اس کشادہ بیڈ روم میں وسیع و عریض بیڈ کے علاوہ روم ریفریجریٹر اور مکمل صوفہ سیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ گھر کے افراد بعض اوقات ان کے بیڈ روم میں جمع ہوتے تھے تو اس سیٹنگ کی وجہ سے اٹھنے بیٹھنے میں آسانی رہتی تھی۔

"آپ بہت دنوں سے اصرار کر رہی تھیں نا کہ اب مجھے......" اس نے ماریا سے شادی کا فیصلہ سنانے کے لیے گفتگو کا آغاز کیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز ابھری اور مریم سجاد رانا کمرے میں داخل ہوئی۔

"مجھے معلوم ہوا کہ شہریار آیا ہے تو میں ملنے کے لیے چلی آئی۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن یہ مسکراہٹ بے حد پھیکی تھی۔ شینا اور سجاد رانا کی موت نے اسے بالکل گھلا کر رکھ دیا تھا۔ بہت زیادہ عمر نہ ہونے کے باوجود وہ بوڑھی سی دکھائی دینے لگی تھی۔

"السلام علیکم بھابی! آئیں بیٹھیں۔ اچھا ہوا کہ آپ خود آ گئیں ورنہ میں آپ کو بلوانے ہی والا تھا۔" شہریار نے خوش گوار انداز میں اس کا استقبال کیا۔ اس خوش گواری کا مظاہرہ کرنے کے لیے اسے اپنے آپ پر اچھا خاصا جبر کرنا پڑ رہا تھا۔ پچھلے چند گھنٹوں میں اس کے ساتھ جو کچھ پیش آ چکا تھا، وہ اس کے لیے اتنا ہولناک تھا کہ اگر اسے اپنے پیاروں کی پروا نہ ہوتی تو وہ عمر بھر مسکرانا ہی چھوڑ دیتا۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کے بہت بڑے امتحان سے گزر رہا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی زندگی کا اتنا اہم رشتہ اس طرح جوڑے گا کہ اس رشتے کی بنیاد نہ تو محبت پر ہو گی، نہ ہی پسند پر۔ وہ یہ اہم ترین رشتہ خود سے سرزد ہونے والے گناہ کی تلافی کے لیے جوڑنے جا رہا تھا۔

"لگتا ہے کوئی خاص بات ہے۔" مریم نے بیٹھتے ہوئے وہاں موجود ماریا پر ایک گہری نظر ڈالی اور بولی۔ یقیناً ایک اجنبی لڑکی کی آفرین رانا کے بیڈ روم میں شہریار کے ساتھ موجودگی خاصی معنی خیز تھی۔

"بات تو خاص ہی ہے۔ میں آپ کی ہونے والی دیورانی کو آپ سے ملوانے لایا تھا۔" آخرکار شہریار نے وہ خبر سنا ہی دی جو خاصی دھماکا خیز تھی...... خصوصاً مسز آفرین رانا کے لیے۔ انہیں بہت اچھی طرح یاد تھا کہ شہریار نے اس لڑکی کا تعارف ماریا جوزف کے نام سے کروایا تھا، یعنی وہ اپنی شریکِ حیات کے طور پر ایک غیر مسلم لڑکی کا انتخاب کر چکا تھا۔ اگرچہ یہ بات ان کی کلاس میں اتنی انوکھی نہیں تھی لیکن خود رانا خاندان میں کبھی ایسا اتفاق پیش نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

آنکھ بند ہونے اور کھلنے کے درمیان زندگی میں اتنا بڑا انقلاب برپا ہو جائے گا، یہ ماہ بانو نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا...... وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ رات وہ اپنی روم میٹ کی دی ہوئی ٹرنکولائزر کھا کر سوئی تھی تو سوچا بھی نہیں تھا کہ ہاسٹل کے بجائے کسی اور جگہ آنکھ کھلے گی۔ کچھ دیر تو اسے سمجھ ہی نہیں آ سکا تھا کہ ہاسٹل کا وہ بے رونق چھوٹا سا کمرا اس سجے سجائے کشادہ کمرے میں کس طرح تبدیل ہو گیا؟ لیکن پھر جلد ہی اسے سمجھ آ گئی کہ صرف کمرے کا نقشہ اور حدود اربع نہیں بدلا ہے، باقی سب کچھ بھی بدل گیا ہے۔ وہ جس کمرے میں تھی، وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ کمرا تو بے شک اجنبی تھا لیکن دیوار پر لگی فریم شدہ تصویر تعارف کروا رہی تھی کہ کمرے کا مالک کون ہے اور ایک بار پھر کس کی قید میں پہنچ چکی ہے۔ کلف لگے شلوار کرتے میں، سر پر اونچے شملے کی پگڑی باندھے وہ سو فیصد چودھری افتخار عالم شاہ ہی تھا جس کی اندرونی خباثت تصویر میں بھی چہرے سے جھلک رہی تھی۔

ماہ بانو متوحش انداز میں بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تیر کی طرح دروازے تک پہنچی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ ہینڈل سے کچھ دیر کی زور آزمائی کے بعد جب وہ تھک گئی تو زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی۔ اس کی اس حرکت کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور دروازے کے دوسری طرف یوں خاموشی چھائی رہی جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو۔ آخرکار ماہ بانو کو تھک ہار کر یہ کوشش بھی ترک کرنی پڑی۔ وہ واپس آ کر بیڈ پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ وہ تو شہریار کی بے رخی کے سوگ میں رت جگا منا رہی تھی کہ اپنی روم میٹ کے مشورے پر اس کی دی ہوئی ٹرنکولائزر کھا کر سو رہی اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ اس پر کیا گزری اور وہ کیسے یہاں تک پہنچی؟ اگر وہ اس وقت حیدرآباد میں تھی تو کراچی سے حیدرآباد کا فاصلہ اتنا مختصر تو نہیں تھا کہ وہ صرف ایک گولی کے نشے کے زیرِ اثر سوتی رہتی، وہ بھی اس عالم میں کہ سرے سے آنکھ ہی نہیں کھلتی۔ اس صورتِ حال پر اس کے ذہن میں خود بخود یہ خیال ابھر رہا تھا کہ شاید اس کی روم میٹ نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا اور ٹرنکولائزر کے نام پر کوئی ایسی طاقتور نشے کی گولی دی تھی جس نے اسے بے ہوش ہی کر ڈالا تھا...... لیکن اس صورت میں بھی یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ آخر چودھری نے اس کے ہاسٹل تک رسائی کیسے حاصل کی؟ کیا چودھری کے اثر رسوخ کے سامنے ان کی ساری تدبیریں ناکام ہو گئی تھیں؟ وہ اس کا نام بدل کر رہنا، باہر نکلنے کے لیے نقاب استعمال کرنا، اپنے کسی جاننے والے سے رابطہ نہ کرنا، سب بے کار چلا گیا تھا؟ اور وہ جس آسیب سے بھاگتی پھر رہی تھی پھر اس کے شکنجے میں پھنس گئی تھی۔ شاید اس کے دل کو اس انہونی کی پہلے ہی خبر ہو گئی تھی جب ہی تو مسلسل گھبرائے جا رہا تھا اور اسی گھبراہٹ کی وجہ سے اس نے شہریار کی طرف سے عائد پابندی کو نظر انداز کر کے اسے فون کرنے کی جسارت کر لی تھی...... لیکن اس نے اس کی بات سنی ہی نہیں اور اب وہ یہاں تھی۔ چودھری کے نہ جانے کس ٹھکانے پر۔ معلوم نہیں کوئی اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں تک پہنچ بھی پاتا یا نہیں؟ وہ سانپوں کی طرح ڈستے کئی سوالوں کے درمیان پھنسی عجیب ادھیڑبن میں بیٹھی تھی کہ دروازہ ہلکی آواز کے ساتھ کھلا۔ اس نے آواز پر چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ کھلے دروازے سے چودھری اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"بلے بھئی بلے۔ یہ تو اپنی ماہ بانو بیگم صاحبہ ہے۔" اس سے نظر ملتے ہی وہ طنز بھرے لہجے میں بولا تو ماہ بانو نے نفرت سے اپنے چہرے کا رخ بدل لیا۔

"نہ کڑیے! ایسے منہ نہ موڑ...... اس بڈھے کو دیکھنے کے لیے تو ہم نے جانے کدھر کدھر کی خاک چھانی ہے۔ بہت بھاگے ہیں تیرے پیچھے۔ فیر سنا کہ تو پہاڑوں پر دھماکے میں مر گئی ہے۔ مت پوچھ تیرے مرنے کا سن کر دل پر کیا گزری تھی۔ ایسا سوہنا چہرہ اور کھن ملائی سا بدن ہم سے داد پائے بغیر ہی ٹوٹے ٹوٹے ہو گیا...... یہ سن کر کلیجا منہ کو آ گیا تھا۔" وہ ماہ بانو کے رخ پھیرنے پر مزید ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے قریب چلا آیا اور اس کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ پھیرنے لگا۔

"دور رہو مجھ سے غلیظ آدمی۔" ماہ بانو نے یوں اس کے ہاتھ جھٹکے جیسے وہ انسانی ہاتھ نہ ہوں، رینگتے ہوئے بچھو ہوں۔ ویسے اسے چودھری کی معلومات پر حیرت تھی۔ اسے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے بارے میں ساری خبریں تھیں۔

"واہ بھئی واہ... تو تو اب بھی ویسی ہی تیکھی ہے۔" چودھری خباثت سے ہنسا پھر بولا۔

"ویسے تیرا نخرے کرنا بنتا ہے۔ آخر اے سی شہریار کا ہتھ ہے تجھ پر۔ اب تک وہی تو مرغی کی طرح تجھے اپنے پروں میں چھپا تا رہا ہے... پر دیکھ لے، ہماری لگن بھی سچی تھی۔ ہم تجھے وہاں سے بھی نکال لائے جہاں کسی کا دھیان ہی نہیں جا سکتا تھا۔ مہرین... واہ بھئی واہ! کیا سوہنا نام چنا تھا تو نے اپنے لیے۔ ویسے سچ بتا تو نے چنا تھا یا اپنے اے سی صاحب نے؟ آدمی وہ بھی کم باذوق نہیں ہے۔ ایسے ہی تو ہمارا رقیب نہیں بن گیا۔ اس کا بھی دل آ گیا ہوگا تیری جیسی سوہنی کڑی پر۔" چودھری مسلسل اس کے ساتھ شغل کر رہا تھا۔ اس کی بات سن کر ماہ بانو کا دل بھر آیا۔ ایک یہی تو یقین نہیں تھا اس کے پاس کہ شہریار نے بھی اپنا دل اس کے آگے ہارا ہوگا۔ وہ مہربان بھی ہوتا تھا تو اس طرح کہ انسانیت کے نام پر ہمدردی کرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس جذبے کا تو پتا ہی نہیں چلتا تھا جسے محبت کا نام دیا جا سکے۔

"تمہیں میرے بارے میں کس نے اطلاع دی کہ میں کراچی میں ہوں؟" تمام باتوں سے اپنا دھیان ہٹاتے ہوئے اس نے اس شخص کا نام جاننا چاہا جو اس کی اسیری کا سبب بنا تھا۔

"اطلاع... ہا... یہ بھی خوب سوال پوچھا تو نے۔ گل یہ ہے بی بی کہ جدھر پیسا ہو ادھر سب کچھ کھنچا چلا آتا ہے۔ پیسے کے لیے ادھر لوگ اپنے باپ کو بیچ دیتے ہیں، خبریں پہنچانا کون سی وڈی گل ہے۔" چودھری نے جو جواب دیا، اس سے ماہ بانو کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکی البتہ اس نے اتنا ضرور سمجھ لیا کہ اس کی جان پہچان کے کسی شخص نے ہی مخبری کی ہے۔ وہ صبر سے چودھری کی بڑکیں سننے لگی کہ شاید وہ شیخی میں مخبر کا نام بھی بتا دے لیکن اس سے قبل ہی چودھری کا موبائل بجنے لگا اور وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کال شاید کسی خاص شخصیت کی طرف سے تھی۔ وہ جوش و خروش سے حال احوال دریافت کرنے لگا۔

"کیا دس رہے ہو تسی۔ یہ تو بہت ہی وڈی خبر ہے۔" فون کرنے والے نے نہ جانے کیا خبر سنائی تھی کہ چودھری پھڑک اٹھا۔

"بہت بہت مبارک ہو جی! آپ کو اے سی داماد مل رہا ہے۔" چودھری زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا اور ماہ بانو کو نظر انداز کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی دروازے کے قریب کھڑے ایک گن مین نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ اگر اس وقت دروازہ کھلا بھی رہ جاتا تو ماہ بانو کسی قسم کی حرکت کرنے سے قاصر رہتی۔ اس کا ذہن تو چودھری کے جملے میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ جانے فون پر کون تھا جسے چودھری اے سی داماد ملنے پر مبارک باد دے رہا تھا۔ ملک بھر میں صرف ایک شہریار ہی اے سی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس پوسٹ پر بہت سے لوگ کام کر رہے تھے لیکن وہ تو بس ایک شہریار کو ہی جانتی تھی... اور اگر وہ کسی اور کا بننے جا رہا تھا تو یہ خبر اس کے دل میں چٹکی محبت کی نوخیز کلی کے لیے سخت آندھی کی طرح تھی۔ اس تند و تیز آندھی کی زد میں آ کر وہ نوخیز کلی بری طرح لرز رہی تھی۔ محبوب کو نہ پا سکنا شاید کبھی بھی اتنا بڑا حادثہ نہیں ہوتا جتنا اس کا کسی اور کے ہو جانے سے صدمہ پہنچتا ہے۔ وہ بھی ایسے ہی کسی صدمے کی زد میں تھی۔

☆☆☆

شہریار بے یقینی کے انداز میں آئی جی مختار مراد کی شکل دیکھ رہا تھا۔ مختار مراد نے اسے ورما کے فرار کی خبر سنا کر ششدر کر دیا تھا۔ ایک ایسا شخص جس سے اس کی صرف ذاتی دشمنی ہی نہیں تھی بلکہ وہ ملک و قوم کا بھی مجرم تھا... ہاتھ آنے کے بعد اتنی آسانی سے بھاگ نکلا تھا، یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ورما کی گرفتاری کے لیے اس نے معمولی جدوجہد نہیں کی تھی۔ اس نے اپنی حدود سے تجاوز کر کے اس شخص کو شکنجے میں کسا تھا۔ اس کا ورما کی گرفتاری کی خاطر کراچی جانا اور پھر ماہ بانو کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ پر چھاپا مارنا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس سرگرمی کے نتیجے میں وہ خود بھی ورما کے ہاتھ سے نقصان اٹھا سکتا تھا۔ کسی کے علم میں آنے پر اس کی نوکری بھی جا سکتی تھی لیکن اس نے کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر صرف اور صرف ورما کو پکڑنا ضروری سمجھا تھا اور اب اسے بتایا جا رہا تھا کہ ورما فرار ہو چکا ہے۔ وہ تو خود کو ملنے والے ایک دھمکی آمیز پیغام کو مختار مراد سے ڈسکس کرنے آیا تھا۔ آج لاہور پہنچنے کے صرف دو گھنٹے بعد اسے ایک عام سے لفافے میں کوریئر سروس کے ذریعے یہ پیغام بھیجا گیا تھا۔ لفافے میں موجود کاغذ پر ایک مختصر تحریر درج تھی۔

"خود کو ہمارے معاملات سے الگ رکھو ورنہ اپنے پورے خاندان کو کھو دو گے۔ ابھی ہم نے تمہیں صرف وارننگ دی ہے۔" اس تحریر کو پڑھ کر وہ الجھ گیا تھا کہ اسے یہ دھمکی دینے والا کون ہے۔ پچھلے کچھ عرصے میں اس نے اپنے لیے خاصی دشمنیاں پال لی تھیں۔ ایک طرف اگر چودھری افتخار عالم شاہ سے اس کے ڈھیروں اختلافات تھے تو دوسری طرف وہ "را" والوں کو بھی چھیڑ بیٹھا تھا۔ دشمنی میں چودھری کے بھی حد سے گزر جانے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن ورما کی گرفتاری کی شکل میں اس کی حالیہ جھڑپ "را" والوں ہی سے ہوئی تھی۔ پھر لیاقت رانا کی گاڑی پر جس منظم طریقے سے فائرنگ کی گئی تھی، اس سے بھی یہی لگتا تھا کہ اس کام کے پیچھے عام غنڈے بدمعاشوں کے بجائے تربیت یافتہ لوگ ہیں اس لیے اس کا زیادہ شک "را" کی طرف ہی جا رہا تھا۔ اپنے شک کی تصدیق کرنے کے لیے وہ مختار مراد سے ملنے آیا تھا لیکن یہاں تو ایک اور ہی خبر اس کی منتظر تھی۔ مختار مراد نے اس کے شکوک کی تائید کرتے ہوئے اسے بتایا کہ حملہ یقیناً "را" والوں کی طرف سے ہی کیا گیا تھا کیونکہ ورما کے فرار کے بعد انہیں یہ علم ہو گیا ہوگا کہ اسے گرفتار کروانے والا شہریار ہے۔

"آپ نے اتنی بڑی خبر مجھ سے چھپا کر رکھی۔" کچھ دیر بعد وہ بولنے کے لائق ہوا تو اس نے مختار مراد سے شکوہ کیا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم یہ خبر سن کر بہت پریشان ہو جاؤ گے اس لیے میں نے تمہیں خبر نہیں دی لیکن یہ جو نئی صورت حال سامنے آئی ہے اور تمہیں دھمکی آمیز پیغام ملا ہے، اس کے بعد مجھے لگا کہ تمہیں حقیقت سے آگاہ کر دینا چاہیے تاکہ تم اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے لیے محتاط ہو جاؤ۔ میں تو شروع ہی سے تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ خود کو ایسے معاملات میں ملوث نہیں کرو۔ رانا صاحب کی فیملی کے لیے تم بہت اہم ہو۔ سجاد کو کھونے کے بعد ان کے پاس تم ہی بچے ہو۔ نہ وہ تمہیں کھونا برداشت کر سکتے ہیں، نہ تمہیں ان میں سے کسی کا نقصان برداشت ہوگا۔ تمہارے دشمن بھی یہ بات سمجھتے ہیں اور رانا صاحب کی گاڑی پر فائرنگ کروا کر وہ اسے باور بھی کروا چکے ہیں۔" مختار مراد ہمیشہ کی طرح اسے نصیحتیں کرنے لگا۔ وہ ہونٹ بھینچے اس کی ساری باتیں سنتا گیا۔ اندر اپنا جذبات کا لاوا ابل رہا تھا لیکن مختار مراد کی حیثیت اس کے لیے ایک بزرگ کی سی تھی جس سے اختلاف ہونے کے باوجود وہ اونچی آواز میں بات نہیں کر سکتا تھا۔

"ورما کس طرح فرار ہوا؟ کیا اس کی سیکیورٹی کا انتظام صحیح طرح نہیں کیا گیا تھا؟" مختار مراد کے خاموش ہونے کے بعد اس نے سوال کیا۔

"اصل میں وہ ابھی تک کراچی پولیس کی ہی کسٹڈی میں تھا۔ اسے اس نوعیت کے زخم آئے تھے کہ فوری طور پر یہاں شفٹ کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اسے ایک بڑے پرائیویٹ اسپتال کے اسپیشل روم میں رکھا گیا تھا۔ سیکیورٹی کا بھی ٹھیک ٹھاک انتظام تھا لیکن اس کے ساتھیوں نے گیم ایسا کھیلا کہ سیکیورٹی والے بھی مار کھا گئے۔ انہوں نے اسپتال کے سینئر سرجن ڈاکٹر نقوی کو ٹریپ کر کے اس طرح کی سچویشن کری ایٹ کی کہ انہیں ورما کو فرار کروانے میں کافی آسانیاں مل گئیں۔" وہ اسے تفصیل سے بتانے لگا کہ کس طرح ڈاکٹر نقوی کے نواسے کو اسکول سے واپسی میں اغوا کیا گیا اور پھر اس کے گھر کی خواتین کو ہراساں کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے مطالبہ کیا گیا کہ اگر اپنے نواسے کی واپسی چاہتے ہو تو ہمارے احکامات کی تعمیل کرو۔

"اپنے اکلوتے نواسے کی خاطر ڈاکٹر نقوی نے ان لوگوں کے ہاتھوں کھلونا بننا قبول کر لیا اور جو کچھ اس سے کہا گیا، اس پر عمل کر ڈالا... لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ان ظالموں نے اس کا نواسا اس صورت میں اسے واپس کیا کہ وہ زندہ نہیں تھا۔ انویسٹی گیشن ٹیم کے سامنے جو سچویشن آئی تھی، اس سے انہیں شک تو ہو گیا تھا کہ ورما کے فرار میں ڈاکٹر نقوی نے مدد دی ہے لیکن خود ڈاکٹر نقوی اس بات کو قبول نہیں کر رہا تھا... نواسے کی موت کی اطلاع ملی تو وہ ہمت ہار بیٹھا اور اس نے تفتیشی افسر کو سب کچھ بتا دیا... لیکن اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ اسے صحیح طرح اندازہ نہیں تھا کہ جو کچھ اس سے کرنے کو کہا جا رہا ہے، اس کا کیا ری ایکشن سامنے آئے گا۔ اس سے تو صرف اتنا مطالبہ کیا گیا تھا کہ کسی بہانے سے ورما کو اسپتال کے گراؤنڈ فلور تک بھجوا دو۔ اسپتال میں ہر نوعیت کی لیبارٹریز گراؤنڈ فلور پر ہیں چنانچہ ڈاکٹر نقوی نے اسکیننگ کے بہانے اسے نیچے بھجوا دیا۔ وہاں ورما کے ساتھی وزیٹرز کے بہروپ میں پہلے ہی سے تیار تھے۔ انہوں نے اچانک ہی اس طرح حملہ کیا کہ سیکیورٹی اہلکاروں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔" مختار مراد نے اسے ساری تفصیل کہہ سنائی۔

"یہ بہت برا ہوا۔ اب دوبارہ ورما پر ہاتھ ڈالنا مشکل ہوگا۔ وہ مکمل طور پر چھپ کر بیٹھ جائے گا اور اپنی کارروائیاں کرتا رہے گا۔" شہریار کا افسوس کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

"کرنے دو اسے کارروائیاں۔ وہ کوئی ایک تو نہیں ہے۔ ایسے کتنے لوگ ہیں جو ہمارے درمیان رہ کر ہمارے ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس طرح کا گیم تو ساری دنیا میں کھیلا جا رہا ہے۔ ہر ملک نے اپنی خفیہ ایجنسیز کو دوسرے ملکوں میں پھیلا رکھا ہے۔ ان کے ایجنٹ جاسوسی کے ساتھ ساتھ تخریبی کارروائیاں بھی کرتے رہتے ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارا واسطہ ایک ایسے دشمن سے پڑا ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

جو کینہ پرور اور کم ظرف ہے چنانچہ ہمارے لیے مسائل بھی زیادہ کھڑے کرتا ہے۔ تم اتنی ٹینشن مت لو۔ ہمارے افسران کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح ورما کو دوبارہ گرفت میں لیا جا سکے۔ انشاء اللہ بہتری کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔ تم سب کچھ بھول بھال کر اس وقت اپنی خوشی میں خوش رہو۔ میری مریم سے بات ہوئی تھی، اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے کوئی لڑکی پسند کر لی ہے اور جلد از جلد شادی کرنا چاہتے ہو۔ مجھے یہ خبر سن کر بہت خوشی ہوئی اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی خوش رہو۔ شادی انسان کی زندگی کا بہت اہم موقع ہوتا ہے اور میری خواہش ہے کہ تم اس موقع کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرو۔ بہت بڑے بڑے صدمے سہنے کے بعد رانا فیملی ایک خوشی دیکھنے جا رہی ہے۔ اگر اس موقع پر تم ہی اَپ سیٹ رہے تو باقی لوگ کس طرح انجوائے کریں گے؟ یہ زندگی ہے بیٹا! یہاں بہت کچھ ہماری مرضی اور خواہش کے برخلاف ہوتا ہے اور ہمیں اسے نظر انداز کر کے خود کو حالات کے مطابق ڈھالنا پڑتا ہے۔" اس کے لہجے میں بزرگانہ شفقت اور خلوص جھلک رہا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، شہریار کے حالات سے کتنا قریب تھا خود اسے بھی نہیں معلوم تھا لیکن خود شہریار کی اندرونی کیفیت رقیق ہو رہی تھی۔ اس کی ذاتی زندگی میں جو کچھ ہو چکا تھا اور جو کچھ ہونے جا رہا تھا، وہ اس کی مرضی اور خواہش کے کتنا برخلاف تھا... یہ تو وہ خود ہی جانتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار لڑکھڑانے والے قدموں نے اس کی زندگی کا دھارا ہی بدل کر رکھ دیا تھا لیکن وہ کسی پر کچھ بھی ظاہر کیے بغیر سمندر کے سے سکوت کے ساتھ سب کچھ خود ہی سہہ رہا تھا۔

ڈاکٹر ماریا کو اپنی پسند قرار دے کر اس نے اس کے غیر مسلم ہونے کا اعتراض بھی زد کر ڈالا تھا۔ رانا ہاؤس میں اس کے اس فیصلے کو قبول کر لیا گیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ اتنے خوش نہیں ہیں جتنے ماریا کے مسلمان ہونے کی صورت میں ہوتے۔ ان کی یہ نیم دلی خود اس کے لیے بہت دکھ کا سبب تھی لیکن وہ مجبور تھا... بے حد مجبور کیونکہ وہ اس مرحلے پہ ماریا کو اپنانے سے انکار کر کے اپنے ضمیر کی مار نہیں سہہ سکتا تھا۔ اس کے پاس دو ہی راستے تھے، اگر وہ اپنے دل کی خوشی دیکھتا تو ماریا کو اس کے حال پہ چھوڑ سکتا تھا۔ کون تھا جو اس کا گریبان پکڑ سکتا تھا؟ لیکن وہ تو ضمیر کی عدالت میں پھنس گیا تھا۔ ضمیر اسی صورت میں... مطمئن ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرے چنانچہ اس نے دل کی خوشی کے مقابلے میں ضمیر کے اطمینان کو منتخب کر لیا تھا۔

☆☆☆

"تیرے پیو نے حد کر دی ہے تاجور! جیاتی گزر گئی، اس کی عیاشیاں دیکھتے اور برداشت کرتے۔ وہ مجھ پہ سوکن پہ سوکن لا کر بٹھاتا گیا، میں نے سہہ لیا۔ طوائفوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا رہا، میں کچھ نہیں بولی۔ پچھلے دنوں وہ میم آ کر حویلی میں رہی، تب بھی زبان بند رکھی... پر اس ماہ بانو کی بچی کو نہیں برداشت کر سکتی۔ پچھلی سوکنیں میں نے اس لیے برداشت کر لی تھیں کہ وہ خاندانی عورتیں تھیں۔ کسی کمین کو تیرے باپ نے میری برابری میں لا کر نہیں بٹھایا تھا، پر اب وہ ایسا کرنے لگا ہے۔ ہمارے ٹکڑوں پہ پلنے والوں کی اولاد اگر برابری میں آ جائے گی تو فرق ہی کیا رہے گا ہم میں اور اس میں؟ تیرا پیو اگر اسے رکھیل بنا کر رکھتا تو میں کچھ نہیں کہتی کہ آخر اس کا طوائفوں کے پاس جانا بھی تو برداشت کرتی ہوں۔ ہر وڈے زمیندار کی گھر والی کو برداشت کرنا بھی پڑتا ہے، پر طوائف سے دل بہلانے اور نیچ خاندان کی عورت کو بیوی بنانے میں وڈا فرق ہوتا ہے۔ میں نے تو شکر کیا تھا کہ وہ چڑیل کہیں دفان ہو گئی اور تیرے پیو کے سر سے ایک ہور بیاہ رچانے کا بھوت اترا لیکن وہ تو اسے فیر سے لے آیا ہے اور لا کر رکھا بھی حویلی کے مہمان خانے میں ہے... جس کا مطلب ہے کہ وہ اس کل کی چھوکری سے ویاہ ضرور رچائے گا۔"

وڈی چودھرائن اپنی بڑی بیٹی تاجور کے سامنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔ اگرچہ چودھری نے بہت خفیہ طور پر ماہ بانو کو مہمان خانے میں رکھا تھا لیکن وڈی چودھرائن تو پھر وڈی چودھرائن تھی۔ حویلی کا انتظام و انصرام اس کے ہاتھ میں تھا تو ایسے ہی نہیں تھا۔ اس کے جاسوس حویلی میں پیش آنے والے معمولی سے معمولی واقعے کی اطلاع بھی اس تک پہنچاتے تھے۔ عملی طور پر حویلی کی عورتوں کا مہمان خانے سے تعلق نہ ہونے کے باوجود اسے وہاں ٹھہرنے والے مہمانوں کے بارے میں سب معلوم ہوتا تھا کہ کون کب وہاں آیا اور کب تک ٹھہرا۔ ماہ بانو وہاں لا کر رکھی گئی تو بھی اس سے چھپ نہیں سکا۔ ماہ بانو کی حویلی میں موجودگی کا سن کر اسے پتنگے لگ گئے لیکن اس نے جذبات میں چودھری سے بھڑنے کے بجائے اپنی مشیرِ خاص تاجور کو بلا بھیجا۔ بڑی بیٹی ہونے کے ناتے وہ ماں سے بہت قریب تھی اور وہ اکثر اس سے مشاورت کرنا پسند کرتی تھی۔ اس وقت بھی وڈی چودھرائن نے اس کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کیا تو وہ سوچ میں پڑ گئی اور کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد ماں کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں ایک واضح خیال چمک رہا تھا۔

"میرا خیال ہے اماں، ہمیں یہ مسئلہ اشرف شاہ کے سامنے رکھنا چاہیے۔ اباجی کا ایک ہور ویاہ تو اس سے بھی برداشت نہیں ہوگا۔ اباجی ہور ویاہ کر کے جائداد کے وارثوں میں اضافہ کریں، یہ ہم میں سے کسی کو قبول نہیں۔ اشرف شاہ کو ملوم ہے کہ اباجی کے بعد جاگیر کا سارا انتظام داماروں کے ہاتھ ہی آنا ہے۔ بھائی مراد شاہ کا امریکا سے واپس ادھر پلٹنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور بہزاد شاہ کسی کم جوگا نہیں۔ اپنے بھلے کا سوچ کر اشرف شاہ کوئی چنگا ہی مشورہ دے گا۔"

"تو کہتی ہے تو فیر اسے یہاں بلوا کر اس سے مشورہ کر لیتے ہیں۔ تیرے ساتھ ہی آیا ہے نا؟" وڈی چودھرائن نے اس کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے پوچھا۔

"ساتھ ہی ہیں۔ مردانے میں رک گئے تھے کہ اباجی سے ملاقات کر لیں گے۔" تاجور نے بتایا تو وڈی چودھرائن نے ایک ملازمہ کو پکار کر اسے حکم دیا کہ اشرف شاہ کو مردانے سے بلا لائے۔ ملازمہ حکم کی تعمیل کے لیے پلٹ گئی تو ماں بیٹی ایک بار پھر باتوں میں مشغول ہو گئیں۔

"چھوٹی اماں کہاں ہیں، نظر نہیں آئیں۔ پچھلی واری بھی آئی تھی تو ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔" تاجور نے چودھرائن ناہید کے بارے میں دریافت کیا۔

"پڑی رہتی ہے اپنے کمرے میں منہ چھپا کر۔ بیٹی نے کسی کو منہ دکھانے جوگا چھوڑا ہی کہاں ہے اسے۔" وڈی چودھرائن نے ناک چڑھا کر جواب دیا۔ ساری زندگی حویلی کی سب سے بااختیار عورت کی حیثیت سے گزارنے کے باوجود اس کے دل میں سوکن کے لیے حاسدانہ جذبات تو رہے تھے اور اب جبکہ وہ بیٹی کی وجہ سے معتوب ٹھہرائی گئی تھی تو اس کے دل کو ایک سکون سا محسوس ہوتا تھا۔

"کم تو وڈا دکھایا ہے کشور نے۔ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس ماسٹر سے عشق لڑاتی رہی اور فیر اس کے ساتھ نکل بھی گئی... پر اتنا تو مجھے بھی ملوم ہے کہ اباجی اسے چھوڑیں گے نہیں۔ انہوں نے اپنے بندے ان دونوں کی تلاش میں لگا رکھے ہوں گے۔ جس دن دونوں ہاتھ لگے، دونوں کی خیر نہیں ہوگی۔ اباجی ٹوٹے ٹوٹے کروا دیں گے ان کے۔" تاجور نے تبصرہ کیا۔

"ہوتا رہے جو ہوتا ہے۔ مجھے تو اب اس نئی مصیبت کی فکر لگی ہے جو تیرا پیو میرے سر پر ڈالنے والا ہے۔" وڈی چودھرائن نے بیزاری سے جواب دیا۔ اسی وقت دروازے کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی تو دونوں ماں بیٹی سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"سلام پھپھی۔" اگلے لمحے اشرف شاہ اندر داخل ہوا اور وڈی چودھرائن کو سلام کیا۔

"جیتا رہ میرا پتر! آ ادھر بیٹھ۔ وڈے دن گزرے تجھ سے ڈھنگ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔" وڈی چودھرائن نے لہجے میں شیرینی سموتے ہوئے اسے اپنے قریب بیٹھنے کی جگہ دی۔

"ہم مردوں کے دھندے ہی اتنے ہوتے ہیں کہ کسی سے گل بات کرنے کی فرصت نہیں ہوتی۔ اگر گھر کی زنانیوں کے ساتھ بیٹھ کر گپیں لڑاتے رہے تو چل چکے ہمارے دھندے۔" اشرف شاہ وڈی چودھرائن کا صرف داماد ہی نہیں، سگا بھتیجا بھی تھا لیکن بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں وہی نخوت تھی جو چودھریوں کا خاصہ تھا۔

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے پتر پر بعض دفعہ زنانیاں بھی ایسی عقل کی گل کرتی ہیں جو مردوں کے فیدے کی ہوتی ہیں۔ ابھی میں نے تجھے ایسی ہی گل کے لیے بلایا تھا۔" وڈی چودھرائن نے اپنے لہجے کی مٹھاس برقرار رکھتے ہوئے اشرف شاہ کو جواب دیا۔

"اچھا... میں بھی تو سنوں کہ ایسی کون سی گل ہے؟" اشرف شاہ اپنی جگہ پر سیدھا ہو کر بیٹھا۔

"اسی کڑی ماہ بانو کا قصہ ہے۔ ڈھونڈ نکالا ہے تیرے پھپھا نے اسے فیر سے۔ اس بڈھے ویلے اس کے سر پہ عشق کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ مر رہا ہے اس کمی ذات سے ویاہ کے لیے۔ ویاہ ہو گیا اور عشق کی زورا زوری میں کوئی بچہ بھی پیدا ہو گیا تو مطلب ہے جائداد کا ایک وارث ہور آ گیا۔ میں کہتی ہوں ایسی نوبت آنے سے پہلے ہی کوئی حل سوچ۔ کسی طرح کام تمام کرو اس کڑی کا۔ جان چھڑاؤ اس سے۔" چودھرائن نے ساری صورتِ حال اس کے سامنے رکھی۔

"تو فکر ہی نہ کر پھپھی! بس سمجھ کہ تیری جان چھوٹ گئی اس مصیبت سے۔ ایسا غیب کرواؤں گا اسے کہ فیر کبھی دوبارہ اس کی شکل نظر نہیں آئے گی کسی کو۔" اشرف شاہ گویا لمحوں میں سب کچھ سوچ بیٹھا تھا۔

"جیتا رہ میرا پتر! میں بھی تو سنوں کہ تو نے ایسا کیا حل سوچا ہے؟" وڈی چودھرائن نے خوشی سے باچھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ میرا مسئلہ ہے پھپھی۔ تو بس اتنا کر کہ مہمان خانے میں آج کل ڈیوٹی دینے والے نوکروں میں سے کسی ایسے نوکر کو بلا لے جو جی دار بھی ہو اور لالچی بھی۔ آ کر ہمارا کم بھی کر

دے۔ اصل مسئلہ کُڑی کو مہمان خانے سے نکالنے کا ہے۔ وہ وہاں سے نکل گئی تو سمجھ فیر ایسی غیب ہو گی کہ کسی کو اس کا نام و نشان نہیں ملے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تجو اور اس کی گھر والی کو بلا لیتی ہوں۔ تجو کی دھی کا ویاہ ہونے والا ہے۔ اس کے لیے اسے رقم کی ضرورت تو ہو گی۔ وہ جلدی راضی ہو جائے گا۔" چودھرائن اشرف شاہ کا پورا منصوبہ تو نہیں سمجھ سکی لیکن اتنا بہر حال اسے بھی سمجھ آ رہا تھا کہ ماہ بانو کو منظر سے غائب کرنے کے لیے اسے مہمان خانے کی محفوظ پناہ گاہ سے باہر نکالنا ضروری ہے۔ اس نے فوراً ایک ملازمہ کے ذریعے تجو کی بیوی کو بلوا بھیجا۔ دونوں میاں بیوی کو ایک ساتھ بلوانا مناسب نہیں تھا کہ ایک ساتھ آتے ہوئے وہ دوسرے ملازمین کی نظر میں آ جاتے اور ماہ بانو کے غائب ہونے کے بعد جب چودھری تحقیق کرتا تو اس کے لیے معاملے کی تہ تک پہنچ کر اس واقعے کے پیچھے چودھرائن کا ہاتھ ڈھونڈ لینے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ تجو کی بیوی بلاوے پر فوراً ہی چلی آئی اور سلام کر کے ایک جانب خاموشی سے کھڑی ہو گئی لیکن اس کے چہرے پر موجود حیرانی صاف پڑھی جا رہی تھی۔ یقیناً اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وڈی چودھرائن نے اپنی بیٹی اور داماد کی موجودگی میں اسے کس کام سے بلایا ہے۔

"سنا ہے تیری دھی کا ویاہ ہونے والا ہے۔ تیاری شیاری ہو گئی تم لوگوں کی یا نہیں؟" اشرف شاہ نے خود گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"دو چار کپڑے لتوں کے سوا ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں اور تجو وڈے پریشان ہیں کہ باقی کی تیاری کیسے ہو گی؟ لڑکے والوں سے گل کی تھی کہ تھوڑی مہلت ہور دے دیں، پر ادھر لڑکے کی ماں بیمار ہے۔ اسے جلدی ہے کہ بہو گھر لے آئے اس لیے اس نے ہماری گل نہیں مانی۔ اب رب کے بھروسے پر بیٹھے ہیں کہ وہ آپ ہی کچھ مدد کرے گا ہم غریبوں کی۔" تجو کی بیوی کے لہجے میں وہی بے بسی اور عاجزی تھی جو ازل سے اس کے طبقے کا نصیب ہے۔

"تو فیر سمجھ کہ رب نے تیری سن لی۔ تیری دھی کے ویاہ کا سارا خرچہ میں اٹھاؤں گا۔ تو ایسا جہیز دینا اپنی دھی کو کہ سارے پنڈ کی آنکھیں کھلی رہ جائیں۔" اشرف شاہ نے مچھلی کو چارہ ڈالا۔

"وڈی مہربانی سرکار! آپ کا یہ اتنا وڈا احسان میں تمانی کبھی بھی نہیں اتار سکتی۔" تجو کی بیوی کی آواز بھرا گئی اور وہ اشرف شاہ کے قدموں میں جھکنے کے لیے آگے بڑھی۔

"تو ہمارا یہ احسان اتار سکتی ہے... بس اس کے بدلے میں تجھے ہمارا ایک چھوٹا سا کام کرنا ہو گا۔" اشرف شاہ نے مکاری سے کہا۔

"میں اپنی جان بھی دینے کو تیار ہوں سرکار۔" تجو کی بیوی اب زمین پر بیٹھ چکی تھی اور اس کے ہاتھ اشرف شاہ کے پیروں کو چھو رہے تھے۔

"تجھے مہمان خانے میں موجود لڑکی کو وہاں سے نکال کر حویلی کے باہر بھیجنا ہو گا۔" اشرف شاہ نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ تجو کی بیوی سے ساری بات چیت وہ اکیلے ہی کر رہا تھا۔ تاجور اور وڈی چودھرائن کی حیثیت محض خاموش تماشائی کی تھی۔

"وڈے چودھری مجھے جان سے مار دیں گے۔" اشرف شاہ کی فرمائش سن کر وہ خوف سے پیلی پڑ گئی۔

"ابھی تو تو کہہ رہی تھی کہ اپنی جان بھی دے سکتی ہے۔" اشرف شاہ نے اسے اس کا وعدہ یاد دلایا تو وہ چپ سی رہ گئی۔

"فکر نہ کر... تجھے اور تیرے گھر والے کو کچھ نہیں ہو گا۔ ہمارا ہاتھ تیرے سر پر رہے گا۔ اپنے لیے کام کرنے والوں کا ہم پورا خیال رکھتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے سرکار! میں راضی ہوں۔ تجو بھی میرے کہنے پر مان جائے گا۔ دھی کی خوشیوں کی خاطر ہمیں اپنی جان دینی بھی پڑی تو دے دیں گے۔ ہمارا کیا ہے، بہت جی لیے۔ بڈھے ہونے کو آئے ہیں۔ اب نہیں تو دس پندرہ برس بعد بھی تو مرنا ہی ہے۔" وہ خالصتاً ایک ماں کے انداز میں سوچ رہی تھی۔ تجو کے بجائے اسے بلانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ عورتیں جذباتی انداز میں سوچتی ہیں اور اگر کسی سوچ پر قائم ہو جائیں تو مرد سے بھی اپنی بات منوا کر چھوڑتی ہیں۔ اب تجو چاہے لاکھ بیوی کو باز رکھنے کی کوشش کرتا لیکن آخرکار اسے اسی کی بات ماننی تھی۔

"ٹھیک ہے فیر کل رات تیار رہنا۔ میں بعد میں تجھے بتاؤں گا کہ کب اور کیا کرنا ہے۔" اس کی رضامندی پا کر اشرف شاہ نے اس سے کہا اور رخصت ہونے کا اشارہ کر دیا۔ تجو کی بیوی اسے جھک کر سلام کرتی ہوئی وہاں سے رخصت ہوئی تو اس کی پشت پر نظر جما کے بیٹھے اشرف شاہ کے ہونٹوں پر معنی خیز سی مسکراہٹ رینگ گئی۔

☆☆☆

"مجھے سمجھ نہیں آتا کہ تم نے اتنی ایمرجنسی میں شادی کا فیصلہ کیوں کیا؟ ایک ہفتے کے نوٹس پر بھی کوئی شادیاں ہوا کرتی ہیں۔ اتنے ارمان تھے میرے دل میں تمہاری شادی کے لیے۔ سوچا تھا ایسی بری بناؤں گی کہ لوگ دیکھتے رہ جائیں گے۔ ایسی دھوم سے برات جائے گی کہ دور دور تک شہنائی کی آواز سنائی دے گی اور بھی پتا نہیں کیا کیا منصوبے تھے میرے ذہن میں۔ تمہاری جلدی نے سب کچھ تلپٹ کر کے رکھ دیا۔" فون کے دوسری طرف آفرین رانا تھیں جو اس سے شکوے پر شکوہ کیے جا رہی تھیں۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ ان کے سارے شکوے سن رہا تھا لیکن جب ان کے خاموش ہونے کے بعد خود بولنا شروع کیا تو لہجے میں نرمی اور شگفتگی تھی۔

"آپ کو کون روک رہا ہے ارمان نکالنے سے؟ جیسی چاہیں بری بنائیں اور جتنی دھوم سے چاہیں برات نکالیں۔ آپ تو لڑکے کی ماں ہیں نا اور میں نے سنا ہے کہ لڑکے والوں کے لیے کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ وہ کیا کہتی ہیں بڑی بوڑھیاں... لڑکے کی بری بازار میں کھڑی۔ تو بس بازار جائیں اور کھٹا کھٹ جو چاہیں خرید ڈالیں۔ باقی کے ارینجمنٹ کے لیے بھی ایسے کئی ادارے کام کر رہے ہیں جو ایمرجنسی میں بھی آپ کو بہت عمدہ سروسز پرووائڈ کر سکتے ہیں۔"

"وہ تو میں خود بھی جانتی ہوں۔ تمہارے مفت مشورے کی ضرورت نہیں ہے مجھے... لیکن جو مزہ مجھے اطمینان سے مہینوں تمہاری شادی کر کے آتا، وہ ایک ہفتے میں کیسے آ سکتا ہے؟ مجھے تو ڈر ہے کہ جلد بازی میں کوئی شخص انوائٹ کرنے سے نہ رہ جائے۔ اتنی مصروفیت میں انسان کا دماغ صحیح طرح سے کام ہی کہاں کرتا ہے۔" وہ بدستور اس سے خفا تھیں۔

"چلیں تو پھر میں آپ کی خوشی کی خاطر ایک شادی اور کر لوں گا۔ "اس" شادی میں آپ "اس" شادی کی رہ جانے والی کسر نکال لیجیے گا۔ ہمارا کیا ہے، ہم تو دوسروں کی خوشی میں ہی خوش ہو جاتے ہیں۔" اس نے لہجے میں شوخی سموتے ہوئے انہیں چھیڑا۔ درحقیقت وہ خود بھی آفرین رانا کے احساسات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ انہوں نے اس کے والدین کی وفات کے بعد اسے بالکل سگی ماں کی طرح پالا تھا، سو اس کے لیے جذبات اور ارمان بھی سگی ماؤں جیسے ہی رکھتی تھیں۔ اس نے اپنی مرضی سے ایک غیر مسلم لڑکی سے شادی کا فیصلہ سنا کر ایک طرح سے انہیں ہرٹ کیا تھا۔ پھر ڈاکٹر ماریا کا فیملی بیک گراؤنڈ بھی اتنا مضبوط نہیں تھا کہ وہ اپنے سرکل کے لوگوں کو فخر سے اپنے سمدھیانے سے متعارف کروا پاتیں۔ خود شہریار، ڈاکٹر ماریا اور اس کی والدہ کے سوا ان کی فیملی کے کسی فرد سے واقف نہیں تھا۔ اگر اس کے سر میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کا سودا نہ سمایا ہوتا تو وہ خود بھی کبھی اس شادی کے بارے میں نہیں سوچ سکتا تھا۔

"شیری! تم خوش تو ہو نا بیٹا؟" اس کی شوخی کے جواب میں مسز آفرین رانا نے تشویش سے پوچھا۔

"وائے ناٹ، ڈاکٹر ماریا مجھے پسند ہے۔ میں اپنی مرضی سے اس سے شادی کر رہا ہوں۔" اس نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔

"معلوم نہیں کیوں مجھے تم خوش نہیں لگتے۔ میرا دل مجھے تمہاری خوشی کی گواہی نہیں دیتا۔" انہوں نے اپنے احساسات کا اظہار کیا۔

"اصل میں آپ کا دل اس خیال سے اداس ہے کہ بیٹا کسی اور کا ہونے جا رہا ہے اس لیے آپ خوشی کو محسوس ہی نہیں کر پا رہی ہیں۔" اس نے انہیں چڑانے کی کوشش کی۔

"فضول مت بولو۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں اس انداز میں سوچنے والی عورت نہیں ہوں۔ تمہیں خود بھی اچھی طرح یاد ہو گا کہ جب سجاد کی شادی ہوئی تھی تو میں نے خود اسے اور مریم کو الگ گھر میں شفٹ ہو جانے کو کہا تھا تاکہ وہ اپنی مرضی کی زندگی گزار سکیں۔ ویسے بھی ہم جیسی ماؤں کو بہوؤں کے آنے نہ آنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارے بیٹے ایک جگہ ٹک کر بیٹھتے ہی کب ہیں جو ہم انہیں اپنی نظروں کے سامنے رکھ سکیں۔ خود کو ہی دیکھ لو۔ لاہور سے اتنی دور بیٹھے ہو۔ ہفتوں گزر جاتے ہیں، تب کہیں جا کر تمہاری شکل دکھائی دیتی ہے۔ بیوی سے پہلے ہی تم اپنی نوکری کو پیارے ہو گئے ہو۔ بہو بے چاری کو کیوں مفت میں بدنام کروں؟ اس کے آنے سے تو مجھے سکون ملے گا کہ کوئی تمہارا خیال رکھنے کے لیے تمہارے پاس موجود ہے۔" اس کی چھیڑ چھاڑ کے جواب میں آفرین رانا نے ایک مختصری تقریر کر ڈالی۔

"چلیں جناب! امی نے مان لیا کہ آپ ایک آئیڈیل ساس ہیں اور میرے خیال میں مجھے اتنی اچھی ساس کا وقت بالکل بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنی بہو کے لیے شاپنگ کرتے ہوئے گزار سکے۔" وہ ایک بار پھر انہیں چھیڑنے سے باز نہیں آیا۔

"یہ کہو کہ تمہارے اپنے پاس وقت نہیں ہے۔ لگے ہوں گے دس کام تمہاری جان سے اور تم سوچ رہے ہو گے کہ ممانی جان سے نجات پاؤں تو اس طرف توجہ دوں۔" وہ بھی اس کی ہی ممانی تھیں اس لیے جوابی جملہ کہنے سے ذرا نہ چوکیں۔ ان کی بات سن کر شہریار ہنس پڑا۔ پوری گفتگو میں یہ پہلی ہنسی تھی جو اس کے ہونٹوں سے نکلی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"شکر ہے تمہاری شکل تو سنائی دی۔ اب مجھے کچھ سکون ملا ہے اور میں ذرا اطمینان سے شاپنگ کے لیے جا سکتی ہوں۔ تم مجھے اجازت دو۔ میرے پاس پہلے ہی وقت کم ہے۔" انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا تو شہر یار بھی اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن پھر دوبارہ بجنے والی گھنٹی نے... توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔

"کراچی سے کوئی مسز رضوی بات کر رہی ہیں سر! کہتی ہیں انہیں آپ سے ضروری کام ہے۔ آپ کی غیر موجودگی میں پہلے بھی دو تین بار کال کر چکی ہیں۔" دوسری طرف سے اسے اطلاع دی گئی تو وہ چونک گیا۔ مسز رضوی اس ہاسٹل کی وارڈن تھیں جہاں ماہ بانو مقیم تھی۔ ان کا بار بار کال کرنا خاصا تشویش ناک تھا۔

"بات کروائیں۔" تشویش میں گھرے ہوئے اس نے جواب دیا تو آپریٹر نے فوراً ہی لائن کنیکٹ کر دی۔

"السلام علیکم سر! میں مسز رضوی بات کر رہی ہوں۔ ایک اہم اطلاع دینے کے لیے میں مسلسل آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن معلوم ہوا کہ آپ کسی نجی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر ہیں۔ اطلاع چونکہ مہرین کے بارے میں تھی اس لیے میں نے آپ کی سخت ہدایات کے پیش نظر کسی اور کو کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔"

مسز رضوی کو اپنے دفتر کا نمبر دیتے ہوئے اس نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ اگر کبھی ماہ بانو کے سلسلے میں کوئی خاص گفتگو کرنی ہو تو وہ اس نمبر پر رابطہ کر سکتی ہیں لیکن اس کے سوا کسی دوسرے شخص سے ہرگز بھی رابطہ نہ کریں۔ اب ان کی کال اور لہجے میں موجود سنسنی اسے احساس دلا رہی تھی کہ کوئی بڑا واقعہ پیش آ گیا ہے۔

"آپ مجھے کیا اطلاع دینا چاہتی ہیں مسز رضوی! مہرین خیریت سے تو ہے؟" ماہ بانو کراچی میں مہرین کے فرضی نام سے مقیم تھی اس لیے اس نے وہی نام لے کر سوال کیا۔

"میں آپ کو اس کی خیریت کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی کیونکہ اب وہ میرے ہاسٹل میں موجود نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟ وہ ہاسٹل میں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟" شہر یار بُری طرح الجھا۔

"وہ کہاں ہے، میں یہ بھی نہیں بتا سکتی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ کچھ لوگ رات کے آخری پہر چوکیدار کو بے بس کر کے ہاسٹل میں داخل ہوئے اور مہرین کو اغوا کر کے لے گئے۔ انہوں نے یہ ساری کارروائی اتنی خاموشی سے کی کہ کسی کو خبر نہیں ہو سکی۔ صبح چوکیدار کو گیٹ سے غیر حاضر پا کر تلاش کیا گیا تو وہ ایک باتھ روم میں بے ہوشی کی حالت میں بندھا ہوا پایا گیا۔ اس واقعے کی اصل وجہ جاننے کے لیے ہم نے مزید جانچ پڑتال کی تو معلوم ہوا جس کمرے میں مہرین مقیم تھی، اس کا دروازہ باہر سے بند ہے۔ دروازہ کھولنے پر مہرین غائب پائی گئی جبکہ اس کی ساتھی لڑکی اس حالت میں ملی کہ اس کے ہاتھ پیر باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ اس لڑکی نے ہی ہمیں بتایا کہ رات کے آخری پہر کچھ نقاب پوش وہاں آئے تھے اور مہرین کو اٹھا کر لے گئے۔ مہرین کسی وجہ سے ٹینس ہونے کے باعث ٹرنکولائزر لے کر سوئی تھی اس لیے شور شرابا نہیں کر سکی۔ اس کی روم میٹ کو اغوا کنندگان نے اسلحے کے زور پر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا اور پھر بعد میں اسے باندھ کر چھوڑ گئے اس لیے وہ بے چاری بھی شور نہیں مچا سکی۔ اب بھی وہ کافی خوف زدہ ہے۔ اس کے والدین نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ پولیس میں رپورٹ لکھواتے وقت ان کی بیٹی کو اس واقعے سے الگ رکھا جائے اس لیے مجھے آسانی ہو گئی کہ میں یہ معاملہ پولیس کے نوٹس میں ہی نہ لے کر آؤں۔ آپ نے مجھ سے یہی کہا تھا نا کہ مہرین کے ساتھ کوئی بھی حادثہ پیش آنے کی صورت میں صرف اور صرف آپ کو آگاہ کیا جائے، کسی اور سے کچھ نہ کہا جائے۔ مجھے اس کام میں مشکل تو بہت پیش آئی لیکن میں نے آپ کی ہدایت کے خلاف کچھ نہیں کیا۔" مسز رضوی بے حد تفصیل سے گفتگو کرنے والی ایک باتونی عورت تھی جس کی فطرت میں لالچ کا عنصر بھی پایا جاتا تھا۔ شہر یار نے اچھی خاصی رقم کے عوض اس کا یہ تعاون حاصل کیا تھا اور اب اس کا اس قدر احسان جتانا ظاہر کر رہا تھا کہ وہ مزید کی بھی طالب ہے۔

"میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں مسز رضوی۔ میری طرف سے جلد ہی آپ کو چیک مل جائے گا۔" ماہ بانو کے اغوا کی خبر سن کر اس کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ اپنی اس کیفیت پر جیسے تیسے قابو پا کر اس نے مسز رضوی سے کرید کرید کر کئی سوالات کر ڈالے اور یہ جاننے کے بعد کہ ماہ بانو کے اغوا کا واقعہ اسی رات پیش آیا ہے، جب اس نے اسے فون کیا تھا تو دل میں ڈھیروں افسوس اتر آیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ماہ بانو نے اس سے اپنا دل گھبرانے کا ذکر کیا تھا لیکن اس نے اسے ڈانٹ کر ٹال دیا تھا۔ کاش، وہ اس کی بات سن لیتا۔ بات سن لینے سے ہونے والا واقعہ تو بے شک نہیں ٹلتا لیکن دل کو یہ افسوس تو نہ ہوتا کہ اس نے اسے اتنی اپنایت سے پکارا تھا اور جواباً وہ بے حد اجنبیت سے پیش آیا تھا لیکن اب کاش کہنے سے حاصل بھی کیا تھا۔ اس کی زندگی میں تو ویسے ہی آج کل بہت سے کاش جمع ہو گئے تھے۔ وہ تو یہ بھی سوچتا تھا کہ کاش اس روز لیاقت رانا کی گاڑی پر فائرنگ کا واقعہ پیش نہیں آیا ہوتا۔ کاش اس نے ماریا کو اپنا ہم سفر نہ بنایا ہوتا۔ کاش اس کے قدم نہ بہکے ہوتے لیکن سوچنے سے کچھ بدلتا تو نہیں کرتا۔ جو کچھ پیش آنا تھا، وہ پیش آ چکا تھا۔ حالات نے کچھ اس طرح سے کروٹ لی تھی کہ وہ زندگی کے ان چاہے مراحل سے گزرنے پر مجبور تھا۔ یہ زندگی تھی جو اسے ایسے مقام پر لے آئی تھی کہ وہ ایک ان چاہی لڑکی کو اپنانے پر مجبور ہو گیا تھا اور وہ لڑکی جو دل پر دستک دیتی تھی، نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔

☆☆☆

"سنا تھا تُو ہمیں یاد کر رہی ہے۔ بشیرن نے تیرا پیغام ہمیں پہنچایا تو ہم پہلی فرصت میں تیرے پاس چلے آئے، ورنہ آج تو ہمارا کچھ اور ہی پروگرام تھا۔ ایک بہت اڑیل گھوڑی کو لگام ڈالنی تھی لیکن تیرے بلاوے کو بھی تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تُو بھی کسی سے کم تو نہیں ہے۔ خیر ہے بھی چودھری بختیار کی سگی بہن۔ چودھری بختیار... نور پور کا یہ چودھری، جو بس نام کا ہی چودھری ہے۔ لنگڑے کے پلے کچھ نہیں ہے۔ کبھی کوشش کرتا تھا ہمارے منہ لگنے کی لیکن اب اس میں اتنا بھی دم خم نہیں ہے کہ اپنی بہن سے ہماری مرضی کے خلاف مل بھی سکے۔" ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر کرسی پر بیٹھا چودھری افتخار اپنے سامنے بیٹھی فریدہ سے تمسخرانہ انداز میں مخاطب تھا۔

اس کے الفاظ اور انداز گفتگو دونوں ہی ایسے تھے کہ فریدہ توہین سے سلگ اٹھے لیکن خلاف توقع فریدہ نے اس کی باتوں پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور بالکل سپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھی رہی۔ اس کے اس انداز پر چودھری نے کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے گرد ایک بڑی سی چادر لپیٹے بالکل پُر سکون بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کا انداز اس سمندر کا سا تھا جو اپنے اندر بہت سے طوفان چھپائے ہوئے ہو اور اچانک ہی بستیوں کو غرق کر دینے کا ارادہ رکھتا ہو۔ چودھری سوچ میں پڑ گیا کہ آخر ایسی کون سی بات ہے جو فریدہ نے یہ انداز اختیار کر لیا ہے۔ اس کا خود چودھری کو پیغام بھیج کر بلوانا یوں بھی خاصا معنی خیز تھا۔ دور دور تک سوچ کے گھوڑے دوڑانے کے باوجود وہ فریدہ کے رویے کے پیچھے چھپی وجہ تک نہیں پہنچ سکا تو ایک بار پھر اس کا غور سے جائزہ لیا۔ اس جائزے کے دوران میں اس کی نظریں فریدہ کی نظروں سے چار ہو گئیں تو اس نے وہاں ایک طرح کی بے خوفی اور باغیانہ پن دیکھا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ یہ وہی فریدہ ہے جو اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ کر پیر سرکار کے مزار پر پناہ لینے آئی تھی اور پھر اس عاشق کی جو کہ دراصل اس کے بھائی چودھری بختیار کا دشمن تھا، سازش کا شکار ہو کر چودھری کے پنجوں میں پھنس گئی۔

چودھری کی اس کے بھائی سے پرانی دشمنی تھی۔ چودھری بختیار نے ایک بار اس سے بغاوت کی کوشش کی تھی اور حسب روایت سالانہ عرس کے موقع پر مزار پر چڑھائی جانے والی سونے چاندی کے تاروں سے مزین چادر چڑھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس انکار کا چودھری وقتاً فوقتاً کئی بار بدلہ لے چکا تھا لیکن پھر بھی اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی اور پھر اس نے فریدہ کے عاشق قربان کی مدد سے چودھری بختیار کو ایسی زک پہنچائی کہ وہ بے چارہ ہل کر رہ گیا۔ فریدہ نے بھی عزت کا جوہر گنوانے کے بعد بھائی کے در پر واپس جانا گوارا نہیں کیا اور چودھری کے ذہنی معذور بیٹے بہزاد شاہ سے دکھاوے کی شادی کو قبول کر لیا۔ مکروہ کردار کے مالک چودھری نے اپنے ذہنی معذور بیٹے کی منکوحہ کو اپنی داشتہ بنا چھوڑا۔ وہ یہ گھناؤنا فعل کئی ماہ سے بڑی کامیابی سے کھیل رہا تھا اور اب تک کسی کو اس پر شک نہیں ہوا تھا۔ یہاں تک کہ فریدہ نے بھی کسی کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہیں کی تھی... لیکن اب جانے اس ہاری ہوئی بزدل لڑکی میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ وہ بنا پلکیں جھپکائے چودھری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی تھی۔

"کیا گل کرنی ہے تجھے میرے ساتھ؟" چودھری نے سرسراتے ہوئے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"ایک خوش خبری سنانی ہے۔" فریدہ نے اب بھی پلکیں جھپکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

"کیسی خوش خبری؟ کیا تیرا عاشق فیر سے تجھے مل گیا ہے۔ پر وہ تو خود ڈھائی لاکھ میں میرے ساتھ تیرا سودا کر کے گیا تھا۔ وہ واپس پلٹا بھی تو تجھے کسی اور کے ہاتھ بیچ ڈالے گا۔" چودھری نے ایک بار پھر اس کا تمسخر اڑایا۔

فریدہ نے اس کی ساری باتیں ان سنی کر دیں اور نہایت دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پُر سکون لہجے میں بولی۔

"میں ماں بننے والی ہوں۔"

"کیا بکواس کرتی ہے؟" فریدہ نے جس سکون سے اطلاع دی تھی چودھری کو اتنی ہی زور کا کرنٹ لگا۔

"بکواس تو یا کچھ اور لیکن سچ یہی ہے۔" فریدہ کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

سکون میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس بار چودھری نے باانداز دیگر اس کا جائزہ لیا تو اسے احساس ہوا کہ فریدہ پہلے کے مقابلے میں کافی صحت مند ہوگئی ہے اور اس کے سراپا میں ایسی تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں جنہیں چھپانے کے لیے اس نے خود کو چادر میں ملفوف کر رکھا ہے۔ وہ چند لمحوں تک فریدہ کو شعلہ بار نگاہوں سے گھورتا رہا پھر خود کو پُرسکون ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

"اس بچے کو مٹایا بھی جاسکتا ہے۔"

"بہت وقت گزر چکا۔ اب یہ ممکن نہیں ہے۔" فریدہ جانتی تھی کہ وہ ایسی ہی کوئی بات کہے گا اس لیے ترت جواب دیا۔

"اگر یہ ممکن نہیں ہے تو تجھے تو دنیا سے گزارنا ممکن ہے۔ تیرے ساتھ یہ مصیبت بھی ختم ہو جائے گی۔"

سکون کے پردے میں چھپا چودھری کا اشتعال ایک بار پھر ظاہر ہونے لگا۔ وہ خوب اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ فریدہ نے اسے یہ اطلاع اتنی دیر سے دی ہی اس لیے ہے کہ کچھ کرنا ممکن نہ ہو۔ خود اسے کافی عرصے سے اس کے پاس آنے کی فرصت نہیں ملی تھی اس لیے کچھ اندازہ نہیں ہوسکا تھا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم جیسا کمینہ آدمی ایسی ہی کوئی گل کرے گا اس لیے میں نے پہلے ہی سارا بندوبست کرلیا ہے۔ اگر مجھے کچھ ہوا تو تمہاری جان مصیبت میں آجائے گی۔ میں نے اپنے کچھ ہمدردوں کو وصیت کردی ہے کہ اگر میں مری تو اس کا ذمے دار چودھری افتخار عالم شاہ ہوگا۔ وہ لوگ میری لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے سے پہلے تمہیں مجھے دفن بھی نہیں کرنے دیں گے۔۔۔ اور پوسٹ مارٹم سے تو وہ گل کھل کر سامنے آجائے گی جسے تم چھپانا چاہتے ہو۔" فریدہ کے اندازِ گفتگو سے واضح تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، وہ نِری حقیقت ہے ورنہ گاؤں کی ایک نیم خواندہ لڑکی کو بھلا کیا معلوم تھا کہ پوسٹ مارٹم کیا بلا ہے۔۔۔ اور حقیقت یہ تھی کہ اسے ڈاکٹر ماریا نے یہ ساری ٹپس دی تھیں جن کو وہ اس وقت بڑی مہارت سے استعمال کر رہی تھی۔

"بکواس نہ کر۔ تجھ میں اتنا دم نہیں کہ حویلی سے باہر کوئی خبر بھیج سکے۔" چودھری نے حقیقت سے نظریں چرانے کی کوشش کی۔

"تمہاری حویلی کی دیواریں اتنی اونچی نہیں ہیں چودھری۔۔۔ یہ گل اب تو تمہیں سمجھ لینی چاہیے۔ جن دیواروں کو پھلانگ کر تمہاری جوان دھی بھاگ گئی، ان دیواروں سے کسی خبر کا نکل جانا کون سا مشکل ہے۔" چودھری کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر فریدہ نے تمسخرانہ لہجے میں جواب دیا۔ اس کے انداز سے یہ لگتا تھا کہ جیسے وہ چودھری پر جوابی حملے کر رہی ہو اور درحقیقت اس کا یہ جملہ اتنا زوردار تھا کہ چودھری اپنی جگہ پر ٹک کر بیٹھا نہ رہ سکا اور غراتا ہوا فریدہ کی طرف لپکا۔

"کتیا بھونکتی ہے۔" اس نے فریدہ کا گلا پکڑ لیا جواباً فریدہ نے اس کے سینے پر دونوں ہاتھ جما کر اسے زور سے پیچھے دھکیلا۔ چودھری کو اس ردعمل کی امید نہیں تھی اس لیے وہ لڑکھڑا گیا اور اس کے ہاتھوں کی گرفت سے فریدہ کی گردن آزاد ہوگئی۔

"اگر میں نے بھونکنا شروع کر دیا تو میری آواز بہت دور دور تک جائے گی اور دنیا تمہارے منہ پر تھوکے گی کہ تم نے اپنے پاگل بیٹے کی بیوی کو اپنی رکھیل بنا رکھا ہے۔" وہ گویا آج ہر خوف سے آزاد تھی اور جو منہ میں آرہا تھا، وہ بولے جارہی تھی۔ اس کی اس بے خوفی نے چودھری کو سوچ میں ڈال دیا۔ کوئی کمزور عورت یونہی تو مضبوط نہیں ہو جاتی۔ یقیناً فریدہ کو کوئی ایسا آسرا مل گیا تھا جس کے بل بوتے پر وہ اتنا بڑھ چڑھ کر بول رہی تھی۔

"تو اس بچے کو دنیا کے سامنے کس طرح لائے گی؟ کیا کہے گی کہ یہ کس کی اولاد ہے؟" وہ ذرا ٹھنڈا ہو کر پیچھے ہٹ گیا اور اس سے سوال کیا۔

"دنیا اسے اسی کی اولاد کہے گی جس کی اس کی ماں بیوی کہلاتی ہے۔ اس بچے کو بہزاد شاہ کا نام ملے گا اور اگر تم نے مان لیا تو پھر کون ہوگا جو اسے بہزاد شاہ کی اولاد ماننے سے انکار کرسکے۔ جب بہزاد شاہ کا ویاہ ہو سکتا ہے تو پھر اولاد بھی ہو سکتی ہے۔" فریدہ پہلے سے ہی سب کچھ طے کرکے بیٹھی تھی۔

"چل جیسی تیری مرضی۔ میں تیری خوشی میں خوش ہوں۔" اپنی دال نہ گلتی دیکھ کر چودھری نے فی الحال ہتھیار ڈال دینا ہی مناسب سمجھا۔

☆☆☆
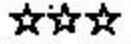
"چل کڑیے چھیتی کر، اٹھ نکل یہاں سے۔ تیری نجات کا رستہ کھل گیا ہے۔" ماہ بانو کو ذرا سی اونگھ آئی تھی کہ کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر زور سے ہلایا اور یہ الفاظ کہے۔ ماہ بانو ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے سامنے وہ ملازمہ کھڑی تھی جو روزانہ اسے تینوں وقت کا کھانا اور دیگر ضرورت کی اشیا فراہم کرنے کی ذمے دار تھی۔ یقیناً وہ چودھری کی قابلِ اعتماد ملازمہ ہی رہی ہوگی جو اس نے اسے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اتنی اہم ذمے داری سونپی تھی۔ لیکن ابھی اس نے غنودگی میں ملازمہ کے جو الفاظ سنے تھے، ان سے تو یہی گمان ہو رہا تھا کہ وہ چودھری سے نمک حرامی کی مرتکب ہو رہی ہے۔ یہ ایک غیر یقینی سی بات لگتی تھی چنانچہ اس نے سوچا کہ اس نے جو کچھ سنا، وہ نیند کے غلبے میں محسوس کی جانے والی ایک خوش فہمی تھی۔ یہاں آنے کے بعد وہ سو بھی تو بہت کم رہی تھی۔ چودھری کے کسی بُری نیت سے آنے کا دھڑکا اسے ڈھنگ سے سونے نہیں دیتا تھا۔ آج رات بھی اس نے جاگتے رہنے کا ہی فیصلہ کیا تھا چنانچہ بستر پر لیٹنے کے بجائے وہ ایک کرسی پر جا بیٹھی لیکن نیند کی شدت اس کے ارادے پر اس طرح غالب ہوئی کہ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی اونگھ گئی اور اب ملازمہ کے اٹھانے پر جاگی تو ہڑبڑاہٹ میں کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہی ہو گئی۔

"نی کُڑیے، اپنے ٹکر ٹکر شکل نہ دیکھ۔ جلدی کر۔ اگر تُو نے دیر لگائی تو کوئی گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔" اس کی گم صم کیفیت دیکھ کر ملازمہ نے اسے ٹوکا۔

"تم کیا کہہ رہی ہو، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔"

"میں تجھے یہاں سے نکال رہی ہوں۔ تجھے اس قید سے نجات مل رہی ہے۔" ملازمہ نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"مگر کیوں اور کس کے کہنے پر؟" ماہ بانو کا دل اس خوش خبری کو سن کر بُری طرح دھڑکنے لگا۔ زندگی میں جب بھی کوئی آسانی پیدا ہوتی نظر آتی تھی، دھیان سیدھا شہریار کی طرف جاتا تھا۔ اب بھی آزادی کا مژدہ سنا تو یہی لگا کہ شہریار کو اس کے ہاسٹل سے غائب ہونے کی اطلاع ملی ہوگی تو اس نے اپنے ذرائع سے معلوم کر لیا ہوگا کہ اس کام کے پیچھے چودھری کا ہاتھ ہے اور پھر اس نے کسی طرح یہ بندوبست کر ڈالا ہوگا کہ چودھری کی حویلی کی اونچی دیواروں میں نقب لگا کر ماہ بانو کو وہاں سے نکالا جا سکے۔

"میں ان سب سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔ تُو یہاں سے نکل کر باہر پہنچے گی تو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ کس نے یہ سارا بندوبست کیا ہے۔" ملازمہ نے اسے جواب دیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی۔ "بس اب نکلنے کی کر۔ کسی ہور نوکر کی آنکھ کھل گئی تو مشکل پڑ جائے گی۔"

اس بار ماہ بانو نے دیر نہیں لگائی اور شانوں پر پڑا دوپٹا اپنے گرد لپیٹتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑی۔ مہمان خانے کے بیشتر کمرے تاریک پڑے ہوئے تھے۔ بس وہ دونوں جہاں سے گزر رہی تھیں، اس راستے پر مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی پھر دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ماہ بانو ملازمہ کے ساتھ چلتی رہی۔

"یہاں سے آگے تجھے میرا گھر والا لے جائے گا۔" ایک دروازے کے قریب پہنچ کر ملازمہ نے اسے سرگوشی میں بتایا پھر بے حد احتیاط سے کنڈی کھول کر دروازے کا ایک پٹ بے آواز کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ماہ بانو کے چہرے سے ٹکرایا اور خود بخود ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ یہ ہوا کا جھونکا اسے اپنی آزادی کا پیامبر محسوس ہوا تھا۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ ماسی!" دروازے سے باہر قدم رکھنے سے پہلے اس نے ادھیڑ عمر ملازمہ کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے دھیمی آواز میں اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر باہر نکل گئی۔ باہر کھلا آسمان اس کا منتظر تھا۔ آسمان پر چمکتے ستارے رات کی تاریکی کو مٹانے میں ناکام ثابت ہونے کے باوجود بہت دل فریب لگ رہے تھے۔ صرف ایک نظر آسمان پر ڈالنے کے بعد ماہ بانو اس آدمی کی طرف متوجہ ہوئی جو اپنے منہ کو ایک بڑے رومال سے ڈھانپے اس کا منتظر کھڑا تھا۔

"دبے قدموں میرے ساتھ چلی آؤ۔" اپنی ساکت کیفیت سے حرکت میں آتے ہوئے اس آدمی نے اس سے کہا تو وہ اس کے پیچھے چل پڑی۔

"چہرہ چادر میں چھپا لے۔" چلتے چلتے اس نے اسے دوسری ہدایت دی جس پر ماہ بانو نے فوراً عمل کیا۔ وہ گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد اس بات کا اندازہ لگا چکی تھی کہ یہ مہمان خانے کا پچھلا حصہ ہے۔ اس طرف روشنی کا کوئی خاص انتظام نہیں کیا گیا تھا اور چند ایک ہی بلب روشن تھے اس لیے ماحول نیم تاریک سا تھا۔ اس نیم تاریکی میں چلتے ہوئے وہ دونوں تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ اچانک کسی طرف سے ایک شخص نکل آیا۔

"کہاں جا رہے ہو مجّو؟ تیرے ساتھ یہ زنانی کون ہے؟" اس شخص نے دوپٹے کو ڈھاٹے کی طرح چہرے پر پھیلا کر لی ہوئی ماہ بانو پر ایک نظر ڈال کر اسے ساتھ لے جانے والے ملازم سے پوچھا۔

"میری دھی ہے بھرا۔ ذرا اسے پچھواڑے تک چھوڑنے جا رہا ہوں۔ اسے ادھر زبیدہ کی کھولی میں جانا ہے۔" مجّو کے نام سے پکارے جانے والے ملازم نے اسے جواب دیا تو وہ مطمئن ہو کر وہاں سے چلا گیا۔

"زبیدہ میری سالی کا نام ہے۔ وہ ادھر حویلی کے پچھواڑے ملازموں کے لیے بنی کھولی میں رہتی ہے۔" وہ شخص چلا گیا تو مجّو نے سکون کا سانس لیتے ہوئے اسے بتایا۔ خود ماہ بانو کی بھی گویا اٹکی ہوئی سانس بحال ہوئی تھی۔ مجّو کے ساتھ چل کر پچھلی طرف جاتے ہوئے اسے بھی وہ کھولیاں نظر آ گئیں جو حویلی کے مستقل ملازموں کے استعمال میں تھیں۔ ان کھولیوں کو سرونٹ کوارٹرز کی جگہ تعمیر ضرور کیا گیا تھا لیکن ان کی باہر ہی سے مخدوش نظر آنے والی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں رہنے والے کس حالت میں زندگی گزارتے ہوں گے۔ مجّو اسے ان کھولیوں سے کنی کترا کر آگے لے گیا۔ قریب سے گزرنے میں احتمال تھا کہ کہیں کسی اور ملازم سے سامنا نہ ہو جائے۔ مجّو کی معیت میں بالآخر وہ ایک ایسے دروازے تک پہنچ گئی جس پر ایک بڑا سا قفل پڑا ہوا تھا۔ مجّو نے اپنی بوسیدہ سی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چابی باہر نکالی اور قفل کھول دیا۔

"یہاں سے نکل کر سیدھی چلتی جا۔ تیرے ہمدرد خود تجھ سے آن ملیں گے۔" قفل کھولنے کے بعد مجّو نے اسے سرگوشی میں بتایا تو وہ تیزی سے دروازہ پار کر گئی۔ یہ وہی دروازہ تھا جس سے گزر کر اس سے قبل کئی بار کشور بھی آفتاب سے ملنے جا چکی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کشور کے لیے اس کی جاں نثار ملازمہ پانی بڑی تگ و دو کے بعد یہ دروازہ کھولنے کا انتظام کرتی تھی جبکہ مجّو کو خود وڈی چودھرائن نے اس دروازے کے تالے کی چابی فراہم کی تھی۔

اپنے گرد بُنے جانے والے سازش کے ایک اور جال سے بے خبر ماہ بانو اس پرندے کی طرح جو دانہ دیکھ کر زمین کی طرف لپکتا ہے اور پھر جال میں پھنس جاتا ہے، مجّو کی ہدایت کے مطابق سیدھی چلتی چلی گئی۔ کچے اور تاریک راستے پر چلتے ہوئے اسے مشکل سے دو تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ آنے والے دوست تھے یا دشمن، اسے خبر نہیں تھی چنانچہ دوپٹے کو چہرے کے گرد کچھ اور بھی مضبوطی سے لپیٹ کر خود کو آنے والی صورتِ حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کرنے لگی۔ گھڑسوار اگر اس کے نجات دہندہ نہیں تھے تو انہیں کیسے ٹالنا ہوگا، وہ تیزی سے اس بارے میں سوچ رہی تھی لیکن ایسی کوئی نوبت ہی نہیں آئی اور تاریکی میں ظاہر ہونے والے گھڑسواروں نے اس کے قریب پہنچتے ہی اپنے گھوڑوں کی باگیں کھینچ لیں۔

"آ جاؤ ماہ بانو۔" ایک گھڑسوار نے آہستہ سے اسے پکارا اور سہارا دینے کے لیے جھک کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

اس شخص کے آہستہ بولنے کے باوجود ماہ بانو نے اس کے لہجے کے کھردرے پن کو بہ خوبی محسوس کیا لیکن دل میں کوئی بھی وہم لائے بغیر اس کے ہاتھ کا سہارا لے کر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اسے سہارا دینے والا ہاتھ لہجے سے بھی زیادہ کھردرا تھا لیکن ماہ بانو کے لیے صرف اس لیے قابلِ بھروسا تھا کہ وہ اسے چودھری کے پنجے سے چھڑا کر لے جا رہا تھا۔

"مجھے مضبوطی سے پکڑ لو ورنہ تم گھوڑے سے گر بھی سکتی ہو۔" اس کے سوار ہو جانے کے بعد گھڑسوار نے اسے ہدایت دی جس پر اس نے فوراً ہی عمل کر ڈالا۔ اس لمحے اس کا ہاتھ گھڑسوار کے شانے سے لٹکتی رائفل سے ٹکرایا لیکن پھر بھی اس کے اندر کوئی کھٹک نہ جاگ سکی اور اس نے یہی سوچا کہ اسے لینے کے لیے آنے والے لوگوں کا مسلح ہونا ایک لازمی امر ہے۔ اس کی غلط فہمیوں پر ماتم کناں ہوا تیز آواز سے سرسراتی رہی۔ ہوا کی طوفانی رفتار سے انجان ماہ بانو اجنبیوں کو اپنا ہمدرد جان کر انجانی راہوں پر آگے بڑھتی رہی۔

☆☆☆

"اٹھ جائیں بھئی، کب تک سوتے رہیں گے۔ آج جمعہ بھی ہے۔ ناشتا کرنے اور نہا کر تیار ہونے میں ہی نماز کا ٹائم ہو جائے گا۔ دیر ہو گئی تو پھر آپ خود ہی افسوس کریں گے کہ جماعت نکل گئی۔" یہ کوئی تیسری بار تھا جو کشور نے آفتاب کو نیند سے جگانے کی کوشش کی تھی اسی لیے اس کے لہجے میں تھوڑی سی جھنجلاہٹ بھی اتر آئی تھی۔

"اتنے غصے سے اٹھائیں گی تو میں بالکل بھی نہیں جاگوں گا۔ مجھے آپ کی ہنستی مسکراتی صورت سے پیار ہے۔ آنکھ کھولتے ہی غصے والی شکل دیکھوں گا تو پورا دن خراب گزرے گا۔" آفتاب نے آنکھیں موندے موندے جواب دیا تو کشور اس بات پر مطمئن ہو کر کہ وہ جاگ چکا ہے، وہاں سے جانے لگی۔ آج اس کے گھر کا کام کاج نمٹانے والی ملازمہ نہیں آئی تھی اس لیے وہ خاصی مصروف تھی۔

"ایسی کیا بے رخی سرکار کہ شکوے کا جواب دینا بھی گوارا نہیں۔" آفتاب نے اس کا آنچل تھام کر اس کے جانے کی راہ مسدود کی اور آنچل اپنے چہرے پر پھیلا لیا۔

"آپ ستا بھی تو بہت رہے ہیں۔ بالکل ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی چھوٹے بچے کو صبح صبح اسکول جانے کے لیے نیند سے جگا رہی ہوں۔" راہِ فرار نہ پا کر کشور اس کے قریب ہی بستر پر بیٹھ گئی اور جوابی شکوہ کیا۔

"میں آپ کو پریکٹس کروا رہا ہوں تا کہ ہمارا سونو مونو سا بچہ جب اسکول جاتے ہوئے آپ کو ستائے تو آپ کو اسے

WWW.PAKSOCIETY.COM

جنذلی کرنے میں پریشانی نہ ہو۔" وہ اس کے آنچل کی نرماہٹیں اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے بنا آنکھیں کھولے بولا۔

"پہلے اسے دنیا میں تو آنے دیں۔ آپ تو ڈائریکٹ اس کے اسکول جانے کے بارے میں ہی سوچنے لگے۔" بچے کا ذکر سن کر کشور کے ہونٹوں پر بھی دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی ورنہ وہ آج صبح سے بڑی ٹینشن میں مبتلا تھی۔

"صرف اسکول جانے کا کیا ذکر... میں تو ابھی سے اپنے ذہن میں ان مہمانوں کی لسٹ بھی تیار کرنے لگا ہوں جنہیں اس کی شادی میں انوائٹ کیا جائے گا۔" کہنیوں پر زور دے کر اٹھتے ہوئے اس نے بڑے مزے سے بتایا۔

"آپ تو بڑے دیوانے ہیں۔" اس کی بات سن کر کشور ہنس دی۔

"چھوٹے دیوانے ہوتے تو آج یہاں نہ ہوتے۔ کسی سے عشق کرنے کے لیے بڑے دیوانے پن کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔" آفتاب نے ترت جواب دیا۔

"مگر میں نے تو آپ کو بڑا ہوش مند آدمی جان کر آپ سے شادی کی تھی۔ میرے ساتھ تو یہ سراسر دھوکا ہو گیا نا؟" کشور کو شرارت سوجھی۔

"دھوکا کھایا ہے تو اب اس کا نتیجہ بھی بھگتیں۔ یہ دیوانہ تو اب آپ کو ساری عمر ستاتا رہے گا۔" اس کی شرارت کے جواب میں آفتاب نے یک دم ہی اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور پے در پے چومتا ہی چلا گیا۔

"بس کر دیں۔ غلطی ہو گئی جو آپ کو دیوانہ کہہ دیا۔ میری توبہ جو آئندہ ایسی کوئی بات زبان سے نکالی۔" بے ساختہ امنڈ آنے والی ہنسی کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے آفتاب کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"بس اتنا ہی حوصلہ تھا؟ اتنی جلدی ہار بھی مان لی۔" آفتاب نے اسے چومنا تو بند کر دیا لیکن اپنی بانہوں کے حصار سے آزاد نہیں کیا۔

"اس وقت میرے حوصلے کی آزمائش سے زیادہ آپ کو گھڑی کی سوئیوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ذرا غور سے گھڑی دیکھیں۔ تھوڑا ہی وقت رہ گیا ہے نمازِ جمعہ کے لیے۔ رات بھر جاگ کر کام کرنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ دن سو کر گزار دیں۔ چلیں شاباش اٹھیں۔ اچھے بچوں کی طرح اٹھ کر نہائیں اور فریش ہو کر ناشتا کریں۔ آج میں آپ کو اپنے ہاتھ سے تیار کیا ہوا ناشتا کھلاؤں گی۔" کشور نے اسے کسی چھوٹے بچے ہی کی طرح پچکارا۔

آج کل آفتاب پر اپنا ناول جلد از جلد مکمل کرنے کی دھن سوار تھی چنانچہ جب بھی وہ موڈ میں ہوتا تھا، لکھنے کے لیے طویل نشست سنبھال لیتا تھا۔ گزشتہ رات بھی اس نے لکھنے میں گزاری تھی اس لیے اب دن چڑھے تک پڑا سو رہا تھا لیکن سونے سے قبل اس نے کشور کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ اسے نمازِ جمعہ کے لیے جگا دیا جائے۔ وہ پنج وقتہ نمازی تو نہیں تھا لیکن جمعے کی نماز کے لیے خصوصی اہتمام ضرور کرتا تھا۔

"آپ کے ہاتھ سے تیار کردہ ناشتا تناول کرنا میری خوش قسمتی سہی لیکن فی الحال میں نے آپ کو کسی بھی کام کے لیے منع کر رکھا ہے۔ آپ کو گھریلو کام کاج کرنے کی عادت نہیں ہے۔ خدانخواستہ کوئی حادثہ ہو گیا تو کیا کریں گی۔ بہتر ہے کہ ابھی آپ خود کو زحمت میں نہ ڈالیں۔ فارغ ہو جائیں تو پھر آرام سے اپنے شوق پورے کرتی رہیے گا۔ میں خود فرمائش کر کے آپ سے اپنی پسند کے کھانے بنوایا کروں گا۔" کشور کے ناشتا تیار کرنے کا سن کر آفتاب اسے سمجھانے لگا۔

"مجھے آپ کی ساری ہدایات اچھی طرح یاد ہیں لیکن آج مجبوری ہے۔ کام والی عورت کے خاندان میں ایک افسوس ناک حادثہ پیش آ گیا ہے اس لیے وہ کام پر نہیں آ سکی۔ اس نے صبح سویرے ہی ایک عورت کے ذریعے پیغام بھجوا دیا تھا۔" کشور نے افسردگی سے جواب دیا۔

"خیریت، کیسا حادثہ پیش آ گیا اس کے خاندان میں؟" آفتاب نے اس کی افسردگی کو دیکھتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

"اس کے بھانجے کو کل دوپہر کسی نے اغوا کر لیا تھا۔ گھر والے دن بھر بچے کو ادھر اُدھر ڈھونڈتے رہے لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ صبح گاؤں کی ایک عورت کنوئیں پر پانی بھرنے گئی تو اسے وہاں بچے کی لاش نظر آئی۔ اس عورت نے بچے کے گھر اطلاع دی۔ ان لوگوں نے جا کر لاش دیکھی تو اندازہ ہوا کہ معصوم بچے کو نہایت بربریت کے ساتھ زیادتی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔" کشور نے اپنے علم میں موجود معلومات اسے فراہم کیں۔

"ویری سیڈ، یہ تو واقعی بہت افسوس ناک حادثہ ہے۔ میں بچے کے باپ سے افسوس کرنے اس کے گھر جاؤں گا۔" ساری تفصیل سن کر آفتاب کو بھی بہت دکھ ہوا۔ اس قسم کے حادثات اکثر و بیشتر سننے میں آنے لگے تھے لیکن سن کر ہر بار نئے سرے سے دکھ ہوتا تھا کہ یہ قومِ لوط کی باقیات ہمارے زمانے میں کہاں سے آ گئیں؟

"افسوس کے سوا اب اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال، آپ اٹھ کر نہانے جائیں، میں اس دوران آپ کا ناشتا تیار کر دیتی ہوں۔" کشور اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

"کسی بکھیڑے میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک پیالی چائے بنا دیں۔ میں اس وقت ناشتا کرنے کے بجائے اب نماز کے بعد دوپہر کا کھانا ہی کھاؤں گا۔ اس کے لیے بھی آپ خود کو زحمت میں مت ڈالیے گا۔ میں دیکھوں گا کہ باہر سے کوئی کھانے کی چیز مل جائے ورنہ پھر فروٹس اور بسکٹس وغیرہ پر گزارہ کر لیں گے۔" آفتاب کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ اسے کشور کا کس درجے تک خیال ہے۔

"کھانے کی فکر نہ کریں، میں قیمہ پکا چکی ہوں۔ صرف روٹیاں رہتی ہیں، وہ آپ تندور سے لے آئیے گا۔ اسلام آباد والی خالہ کے ساتھ رہ کر میں نے جو تھوڑا بہت ان سے سیکھا تھا، آج اس کی آزمائش ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو میرے ہاتھ کا بنا قیمہ ضرور پسند آئے گا۔" اسے جواب دیتے ہوئے کشور نے خالہ کا ذکر کیا تو دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھی۔ خالہ مہربان خاتون تھیں جن سے کشور نے خانہ داری کے چند اہم امور بھی سیکھ لیے تھے لیکن پھر انہیں عجلت میں ان کا گھر چھوڑ کر وہاں سے نکلنا پڑا۔ پھر اسلام آباد میں ہی انہوں نے ایک قیام گاہ تلاش کی مگر پھر اس قیام گاہ کو بھی چھوڑ کر اس نواحی گاؤں میں اٹھ آئے تھے۔ یہاں زندگی کی سہولیات اگرچہ کم تھیں لیکن وہ لوگ زندگی میں تھوڑا سا ٹھہراؤ اور سکون محسوس کر رہے تھے۔ آج جو اچانک ہی خالہ کا ذکر چھڑا تو جہاں زندگی کے بہت سے مصائب یاد آئے، وہیں مہربان خالہ کی یاد نے دل کو دکھی کر دیا۔

"خالہ کتنی اچھی خاتون تھیں نا۔ بے چاری ہماری وجہ سے ماری گئیں۔" اس نے آفتاب کے سامنے دل میں آئے خیال کا اظہار کیا۔

"اب آپ اس بات پر خود کو دکھی مت کریں۔ خالہ کا احسان میں بھی مانتا ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جس کا وقت جب اور جیسے لکھا ہے، وہ اسی طرح اس دنیا سے جائے گا۔" آفتاب نے اسے سمجھاتے ہوئے پیار سے اس کا رخسار تھپتھپایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ کشور نے بھی خود کو سنبھالتے ہوئے اس کیفیت سے باہر نکلنے کی کوشش کی اور باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ آفتاب کے نہا کر نکلنے تک وہ اس کے لیے چائے تیار کر کے نکال چکی تھی۔ آفتاب نے جلدی سے چائے پی اور عجلت میں مسجد کی طرف چلا گیا۔

گاؤں کی واحد مسجد میں آج معمول سے زیادہ رش تھا۔ جمعے کے دن یوں بھی نمازیوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی لیکن آج مقتول بچے کی نمازِ جنازہ کی وجہ سے بھی کافی زیادہ لوگ آئے تھے۔ آفتاب نے بچے کے جواں سال باپ کو غم سے نڈھال دیکھا تو خود بھی افسردہ ہو گیا۔ جس بچے کو اس نے کسی ننھے سے پودے کی طرح سینچ کر اس لائق کیا تھا کہ وہ تنہا اسکول اور مدرسے جانے لگا تھا اور چھوٹے موٹے کاموں میں باپ کا ہاتھ بٹا دیا کرتا تھا، وہ کسی ظالم کے ظلم کا شکار ہو کر جڑ سے اکھڑ گیا تھا تو اس باپ کی صدمے سے بُری حالت ہی ہونی تھی۔ آفتاب طبعاً ایک حساس آدمی تھا جس کا دل ہر ظلم و زیادتی کو دیکھ کر کڑھتا تھا اور اب جبکہ وہ خود باپ بننے جا رہا تھا تو اس نے اس غم زدہ باپ کے دکھ کو کچھ زیادہ ہی محسوس کیا تھا۔ اس روتے بلکتے شخص کو تھوڑی دیر گلے لگا کر تسلی کے چند الفاظ کہنے کے بعد وہ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس وقت کسی کی تسلی اور دلاسا اس شخص کے غم کو کم نہیں کر سکتی۔ چند لمحے وہاں کھڑے رہنے کے بعد وہ مسجد کے اندر چلا گیا۔ باقی لوگ بھی اب یہی کر رہے تھے۔ جمعے کا خطبہ شروع ہو چکا تھا جسے وہ دھیان سے سنتا رہا۔

"آج امام صاحب واپس آ گئے ہیں اور جمعے کی نماز کے علاوہ خیرو کے پتر کا جنازہ بھی وہی پڑھائیں گے۔" اس کے برابر میں بیٹھے شخص نے نہ جانے کس سے یہ الفاظ کہے جو اس کی سماعتوں تک بھی پہنچ گئے۔ وہ جواب تک سر جھکائے بیٹھا تھا، اس اطلاع کو سن کر تجسس سے خطبہ دینے والے شخص کو دیکھنے لگا۔ اسے گاؤں والوں کی زبانی ہی معلوم ہوا تھا کہ امام مسجد کچھ عرصے کی رخصت پر گئے ہوئے ہیں اور ان کی عدم موجودگی میں گاؤں کا ایک شخص جو دوسروں کی نسبت دین کی زیادہ سوجھ بوجھ رکھتا ہے، یہ فرض انجام دے رہا ہے۔ وہ زیادہ سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی حقیقتاً چند سورتوں کا حافظ تھا جو جماعت کروا دینے کے علاوہ دیگر دینی امور کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا تھا۔ آفتاب اس سے قبل جب نماز پڑھنے یہاں آیا تھا تو اس شخص سے ملاقات کی تھی اور چند باتوں سے ہی اس کی علمی استعداد کا اندازہ لگا لیا تھا البتہ اس شخص نے امام مسجد کی علمی بساط اور اخلاق کی اس درجے تعریف کی تھی کہ خود آفتاب کے دل میں اس سے ملاقات کا تجسس پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ جب اسے معلوم ہوا کہ امام مسجد تشریف لا چکے ہیں اور خود جماعت کروا رہے ہیں تو خود بخود ہی اس کی نظر خطیب کی طرف اٹھ گئی۔

وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا جس نے سفید براق لباس

WWW.PAKSOCIETY.COM

زیب تن کر رکھا تھا اور سر پر عمامہ لیے ہوئے تھا۔ اس شخص کے چہرے پر موجود داڑھی کے بال مہندی کی سرخی سے رنگے ہوئے تھے اور یہ داڑھی اتنی گھنی تھی کہ اس کا چہرہ بہت واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی جانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ یہ چہرہ اس کے لیے آشنا ہے۔ اپنے اندر ابھرنے والے اس احساس کی وجہ سمجھنے کی اسے مہلت نہیں مل سکی اور خطبہ ختم ہو کر نمازِ جمعہ کے لیے صفیں ترتیب دی جانے لگیں۔ نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے بعد مقتول بچے کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ نماز کے بعد امام مسجد نے رقت زدہ لہجے میں دعا کی جس میں اللہ سے بچے کے والدین کے لیے صبرِ جمیل کے ساتھ ساتھ اتنا بڑا ظلم کرنے والے شخص کے نیست و نابود ہو جانے کی بھی استدعا کی گئی۔ آفتاب کا ذہن نیند کی کمی اور دکھ کے باعث پوری طرح چوکنا نہیں تھا پھر بھی کوئی خیال تھا جو اس کے ذہن سے ٹکرا کر امام مسجد کے لیے آشنائی کا احساس پیدا کرتا رہا۔ وہ اس احساس کی وجہ سمجھنے کے لیے ان سے ملنا چاہتا تھا لیکن ان کے فارغ ہوتے ہی گاؤں والوں نے جس طرح ان کے گرد جمگھٹا لگا لیا، اس سے اسے اندازہ ہوا کہ اسے ڈھنگ سے ملاقات کا موقع نہیں ملے گا چنانچہ وہ ملاقات کے خیال کو پھر کسی وقت کے لیے ٹال کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی رہائش گاہ مسجد سے ذرا زیادہ فاصلے پر تھی چنانچہ پیدل چل کر جانے میں کچھ وقت لگتا تھا۔ اپنی اس پیدل مارچ کے دوران بھی وہ امام مسجد کے لیے ابھرنے والے آشنائی کے احساس کے بارے میں غور کرتا رہا۔ غور کرتے کرتے اس کے ذہن میں یکدم ہی ایک نام گونجا اور وہ اپنی جگہ بُری طرح ٹھٹک گیا۔ اگر اس کے ذہن میں ابھرنے والا نام درست تھا تو پھر وہ انجانے میں ایک اہم آدمی تک پہنچ گیا تھا۔ اس نام کے ذہن میں آنے کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ یونہی واپس گھر لوٹ جاتا۔ اسے اپنے ذہن میں ابھرنے والے خیال کی تصدیق کرنی تھی اور تصدیق اسی صورت ممکن تھی کہ وہ اس شخص کو ایک بار پھر اچھی طرح قریب سے دیکھے چنانچہ گھر کی طرف جانے والے اس کے قدم اپنا راستہ بدل کر ایک بار پھر مسجد کی طرف پلٹ گئے۔

☆☆☆

چودھری کسی زخمی شیر کی طرح کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے اسے زک پر زک اٹھانی پڑ رہی تھی۔ اس کی زمینوں کا سیلابی پانی کی زد میں آنا، بالے کا ناکارہ ہو کر اسپتال میں جا پڑنا، کشور کا آفتاب کے ساتھ فرار اور اس کے بعد ہر بار ہاتھ آتے آتے نکل جانا، فریدہ کا ماں بننے کی خبر دینا اور اب ماہ بانو کا اس کے مہمان خانے سے نکل بھاگنا ساری ایسی باتیں تھیں جو اس کے خلاف جاتی تھیں۔ وہ برسوں سے حکمرانی کرنے اور اپنی منوانے کا عادی تھا۔ اب جو خلافِ مرضی اتنے سارے واقعات پیش آئے تو برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ خصوصاً ماہ بانو کا مہمان خانے سے فرار ہو جانے کا تازہ ترین واقعہ تو اس کے لیے سخت اشتعال کا باعث بنا تھا۔ ایک رات میں وہ دو کمزور عورتوں کے ہاتھوں شکست کھانے پر مجبور ہوا تھا۔ پہلے فریدہ نے اپنے ماں بننے کی خبر سنا کر اسے طیش دلایا تھا اور اتنی پُراعتماد تھی کہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی نہ کسی بااثر ہستی کی پشت پناہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ فریدہ سے ہونے والی گفتگو نے اسے اتنا بدمزہ کیا تھا کہ اس نے ماہ بانو کے پاس جانے کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ دراصل خود ماہ بانو حویلی سے نکل چکی ہے۔ صبح اسے منشی نے اطلاع دی کہ مہمان خانے سے ماہ بانو غائب ہے اور ساتھ ہی وہ دونوں ملازم میاں بیوی بھی جن کے ذمے ماہ بانو کی نگرانی کا کام لگایا گیا تھا۔ اس خبر کو سنتے ہی چودھری کا پارا ہائی ہو گیا۔ اس نے پہلے منشی کو ڈھیروں گالیوں سے نوازا پھر اس گن مین کو اپنے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا جو صرف اور صرف مہمان خانے کی نگرانی پر مامور تھا۔ اس وقت وہ اسی گن مین کے انتظار میں ادھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اسے ٹہلتے ہوئے دو تین منٹ گزرے تھے کہ منشی ڈرتا ڈرتا اندر داخل ہوا۔ چودھری کی توقع کے خلاف اس کے ساتھ گن مین موجود نہیں تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے منشی کو گھورا۔

”میں نے فون کر دیا ہے سرکار! شکورا ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہو گا۔ مین گیٹ والے چوکیدار نے بتایا ہے کہ وہ رات سے ڈیرے پر گیا ہوا ہے۔“ منشی نے دھیمی آواز میں بتایا۔

”کیوں؟ ادھر کیا اس کی گھر والی مجرا کر رہی تھی جسے دیکھنے گیا تھا؟“ چودھری دہاڑا۔

”وہ آئے گا تو اصل گل کا پتا لگے گا۔ چوکیدار سے تو یہی بول کر گیا تھا کہ اسے چودھری صاحب نے ڈیرے پر جانے کا کہا ہے۔“ منشی نے ادب سے جواب دیا۔

”ہور مجّو کی کیا خبر ہے... کیا وہ بھی میرا نام لے کر کہیں دفان ہو گیا ہے؟“

”اس کی کوئی خبر نہیں سرکار! اس کے گھر پتا کروایا تھا میں نے... ادھر صرف اس کی دھی اور کاکا ہے۔ وہ دونوں بولتے ہیں کہ اماں ابا حویلی ہی میں ہیں، ہمیں کہیں اور جانے کا بتا کر نہیں گئے۔ میں نے ان دونوں کو حویلی میں بلوا لیا ہے اور دو بندوں کو گھر کی تلاشی لینے کو کہا ہے۔ وہ دونوں آجائیں تو پتا لگے گا کہ کہیں کسی رقم شقم کے لالچ میں تو مجّو اور اس کی گھر والی نے نمک حرامی نہیں کی۔ مجھے معلوم چلا ہے کہ مجّو کی دھی کا ویاہ ہونے والا ہے اور مجّو کے پاس رقم نہیں ہے اس لیے آج کل وہ گاؤں میں سب سے قرض مانگتا پھر رہا ہے۔“

منشی نے اپنی پوری کارگزاری سنائی تو چودھری ہونہہ کر کے رہ گیا اور منقش تخت پر جا بیٹھا۔ بیٹھتے ہی اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ منشی نے فوراً آگے بڑھ کر حقے کی نے اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ ناک پھلا پھلا کر حقہ گڑگڑانے لگا۔ اس کا حقہ گڑگڑانے کا انداز ایسا تھا کہ صاف ظاہر ہو رہا تھا وہ غصے سے ابل رہا ہے اور اس غصے کی زد میں کچھ بھی آسکتا ہے۔ اس کا مزاج آشنا منشی اس کی کیفیت کو سمجھتا ایک طرف ہاتھ باندھے اور سر جھکائے ادب سے کھڑا رہا۔ پندرہ منٹ کا دورانیہ گزرنے کے بعد اسے اطلاع ملی کہ گن مین شکورا حویلی پہنچ چکا ہے۔

”شکورا آگیا ہے سرکار! اسے آپ کی خدمت میں پیش کروں؟“ اطلاع ملنے پر اس نے چودھری سے اجازت طلب کی۔

”ہور نہیں تو کیا فیر کورٹ سے سمن جاری ہونے کا انتظار کرے گا؟“ چودھری برہم ہوا۔ اس کی برہمی دیکھ کر منشی جلدی سے باہر کی طرف دوڑا۔ اگلے ہی لمحے شکورا اس کے ساتھ چودھری کی خدمت میں حاضر تھا۔

”ہاں بھئی شکورے! کدھر تھا تُو؟“ چودھری نے گن مین کو شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”ڈیرے پر تھا سرکار! رات مجّو نے مجھے آپ کا پیغام دیا تھا کہ چودھری صاحب کہہ رہے ہیں آج رات ڈیرے پر ڈیوٹی دے دے، ادھر نفری کم ہے تو میں ادھر چلا گیا۔“ غلطی نہ ہونے کے باوجود شکورے نے کپکپاتے ہوئے جواب دیا۔ چودھری کے مزاج کا کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ غیظ میں بے قصور ہوتے ہوئے بھی اسے سزا کا حق دار ٹھہرا دے۔

”ہونہہ! اس کا مطلب ہے کہ جو کچھ ہوا اس میں مجّو کا ہاتھ تھا۔ وہ کسی کے ہاتھوں بک گیا تھا اس لیے اس نے تجھے وہاں سے ہٹانے کے لیے یہ ترکیب نکالی کہ تجھے ڈیرے پر بھیج دے۔ اسے کسی سے ملوم ہو گیا ہو گا کہ آج کل ڈیرے پر پہرا دینے والوں کی نفری کم ہو گئی ہے۔“ چودھری پُرسوچ لہجے میں بولا۔ اس کے انداز پر گن مین کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہو گئیں۔ اسے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ کم از کم اسے قصوروار نہیں سمجھا جا رہا۔

”چودھری صاحب! مجّو کے گھر کی تلاشی لینے والے بندے واپس آگئے ہیں۔ ان کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔“ اسی وقت کسی ملازم نے آکر منشی کے کان میں سرگوشی کر کے اسے کچھ بتایا تو وہ سنسنی خیز لہجے میں چودھری سے بولا۔

”بلاؤ ان دونوں کو۔“ چودھری نے تیز لہجے میں حکم دیا۔ منشی کے پاس اطلاع لے کر آنے والا ملازم اس حکم پر فوراً باہر کی طرف دوڑا۔ اگلے لمحے دونوں ملازمین وہاں موجود تھے۔

”ہاں بھئی، کیا خبر لائے ہو؟“ چودھری نے ان میں سے ایک کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”خبر نہیں سرکار خبریں ہیں۔ پہلی خبر یہ ہے کہ مجّو کے گھر کی تلاشی لینے پر ایک پیٹی میں سے یہ دس ہزار روپے ملے ہیں۔“ اس نے نوٹوں کی ایک گڈی چودھری کے سامنے کی جسے منشی نے تھام لیا۔ گڈی سو اور پانچ سو کے استعمال شدہ نوٹوں پر مشتمل تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مجّو کو رقم دینے والا شخص بہت ہوشیار اور چالاک تھا۔

”دوسری خبر؟“ گڈی پر ایک نظر ڈالنے کے بعد چودھری نے اسی آدمی سے دریافت کیا۔

”نہر کے پاس اسکول کی عمارت کے پیچھے مجّو اور اس کی گھر والی کی لاشیں ملی ہیں۔ دونوں کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔ لاشیں جھاڑیوں میں چھپی ہوئی تھیں اس لیے فوری طور پر کسی کی نظر نہیں پڑی۔ اسکول بھی ایک دو دن سے بند پڑا ہے۔ سنا ہے وہ عیسائی استانی اپنی دھی ڈاکٹر ماریا کے ویاہ کے چکر میں معروف ہے اس لیے اسکول نہیں آرہی ہے ورنہ بچے ہی کھیلنے کودنے نکلتے تو لاشیں دیکھ لیتے۔ وہ تو آوارہ کتّے لاشوں کی بُو پا کر وہاں جا نکلے ہوں انہوں نے لاشیں گھسیٹ کر جھاڑیوں سے باہر نکال لیں۔ کتّوں کے بھونکنے اور شور مچانے پر کھیتوں میں کام کرنے والوں نے اس طرف دھیان دیا تو انہیں لاشیں نظر آگئیں۔ کتّوں نے اچھا خاصا گوشت ادھیڑ ڈالا تھا لاشوں کا لیکن گاؤں والوں نے مجّو اور اس کی گھر والی کو پہچان لیا۔ ہم مجّو کے گھر سے تلاشی لے کر نکلے ہی تھے تو لاشیں ادھر پہنچیں اور ہم ساری تفصیل ملوم کر کے آپ کو اطلاع دینے چلے آئے۔“

اس آدمی نے تفصیل سے سب کچھ بتایا تو چودھری کا یہ یقین اور بھی پختہ ہو گیا کہ کسی ہوشیار اور چالاک آدمی نے مجّو اور اس کی گھر والی کو استعمال کیا ہے، وہ بھی اس طرح کہ اب وہ دونوں اس کا نام بتانے کے لیے زندہ نہیں بچے ہیں۔ آج کل اسے پہنچنے والے ہر نقصان کے پیچھے ایک ہی شخص ہوتا تھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور وہ تھا شہریار۔ فریدہ اور ماہ بانو کی پشت پناہی شہریار کر رہا ہو۔ اس بات کا قوی امکان تھا۔ فریدہ کے بھائی چودھری بختیار سے شہریار کے ٹھیک ٹھاک تعلقات تھے۔ چودھری بختیار سے دوستی نبھانے کے لیے وہ اس کی بہن سے ہمدردی کر سکتا تھا۔ فریدہ نے کسی ذریعے سے اس سے رابطہ کیا ہوگا تو اس نے فریدہ کو یقین دلا دیا ہوگا کہ وہ اس کا پورا پورا ساتھ دے گا۔ یہ سوچنا تو اب غیر ضروری تھا کہ فریدہ نے کس ذریعے سے شہریار سے رابطہ کیا ہوگا۔ ملازمین کی نمک حرامی اس کے سامنے تھی۔ اگر مجو اور اس کی گھر والی اپنے کسی مفاد کے لیے بک گئے تھے تو کوئی اور ملازم بھی بک سکتا تھا۔ فریدہ کا ساتھ دینے کے لیے شہریار کے پاس دوسری اہم وجہ چودھری سے دشمنی تھی۔ اس دشمنی کو نبھانے کے لیے بھی وہ فریدہ کا ساتھ دے سکتا تھا بلکہ وہ تو منتظر ہوگا کہ کب فریدہ منظرِ عام پر آتی ہے اور میڈیا کے ذریعے ساری دنیا کو چودھری کے کرتوت بتاتی ہے۔

دوسری شخصیت ماہ بانو کا تو وہ عرصے سے ساتھ دے ہی رہا تھا۔ اسی کی مدد سے ماہ بانو پیرآباد سے نکلنے میں کامیاب ہوئی اور پھر اِدھر اُدھر جو تھی پھری تو اسے چھپنے کے لیے پناہ گاہیں فراہم کرنے والا بھی شہریار ہی تھا۔ شہریار ہر بار اپنے مقصد کی کامیابی کے لیے قانونی طریقہ استعمال کرے گا، یہ بھی اب ضروری نہیں رہا تھا۔ پہلے بھی وہ اس کے ڈیرے پر غنڈوں سے حملہ کروا کر آفتاب کو وہاں سے آزاد کروا چکا تھا۔ پھر بالے کے زخمی ہو کر اسپتال پہنچ جانے کی مثال بھی اس کے سامنے تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کیس میں بھی شہریار نے غنڈا عناصر کا استعمال کیا تھا۔ چودھری شواہد حاصل نہیں کر سکا تھا کہ یہ کارگزاری شہریار کی ہے، اس کے باوجود اسے یقین تھا کہ یہ سب اسی نے کروایا ہے۔ اب ماہ بانو کے مہمان خانے سے غائب ہو جانے کے پیچھے بھی اسے شہریار کا ہی ہاتھ لگ رہا تھا۔

شہریار جیسے متمول آدمی کے لیے مجو کو رقم کا لالچ دے کر استعمال کر لینا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اس معاملے میں جو واحد چیز اسے کھٹک رہی تھی، وہ مجو اور اس کی بیوی کا قتل تھا۔ اب تک اس نے شہریار کی فطرت کو جہاں تک سمجھا تھا، اس سے یہی سمجھ آتا تھا کہ وہ کسی بے قصور اور غیر متعلقہ شخص کو نقصان نہیں پہنچا سکتا لیکن شہریار کے علاوہ کوئی دوسرا نام بھی فی الحال اس کے ذہن میں نہیں تھا جس کے بارے میں وہ کہہ سکے کہ اس شخص کو ماہ بانو سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ماہ بانو کو تو بس شہریار ہی اس سے چھین کر لے جا سکتا تھا اور یہ بات اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی... لیکن فی الحال وہ شہریار کے خلاف کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ شہریار اس کا کوئی مزارع نہیں تھا جس کے گھر پر وہ اپنے کارندوں سے حملہ کروا کر ماہ بانو کو بازیاب کروا لیتا۔ اسے ماہ بانو کو شہریار سے واپس حاصل کرنے کے لیے اسی صفائی سے کام کرنا تھا جس صفائی سے وہ اس کی حویلی سے اسے نکال لے گیا تھا۔

''مجو کی دھی اور پتر اِدھر حویلی میں ہی ہیں نا؟'' حالات پر کافی غور و خوض کرنے کے بعد اس نے منشی سے دریافت کیا۔

''جی سرکار! اگر آپ کا حکم ہو تو میں ان دونوں کو آپ کی خدمت میں پیش کروں؟'' منشی نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''نہیں، اس کی کوئی لوڑ نہیں۔ میں نے ان دونوں کے لیے کچھ ہور سوچا ہے۔ مجو اور اس کی گھر والی نے میرے ساتھ جو نمک حرامی کی ہے، اس کی سزا اس کی نسل کو بھی بھگتنی پڑے گی۔ آخر وہ بھی تو ہمارا ہی نمک کھا کر پلے بڑھے ہیں۔ اس نمک کے ساتھ بے وفائی کرنے والے کو ہم کسی صورت معاف نہیں کر سکتے۔ ہم مجو کی اولاد کا وہ حشر کریں گے کہ وہ اُدھر دوسری دنیا میں بھی تڑپ اٹھے گا۔ ہور آئندہ ہمارا کوئی ملازم ہم سے نمک حرامی کی سوچے گا بھی تو اس کے سامنے اپنا عبرت ناک انجام آجائے گا۔'' قہر آلود لہجے میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے چودھری نے منشی کو وہ سزا بتائی جو وہ مجو کی اولاد کے لیے تجویز کر چکا تھا۔ بے ضمیر منشی نے اس لرزہ خیز سزا کو اطمینان کے ساتھ سنا اور اس پر عمل کروانے کی یقین دہانی کرواتے ہوئے چودھری کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ چودھری کی بھڑاس بھی کچھ نہ کچھ نکل ہی گئی تھی چنانچہ جب اس کے سامنے ام الخبائث سے بھرا جام پیش کیا گیا تو وہ اس جام کو گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے اپنا آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگا۔

☆☆☆

''کیا تمہیں سو فیصد یقین ہے کہ ماہ بانو اب چودھری کی حویلی میں نہیں ہے؟'' دیوار پر نظریں جمائے بیٹھے شہریار نے فون پر دوسری طرف موجود عبدالمنان سے پوچھا۔ ماہ بانو کے بلتستان سے نکل کر کراچی پہنچائے جانے کے بارے میں اس نے عبدالمنان کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ بالکل نہیں جانتا تھا کہ ماہ بانو زندہ ہے اور کراچی کے کسی ہاسٹل میں رہائش پذیر ہے۔ اس کو کچھ نہ بتانے کی وجہ بداعتمادی نہیں تھی بلکہ شہریار نے احتیاط کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہی مناسب سمجھا تھا کہ کم سے کم لوگوں کو اس راز میں شریک کیا جائے لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی۔ ماہ بانو ہاسٹل سے اغوا کی جا چکی تھی اور اس کی تلاش کے لیے اسے اپنے تمام وسائل کو استعمال کرنا تھا۔ ان میں عبدالمنان کی حیثیت بڑی مسلّم تھی۔ عبدالمنان مقامی معاملات سے باخبر رہنے والا ایک ایسا آدمی تھا جو چودھری کی حویلی کے اندر تک سرنگ لگا کر وہاں سے خبر نکال کر لا سکتا تھا چنانچہ اس نے عبدالمنان کو ہی یہ ذمے داری سونپ دی تھی۔ خود وہ تو آج کل یوں بھی بڑا مصروف تھا۔ ممانی جان نے اصرار کر کے بلکہ باقاعدہ حکم دے کر اسے لاہور بلوا لیا تھا اور اسے لے کر مختلف بازاروں میں پھرتی رہی تھیں۔ اس کے لیے شادی کا جوڑا انہوں نے ایک مشہور ڈریس ڈیزائنر سے ارجنٹ میں منہ بولی قیمت پر تیار کروایا تھا لیکن پھر بھی مطمئن نہیں تھیں اور ان کا یہی کہنا تھا کہ اس ایمرجنسی کی شادی کی وجہ سے ان کے کئی پروگرام ادھورے رہ گئے ہیں۔

رشتوں کی زنجیر میں جکڑا شہریار ان کی محبت کے آگے بے دست و پا تھا اور یہاں بیٹھ کر ماہ بانو کی بازیابی کے سلسلے میں جو کچھ کر سکتا تھا، وہ کر رہا تھا۔ اس نے کراچی سے بھی درست معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دی تھی اور اس آدمی سے اسے اب تک جو رپورٹس ملی تھیں، ان سے یہی پتا چل سکا تھا کہ کچھ لوگوں نے اچانک ہی ہاسٹل میں گھس کر ماہ بانو کو وہاں سے اغوا کر لیا تھا۔ اس کی روم میٹ اس معاملے میں قطعی بے قصور پائی گئی تھی... اور جیسا کہ اس پر شک کیا جا رہا تھا کہ شاید اس نے ماہ بانو کا اتا پتا چودھری کو دیا ہے تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ بے چاری تو خود بہت خوف زدہ اور ہراساں تھی اور ابھی تک اس لائق نہیں ہوئی تھی کہ کالج جوائن کر سکے۔ شہریار نے اس آدمی کے ذمے ماہ بانو کی دوسری قریبی لڑکیوں کو ٹٹولنے کی ذمے داری لگا دی تھی لیکن چونکہ اسے یقین تھا کہ اس کے اغوا کے معاملے میں چودھری کا ہی ہاتھ ہو سکتا ہے، اس لیے اس کا سارا زور بھی اسی طرف تھا۔ اس کی ہدایت پر چودھری کے ارد گرد کی سُن گُن لیتے پھرتے عبدالمنان نے معلوم کروا لیا تھا کہ ماہ بانو کو واقعی چودھری نے ہی اغوا کروایا تھا اور حیرت انگیز طور پر اسے کسی خفیہ ٹھکانے پر چھپانے کے بجائے اپنی حویلی کے مہمان خانے میں رکھا تھا۔ شاید اس نے ایسا اس لیے کیا تھا کہ کسی کو شک ہی نہ گزرے اور ڈھونڈنے والے ماہ بانو کو اس کے کسی خفیہ ٹھکانے پر ڈھونڈنے کی کوشش کرتے رہیں لیکن ماہ بانو وہاں سے بھی غائب ہو گئی تھی اور اس وقت عبدالمنان نے اسے یہی اطلاع دی تھی جس پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''بالکل سر! میں نے حویلی میں مستقل کام کرنے والے ایک ملازم سے یہ ساری معلومات حاصل کی ہیں اور ان معلومات کی تصدیق ماہ بانو کی نگرانی پر مامور ملازم اور اس کی بیوی کی ہلاکت سے بھی ہو رہی ہے۔'' عبدالمنان نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

''کیا ان دونوں ملازم میاں بیوی کو چودھری نے مروایا ہے؟'' شہریار نے نہایت سنجیدگی سے سوال کیا۔

''نو سر! یہ کسی اور کا ہی کارنامہ ہے۔ مجھے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق کسی نے رشوت دے کر ان ملازمین کو استعمال کیا اور پھر راز نہ کھلے اس لیے انہیں ہلاک کروا دیا۔ ان دونوں ملازمین کی ہلاکت کے بعد یہ بات ایک معمّا بن گئی ہے کہ ماہ بانو کو کس نے اور کیوں حویلی سے فرار کروایا۔ اس کا ایسا کون ہمدرد تھا جو اتنا بااثر و بارسوخ تھا کہ پہلے ملازمین کو رشوت دے کر اسے فرار کروانے میں کامیاب ہوا اور پھر ملازمین کو ہلاک بھی کروا دیا۔'' عبدالمنان کا ہوم ورک ہمیشہ کی طرح مکمل اور جامع تھا۔ اس نے اگر بتایا تھا کہ ماہ بانو اب حویلی میں نہیں ہے تو واقعی وہ اس بات کی اچھی طرح تصدیق کر چکا تھا۔

''شیری! کیا ہے بیٹا؟ تم نے ابھی تک تیار ہونا شروع نہیں کیا۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ تمہارے ماموں جان وقت کے کتنے پابند ہیں۔ وقت پر بارات روانہ نہیں ہوئی تو وہ تمہیں تو کچھ نہیں کہیں گے لیکن مجھ پر سخت خفا ہوں گے۔'' وہ عبدالمنان کے ساتھ اپنی گفتگو کا سلسلہ مزید آگے بڑھاتا، اس سے قبل ہی آفرین رانا کمرے میں داخل ہوئیں اور اسے فون پر باتیں کرتا دیکھ کر ناراض ہونے لگیں۔

''ٹھیک ہے عبدالمنان! تم اس معاملے پر نظر رکھو اور اگر کوئی اہم بات معلوم ہو تو مجھے اطلاع دے دینا۔'' اس نے جلدی سے گفتگو کو سمیٹتے ہوئے عبدالمنان سے کہا اور فون بند کر کے آفرین رانا کی طرف متوجہ ہوا۔

''عبدالمنان تمہارا پی اے ہے نا؟ تم نے اسے اپنی شادی میں انوائٹ نہیں کیا؟'' آفرین رانا نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے ضروری نہیں سمجھا۔'' وہ سنجیدگی سے جواب دیتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور وارڈروب کی طرف بڑھ گیا۔ آج کی تقریب میں پہننے کے لیے خصوصی طور پر تیار کردہ سوٹ بڑے سلیقے سے ہینگر میں لٹکا ہوا تھا۔ اس نے بڑے بے نیاز انداز میں ہینگر سمیت سوٹ باہر نکالا۔ آفرین

WWW.PAKSOCIETY.COM

رانا اس کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھ رہی تھیں اور ان کے ذہن میں یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ شہریار یہ شادی اپنے دل کی خوشی سے نہیں بلکہ کسی مجبوری کے تحت کر رہا تھا۔ وہ مجبوری کیا تھی، وہ سمجھنے سے قاصر تھیں اور شہریار کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے یہ بھی اندازہ تھا کہ وہ اس سلسلے میں اپنی زبان نہیں کھولے گا۔ ویسے اگر وہ انہیں اب کچھ بتا بھی دیتا تو وہ کیا کر سکتی تھیں؟ اب جبکہ بالکل آخری لمحات آگئے تھے اور شادی کی تقریب شروع ہونے ہی والی تھی تو کچھ تبدیل بھی تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس تقریب میں شہر بھر کے خاص خاص افراد کو مدعو کیا گیا تھا۔ وزیراعظم اور صدر تک کو دعوت نامے بھیجے گئے تھے تو ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ کسی فلم کی طرح عین کلائمکس پر جا کر اعلان کر دیا جائے کہ خواتین و حضرات... آپ لوگ جس شادی میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں، وہ کینسل کر دی گئی ہے یا پھر اس کے دولہا دلہن تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ زندگی کی کہانی اور فلمی کہانی میں یہی فرق ہوتا ہے۔ فلمی کہانی کا انجام اس طرح کیا جاتا ہے کہ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ جائے۔ زندگی کی کہانی سمجھوتوں کے سہارے جگ ہنسائی سے بچنے کی کوشش میں چلتی رہتی ہے۔ شہریار کو بھی شاید اپنی زندگی میں ایک بڑا سمجھوتا کرنا پڑا تھا اور وہ اس کے لیے صرف خوشی کی دعا کر سکتی تھیں۔ اب بھی وہ زیرِ لب یہ دعا کرتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئیں۔ ان کے جانے کے آدھے گھنٹے بعد شہریار بھی تیار ہو کر باہر آگیا۔ لیونگ روم میں آفرین رانا اور مریم کے علاوہ خاندان کی کئی اور خواتین بھی موجود تھیں۔ ان خواتین نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا اور جانے کون کون سی رسومات ادا کرنے لگیں۔

بے دلی سے ان رسومات کو بھگتانے کے باوجود شہریار نے کسی قسم کا کلمۂ اعتراض نہیں اٹھایا۔ البتہ اس نے یہ بات پہلے ہی واضح کر دی تھی کہ وہ عام روایتی دولہا کی طرح سہرا وغیرہ ہرگز نہیں باندھے گا چنانچہ اس وقت اس کے گلے میں صرف ایک عدد پھولوں کا ہار تھا اور اس واحد ہار نے بھی اس کی شخصیت میں اتنی تبدیلی پیدا کر دی تھی کہ آفرین رانا اس کی بلائیں لیتے نہیں تھک رہی تھیں۔ وہ بہت اچھا لگ رہا تھا اور وہ نظر لگ جانے کے ڈر سے بار بار اس پر سے نوٹ وار کر ملازمین میں تقسیم کرتی جا رہی تھیں۔ رسومات کی ادائیگی کے بعد گاڑیوں کے قافلے کی شکل میں رانا ہاؤس سے اس کی برات روانہ ہوئی۔ تقریب کا اہتمام ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کیا گیا تھا جہاں اس وقت ڈاکٹر ماریا، اس کی والدہ مسز جوزف اور ان کی جان پہچان کے دیگر لوگ موجود تھے۔ شادی کی اس تقریب کے لیے سارا انتظام اور اہتمام آفرین رانا نے خود کیا تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ ڈاکٹر ماریا کی مالی حیثیت ایسی نہیں کہ وہ ان کے اسٹیٹس کے مطابق انتظامات کر سکے چنانچہ انہوں نے اس معاملے میں ان لوگوں کو زحمت بھی نہیں دی تھی۔

برات ہوٹل پہنچی تو یوں لگا کہ وہاں رنگ و نور کا ایک طوفان امنڈ آیا ہو۔ دھیمے سروں میں بجتی موسیقی، خوب صورت ترتیب سے کی گئی لائٹنگ، اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو، ادھر سے اُدھر دوڑتے باوردی بیرے، جگہ جگہ تعینات سیکیورٹی گارڈز سب مل کر بتا رہے تھے کہ شہر کی کسی ممتاز شخصیت کی شادی کی تقریب ہو رہی ہے۔ یہ سارا اہتمام و انصرام لیاقت رانا کی حیثیت کی وجہ سے تھا۔ ان کی مضبوط سیاسی پوزیشن کی وجہ سے ان کے بے شمار جاننے والے تھے جنہیں اس قسم کے مواقع پر یاد رکھنا ضروری بھی تھا۔ خود شہریار بھی اپنے کیریئر کے ابتدائی مراحل سے گزر رہا تھا اور لیاقت رانا ضروری سمجھتے تھے کہ اس کے لوگوں سے روابط بڑھیں اس لیے اس کی دلچسپی نہ ہونے کے باوجود انہوں نے بہت سے لوگوں کو بلا رکھا تھا اور اب وہ ایک ایک سے اس کا تعارف بھی کروا رہے تھے۔ نئے ملنے والوں سے تعارف اور پرانے آشناؤں سے علیک سلیک کے مراحل طے کرتا ہوا وہ ایک ٹیبل پر چودھری افتخار عالم شاہ کو بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ چند اہم کاروباری شخصیات کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور جیسا کہ اس کی عادت تھی حقے کو چھوڑ کر شہری تقریبات وغیرہ میں سگار کا استعمال کرتا تھا... تو اس وقت بھی سگار پی رہا تھا۔

”مبارک ہو اے سی صاحب! آخر آپ بھی پھنس ہی گئے۔ مجھے تو آپ کی شادی کا سن کر دلی خوشی ہوئی اور باوجود دس کام ہونے کے، میں دعوت نامہ ملنے پر شادی میں شرکت کے لیے چلا آیا۔“ شہریار کے ٹھٹکنے کو محسوس کر کے وہ خود ہی آگے بڑھ کر اس سے ملا اور چہکتے ہوئے بتایا لیکن شہریار اپنی جگہ حیران تھا کہ چودھری کو آخر دعوت نامہ بھیجا کس نے؟ خود اس نے تو لیاقت رانا کے کہنے کے باوجود اس کا نام لسٹ میں سے کٹوا دیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اب وہ وقت گزر چکا ہے جب وہ مصلحتاً چودھری سے تعلقات نبھانے کی کوشش کرتا تھا۔ اب تو اس کی چودھری سے کھلی جنگ تھی اور دشمن کو کسی خوشی میں شامل کرنے کا کیا سوال تھا؟

”اتنے حیران ہو کر نہ دیکھیں اے سی صاحب! بخدا ہم بغیر دعوت کے یہاں نہیں آئے ہیں۔ آپ کی طرف سے نہ سہی لڑکی والوں کی طرف سے ہمیں مدعو کیا گیا ہے۔ آپ کی شریکِ حیات سے ہمارے بڑے گہرے مراسم ہیں۔ ہمیں مدعو کیے بغیر وہ بیاہ رچا لیتیں، یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔“ چودھری کے انداز میں بڑی معنی خیزی تھی جسے محسوس کر کے شہریار کا چہرہ احساسِ توہین سے سلگ اٹھا اور وہ تیزی سے وہاں سے پلٹ گیا۔ اپنی بیوی کے حوالے سے کوئی بھی مرد کوئی ایسی ویسی بات سننا گوارا نہیں کرتا اور ماریا کے بارے میں تو وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ چودھری نے اسے اپنا کھلونا بنا رکھا تھا۔ خود ماریا نے اس کے سامنے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ اگر اس نے چودھری کا مطالبہ ماننے سے انکار کیا تو وہ اس کی والدہ مسز جوزف کو قتل کروا دے گا۔ ماں کی زندگی کی خاطر ماریا چودھری کی ہوس پوری کرتی رہی تھی اور اس وقت چودھری نے اسے یہی بات جتائی بھی تھی۔ کھولتے خون کے ساتھ وہ تمام مہمانوں کو نظرانداز کر کے ایک بالکل الگ تھلگ خالی ٹیبل پر جا بیٹھا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال کروٹیں لے رہا تھا کہ کہیں میں نے جذبات میں ماریا سے شادی کرنے کا فیصلہ کر کے کوئی غلطی تو نہیں کر دی لیکن مسئلہ اس کے اپنے ضمیر کا تھا۔ ماریا کا وجود پہلے ہی سے کتنا داغ دار تھا، اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی، وہ تو صرف اس داغ کو دھونے کی کوشش کر رہا تھا جو اس نے لگایا تھا... اور جو خود اس کے اپنے دامن پر بھی لگ کر اسے اس کی اپنی ہی نظروں میں داغ دار کر گیا تھا۔

”ارے بھئی نوشے میاں! تم سب سے کٹ کر یہاں اکیلے کہاں آبیٹھے ہو؟ قاضی صاحب نکاح پڑھانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں اور دولہا کی عدم موجودگی پر سخت پریشان ہیں کہ بغیر دولہا کے نکاح کیسے ہو گا؟“ وہ اپنے ہی خیالات کے گرداب میں نہ جانے کب تک گھرا رہتا کہ آئی جی مختار مراد نے قریب آکر اس سے خوش گوار لہجے میں کہا۔ انہوں نے آج پولیس یونیفارم یا پارٹی ڈنر سوٹ کے بجائے سیاہ رنگ کی شیروانی زیبِ تن کر رکھی تھی اور خوب جچ رہے تھے۔ شہریار کی شادی ان کے نزدیک گھر کی شادی تھی جس میں انہوں نے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور اب بھی کسی مشفق بزرگ کی طرح اس سے مخاطب تھے۔ ان کی بات سن کر اس نے رخ موڑ کر اسٹیج کی طرف دیکھا۔ وہاں ماریا بھاری کام دار جوڑے اور خوب صورت میک اپ کے ساتھ بڑی شان سے براجمان تھی اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ کافی اچھی بھی لگ رہی تھی لیکن نجانے کیا بات تھی کہ اسے بہ حیثیت ایک انسان پسند کرنے کے باوجود اس کا دل اس کی طرف کھنچتا نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے دنیا میں موجود بے شمار عورتوں میں سے ایک عورت تھی جس کے ہونے نہ ہونے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا... لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اس عام سی عورت نے اس سے اس کا زعمِ پارسائی چھین لیا تھا۔ جانے وہ رات کیسی تھی جب وہ ماریا کے لیے دیوانہ ہو گیا تھا اور اپنی ساری حدود پار کر بیٹھا تھا۔ ایسا تو کبھی ماہ بانو کی موجودگی میں بھی نہیں ہوا تھا... حالانکہ ماہ بانو تو وہ لڑکی تھی جس کے لیے اس نے پہلی بار اپنے دل میں کوئی کشش محسوس کی تھی۔ اس کشش کے باوجود اس کے قدم ماہ بانو کی موجودگی میں بھی بہکنے نہیں پائے تھے۔

”کس سوچ میں گم ہو بیٹا! رانا صاحب تمہیں یاد کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اب نکاح ہو جانا چاہیے تاکہ تقریب وقت پر ختم ہو سکے۔“ اسے خاموش پا کر مختار مراد نے اسے ٹوکا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور ان کی معیت میں اسٹیج کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے پہنچتے ہی نکاح کی رسمی کارروائی شروع ہو گئی اور پھر چند بولوں کی ادائیگی سے وہ ماریا کا بن گیا۔ نکاح کے بعد حسبِ روایت لوگ دولہا دلہن کو مبارک بادیں دینے لگے۔ ساتھ ہی ڈنر بھی شروع کروا دیا گیا۔ بے پناہ مصروفیت کے ان لمحات میں ہوٹل کا ایک ملازم شہریار کے قریب آکر اس سے مخاطب ہوا۔

"سر! آپ کے لیے کال ہے۔" اس نے اپنے ہاتھوں میں موجود کارڈلیس کو نمایاں کرتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

"میرے لیے کال... وہ بھی ہوٹل کے نمبر پر؟" شہریار حیران ہوا۔

"کون بات کررہا ہے؟ نام بتایا ہے کال کرنے والے نے؟" کارڈلیس کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے اس نے دریافت کیا۔

"نو سر! کال کرنے والے نے اپنا نام نہیں بتایا لیکن اس کا کہنا ہے کہ اسے آپ کو کوئی بہت ہی اہم اطلاع دینی ہے۔" ملازم نے مؤدبانہ اسے بتایا۔

"اوکے، میں بات کرتا ہوں۔" اس نے ملازم کے ہاتھ سے کارڈلیس لے کر ماؤتھ پیس میں "ہیلو" کہا۔

"شادی مبارک ہو جناب!" اس کی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے چہکتے ہوئے کہا گیا۔

"آپ مجھے کون سی اہم اطلاع دینا چاہتے ہیں؟" اس کی مبارک باد کو نظرانداز کرتے ہوئے شہریار نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں آپ کو ایک افسوس ناک واقعے کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔" اس آدمی کا لب ولہجہ ہرگز بھی ایسا نہیں تھا جس سے یہ اندازہ ہوسکے کہ وہ جس افسوس ناک واقعے کی اطلاع دینا چاہتا ہے اس پر اسے خود بھی کوئی افسوس ہے۔

"میں سن رہا ہوں، فرمایئے۔" شہریار نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے ہموار لہجے میں اس سے کہا۔ اس فون کال کو نمٹانے کے لیے وہ باقی لوگوں سے الگ ہوکر چلتا ہوا ایک خالی گوشے میں آگیا تھا۔

"یہ واقعہ پیرآباد میں پیش آیا ہے۔ میں آپ کو اس واقعے کی اطلاع اس لیے دے رہا ہوں کہ آپ اس کے پیچھے موجود وجہ سے براہِ راست جڑے ہوئے ہیں۔" فون کرنے والے نے اصل واقعہ سنانے سے پہلے تمہید باندھی۔ شہریار کچھ بھی کہے بغیر اس کی باقی بات سننے کا منتظر رہا، البتہ پیرآباد کا نام سن کر اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کے لیے واقعی کوئی بُری خبر موجود ہے۔

"میری معلومات کے مطابق آپ نے چودھری افتخار کی حویلی سے ایک لڑکی ماہ بانو کو فرار کروانے کے لیے ان کے ملازم میاں بیوی کو استعمال کیا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی بعد میں پُراسرار طور پر مُردہ پائے گئے لیکن چودھری افتخار پر یہ واضح ہونے کے بعد کہ ان دونوں مقتول ملازمین نے اس کے ساتھ نمک حرامی کی ہے، انتقاماً ان کے نوجوان بیٹا بیٹی کو گھر سے اٹھوالیا اور ابھی دو گھنٹے قبل ان دونوں بہن بھائیوں کو ماں باپ کے کیے کی سزا دینے کے لیے برہنہ حالت میں منہ کالا کرکے پورے گاؤں میں گدھے پر بٹھا کر گھمایا گیا ہے۔ لڑکا عمر میں بہن سے چھوٹا تھا لیکن بہرحال اتنا سمجھ دار ضرور تھا کہ بے عزتی کو محسوس کرسکے۔ اس سے اپنی اور اپنی جوان بہن کی تذلیل برداشت نہیں ہوئی اور وہ اپنے تنہا ہونے کی پروا کیے بغیر چودھری کے کارندوں پر حملہ آور ہوگیا۔ اس کی یہ جراٴت ظاہر ہے ان لوگوں کو پسند نہیں آئی اور انہوں نے رائفلوں کے بٹ مار مار کر لڑکے کی کھوپڑی توڑ ڈالی۔ مجھے جو آخری اطلاع ملی ہے، اس کے مطابق لڑکی اپنی رسوائی اور بھائی کی موت کا دکھ برداشت نہیں کرسکی اور اس نے اپنے آپ کو آگ لگا کر خودکشی کرلی۔ میرے خیال میں شادی جیسے اہم موقع پر یہ خبر سن کر آپ سخت بدمزہ ہوئے ہوں گے لیکن آپ کی پیرآباد کے لوگوں سے دلی ہمدردی دیکھتے ہوئے میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کو فوری طور پر یہ خبر پہنچادی جائے۔" خبر سنانے والے کا لہجہ آخر میں خاصا طنزیہ ہوگیا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ یہ خبر کسی نیک نیتی کے بجائے صرف اس کی خوشی برباد کرنے کے لیے سنا رہا ہے۔ بہت ممکن تھا کہ وہ چودھری کے اشارے پر ہی یہ کام کررہا ہو۔

"کیا آپ اپنا تعارف کروانا پسند کریں گے؟" شہریار نے سلگتے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"سوری سر! میں خود کو مشکل میں ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ ویسے بھی نام میں کیا رکھا ہے؟ میرا اصل کام تھا آپ کو باخبر کرنا، سو وہ میں نے کردیا۔" اس شخص نے جواب دیا اور پھر یکدم ہی سلسلہ منقطع کردیا۔ پہلے ہی سے اندرونی خلفشار سے بڑھ جانے والا دورانِ خون کنپٹی پر ٹھوکریں مار مار کر اسے کچھ کرگزرنے پر اکسا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے ہاتھوں سے چودھری کا قتل کرڈالے تاکہ کرۂ ارض پر سے ایک فتنہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے۔ جھنجلائے ہوئے انداز میں کارڈلیس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بھینچتے ہوئے اس نے چودھری کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ وہ اسے فوراً ہی نظر آگیا۔ وہ بھی اس حالت میں کہ اس کی نظریں اس پر ہی لگی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ چودھری کا یہ انداز دیکھ کر اس کے اس شبہے کی تصدیق ہوگئی کہ اس تک خبر پہنچانے والا چودھری کا ہی کوئی کارندہ تھا۔ بہت ممکن تھا کہ ایک طے شدہ وقت پر اس تک یہ خبر پہنچانے کا مقصد

WWW.PAKSOCIETY.COM

یقیناً اسے ذہنی اذیت میں مبتلا کرتا تھا اور واقعی وہ بہت بُری طرح تپ گیا تھا چنانچہ ہر طرح کی مصلحت اور رکھ رکھاؤ کو بالائے طاق رکھتا ہوا تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا چودھری تک پہنچا اور اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ چودھری نے دور سے ہی اس کا ارادہ بھانپ لیا تھا لیکن کوئی مزاحمت اس لیے نہیں کی کہ وہ جانتا تھا، اتنے ہجوم میں شہریار اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا بلکہ الٹا اس کے خلاف ہی ایک اسکینڈل بن جائے گا۔ اس کا ہر اندازہ درست ثابت ہوا۔ جیسے ہی شہریار نے اس کا گریبان پکڑا، ایک شور سا مچ گیا اور کئی لوگ بیچ بچاؤ کروانے کے لیے آگے بڑھے۔

”چھوڑ دو مجھے۔ یہ شخص اس لائق نہیں ہے کہ اسے زندہ چھوڑا جائے۔“ بپھرا ہوا شہریار کسی کے قابو میں آنے کو تیار نہیں تھا۔ کئی افراد نے مل کر اسے چودھری سے الگ کیا اور پھر اسے ایک علیحدہ کمرے میں لے گئے۔

”یہ کیا بیوقوفی تھی شہریار... اپنی نہیں تو کچھ میری ہی عزت کا خیال کرتے۔ کل صبح کے اخبارات میں تمہاری اس حرکت کی خبر تصویروں سمیت لگی ہوگی بلکہ صبح کا بھی کیا انتظار؟ الیکٹرانک میڈیا تو ابھی تھوڑی دیر میں نمک مرچ لگا کر یہ خبر نشر کرے گا۔“ لیاقت رانا شاید زندگی میں پہلی بار اس سے اس لہجے میں بات کر رہے تھے۔ درحقیقت زندگی میں پہلی بار ہی ایسا ہوا تھا کہ انہیں شہریار کی وجہ سے شدید سبکی کا سامنا کرنا پڑا تھا، ورنہ وہ تو ہمیشہ ان کے لیے باعث فخر رہا تھا اور کبھی بھی اس نے اپنا سیلف کنٹرول اس طرح سے نہیں کھویا تھا۔

”ہونے دیں خبر نشر۔ میں خود میڈیا والوں کو چودھری کے کرتوت بتاؤں گا۔“ اس کا غصہ ابھی اترا نہیں تھا چنانچہ وہ بدستور جذباتیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”تم اس کے بارے میں سچ بتاؤ گے اور وہ جواب میں جھوٹ گھڑ گھڑ کر تمہیں بدنام کرے گا۔ میڈیا والوں کو سچ اور جھوٹ دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ انہیں بس چٹ پٹی مسالے دار خبریں چاہیے ہوتی ہیں جن سے ان کے چینل کا کاروبار چلتا رہے۔“ لیاقت رانا نے اسے حقیقت کا آئینہ دکھایا تو وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”سوری ماموں جان! واقعی مجھ سے جذبات میں ایک بڑی غلطی ہو گئی ہے۔“ ان سے معذرت کرتے ہوئے اس نے اعتراف کیا۔

”مجھ سے سوری کہہ دینے سے مسئلہ حل تھوڑی ہو جائے گا۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تمہاری اس حرکت پر مجھے لوگوں کے سامنے کتنی اور کیا کیا وضاحتیں دینی پڑیں گی۔ وہ تو شکر ہے کہ صدر اور وزیراعظم صاحب اپنے معروف شیڈول کی وجہ سے تقریب میں شرکت نہیں کر سکے ورنہ مجھے ان کے سامنے بھی سخت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔“ ان کا موڈ بہت بُرا خراب تھا۔

”میں واقعی بہت شرمندہ ہوں ماموں جان! بات ہی کچھ ایسی تھی کہ میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا۔“ اس نے انہیں منانے کی کوشش کی۔

”تمہیں بچپن سے ناقابلِ برداشت باتوں کو برداشت کرنے کی تربیت دی گئی ہے۔ اگر تمہارے ہمارے جیسے لوگ یوں اپنا ٹمپر لوز کرتے رہیں تو عوام کو تو ہر روز ایک تماشا دیکھنے کو ملے گا۔ بہرحال، فی الحال میں تمہیں اس حرکت کے لیے معاف کر رہا ہوں، وہ بھی صرف اور صرف اس وجہ سے کہ آج تمہاری شادی ہے۔“ لیاقت رانا اس سے یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے اور وہ وہاں تنہا رہ گیا۔ تنہائی ملتے ہی وہ بے دم سا ہو کر ایک ٹو سیٹر پر سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ بند کمرے کی یہ عافیت عارضی ہے۔ باہر ایک ہجوم موجود ہے جس کی زبانوں پر بہت سے سوال مچل رہے ہوں گے۔ اسے ان سوالوں کے معقول جواب بھی سوچنے تھے اور آئندہ کے لیے کوئی ایسا لائحہ عمل بھی بنانا تھا جس پر عمل کر کے چودھری کے شر سے نمٹا جا سکے۔

☆☆☆

بڑے سے پتھر پر بیٹھی ہوئی ماہ بانو نے نظریں گھما کر اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہ جہاں بیٹھی تھی، اس سے کچھ فاصلے پر ایک کنواں تھا اور ایک آدمی کنوئیں سے پانی نکال رہا تھا۔ اس کی پھرتی اور جفاکشی دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک سخت جان آدمی ہے۔ اس نے گھیر دار شلوار قمیص کے ساتھ سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی اور چہرے پر خوب بڑھی ہوئی داڑھی مونچھیں تھیں۔ اس جیسے حلیے کے یہاں اور بھی بہت سے لوگ تھے اور حلیوں کے علاوہ ان کے درمیان جو قدر مشترک تھی، وہ ان کا پیشہ تھا۔ دو دن ان لوگوں کے درمیان گزارنے کے بعد وہ اچھی طرح جان چکی تھی کہ وہ سب پیشہ ور ڈاکو ہیں اور یہاں جنگل میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ ان کی اس پناہ گاہ میں زندگی کی تمام بنیادی ضروریات پوری کرنے کا انتظام تھا۔ وہ یہاں کافی ٹھاٹ باٹ سے رہ رہے تھے اور کیوں نہ رہتے کہ ان کے پاس لوگوں سے لوٹا ہوا بہت سا مال مفت ہونے کے علاوہ وہ روپیا بھی تھا جو انہیں سپورٹ کرنے والے وڈیرے اور جاگیردار بڑی فراخ دلی سے فراہم کرتے تھے۔ بدلے میں یہ ڈاکو ان کے احکامات کی تعمیل کر دیا کرتے تھے۔ وہ کسی ایک کے وفادار یا ملازم نہیں تھے۔ جو ان کو رقم فراہم کرتا، اس کی خدمت بجا لانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ وہ کس سازش کا شکار ہو کر یہاں تک پہنچائی گئی ہے، اسے ٹھیک سے علم نہیں تھا لیکن اتنا ضرور سمجھ آ گیا تھا کہ حویلی کے مہمان خانے سے نکلتے ہوئے وہ جس خوش فہمی کا شکار تھی، وہ سراسر غلط تھی۔ اس نے تو یہی سوچا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس کی حویلی میں موجودگی کا پتا چلا کر شہریار نے اس کی رہائی کا بندوبست کیا ہے۔ خود کو لینے کے لیے آنے والوں کے ساتھ وہ کافی دیر تک اسی خیال کے تحت سفر کرتی رہی تھی لیکن پھر ان کے سفر کی سمت دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ تاریک راہوں پر گھوڑے دوڑاتے وہ لوگ جنگل میں داخل ہو گئے تھے اور کسی قسم کی دشواری یا جھجک کے بغیر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

رات کے اندھیرے میں جنگل کے اندر ہونے والے اس سفر نے ماہ بانو کو خوف زدہ کر دیا اور اس نے اپنے آگے موجود گھڑسوار سے استفسار کیا۔ اس استفسار کے جواب میں اسے بے ہوشی کی کوئی دوا سونگھا دی گئی اور دوبارہ جب اسے ہوش آیا تو وہ اس جگہ موجود تھی۔ یہ انوکھی جگہ تھی۔ یہاں جنگلی بیل بوٹوں کی خوشبو بھی تھی اور پرندوں کی چہکاریں بھی۔ تازہ ہوا بھی تھی اور ٹھنڈا میٹھا پانی بھی لیکن پھر بھی کسی خوب صورتی کے بجائے وحشت کا احساس ہوتا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس کو اچھا خاصا وقت ایک تنگ جھونپڑی نما جگہ پر گزارنا پڑا جہاں اسے وقت پر کھانا فراہم کر دیا جاتا تھا۔ اس کے لیے کھانا لے کر آنے والی ایک عورت نے ہی اس کے پوچھنے پر اسے بتایا تھا کہ وہ جنگل میں ڈاکوؤں کے ایک ڈیرے پر موجود ہے اور کسی وڈیرے سے سودے بازی کے نتیجے میں یہاں پہنچائی گئی ہے۔ وہ وڈیرا کون تھا، اس بات کا عورت کو خود بھی علم نہیں تھا۔ خود ماہ بانو بھی درست اندازہ لگانے سے قاصر تھی۔

وہ چودھری افتخار عالم شاہ کی قید میں تھی اور وہاں سے اسے بہت پُراسرار طریقے سے یہاں پہنچایا گیا تھا۔ اگر یہ کام چودھری کا تھا تو اسے اتنا لمبا چوڑا ڈراما رچانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ سیدھے سادے طریقے سے بھی اسے ان لوگوں کے حوالے کر سکتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ وہ تو خود اس کا متمنی تھا۔ اس سے بھلا یہ امید کیسے رکھی جا سکتی تھی کہ وہ اسے کسی اور کے حوالے کر دے۔ یہ کسی دوسرے ہی شخص کا کام تھا جو کسی نہ کسی طرح چودھری کا دشمن تھا اور اسے زک پہنچانا چاہتا تھا لیکن وہ بہرحال اندازہ لگانے سے قاصر تھی کہ وہ کون ہو سکتا ہے؟ یوں بھی اس کے لیے اس سوال کا جواب جاننے سے زیادہ اہم اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا تھا۔

قسمت و حالات کے گرداب میں پھنسی وہ ایک مصیبت سے نکلتی تھی تو دوسری میں الجھ جاتی تھی۔ حالات نے اسے ایسا بے دست و پا کر دیا تھا کہ وہ ایک عام فرد کی طرح معمول کی زندگی گزارنے سے قاصر تھی۔ پچھلے دنوں شہریار کے تعاون سے اس نے ایسی زندگی کا آغاز کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس زندگی کا دورانیہ بہت مختصر ثابت ہوا اور وہ ایک اور نئے جال میں پھنس گئی۔ ڈاکوؤں کے اس ڈیرے پر پہنچنے کے بعد اسے تقریباً ڈیڑھ دن بعد جھونپڑی سے باہر آنے کی اجازت دی گئی اور وہ بھی اس حالت میں کہ اس کے دونوں پیروں کے درمیان ایک زنجیر تھی۔ اس زنجیر کا طول اتنا کم تھا کہ وہ چل تو بے شک سکتی تھی لیکن بہت چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر۔ یہ انتظام یقیناً اسے فرار سے روکنے کے لیے کیا گیا تھا۔ چلنے پھرنے کی آزادی کیوں دی گئی، وہ اس نے اس وقت جانا جب اسے جھونپڑی سے نکالنے کے بعد ایک اوپن ایئر کچن میں پہنچایا گیا اور ایک بڑا سا تھال بھر کر آٹا گوندھنے کے بعد روٹی پکانے کا حکم ملا۔ اتنی مقدار میں آٹا گوندھنے اور روٹیاں پکانے کا یہ اس کی زندگی میں پہلا اتفاق تھا۔ ان گنت روٹیاں پکا پکا کر اس کے حواس جانے لگے اور اسے یوں لگا کہ وہ انسانوں کے بجائے جنوں کی خوراک کا بندوبست کرنے پر مامور کر دی گئی ہو۔ روٹی پکا کر فارغ ہوئی تو اس کی کمر تختے کی طرح اکڑ گئی تھی اور جسم کے ایک ایک مسام سے پسینا بہہ رہا تھا۔ اس نے خود کو واپس جھونپڑے میں لے جانے کے لیے آنے والے ڈاکو سے درخواست کی کہ اسے کچھ دیر کھلی ہوا میں بیٹھنے کی اجازت دے دی جائے۔ وہ ڈاکو جو اپنے حلیے اور چال ڈھال سے باقی سب سے مختلف نظر آتا تھا، اس کی یہ بات مان گیا اور اب وہ اس بڑے سے پتھر پر بیٹھی ہوئی اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے یہاں بیٹھنے کی اجازت دینے والا ڈاکو بھی اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا اور بڑی تن دہی سے رائفل کی صفائی کر رہا تھا۔

ماہ بانو یونہی اس کا جائزہ لینے لگی۔ ڈاکو جوان العمر آدمی تھا اور اس نے باقی سب کی طرح گھیردار شلوار قمیص کے بجائے گھسی ہوئی جینز اور ٹی شرٹ کے اوپر چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر موجود داڑھی بھی خاصی نفاست سے ترشی ہوئی تھی اور چہرے پر وحشت کے بجائے قدرے نرمی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ وہ ان میں سے نہیں ہے بلکہ ان سے مختلف کوئی پڑھا لکھا انسان ہے۔ لیکن

لگنے سے کیا ہوتا ہے، تھا تو بہر حال وہ ان ڈاکوؤں کا ہی ایک ساتھی۔

"اے لڑکی! چل ادھر آ اور کپڑے دھونے میں اس کا ہاتھ بٹا۔" وہ جانے کب تک اپنے خیالوں میں گم رہتی کہ ایک کرخت آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے آواز کی سمت میں دیکھا۔ کنوئیں سے پانی نکالنے والا تنومند ڈاکو اس سے مخاطب تھا۔ کچھ دیر قبل جب اس نے اس کی طرف دیکھا تھا تو وہ تنہا تھا لیکن اب اس کے قریب ایک مدقوق سی عورت کھڑی نظر آ رہی تھی۔ عورت کے جسم پر معمولی گھسا پٹا لباس تھا جو اس کے دبلے پتلے لاغر جسم پر خاصا ڈھیلا ہو رہا تھا۔ ماہ بانو پکارنے والے کے حکم کی تعمیل کے لیے اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور زنجیر میں جکڑے پیروں سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کی سمت بڑھ گئی۔ قریب پہنچ کر اس نے دیکھا، کنوئیں کے قریب ہی ایک بڑا سا چبوترا بنا ہے جس پر دُھلنے والے کپڑوں کا ایک گٹھڑ رکھا ہوا ہے۔

"میں کپڑوں کو صابن لگا کر دیتی جاتی ہوں، تم انہیں کھنگال لینا۔" مدقوق الحال عورت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر گٹھڑ کھولنے لگی۔ ماہ بانو کا کام فی الحال شروع نہیں ہوا تھا اس لیے وہ کھڑی عورت کا جائزہ لیتی رہی۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ کافی عمر دار محسوس ہو رہی تھی۔ شاید کام کی زیادتی نے ہی اسے چڑچڑا بھی کر دیا تھا۔ اپنی حالت کے برخلاف وہ خاصی پھرتی سے کام کر رہی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" ماہ بانو نے اس سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

"لیلیٰ۔" عورت نے مختصر جواب دیا اور ایک قمیص کو برش سے رگڑنے لگی۔ اس کا انداز دیکھتے ہوئے ماہ بانو کو اندازہ ہوا کہ وہ بات چیت کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ وہ خود بھی خاموشی سے کام میں لگ گئی۔ یہ کام روٹیاں پکانے سے زیادہ محنت طلب اور دشوار تھا۔ کپڑے نہ صرف بے حد میلے تھے بلکہ ان سے شدید بدبو اٹھ رہی تھی۔ ماہ بانو کو کئی بار ان کی بُو سے ابکائی سی آ گئی۔

"بہت مشکل کام ہے یہ تو۔ بندہ اس بُو سے مر بھی سکتا ہے۔" ایک گھیر دار شلوار کو زور لگا کر نچوڑتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔

"یہاں موت اتنی آسان نہیں ہے۔ تم صرف کپڑے دھونے سے گھبرا گئیں، جب ان کے بدبودار جسموں کو برداشت کرنا پڑے گا تب کیا کرو گی؟" اس کی ساتھی عورت نے اس کی بڑبڑاہٹ کے جواب میں طنز سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" ماہ بانو متوحش ہوئی۔

"مطلب بہت جلد تمہیں خود سمجھ آ جائے گا۔" عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دے کر وہ دُھلے ہوئے کپڑوں سے بھری بالٹی اٹھا کر وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ کچھ فاصلے پر زمین میں بانس گاڑھ کر ان کے ساتھ رسّیاں باندھی گئی تھیں۔ لیلیٰ نامی وہ عورت کپڑے جھٹک جھٹک کر رسّیوں پر پھیلانے لگی۔ ماہ بانو کچھ دیر تک اسے یہ کام کرتا دیکھتی رہی پھر وہاں سے ہٹ گئی۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ اس مشقت سے دکھ چکا تھا اور اب وہ اپنے لیے مخصوص جھونپڑی میں جا کر کچھ دیر آرام کرنا چاہتی تھی۔ چلتے چلتے اس کی نظر یونہی اس طرف گئی جہاں سب سے منفرد نظر آنے والا ڈاکو بیٹھا اپنی رائفل صاف کر رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر ٹھٹک گئی کہ وہ ڈاکو اپنا کام چھوڑ کر بہت محویت کے ساتھ اسے تک رہا ہے۔ ماہ بانو سے نظر ملی تو اس نے آہستہ سے اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا لیکن اس کی چوری تو بہر حال وہ پکڑ ہی چکی تھی۔ ڈاکو کی محویت نے لیلیٰ کی کچھ دیر قبل کہی ہوئی بات کے ساتھ مل کر اس کو بُری طرح ہراساں کر دیا۔ زندگی میں پے در پے پیش آنے والے کئی واقعات نے مل کر اسے اس کم عمری میں ہی یہ بات سمجھا دی تھی کہ مرد مفت میں ہاتھ آئی عورت کو بخشنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اوڑھنی کو اور بھی اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتی ہوئی تیز تیز قدموں کے ساتھ وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ پیروں میں پڑی زنجیر اس تیزی کو قائم رکھنے میں اگرچہ رکاوٹ ڈال رہی تھی لیکن پھر بھی اس نے حتی الامکان تیزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ جھونپڑی میں پہنچ کر اس نے قدرے سکون کا سانس لیا اور زمین پر بچھی ترپال پر گرنے کے انداز میں لیٹ گئی۔ مشقت سے تھکے ہوئے جسم نے اسے بہت دیر تک سوچنے کا موقع نہیں دیا اور جلد ہی وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ سوتے ہوئے وقت کا کتنا بڑا حصہ گزر گیا، اسے اندازہ نہیں ہو سکا۔ بہت گہری نیند سوتے ہوئے ایک عجیب سے احساس نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اس احساس کو سمجھتے ہی اسے بُری طرح ڈر لگا اور وہ اچھل کر اپنی جگہ پر اٹھ بیٹھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہر یار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِنگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہر یار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا ہے اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ پیر آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے شہر یار کا سہارا پاکر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ آفتاب اور کشور خفیہ نکاح کر لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چودھری اسے اغوا کروا لیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شہر یار اپنے ڈرائیور مشابرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو [illegible] منتقل کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کر لیتے ہیں اور اس کارروائی میں اکرم خان مارا جاتا ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چودھری، ماہ بانو کی تلاش میں ہے، وہ اسے ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے مگر عمران ایک جگہ ایوالانچ کی زد میں آ جاتا ہے اور اس میں دب کر اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ ادھر مشابرم خان ماہ بانو کی تلاش میں اس برف زار تک پہنچ جاتا ہے اور دشمنوں کا پتا لگا لیتا ہے اور وہاں ایمونیشن بلاسٹ ہونے سے کافی تباہی ہوتی ہے۔ چودھری افتخار کو کشور کے غیاب کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چودھری، ماسٹر آفتاب کو اغوا کرا لیتا ہے۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کہ مخبر ہوتا ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ادھر مشابرم خان لڑائی کے دوران زخمی ہو جاتا ہے اور پاکستان آرمی والوں کے وہاں پہنچنے سے ان کی تحویل میں پہنچ جاتا ہے۔ شہر یار ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جگو کا سہارا لیتا ہے اور جگو آفتاب کو چودھری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ پاکستان میں دہشت گردوں کا ٹھکانا تباہ ہونے سے ڈیوڈ چراغ پا ہو جاتا ہے اور تحقیق کے لیے لنڈا کو یہاں بھیجتا ہے۔ ادھر ماہ بانو کو بچانے والا مہربان شخص اپنے واقف کار کے توسط سے اسے ایک مخبر سے ملوا دیتا ہے جو ماہ بانو کی فراہم کردہ معلومات کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہر یار کو بھی اس واقعے کی اطلاع مخبر کے ذریعے مل جاتی ہے اور شہر یار فوراً اسکردو پہنچ جاتا ہے اور مشابرم خان اور ماہ بانو کو آرمی کی کسٹڈی سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ماہ بانو کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے کراچی منتقل کر دیتا ہے۔ صحافی افضل قاتلانہ حملے میں مارا جاتا ہے۔ ادھر چودھری افتخار کے آدمی اسکول کی عمارت اور ٹیچرز کی رہائش گاہ کو آگ لگا دیتے ہیں جہاں رہائش پذیر تین اساتذہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ شہر یار اس واقعے کی رپورٹ چودھری کے خلاف درج کروا دیتا ہے۔ ماہ بانو کراچی میں میڈیکل کالج میں مہرین کے نام سے داخلہ لے لیتی ہے۔ وہاں اسے راحیلہ نامی ایک لڑکی ملتی ہے جو اس سے کافی گھل مل جاتی ہے۔ کشور اور آفتاب افضل کے ایک دوست بابر کی مدد سے اسلام آباد میں اس کی خالہ کے گھر پناہ گزیں ہو جاتے ہیں مگر کشور کو یہاں بھی سکون میسر نہیں آتا۔ خالہ کا اوباش بیٹا اسے تنگ کرتا ہے۔ ادھر چودھری کے وفادار بابر کو کچھ لوگ یرغمال بنا کر تشدد کا نشانہ بناتے ہیں جس کا الزام چودھری شہر یار پر لگاتا ہے۔ ماہ بانو کو اس کی سہیلی راحیلہ اپنے بھائی سے ملوانے گھر لے جاتی ہے۔ وہاں ماہ بانو پڑوس کے بنگلے میں جہاں گرد کو دیکھ لیتی ہے اور شہر یار کو مطلع کرتی ہے۔ شہر یار فوراً کراچی آ جاتا ہے۔ وہاں وہ اپنے ایک دوست کے خالی بنگلے میں ٹھہرتا ہے اور ماہ بانو کے بتائے ہوئے بنگلے کی نگرانی شروع کر دیتا ہے۔ نگرانی کے دوران اسے سرمد نظر آتا ہے۔ وہ اس سے مل کر جہاں گرد کا پتا لگاتا ہے اور ماہ بانو کی مدد سے اس پر قابو پا لیتا ہے۔ ادھر چودھری کے کارندے بابر کو مار کر آفتاب اور کشور کا پتا لگا لیتے ہیں لیکن وہ وہاں سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ ماہ بانو اپنی سہیلی راحیلہ کے گھر جاتی ہے۔ وہاں سے واپسی پر اسے چودھری کا کارندہ نظر آتا ہے جو اسے اشارے سے اپنے پاس بلاتا ہے مگر ماہ بانو خوف سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ جب اسے ہوش آتا ہے تو وہ راحیلہ کے گھر میں ہوتی ہے۔ ادھر کشور کی ملازمہ خاص رانی کا منگیتر اکو جنگل میں پوست کی کاشت کا پتا لگا لیتا ہے۔ اسے وہاں چودھری کے کارندے دیکھ لیتے ہیں اور اس کا پیچھا کر کے اسے مار دیتے ہیں۔ جہاں گرد (ورما) کے لوگ ایک سینئر ڈاکٹر کی فیملی کو یرغمال بنا کر ڈاکٹر کو ساتھ دینے پر آمادہ کرتے ہیں اور ورما کو اسپتال سے نکال لے جاتے ہیں۔ اس میں کافی لوگوں کی جانیں جاتی ہیں اور ڈاکٹر زیرِ تفتیش آ جاتا ہے۔ ادھر شہر یار کے ماموں لیاقت رانا پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ شہر یار خبر سن کر پریشان ہو جاتا ہے اور انہیں دیکھنے کے لیے لاہور جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر ماریا بھی اس کے ساتھ لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے۔ راستے میں ڈاکٹر ماریہ کی طبیعت کی خرابی کے باعث انہیں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں مختصر قیام کرنا پڑتا ہے اور اس قیام کے دوران وہ ماریا کے قریب ہو جاتا ہے۔ ماہ بانو شہر یار کے رویے پر پریشان ہوتی ہے اور اسی کیفیت کے زیرِ اثر اسے نیند نہیں آتی۔ اس کی روم میٹ اسے ٹرنکولائزر دے دیتی ہے جسے کھا کر وہ نیند کی وادی میں اترتی چلی جاتی ہے۔ آنکھ کھلنے پر ماہ بانو خود کو نامانوس سی جگہ پر پاتی ہے اور اسے پتا چل جاتا ہے کہ وہ ایک بار پھر چودھری کے ہتھے چڑھ چکی ہے۔ ادھر شہر یار اپنے قدم بہکنے پر خود کی اور ماریا کی نظروں میں گر جاتا ہے اور ماریا کی طرف سے گفتگو سن کر اس سے شادی کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ وڈی چودھرائن اپنے داماد سے ماہ بانو کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کرتی ہے اور اشرف شاہ ماہ بانو کو چودھری کی قید سے نکال کر ڈاکوؤں کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ چودھری سمجھتا ہے کہ اس ساری کارروائی کے پیچھے شہر یار کا ہاتھ ہے۔ ادھر آفتاب جمعے کی نماز کے لیے جاتا ہے تو وہاں اسے پیش امام کا چہرہ شناسا سا لگتا ہے اور کسی کی صورت ذہن میں آنے کے بعد وہ اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہے۔ شہر یار کی شادی کے موقع پر وہاں چودھری کی موجودگی اسے مشتعل کر دیتی ہے اور وہ اس سے گتھم گتھا ہو جاتا ہے۔ ماہ بانو ڈاکوؤں کے جنگل میں ہوتی ہے اور ان کے کام کاج کرتی ہے۔ وہ تھک ہار کر لیٹتی ہے تو اسے نیند آ جاتی ہے مگر ایک احساس اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس احساس کو سمجھتے ہی اسے جیسے ڈنک لگتا ہے اور وہ اچھل کر اٹھ بیٹھتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جھونپڑی میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کونے میں جلتی چھوٹی سی لالٹین کی مدھم لَو نے ماحول کو بس اتنا واضح کیا تھا کہ وہاں موجود اشیا سائے کی صورت میں نظر آ رہی تھیں۔

ماہ بانو نے ماحول کو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس کے ذہن نے سب سے پہلے اس احساس کا تجزیہ کیا جس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ انسانی ہاتھ کا لمس تھا جسے وہ اپنے ہاتھ کی پشت پر متحرک محسوس کر سکتی تھی۔ متحرک ہاتھ کا کھردرا پن اور سختی صاف بتا رہی تھی کہ وہ مردانہ ہاتھ ہے۔ لمحہ بھر میں مکمل ہونے والے تجزیے کا نتیجہ سامنے آتے ہی وہ اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھی۔ اس کے ہاتھ پر متحرک ہاتھ اس کے اس ردِعمل پر فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا۔ ماہ بانو نے آنکھیں پھاڑ کر تاریکی کی چادر میں چھپے اس شخص کو دیکھنے کی کوشش کی۔ ذرا سی کوشش سے ماحول سے ہم آہنگ ہو جانے والی اس کی نظروں نے جس شخص کو شناخت کیا، وہ اس کی توقع کے بالکل برخلاف تھا۔ چند گھنٹے قبل ہی تو اس نے اس شخص کے بارے میں اندازہ لگایا تھا کہ وہ اپنے سب ساتھیوں سے مختلف ہے لیکن شاید صرف اس کا ظاہر ہی ان لوگوں سے مختلف تھا۔ باطن میں وہ بھی وہی تھا جو اس کے دوسرے ساتھی تھے۔

اپنے مختلف پہناوے کی وجہ سے وہ دوسروں سے کچھ منفرد محسوس ہوا تھا اور ماہ بانو نے اس وقت اسے آسانی سے شناخت بھی اسی لیے کر لیا تھا کہ وہ دوسرے ڈاکوؤں کی طرح گھیردار شلوار قمیص کے بجائے جینز اور شرٹ پہنے ہوا تھا لیکن افسوس ناک بات یہ تھی کہ حلیے سے دوسروں سے الگ نظر آنے والا کردار کے معاملے میں بالکل مختلف ثابت ہوا تھا۔ اس کے ساتھی اگر دن بھر اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے تھے تو وہ بھی اپنی ہوس پوری کرنے رات کی تاریکی میں اس تک پہنچ گیا تھا۔ ماہ بانو کو خود کو اس کے ناپاک عزائم سے محفوظ رکھنا تھا چنانچہ وہ تیزی سے اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچنے لگی۔

”آئی ایم سوری! میں نے آپ کی نیند خراب کر دی۔“ وہ کچھ سوچ پاتی، اس سے قبل ہی اندھیرے کی چادر کے اس پار سے ایک آواز سفر کرتی ہوئی اس تک پہنچی اور اپنے الفاظ سے اسے پہلے سے بھی زیادہ چونکا گئی۔ بولنے والے کا لہجہ بہت صاف اور نرم تھا اور واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ اس شخص کی ہر خصوصیت سے بڑھ کر ماہ بانو کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس وقت اس کی وہاں موجودگی کی وجہ جان سکے کیونکہ اس کی جس حرکت کی وجہ سے اس کی نیند خراب ہوئی تھی، وہ نظرانداز کیے جانے کے قابل نہیں تھی۔

”میں اس لیے یہاں آیا ہوں کہ صرف مجھے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ میں یہاں آ سکوں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میں نے یہ اختیار خود اپنے لیے حاصل کیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ ماہ بانو نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔ تاریکی کی وجہ سے اس کے چہرے کے نقوش بھی واضح طور پر نظر نہیں آ رہے تھے۔ تاثرات سمجھنا تو بہت دور کی بات تھی۔

”مطلب...“ اس نے سوچنے والے انداز میں کہا اور پھر خاموشی اختیار کر لی۔

ماہ بانو اس کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ آخر اس نے کچھ دیر بعد اپنے لبوں پر پڑا خاموشی کا قفل کھول ہی دیا۔

”ہم ڈاکو ہیں اور ان جنگلات میں پناہ گزین ہیں، یہ بات تو تم نے جان ہی لی ہوگی؟“ اس نے گویا اصل گفتگو سے قبل تمہید باندھنے کے لیے یہ سوال کیا۔

”ظاہر ہے اور بہت سے لوگوں کی طرح میں بھی یہ بات جانتی ہوں کہ ان جنگلات میں ڈاکوؤں کا ٹھکانا ہے جو وقتاً فوقتاً اردگرد کے معصوم دیہاتیوں کو لوٹتے رہتے ہیں۔ اپنی ان معلومات کی روشنی میں میرے لیے یہ اندازہ لگانا کیا مشکل تھا کہ تم لوگ ڈاکو ہو۔ ویسے اگر میرے علم میں یہ بات نہ بھی ہوتی تو تم لوگوں کی وضع قطع اور اسلحہ دیکھ کر بھی سمجھ جاتی۔“ ماہ بانو نے اسے جواب دیا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، یقیناً تم نے ہمیں دیکھتے ہی ہمارے بارے میں جان لیا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ہم نے اس جنگل میں اپنے لیے زندگی کی ممکنہ سہولیات جمع کر لی ہیں اور کافی آرام دہ زندگی گزار رہے ہیں لیکن یہاں ایک چیز کی بہت کمی ہے اور اس چیز کے بغیر رہنا مرد کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔“ ماہ بانو نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ کس چیز کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

یہاں اتنے بہت سارے مردوں کے درمیان اس نے عورت کی شدید قلت دیکھی تھی۔ اپنے علاوہ یہاں اس نے صرف دو عورتیں دیکھی تھیں، ایک وہ موٹی تڑنگی عورت جو اسے کھانا وغیرہ پہنچاتی رہی تھی اور دوسری وہ سوکھی چمرخ جس کے ساتھ مل کر اس نے آج ان ڈاکوؤں کے میلے کپڑوں کا ڈھیر دھویا تھا۔ وہ دو عورتیں یقیناً اتنے سارے مردوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ناکافی تھیں۔ پھر ان کا جو حال تھا، اسے دیکھ کر بھی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کسی مرد کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

لیے کوئی کشش نہیں رکھتی ہوں گی اور وہ بس مجبوراً ہی ان سے کام چلا رہے ہوں گے۔ ایسے میں ماہ بانو کا تازہ گلاب کا سا شاداب وجود دیکھ کر ان کی رال ٹپکنا تو لازم تھا اور اس کے سامنے موجود شخص یقیناً اس کا پہلا طلب گار بن کر یہاں آیا تھا۔ اس کے بعد شاید وہ بھی باقی دونوں عورتوں کی طرح سب کی مشترکہ جاگیر بن جاتی۔ ان عورتوں کے ساتھ وہاں کیا سلوک روا رکھا جا رہا تھا، اس بات کا اندازہ اس نے خود ہی لگا لیا تھا اور اب خود کو بھی انہی کی قطار میں محسوس کر کے اندر سے کانپ کر رہ گئی۔ اس کی کیفیت سے بے نیاز اس کی تنہائی میں آنے والے ڈاکو نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

''اپنی زندگی میں موجود اس کمی کو پورا کرنے کے لیے یہاں کچھ نہ کچھ بندوبست کیا جاتا رہتا ہے۔ کبھی کسی واردات کے وقت جیسے موقع لگے، وہ استفادہ کر لیتا ہے... کبھی یہ لوگ کہیں سے کوئی لڑکی اٹھا لاتے ہیں اور کبھی کبھار کسی پیشہ ور طوائف کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں لیکن یہ سارے چانسز مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ پکڑے جانے کا خوف کبھی بھی کسی کو دل بھر کر اپنی حسرتیں نکالنے کا موقع نہیں دیتا۔ ہمارا ایک ساتھی اس معاملے میں بہت ہی بے صبرا تھا اور اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے بڑی پابندی سے ایک طوائف کے کوٹھے پر جاتا تھا۔ وہاں کسی نے مخبری کر دی۔ پولیس نے چھاپا مار کر اسے کوٹھے پر سے گرفتار کر لیا۔ ہم تک بھی اس کی گرفتاری کی اطلاع پہنچ گئی۔ پورے گروہ میں کھلبلی مچ گئی کہ جانے کب اس ساتھی کے ذریعے پولیس ہمارے ٹھکانے تک پہنچ جائے۔ ہم سارے روپوش ہونے کے لیے اِدھر اُدھر بکھر گئے لیکن ہمارا وہ ساتھی بھی جوان کا بچہ نکلا۔ پولیس کا تشدد سہتے سہتے اس نے اپنی جان دے دی لیکن زبان نہیں کھولی کوئی۔'' وہ اسے ایک بات کی تفصیل بتاتے بتاتے دوسرے معاملے کو چھیڑ بیٹھا اور اپنے ساتھی کی تعریفیں کرنے لگا۔

''تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟ مجھے تمہارے ان سب معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' اچھی خاصی خوف زدہ ماہ بانو نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اسے ٹوکا۔

''مگر میرا خیال ہے کہ تمہیں دلچسپی لینی چاہیے۔ اب تم ہمارے درمیان ہو اور یقیناً تمہیں ایک طویل عرصے تک ہمارے ساتھ رہنا ہے۔ ویسے بھی میں نے یہ سب کچھ تمہیں خود سے بتانا شروع نہیں کیا ہے۔ تم نے مجھ سے کچھ سوالات کیے تھے اور میں تمہیں ان سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' اسے اپنا ٹوکے جانا پسند نہیں آیا اور کچھ ناراضی سے اسے جواب دیتے ہوئے بولا۔

''میں تو یہ بھی جاننا چاہتی ہوں کہ میں یہاں کیسے اور کس کی وجہ سے پہنچی ہوں؟ کیا تم مجھے میرے ان سوالوں کے جواب دو گے؟'' اس شخص کا رواں لہجہ اس کے تعلیم یافتہ ہونے کی چغلی کھا رہا تھا اور ایک یہی چیز ماہ بانو کو امید دلا رہی تھی کہ وہ ڈاکو ہونے کے باوجود قدرے مہذب ثابت ہو سکتا ہے اس لیے اس کی ناراضی کے باوجود حوصلہ کرتے ہوئے اپنے ذہن میں اگلے سوالات بھی کر ڈالے۔ یوں بھی وہ جس تواتر سے بول رہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ گفتگو کی روانی میں وہ اسے بہت کچھ بتا سکتا ہے۔

''تم جو جاننا چاہتی ہو میں تمہیں وہ بھی بتا دوں گا لیکن پہلے تم مجھے اپنے پچھلے سوالوں کا جواب مکمل کرنے دو۔ میں کبھی بھی ادھورے پرچے حل کرنے کا عادی نہیں رہا۔'' اس کے اس جملے نے ماہ بانو کا یقین اور بھی پختہ کر دیا کہ وہ کوئی پڑھا لکھا آدمی ہے جو نہ جانے کس طرح ان اجڈ ڈاکوؤں کے ساتھ آ ملا ہے۔

''ٹھیک ہے۔ پہلے تم اپنی بات مکمل کر لو پھر مجھے میرے اس سوال کا جواب دے دینا۔'' اس نے قدرے نرم اور متوازن لہجے میں گویا اسے اجازت دی۔ اس پر چھا جانے والا خوف بھی اب بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔

''میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے ساتھی اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتے ہیں۔ کچھ نہ نے تو یہاں ڈیرے پر موجود دونوں عورتوں میں سے ہی کسی سے کام چلا لیا جاتا ہے لیکن میں اپنے ساتھیوں میں وہ واحد شخص ہوں جس نے خود کو قابو میں رکھا ہوا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ میری زندگی میں عورت کا خانہ بالکل خالی رہا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرے اندر کوئی خواہش نہیں ہے یا میں کوئی زاہد خشک ہوں۔ میں بھی ہر مرد کی طرح اپنے دل میں ایک عورت کی تمنا رکھتا ہوں لیکن اس معاملے میں میرا نفس کسی جانور کی طرح بے لگام نہیں ہے۔ اصل میں جمالیاتی ذوق اتنا بلند ہے کہ کوئی معمولی عورت کبھی میرے معیار پر پوری ہی نہیں اتر سکی۔ میرے ساتھی میری اس بات کو نہیں مانتے تھے اور اکثر اس شک کا اظہار کرتے تھے کہ شاید میں اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ میں نے کبھی ان کے شکوک دور کرنے کے لیے بھی خود کو اپنے معیار سے نیچے لانا پسند نہیں کیا لیکن جب میں نے تمہیں دیکھا تو مجھے لگا کہ میرا انتظار ختم ہو گیا ہے اور تم ہی وہ عورت ہو جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے نمبردار سے کہہ کر تمہیں اپنے لیے

مانگ لیا اور ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھ دی کہ تمہیں میرے سوا کوئی اور نہیں چھوئے گا۔ کیونکہ میں نے پہلی بار کسی عورت کے لیے دلچسپی کا اظہار کیا تھا اس لیے سردار نے میری بات ماننے سے انکار نہیں کیا اور وعدہ کر لیا کہ جب تک میرا تم سے دل نہیں بھر جاتا یا میں خود اجازت نہیں دے دیتا، تب تک گروہ کا کوئی دوسرا شخص تمہیں ہاتھ نہیں لگائے گا۔''

وہ نہایت اطمینان سے جو کچھ بتا رہا تھا، اسے سن کر ماہ بانو کا اپنا سارا اطمینان رخصت ہو گیا اور وہ سمجھ گئی کہ وہ ایک بار پھر ان حالات میں پھنس گئی ہے جن سے اب تک بچتی رہی ہے۔ چودھری افتخار سے لے کر اس ڈاکو تک اس نے مردوں کے کئی روپ دیکھے تھے۔ وہ سارے زبان، لباس اور پیشے وغیرہ کے اعتبار سے تو ایک دوسرے سے مختلف تھے لیکن عورت کے معاملے میں سب کا ندیدہ پن یکساں تھا۔ وہ اللہ کی مہربانی سے اب تک ان حیوان صفت مردوں سے بچتی رہی تھی لیکن نہیں جانتی تھی کہ اب اس جنگل بیابان میں اس کے ساتھ کیا پیش آتا ہے؟ ایک ایسی جگہ پر جہاں سب ہی عورت کے معاملے میں بھوکے درندوں کی طرح تھے، کوئی اس کا مددگار ثابت بھی ہوتا تو کیسے؟

''میں تمہیں تمہارے ناپاک ارادوں میں ہرگز بھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔'' خوف زدہ ہونے کے باوجود اس نے اپنے مالک بنے بیٹھے ڈاکو کے سامنے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔

''اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ ابھی تو میں تمہیں تمہارے سوالوں کے جواب دے رہا ہوں اور یہ بات میں تم پر پہلے ہی واضح کر چکا ہوں کہ میں ادھورے پرچے حل کرنے کا عادی نہیں ہوں۔'' اس نے ماہ بانو کی بات کو کسی دخل اندازی سے زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوئے اسے جواب دیا اور اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''تم نے پوچھا تھا کہ تم یہاں کیسے اور کس کی وجہ سے پہنچی ہو تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ تمہیں یہاں پہنچانے کا ذمے دار چودھری کا داماد اشرف شاہ ہے۔ کسی وجہ سے وہ نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری شادی چودھری سے ہو اس لیے اس نے تمہیں حویلی سے غائب کرنے کا بندوبست کر دیا۔ وہ چاہتا تو تمہیں ہلاک بھی کروا سکتا تھا لیکن اس نے ایک تیر سے دو شکار کرتے ہوئے تمہیں تحفے کے طور پر سردار کے حوالے کر دیا۔ سردار کی اشرف شاہ سمیت سارے چودھریوں سے اچھی دوستی ہے اور اس دوستی کو نبھانے کے لیے ان کے درمیان باہمی مفادات کے سلسلے میں اس طرح کے کام ہوتے رہتے ہیں۔ اب تم اپنا معاملہ ہی لے لو۔ اشرف شاہ نے اپنی خواہش کے مطابق تم سے جان بھی چھڑا لی اور سردار کو تحفہ بھیج کر اسے خوش بھی کر دیا۔ اب آئندہ اشرف شاہ سردار سے اپنا کوئی کام کہے گا تو سردار انکار تھوڑی کر سکے گا۔''

اس کا جواب سن کر ماہ بانو سوچ میں پڑ گئی کہ آخر اشرف شاہ کو اس سے کیا دشمنی تھی کہ اس نے اسے یہاں ڈاکوؤں کے درمیان بھیج دیا... لیکن سوچنے پر بھی اسے دشمنی کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آئی، البتہ وہ یہ ضرور سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اس کی چودھری سے شادی ہونے کی صورت میں یقیناً اشرف شاہ کے کسی مفاد پر ضرب پڑتی ہو گی اس لیے اس نے یہ سارا چکر چلایا تھا۔ بہرحال وہ تو اس کے لیے بیک وقت نجات دہندہ بھی ثابت ہوا تھا اور دشمن بھی۔ اس کی وجہ سے ایک طرف وہ چودھریوں کے چنگل سے نکلی تھی تو دوسری طرف اس جنجال میں آ پھنسی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' اندھیرے کے باوجود اس نے ماہ بانو کی کیفیات بھانپ لیں اور اس سے سوال کیا۔

''کچھ نہیں۔'' ماہ بانو نے اسے اپنی سوچوں سے آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

''شاید تم مجھ سے خوف زدہ ہو۔'' اس نے کافی حد تک درست اندازہ لگایا۔

''جو شخص میری عزت کے درپے ہے کیا مجھے اس سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے؟'' جواباً وہ تیز لہجے میں بولی۔

''نہیں، کم از کم تمہیں مجھ سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں نے جو کچھ کیا، وہ تمہاری عزت بچانے کے لیے کیا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ تم وہ پہلی لڑکی ہو جس نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے اور جس کی تمنا میرے دل میں جاگی ہے لیکن میں سردار سے تمہیں مانگنے کے بعد مسلسل تمہارے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ میں نے بہت غور کیا۔ فطری طلب بھی مجھے اکساتی رہی لیکن بے شمار برائیوں میں مبتلا ہو جانے کے باوجود میں خود کو اتنا گرانے کی ہمت نہیں کر سکا کہ اپنے ہاتھوں کسی عورت کی عزت پامال کر سکوں۔ تم بہت پیاری لڑکی ہو۔ ابھی جب میں نے تمہارے ہاتھ تھام رکھے تھے تو میرے دل کو بڑا سکون محسوس ہو رہا تھا لیکن اس سے زیادہ قربت کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔'' وہ اتنا کہہ کر یک دم ہی رخ موڑ کر وہاں سے باہر نکل گیا۔ دم بخود سی ماہ بانو اس کے اس طرح اچانک چلے جانے پر ناسمجھی کے عالم میں پلکیں جھپکا کر رہ گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆☆☆

"تم دونوں ہنی مون کے لیے کہاں جارہے ہو؟" وہ سب شام کی چائے پر جمع تھے، تب اچانک آفرین رانا نے شہریار اور ماریا کی طرف دیکھتے ہوئے یہ سوال کیا۔

"میں نے کچھ سوچا نہیں۔" شہریار گویا ہڑبڑا کر کسی خیال سے باہر آیا۔ اس نے ڈاکٹر ماریا سے شادی محض اپنی غلطی کی تلافی کے لیے کی تھی۔ اپنے گناہ کا تاوان ادا کرتے ہوئے ذہن میں ہنی مون جیسے خوب صورت خیال کا گزر ہونا ممکن ہی نہیں تھا، اسی لیے آفرین رانا کے سوال نے اسے بوکھلاہٹ میں مبتلا کردیا تھا۔

"سوچا نہیں تو اب سوچ لو۔ ماریا کیا سوچے گی کہ اس کا کس قسم کے آدمی سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ آج کل تو لوگ شادی سے پہلے ہنی مون پلان کرلیتے ہیں اور تمہیں شادی شدہ ہوجانے کے بعد بھی ہوش نہیں۔" آفرین رانا نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ جواباً شہریار نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اس موقع پر ماریا اس کی مدد کے لیے آگے بڑھی۔

"آپ میرے سوچنے کی فکر نہیں کریں آنٹی! میں جانتی ہوں کہ شہریار کس قسم کے آدمی ہیں۔ مجھے ان کی مصروفیات کا بھی اندازہ ہے۔ ان کا شیڈول جتنا ٹائٹ ہے اس میں انہوں نے شادی کا وقت نکال لیا، یہی بڑی بات ہے۔ ہنی مون وغیرہ کے لیے ان کے پاس فی الحال وقت نہیں ہے۔ یہ میں جانتی ہوں اس لیے اس حوالے سے میں نے خود بھی کچھ نہیں سوچا ہے۔"

"سوچنا چاہیے تھا۔ اگر تم اسے اسی طرح ڈھیل دیتی رہیں تو تمہاری زندگی بالکل خشک اور روکھی پھیکی گزرے گی۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ جنون کی حد تک اپنے کام کے ساتھ انوالو ہوجانے کا عادی ہے اور بیوی کی حیثیت سے اس کی یہ عادت تمہیں بہت پریشان کرے گی۔" انہوں نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے گویا ماریا کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ فکر نہیں کریں۔ میں ہر بار انہیں اس طرح نہیں چھوڑوں گی۔ ہمارا ہنی مون ان پر ڈیو رہے گا اور فرصت ملتے ہی میں سب سے پہلے ان سے اپنی پسندیدہ جگہوں پر جانے کا اصرار کروں گی۔ ابھی تو فی الحال میں خود بھی کافی مصروف ہوں۔ پیر آباد کے ہیلتھ سینٹر میں میرے علاوہ کوئی دوسری لیڈی ڈاکٹر نہیں ہے۔ چھٹیوں پر جانے سے پہلے مجھے اپنی جگہ کسی دوسری ڈاکٹر کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔"

وہ بہت سجاؤ سے شہریار کا دفاع کررہی تھی۔ شہریار خاموشی سے بیٹھا ہونے کے باوجود اس بات کو اچھی طرح محسوس کررہا تھا اور دل ہی دل میں ماریا کا شکر گزار بھی تھا۔ شادی کے بعد اس نے اس کے لیے کوئی بھی پریشانی کھڑی نہیں کی تھی۔ وہ ذرا بھی ڈیمانڈنگ نہیں تھی۔ کوئی فرمائش کرنا تو کجا، اس نے شہریار کے لیے دبے انداز پر بھی کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔ ماریا سے قلبی لگاؤ نہ ہونے کے باوجود وہ اس کے اس رویّے پر تہِ دل سے اس کا مشکور تھا۔ ورنہ آج کل اس کے قلب و ذہن کی جو حالت تھی، اس کے ساتھ اگر ماریا بھی اس کے لیے کوئی پریشانی کھڑی کرتی تو وہ بہت ڈسٹرب ہوجاتا۔ پہلے ہی پے در پے ایسے کئی واقعات پیش آچکے تھے جن کی وجہ سے وہ غم و غصے کا شکار تھا۔ اوّل بڑی جدوجہد کے بعد ہاتھ آیا را کا ایجنٹ ورما پولیس کی نااہلی کی وجہ سے اسپتال سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا۔ دوم اچھی بھلی سکون سے کراچی کے ہاسٹل میں مقیم ماہ بانو کو کسی نے اغوا کرلیا، سوم اس کی ساری زندگی کی پارسائی کا بھرم ٹوٹ گیا۔ یہ سارے واقعات کوئی معمولی نہیں تھے۔ ورما اس کی چہیتی بھتیجی شیبا کا قاتل ہونے کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کا دشمن بھی تھا۔ اس نے اب تک جانے ملک کو کتنے نقصان پہنچائے تھے اور اب آزادی ملنے کے بعد کتنے پہنچانے والا تھا، کچھ معلوم نہیں تھا۔

ماہ بانو بھی ایسی غائب ہوئی تھی کہ ابھی تک اس کا کچھ اتا پتا تھا اور نہ ہی اب تک یہ معلوم ہوسکا تھا کہ کس طرح اس تک چودھری کی رسائی ممکن ہوسکی۔ اس نے چاہے اب تک واضح طور پر خود سے یہ اقرار نہیں کیا تھا کہ وہ ماہ بانو کی محبت میں مبتلا ہے لیکن دل میں اس کے لیے جو جذبہ تھا، وہ خود اسے ماہ بانو کے لیے تڑپاتا تھا اور وہ بے چین ہوجاتا تھا کہ وہ جہاں بھی، جس بھی مشکل میں گرفتار ہے، اسے اس سے نجات دلا کر ایک پُرسکون اور خوشیوں بھری زندگی دے سکے۔ وہ اس زندگی میں اپنے ساتھ کو ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ ماہ بانو کے لیے اس کے دل میں جو جذبہ تھا، وہ قطعی بے غرض اور بے لوث تھا۔ اور اب اس کی زندگی میں جو اتنا بڑا حادثہ پیش آچکا تھا، اس کے بعد تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ ماہ بانو جیسی معصوم لڑکی کے ساتھ کی خواہش کرتا۔ ماریا کے معاملے میں اس کے قدم جس طرح ڈگمگائے تھے اور وہ خود اپنی ہی نظروں میں گرا تھا، اس کے بعد تو زندگی بس گناہ کا کفارہ ادا کرتے ہوئے ہی گزرنی تھی اور وہ اسے بھی اپنی خوش قسمتی ہی سمجھ رہا تھا کہ ماریا بہرحال ایک سمجھ دار اور پڑھی لکھی لڑکی ہے جس کا ساتھ اسے قلبی خوشی بے شک نہ دے سکے لیکن وہ اس کے لیے مسائل بھی نہیں کھڑے کرے گی۔

"آپ کا موبائل بج رہا ہے شہریار!" وہ اپنی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ ماریا نے اس کے شانے کو آہستہ سے ہلاتے ہوئے اس کی توجہ موبائل کی طرف مبذول کروائی۔ اس نے موبائل ہاتھ میں لے کر اس کی اسکرین پر آنے والا نمبر دیکھا۔ یہ کال اس آدمی کی طرف سے تھی جسے اس نے کراچی میں ماہ بانو کے اغوا کے واقعے کی تحقیقات کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔

"ایکسکیوزمی۔" اس نمبر کو دیکھ کر وہ سب کے درمیان سے اٹھ کر تیزی سے باہر کی طرف چلا گیا۔ لیاقت رانا کی کوٹھی کا لان خاصا خوب صورت تھا۔ وہاں مختلف اقسام کے کئی پھول دار پودے لگے ہوئے تھے۔ ان پودوں کی شاخیں ہمہ وقت پھولوں سے لدی رہتی تھیں اور دیکھنے والوں کے لیے خوب صورت نظارہ پیش کرتی تھیں لیکن اس وقت وہ کسی نظارے سے لطف اندوز ہونے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس کی ساری توجہ اس کال کی طرف تھی جسے سننے کے لیے وہ سب کے درمیان سے اٹھ کر یہاں آیا تھا۔

"ہاں بولو! کیا بات ہے؟" کال ریسیو کرتے ہی اس نے سوال کیا۔

"شیبا نے اچھی خاصی معلومات کرلی ہے سر! ماہ بانو کی روم میٹ بالکل کلیئر ہے، البتہ اس نے ماہ بانو کی ایک کلاس فیلو کی نشان دہی کی تھی جس کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ ماہ بانو کی اس لڑکی سے کافی دوستی تھی اور وہ کئی بار اس کے ساتھ اس کے گھر بھی گئی تھی۔ میں نے اس لڑکی کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تو بہت سی قابلِ غور باتیں معلوم ہوئیں جن سے مجھے شک ہورہا ہے کہ ماہ بانو کے اغوا میں اس کی وہ قریبی دوست انوالو ہوسکتی ہے۔"

"کہیں اس لڑکی کا نام راحیلہ تو نہیں ہے؟" اس کے علم میں تھا کہ ماہ بانو اپنی ایک کلاس فیلو راحیلہ کے بھائی ڈاکٹر طارق سے اسٹڈیز میں مدد لینے کے لیے اس کے گھر جاتی رہی ہے اس لیے فوراً ہی سوال کیا۔ ماہ بانو کے راحیلہ کے گھر جانے کی وجہ سے ہی تو وہ خواجہ سراؤں کے جہاں گرو کا روپ دھار کر رہنے والے را کے ایجنٹ ورما تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔ ماہ بانو نے راحیلہ کے گھر کے ٹیرس پر سے پڑوس کی کوٹھی میں ورما کو دیکھ کر شناخت کرلیا تھا اور پھر اسے اطلاع دی تھی جس کے بعد وہ ورما تک پہنچ کر اسے گرفتار کروانے میں کامیاب ہوسکا تھا۔

"بالکل سر... یہی نام ہے اس لڑکی کا۔ ماہ بانو کی روم میٹ کی نشان دہی پر جب میں نے اس لڑکی سے ملنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ آج کل کالج نہیں آرہی ہے۔ میں کالج ریکارڈ میں سے ایڈریس نکلوا کر اس کے گھر پہنچا تو وہاں اس کے والد سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ راحیلہ اور اس کا بڑا بھائی ڈاکٹر طارق آج کل کلفٹن میں اپنے ایک عزیز کے گھر رہ رہے ہیں۔ ان کے وہ عزیز کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں اس لیے انہوں نے ان لوگوں کو اپنے گھر کی حفاظت کے خیال سے وہاں چھوڑا ہوا ہے۔ میں راحیلہ کے والد سے ایڈریس لے کر کلفٹن پہنچا تو وہاں موجود چوکیدار سے معلوم ہوا کہ وہ دونوں بہن بھائی آج کل وہاں موجود نہیں ہیں۔ ان دونوں کی غیر موجودگی نے مجھے ٹھٹکا دیا۔ میں نے چوکیدار کو ٹٹولا اور تھوڑی بہت معلومات اِدھر اُدھر سے حاصل کیں تو ڈاکٹر طارق کے بارے میں کچھ ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن کی روشنی میں، میں اس شخص کو مشکوک قرار دے سکتا ہوں۔

"وہ انتہا درجے کا فلرٹ آدمی ہے اور اس کی کئی لڑکیوں سے دوستی کے قصے مشہور ہیں۔ خود وہاں کے چوکیدار کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر طارق کے ساتھ اکثر و بیشتر مختلف لڑکیاں بنگلے پر آتی رہتی تھیں۔ وہ جس اسپتال میں جاب کرتا تھا، وہاں بھی اس کی ریپوٹیشن زیادہ اچھی نہیں ہے اور معلوم ہوا ہے کہ حال ہی میں اس کی ایک ساتھی نرس لاپتا ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر طارق نے اس نرس سے اپنی دوستی کو باقی اسٹاف سے پوشیدہ رکھا تھا لیکن جب وہ غائب ہوئی تو اس کی بڑی بہن نے واویلا مچادیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن ڈاکٹر طارق سے ملنے کا بتا کر گھر سے نکلی تھی پھر واپس نہیں آئی۔ ڈاکٹر طارق نے ایسی کسی بات کو ماننے سے صاف انکار کردیا۔ نرس کے گھر والے غریب لوگ ہیں اس لیے تھوڑا سا شور مچا کر چپ ہوگئے اور طارق کی جان چھوٹ گئی لیکن مجھے شک ہے کہ اس قسم کے کردار کا مالک شخص ماہ بانو کے لیے بھی کسی طور مخلص ثابت نہیں ہوا ہوگا اور اس نے ایسی کوئی نہ کوئی حرکت ضرور کی ہوگی جس کی وجہ سے ماہ بانو کو نقصان پہنچا۔ ہوسکتا ہے اس نے ماہ بانو کی کراچی میں موجودگی کی خبر چودھری تک پہنچا کر بدلے میں اس سے رقم وصول کرلی ہو۔ موجودہ حالات میں اس کی بہن سمیت روپوشی میرے اس شک کو اور بھی تقویت دے رہی ہے۔" اس بندے نے واقعی اچھا خاصا کام کیا تھا اور اس کی روشنی میں جو نتائج اخذ کیے تھے، وہ بھی کافی درست محسوس ہورہے تھے۔ شہریار بھی خود کو اس سے متفق محسوس کررہا تھا چنانچہ یہ سب سن کر بولا۔

"ڈاکٹر طارق اور راحیلہ کے والدین کے گھر پر پولیس ریڈ کرواؤ۔ ہوسکتا ہے وہ دونوں بہن بھائی اپنے ہی گھر پر رہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہے ہوں اور ان کے والد نے تم سے جھوٹ بولا ہو۔ اگر وہ دونوں اپنے گھر پر نہ ملیں تو ان کے گھر والوں سے اگلوانے کی کوشش کرو۔ مجھے بہرحال ہر حال میں ان لوگوں تک پہنچنا ہے جنہوں نے ماہ بانو کے اغوا میں مدد کی اور اسے مشکل میں پھنسوایا۔ اس کی بازیابی کے ساتھ ساتھ میرے لیے اس کے مجرموں تک پہنچنا اور ان کو کیفر کردار تک پہنچانا بھی بہت اہم ہے۔ تم میری بات اچھی طرح سمجھ رہے ہو نا؟ کہیں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ کسی کو کوئی رعایت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کا موڈ سخت خراب تھا۔ اگر راحیلہ اور اس کے بھائی نے ماہ بانو کے لیے مارِ آستین کا کام کیا تھا تو وہ کسی صورت انہیں بخشنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''او کے سر! آپ فکر نہ کریں، جیسا آپ کہہ رہے ہیں ویسا ہی ہوگا۔'' دوسری طرف سے اسے یقین دہانی کروائی گئی تو اس نے قدرے مطمئن ہو کر فون بند کر دیا اور موبائل اپنی جیب میں رکھتے ہوئے پلٹا تو اپنے بالکل پیچھے کھڑی ماریا کو دیکھ کر چونک گیا اور قدرے سرد لہجے میں پوچھا۔

''تم کب یہاں آئیں؟''

''بالکل ابھی ابھی۔ آپ فون پر اتنی بری طرح مصروف تھے کہ آپ کو میرے آنے کا بالکل پتا ہی نہیں چل سکا۔ کیا کوئی پریشانی کی بات ہے؟ آپ کا موڈ خاصا آف لگ رہا ہے۔'' وہ اپنے مخصوص مدھم لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔ اس کے بالکل اچانک خاموشی سے پیچھے آ کھڑے ہونے پر برا لگنے کے باوجود شہریار اسے کوئی سخت جواب نہیں دے سکا اور ٹالنے والے انداز میں بولا۔

''ایسی کوئی خاص بات نہیں۔ کچھ آفیشل پرابلمز تھیں جنہیں سب کے سامنے ڈسکس کرنا مناسب نہیں تھا اس لیے میں وہاں سے اٹھ کر آ گیا تھا۔''

''اوہ سوری! پھر تو مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اصل میں آفرین آنٹی پوچھ رہی تھیں کہ رات کے کھانے پر کیا بنواؤں تو میں نے ان سے کہا کہ آپ سے پوچھ کر بتاتی ہوں۔ ابھی مجھے آپ کی پسند ناپسند کا اندازہ تو ہے نہیں ورنہ خود ہی کچھ بتا دیتی۔'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں اپنی وہاں آمد کی وجہ بتائی۔

''ممانی جان کو میری پسند ناپسند کا اچھی طرح معلوم ہے اور وہ مجھ سے پوچھے بغیر خود میری پسند کا کھانا تیار کروا دیتی ہیں۔ تم اپنے لیے جو چاہو وہ بنوا لو۔ اور ہاں، اپنے سامان کی پیکنگ بھی کر لینا۔ کل ہم ارلی مارننگ یہاں سے نکل جائیں گے۔ اگر تمہیں کوئی شاپنگ وغیرہ کرنی ہو تو ممانی جان کے ساتھ جا کر کر سکتی ہو۔ میں اس کام میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔'' اس نے جیب سے پرس نکال کر اپنا کریڈٹ کارڈ اسے تھمایا۔

''تھینکس۔ میں دیکھوں گی... اگر موڈ بن گیا تو اکیلی بھی شاپنگ کے لیے چلی جاؤں گی۔ لاہور میرا دیکھا بھالا شہر ہے اس لیے مجھے آفرین آنٹی کو تنگ کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کریڈٹ کارڈ اپنی مٹھی میں دباتے ہوئے اسے جواب دیا اور وہاں سے جانے کے لیے پلٹ گئی۔

اسی لمحے شہریار کا موبائل ایک بار پھر بجنے لگا۔ شہریار نے اسکرین پر جگمگاتا نمبر دیکھا۔ نمبر اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ اس نے ایک پل کے لیے سوچا کہ اس کال کو ریسیو کیا جائے یا نہیں پھر یس کا بٹن پش کر کے موبائل کان سے لگا لیا۔ اندر جاتی ماریا کے قدم بھی رنگ ٹون سن کر رک گئے تھے۔ اس کے رکنے پر شہریار نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ نفی میں سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ شہریار بھی سر جھٹک کر دوسری طرف سے آتی آواز کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ماریا کی ان حرکتوں پر الجھن محسوس کرنے کے باوجود وہ اسے رعایت دینے پر مجبور تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ماریا بے شک پڑھی لکھی لڑکی ہے لیکن طبقاتی فرق کی وجہ سے اسے ایڈجسٹمنٹ میں کچھ وقت لگے گا اور وہ اس کی کلاس میں رائج ایٹی کیٹس آہستہ آہستہ ہی سیکھ سکے گی۔

''کیا حال ہیں اے سی صاحب! شادی کے بعد کیسی گزر رہی ہے؟'' اس کی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے اس سے پوچھا گیا۔

''کون صاحب؟ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے نہایت سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''ہم سے اپنا ناتا آپ خود طے کریں گے۔ اگر ہماری ہدایت کے مطابق آپ ہم سے چھیڑ چھاڑ کیے بغیر اپنے کام سے کام رکھیں گے تو ہم آپ کو کچھ نہیں کہیں گے ورنہ ہمارے آپ کے درمیان دشمنی کا ناتا بچا ہے۔'' دوسری طرف سے جو جواب دیا گیا، اسے سن کر اسے اندازہ ہو گیا کہ کال کرنے والے کا تعلق کہاں سے ہے۔ جب سے اس نے ورما کو گرفتار کروایا تھا، را والے اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ کچھ عرصے قبل لیاقت رانا کی گاڑی کو گولیوں کا نشانہ بنا کر بھی اسے تنبیہ کی گئی تھی اور اب پھر دھمکی کو دہرایا جا رہا تھا۔

''میری نظر میں ہمارے درمیان دشمنی کا تعلق کسی بھی

طور مشروط نہیں ہے۔ ہمیں یہ دشمنی ورثے میں ملی ہے اور جب تک تم لوگ میرے وطن کے خلاف سازشیں کرتے رہو گے، دشمنی کا یہ سلسلہ بھی چلتا رہے گا۔''

''دوسرے شبدوں میں آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ ہمارے راستے سے نہیں ہٹیں گے؟'' اس شخص کا لہجہ بگڑا۔

''تمہارا اندازہ ٹھیک ہے۔'' شہریار نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''سوچ لیں اے سی صاحب! ابھی کچھ دن تو ہوئے ہیں آپ کے فیملی ممبرز میں اضافہ ہوئے۔ کہیں آپ کی ضد کی وجہ سے ان میں کمی نہ ہو جائے۔'' اس نے بہت واضح دھمکی دی۔

''میرا خاندان نسلوں سے وطن کے لیے قربانیاں دیتا آ رہا ہے۔ اس بار بھی ہم پیچھے نہیں رہیں گے۔'' وقت کے ان لمحات میں گویا وہ ہر طرح کے خدشات سے آزاد ہو گیا تھا اور اسے دوبدو جواب دے رہا تھا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ اب جو ہوگا، وہ آپ خود دیکھ لیں گے۔'' دوسری طرف نے دھمکی دے کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا تو شہریار نے بھی شانے اچکاتے ہوئے اپنا موبائل واپس جیب میں رکھ لیا۔ ویسے اسے حیرت تھی کہ را جیسی ایجنسی کے افراد اتنے بھونڈے انداز میں کیسے کام کر رہے ہیں؟ ان کا رویہ سیکرٹ ایجنٹس کے بجائے بالکل تھرڈ کلاس غنڈوں جیسا تھا۔ بس وہ لوگ اسے کال کرتے وقت اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ کال کسی ایسے نمبر سے کی جائے جس کی سم غیر قانونی ہو اور نمبر کے ذریعے انہیں ٹریس نہیں کیا جا سکے۔ سابقہ تجربے کی روشنی میں شہریار چونکہ یہ بات سمجھ چکا تھا، اس لیے اس نے اپنے موبائل پر آنے والا نمبر ٹریس کروا کے وقت برباد کرنا غیر ضروری سمجھا تھا۔

☆☆☆

''شہریار صاحب کی شادی ہو گئی ہے۔'' اخبار کا صفحہ کشور کے سامنے رکھتے ہوئے آفتاب نے اسے اطلاع دی۔

''واقعی، دکھائیں تو کیسی ہے ان کی بیگم۔'' کشور اشتیاق سے اخبار پر جھکی۔

''تم انہیں جانتی ہو۔ شہریار صاحب نے ڈاکٹر سے شادی کی ہے۔'' آفتاب نے اسے بتایا۔ اس دوران کشور خود بھی اخبار کے صفحے پر چھپی تصویر دیکھ چکی تھی۔ یہ ایک فیملی فوٹو تھا جس میں دولہا دلہن کے علاوہ مسٹر اینڈ مسز لیاقت رانا، مریم سجاد اور آئی جی عمار مراد نمایاں نظر آ رہے تھے۔

''بیوی تو اے سی صاحب نے اچھی ڈھونڈی ہے۔ ڈاکٹر ماریا بڑی سمجھ دار اور نیک فطرت خاتون ہیں۔ مجھ پر تو انہوں نے بڑا احسان کیا تھا۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میرے لیے اپنی اور اپنے بچے کی زندگی بچانا مشکل ہو جاتا۔ مجھے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب مجھے مسلسل ہونے والی الٹیوں پر مشکوک ہو کر بڑی ماں نے لیڈی ڈاکٹر کو بلوا لیا تھا۔ جب تک ڈاکٹر ماریا میرا چیک اپ کرتی رہیں، مجھے یہی ڈر رہا کہ اب میرے اور آپ کے تعلق کا بھانڈا پھوٹ جائے گا لیکن انہوں نے نہ صرف سب کے سامنے بات بنا دی بلکہ بعد میں بھی میری مدد کرتی رہیں۔ انہوں نے مجھے جو دوائیں وغیرہ دی تھیں، ان سے میری حالت سنبھلنے اور راز کو راز رکھنے میں بڑی مدد ملی تھی۔ مجھے اے سی صاحب سے ان کی شادی کی خبر سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے لیکن ساتھ ہی حیرت بھی ہے کہ ان دونوں نے بالکل مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے کے باوجود شادی کا فیصلہ کس طرح کیا۔ کبھی کوئی ایسی بات بھی سننے میں نہیں آئی تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ شہریار صاحب اور ڈاکٹر ماریا کے درمیان پسندیدگی کا کوئی سلسلہ چل رہا ہو۔'' تصویر کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کشور اپنے احساسات اور خیالات کا بھی اظہار کرتی جا رہی تھی۔ اس کے ایک ساتھ اتنے سارے نکات پر گفتگو کرنے پر آفتاب مسکرا دیا اور اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

''آپ عورتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ ایک طرف آپ کو ڈاکٹر ماریا سے شہریار صاحب کی شادی کی خوشی ہے تو دوسری طرف ان کے غیر مسلم ہونے پر اعتراض بھی ہے۔''

''میں نے اعتراض نہیں کیا ہے، صرف حیرت کا اظہار کیا ہے۔'' کشور نے فوراً اپنی صفائی پیش کی۔

''حیرت بھی بے کار ہے۔ وہ دونوں پڑھے لکھے، سمجھ دار اور روشن خیال لوگ ہیں۔ انہوں نے جو بھی فیصلہ کیا ہوگا، سوچ سمجھ کر کیا ہوگا۔ رہی ان کے پسندیدگی کے سلسلے کے سامنے نہ آنے کی بات تو وہ کوئی فلمی ہیرو ہیروئن تو ہیں نہیں کہ کھیتوں کھلیانوں میں ڈوئٹ گاتے پھرتے اور دور دور تک ان کی محبت کے قصے پھیل جاتے۔ انہیں ہماری طرح کسی ظالم سماج کا بھی سامنا نہیں تھا اس لیے بھی کوئی فلمی سچویشن کری ایٹ نہیں ہو سکی اور انہوں نے سیدھے سیدھے بزرگوں کی سرپرستی میں بیاہ رچا کر شہر بھر کو دعوت کھلا دی۔'' آفتاب اب بھی اسے چھیڑنے سے باز نہیں آیا۔

''بڑی شوخیاں سوجھ رہی ہیں جناب کو... حالانکہ جب سے آپ نے امام صاحب کو دیکھا ہے، مجھے مسلسل پریشان ہی نظر آتے رہے ہیں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"پریشان تو میں اب بھی ہوں اور میری خواہش بھی یہی ہے کہ جلد از جلد شہریار صاحب کو اس شخص کی یہاں موجودگی سے باخبر کردوں لیکن ان سے رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اب اخبار دیکھ کر اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ آج کل کہاں مصروف ہیں۔" وہ یک دم ہی سنجیدہ ہو گیا۔

"پریشان نہ ہوں۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ شہریار صاحب چند دن کی چھٹیوں پر ہی گئے ہوں گے۔ آپ ٹرائی کرتے رہیں، کسی دن تو آپ کا ان سے رابطہ ہو ہی جائے گا۔" کشور نے اسے تسلی دی۔

"یہ زیادہ دن انتظار کرنے والا معاملہ نہیں ہے۔ میں نے آپ کو اس شخص کے بارے میں بتایا تھا نا کہ کس طرح یہ پیرآباد کی مسجد میں بہروپ بھر کر مولوی غلام محمد بنا ہوا تھا اور وہاں اس نے کئی معصوم بچوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بھی بنایا تھا۔ ماہ بانو کا چھوٹا بھائی تو بے چارہ اس کی ہوس کا شکار ہو کر موت کے منہ میں ہی چلا گیا تھا۔ اب یہاں بھی اس نے ایک معصوم بچے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اتنے مکروہ کردار کے شخص کو تو ویسے ہی کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ زمین پر آزادی سے چل پھر سکے... اور اس شخص کے بارے میں تو یہ بھی شبہ تھا کہ یہ را کا کوئی ایجنٹ ہے۔ آپ کو نور پور میں ہونے والا بم دھماکا یاد ہے نا؟ اس دھماکے میں خودکش حملہ آور لڑکے کے بارے میں تحقیقات کرتے ہوئے شہریار صاحب اللہ آباد کے ایک مدرسے تک پہنچ گئے تھے۔ اس مدرسے کو شاہنواز نام کا ایک آدمی چلا رہا تھا اور اپنی دریا دلی اور نرم مزاجی کی وجہ سے گاؤں میں اس شخص کی بہت عزت تھی۔ وہ لڑکا بھی شاہنواز کے بہت قریب تھا لیکن بعد میں تحقیقات سے ثابت ہوا کہ شاہنواز نام کا وہ شخص حقیقت میں ملک دشمن ایجنٹ تھا جو دین دار آدمی کا بہروپ بھر کر معصوم بچوں کو ورغلانے کا کام کر رہا تھا۔ شاہنواز کے اس ٹھکانے پر غلام محمد کی موجودگی کے بھی ثبوت ملے تھے جس سے یہی اندازہ لگایا گیا تھا کہ وہ بھی را کا ہی ایجنٹ ہے اور اب اسے یہاں ایک بار پھر بہروپ میں دیکھ کر مجھے یقین ہو چکا ہے کہ یہ شخص واقعی میں را کا کوئی ایجنٹ ہے جو مسلسل اپنے مشن پر ڈٹا ہوا ہے۔" آفتاب کے لہجے میں واضح تشویش تھی۔

"آپ اتنے پریشان نہ ہوں۔ اللہ نے چاہا تو کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آئے گی۔ اللہ ظالم کی رسی بے شک دراز کر دیتا ہے لیکن پھر اس کے لیے اللہ کی پکڑ بھی بہت سخت ہوتی ہے۔ یہ کالے کرتوتوں والا بہروپیا بے شک ایک بار نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن انشاء اللہ اب ضرور پکڑا جائے گا۔ معصوم بچوں کا خون ناحق اس بار اسے بچ کر نہیں نکلنے دے گا۔" کشور کے پُریقین لہجے میں آفتاب کے لیے بڑی ڈھارس تھی۔ آفتاب نے اپنے دل میں ایک سکون سا اترتا ہوا محسوس کیا اور دھیرے سے مسکرا کر اپنی شریکِ حیات کو دیکھا۔ اس عورت کو حاصل کرنے کے لیے اس نے بہت کچھ کھویا تھا۔ خصوصاً پیرآباد کے اسکول کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہونے کا صدمہ اس کے دل کو اب بھی اداسی میں ڈبو دیتا تھا لیکن پھر بھی کبھی وہ پچھتاوے میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ کشور اس لائق تھی کہ اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دی جا سکتی... اسے یقین تھا کہ کشور کی ہمراہی میں ایک دن وہ، وہ سب کر پائے گا جو اس کا مقصدِ زندگی ہے اور جسے انجام دیے بغیر اس کا دل سچی خوشی سے محروم رہے گا۔

"آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔ اچھا خاصا سفر کر کے آئے ہیں، تھکن تو ہو گئی ہو گی۔ آرام کرنے کے بعد فریش ہو جائیں گے تو پھر سکون سے اپنا کام کیجیے گا۔ آپ کو اپنا ناول بھی تو جلد از جلد مکمل کرنا ہے۔" گاؤں میں سہولیات کی قلت کی وجہ سے آفتاب کو ضروری فون کالز کرنے اور اپنے مطلب کے اخبار و جرائد کے حصول کے لیے گاؤں سے باہر جانا پڑتا تھا۔ آج بھی وہ انہی دونوں مقاصد کے لیے گیا تھا۔ شہریار سے بات کرنے میں تو کامیابی نہیں ہو سکی لیکن اس کی شادی کی خبر مل گئی۔ اس خبر نے جہاں ان دونوں میاں بیوی کو خوش کیا، وہیں اس سے رابطہ نہ ہو سکنے کی وجہ بھی سمجھ آ گئی۔ موجودہ حالات میں یہ رابطہ بہت ضروری تھا اور تاخیر سے کوئی بڑی گڑبڑ بھی ہو سکتی تھی۔ آفتاب کی طرح کشور بھی اس بات کو سمجھتی تھی لیکن اس کے سامنے پریشانی کا مظاہرہ کر کے اسے مزید ٹینشن میں مبتلا کرنے کے بجائے مسلسل خوش امیدی کا اظہار کر رہی تھی۔

"آپ کا مشورہ تو مناسب ہے، واقعی میں اس وقت آرام کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔ تھوڑی دیر سو جاؤں گا تو طبیعت بحال ہو جائے گی۔" آفتاب نے اس سے اتفاق کیا اور سونے کے ارادے سے اٹھ گیا۔ بستر پر لیٹ کر اس نے چند سیکنڈز کے لیے آنکھیں بند کیں اور پھر کچھ اضطرابی انداز میں کھول کر کشور کی طرف دیکھا۔ کشور جو اس کی طرف ہی متوجہ تھی، اس کے اضطراب کو محسوس کر کے اس کے قریب گئی اور سرہانے کی طرف بیٹھ کر اپنی نرم ملائم انگلیوں سے اس کے سر کا مساج کرنے لگی۔ آفتاب نے انگلیوں کے اس لمس سے عجیب سی فرحت محسوس کرتے ہوئے اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا اور اس کے غیر مصروف بائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھوں کی

گرفت میں لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کے ہاتھ کا لمس دہکتے ہونٹوں کے لیے شبنم کا احساس جگانے لگا اور جادو جگاتی ان انگلیوں کی ٹھنڈک اور سکون کو اپنے اندر اتارتا وہ کب نیند کی وادی میں جا پہنچا، اسے خود بھی خبر نہیں ہوئی۔ وہ ڈسٹرب نہ ہو، اس خیال سے کشور نے بھی وہاں سے اٹھنا پسند نہیں کیا اور اپنی بے آرامی کی پروا کیے بغیر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔

شاید وہ آفتاب کے جاگنے تک اسی طرح بیٹھی رہتی لیکن دروازے پر ابھرنے والی دستک نے اسے اپنی جگہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اگر وہ دستک کو نظرانداز کرنے کی کوشش کرتی تو ممکن تھا کہ باہر موجود فرد پہلے سے زیادہ زوردار دستک دیتا اور اس دستک کی آواز آفتاب کی نیند خراب کر دیتی۔ اس کی نیند خراب ہونے سے بچانے کے لیے اس نے اپنی جگہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اپنی گود میں رکھا اس کا سر نرمی سے تکیے پر رکھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس دوران میں دوسری دستک دی جا چکی تھی جو کہ پہلے کی نسبت قدرے بلند تھی۔

"کون ہے؟" دروازے کے قریب پہنچ کر اسے کھول کر باہر جھانکنے کے بجائے اس نے اندر سے ہی دریافت کیا۔ شروع سے پردے میں رہنے کی وجہ سے اسے یوں بھی ہر ایک کے سامنے آنے کی عادت نہیں تھی۔ اس پر سے اس روپوشی کی زندگی نے اسے مزید محتاط بنا دیا تھا چنانچہ وہ کسی کے بھی سامنے بلاجھجک آ جانے سے گریز کرتی تھی۔

"احمد صاحب گھر میں تشریف رکھتے ہیں کیا؟" باہر سے مہذبانہ انداز میں دریافت کیا گیا۔ اس گاؤں میں آفتاب نے اپنے نام کے دوسرے حصے سے ہی سب سے اپنا تعارف کروایا تھا اس لیے لوگ اسے احمد کے نام سے ہی جانتے تھے۔

"آپ کون صاحب؟" باہر موجود ملاقاتی کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کشور نے اس سے دریافت کیا۔ باہر موجود شخص کے لہجے نے اسے باور کروا دیا تھا کہ وہ اس گاؤں کا رہائشی نہیں ہے اس لیے اس نے یہ احتیاط برتی تھی۔

"خاتون! میں پیش امام ہوں اور احمد صاحب سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ میری غیر موجودگی میں یہاں آ کر مقیم ہوئے تھے اس لیے میری ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ گاؤں والوں کی زبانی ان کا تذکرہ سنا تو دل میں اشتیاق پیدا ہوا کہ ان سے ملا جائے اور مل کر ان کے مشاغل پر گفتگو ہو۔ سننے میں تو یہی آیا ہے کہ کوئی بڑے لائق اور لکھنے پڑھنے والے آدمی ہیں احمد صاحب... تو پھر بھلا ہم کیوں ایسے لائق فائق آدمی سے ملاقات کرنے سے محروم رہیں؟" باہر سے تعارف کے ساتھ نہایت تفصیلی جواب دیا گیا لیکن اس کے تعارف نے کشور کے سارے وجود میں سنسنی سی دوڑا دی۔ یہ شخص پہلے بھی گاؤں کے ایک فرد کے ذریعے آفتاب کو ملاقات کا پیغام بھجوا چکا تھا۔ آفتاب کو اندیشہ تھا کہ جس طرح اس نے اسے مولوی غلام محمد کی حیثیت سے شناخت کر لیا ہے، اسی طرح وہ بھی اسے ماسٹر آفتاب کے طور پر پہچان لے گا اور یہ اس کے لیے کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔

"میں آپ سے معذرت چاہتی ہوں! احمد کچھ دیر قبل ہی سفر سے واپس آئے ہیں اور بہت زیادہ تھک کر سو رہے ہیں۔ میں ان کے آرام میں خلل نہیں ڈال سکتی۔" وہ جس کردار کا مالک تھا اس سے عزت و احترام کے ساتھ بات کرنے کو دل تو نہیں چاہتا تھا لیکن مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ فی الحال نرمی برتی جائے اور رویے سے ظاہر نہ ہونے دیا جائے کہ وہ ان لوگوں کے لیے ایک ناپسندیدہ ہستی ہے۔

"ماشاء اللہ احمد صاحب بڑے خوش قسمت آدمی ہیں کہ انہیں آپ جیسی خیال رکھنے والی بیوی ملی ہے۔ مجھے آپ کی شوہر پرستی اچھی لگی خاتون! اگر آپ حرج نہ سمجھیں تو احمد صاحب کے جاگنے کے بعد انہیں مطلع کر دیجیے گا کہ میں ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا تھا۔ وہ مناسب سمجھیں تو مجھے یہ شرف بخش دیں۔" اس شخص کے لب و لہجے سے صاف مصنوعی پن جھلک رہا تھا اور کشور جیسی محدود ماحول میں رہ کر پلنے بڑھنے والی لڑکی بھی محسوس کر سکتی تھی کہ وہ نری چاپلوسی سے کام لے رہا ہے، ورنہ اس کے الفاظ میں خلوص کا نام و نشان تک موجود نہیں ہے۔

"میری تعریف کے لیے شکریہ! میں آپ کا پیغام اپنے شوہر تک پہنچا دوں گی لیکن آپ کو اتنا بتاتی چلوں کہ وہ آج کل بہت مصروف ہیں اور ہفتہ دس دن سے پہلے کسی سے شاید ہی ملاقات کر سکیں۔ امید ہے کہ آپ ان کی مجبوری کو سمجھیں گے اور تاخیر کے لیے برا نہیں مانیں گے۔" اس نے نہایت چابک دستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ایسی بات کہہ دی جس سے آفتاب کو کچھ مہلت مل جاتی۔ یقیناً اس مہلت میں وہ شہریار سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا اور اس بہروپیے کا انجام سامنے آ جاتا۔

"چلیں جیسے آپ لوگ مناسب سمجھیں۔ آدمی تو ہم بھی عزت دار ہیں اور سارا گاؤں ہمیں سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے لیکن احمد صاحب شاید کچھ زیادہ ہی خاص آدمی ہیں جو کسی کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

گھاس ڈالنا پسند نہیں کرتے۔ بہرحال، ہمارا شوقِ ملاقات اپنی جگہ ہے۔ اگر وہ اس بندۂ حقیر کے لیے کبھی وقت نکال سکیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ اب مجھے اجازت دیجیے... خدا حافظ۔" کچھ دل گیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ وہاں سے روانہ ہوگیا۔

کشور نے اس کے لہجے سے اندازہ لگالیا تھا کہ اسے اپنا ٹالا جانا اچھا نہیں لگا اور وہ خاصا خفا ہوکر یہاں سے گیا ہے۔ اس کی گاؤں والوں کی نظروں میں جو عزت تھی اسے دیکھتے ہوئے وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ اس کا ناراض ہونا کوئی اچھا شگن نہیں ہے لیکن فی الحال انہیں جو مہلت درکار تھی، اس کے لیے یہ خطرہ مول لینا ہی مناسب تھا۔ بعد میں اس آدمی کی اصلیت کھل جاتی تو پھر سارے مسئلے خودبخود ہی حل ہو جاتے۔

اندر سے سخت تشویش میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ زبردستی خود پر بے نیازی طاری کرنے کی کوشش کرتی ہوئی دروازے سے ہٹ کر اندر کمرے میں چلی آئی۔ آفتاب ابھی تک گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ یونہی وقت گزاری کے لیے اخبار کا جائزہ لینے لگی۔ شہریار اور ماریا کی شادی کی خبر کے سوا وہ کوئی دوسری خبر نہیں پڑھ سکی تھی چنانچہ اپنی فراغت کا فائدہ اٹھا کر اخبار کا مطالعہ کرنے لگی۔ جلد ہی اس کی نظروں نے اس خبر کو اپنی گرفت میں لے لیا جو شہریار کی شادی کی خبر کے ساتھ ساتھ ہی لگی تھی۔ اس خبر میں شہریار کے شادی کے موقع پر بے قابو ہوکر چودھری افتخار سے الجھ جانے کا واقعہ بیان کیا گیا تھا۔ خبر پڑھ کر وہ افسردہ ہوگئی۔ شہریار جیسے بندے کے اس طرح بے قابو ہو جانے کا مطلب تھا کہ اس کے باپ نے کوئی نہایت گری ہوئی حرکت ہی کی ہوگی جسے وہ برداشت نہیں کرسکا۔ اپنے باپ کے کردار پر بھی وہ اس کے انجام کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ بے شک اس کا باپ تھا لیکن تھا تو ظالموں کے اس قبیل میں سے ہی جن کی رسّی فی الحال دراز تھی اور وہ کبھی بھی اللہ کی پکڑ میں آسکتے تھے۔

☆☆☆

"یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" وہ کل والے پتھر پر ہی بیٹھی اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی کہ وہ اس کے قریب چلا آیا اور کچھ تحکمانہ لہجے میں سوال کیا۔

"تم لوگوں کے بدبودار کپڑے دھو دھو کر سر چکرانے لگا تھا اس لیے تھوڑی دیر تازہ ہوا میں سانس لینے کے لیے بیٹھی تھی۔ یہاں سانس لینے پر بھی پابندی ہے کیا؟" اس نے جھنجلاتے ہوئے لہجے میں جواب دے کر پوچھا۔

"پابندی تو نہیں ہے لیکن میں اسے تمہارے لیے مناسب بھی نہیں سمجھتا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ یہاں سب عورت کے بھوکے ہیں۔ تم جتنی دیر ان کی نظروں کے سامنے رہوگی، ان کی اشتہا اتنی ہی بڑھے گی۔ بہتر ہے کہ احتیاط کرو اور کم سے کم وقت ان لوگوں کے سامنے گزارو۔" اس نے اردگرد پھرتے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے سمجھایا تو وہ کچھ چپ سی ہوگئی پھر کچھ دیر بعد بے چارگی سے بولی۔

"وہ جھونپڑی بہت تنگ و تاریک ہے۔ زیادہ دیر وہاں رہوں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔"

"میرے ساتھ آؤ۔" اس کا جواب سن کر وہ تھوڑی دیر سوچ میں پڑ گیا پھر نرمی سے بولا تو ماہ بانو بے چون و چراں اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اور پھر اس کی راہنمائی میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ دونوں پیروں کے درمیان بندھی زنجیر قدموں کو تیز رفتاری سے حرکت دینے میں رکاوٹ تھی اس لیے آہستہ چلنا مجبوری تھی۔ وہ بھی یقیناً یہ بات سمجھتا تھا چنانچہ خود بھی بہت آہستہ رفتار سے چل رہا تھا۔ اس کا رخ درختوں کے اس قطار در قطار سلسلے کی طرف تھا جہاں سے آگے بھی یقیناً گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ وہ اسے بہت آگے تک نہیں لے گیا اور درختوں کے درمیان ایک ایسی جگہ پر پہنچ کر رک گیا جہاں زمین کا ایک ٹکڑا درختوں سے خالی تھا اور بڑی ترتیب سے چھوٹی قامت کے خوش رنگ و خوشبودار پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ پودوں کے درمیان موجود فاصلے اور ترتیب سے ظاہر تھا کہ یہاں انسانی ہاتھوں نے کارروائی کی ہے۔

"اس جگہ کو میں نے اپنے لیے سجایا سنوارا ہے۔ مجھے اپنے لیے یہ چھوٹا سا گوشۂ سکون تیار کرنے کے لیے کافی محنت کرنی پڑی تھی۔ تمہیں یہاں جو خالی جگہ نظر آرہی ہے، یہ بھی درختوں اور جھاڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے خود اپنی محنت سے اسے صاف کیا اور پھر یہاں یہ پھول دار پودے لگائے۔ جب بھی میرا دل سب سے کٹ کر چپ چاپ سکون سے بیٹھنے کی خواہش کرتا ہے تو میں یہاں چلا آتا ہوں۔ سردار سمیت میرے سب ساتھی جانتے ہیں کہ میں اپنے اس گوشۂ تنہائی میں کسی کی آمد کو پسند نہیں کرتا اس لیے جب تک کوئی بہت ضروری کام نہ ہو، کوئی یہاں آکر مجھے ڈسٹرب نہیں کرتا۔ تمہیں میں خاص طور پر اجازت دے رہا ہوں کہ جب دل زیادہ گھبرائے اور کسی پُرسکون جگہ پر بیٹھنے کا دل چاہے تو یہاں آجایا کرو۔" وہ نہایت نرم لہجے میں اس سے کہہ رہا تھا

اور وہ دل ہی دل میں قدرت کی کرشمہ سازی کی معترف ہو رہی تھی۔ یہ اسی معبود کا کرشمہ ہی تو تھا کہ اس نے ان اجڈ ڈاکوؤں کے درمیان ایک شخص کے دل کو اس کے لیے موم کر دیا تھا اور اس کے لیے قید میں آسانی پیدا ہوگئی تھی۔

"میں نے ان دونوں درختوں کے درمیان ایک مچان بھی بنائی ہے۔ شکار وغیرہ کا تو مجھے اتنا خاص شوق نہیں لیکن اس مچان پر سے دور تک کا نظارہ کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں اس مچان پر چڑھنے میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔ تم جتنی دیر چاہو آرام سے وہاں بیٹھ سکتی ہو۔" انگلی سے اشارہ کرکے اسے مچان دکھانے کے ساتھ ساتھ اس نے آفر بھی کی جسے ماہ بانو نے فوراً قبول کرلیا۔ مچان اچھی خاصی بلندی پر تھی جس تک پہنچنے کے لیے لکڑیوں اور رسّی کی مدد سے ایک سیڑھی لگائی گئی تھی۔ اگر اس کے پیروں میں زنجیر نہ بندھی ہوتی تو وہ دو منٹ میں اس سیڑھی کی مدد سے اوپر چڑھ جاتی لیکن اس وقت اس کے سہارے کی محتاج تھی۔ وہ سہارا دے کر اسے اوپر لے گیا تو وہ وہاں کی صفائی ستھرائی دیکھ کر اور بھی حیران رہ گئی۔ وہ ایسی جگہ تھی جہاں کئی گھنٹے تک آرام سے رہا جاسکتا تھا۔ کونے میں رکھی مٹی کی صراحی اور اس پر موجود سلور کے گلاس سے ثابت ہوتا تھا کہ اپنے لیے یہ مچان بنانے والا یہاں اچھا خاصا وقت گزارتا ہے۔ مچان کے ایک گوشے میں شیشے کی بوتل میں ایک نازک سی سبز بیل لگائی گئی تھی۔ اس بیل کے سبز پتوں میں سے جھانکتے ننھے ننھے کاسنی پھول آنکھوں کو عجیب سی ٹھنڈک اور تازگی بخش رہے تھے۔ ایک طرف دو تین کتابیں بھی رکھی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ان کتابوں کو اٹھایا اور ان کا جائزہ لینے لگی۔ ان میں سے دو شاعری کے نسخے تھے جبکہ ایک میں حالاتِ حاضرہ پر مبنی ٹی وی کے ایک پروگرام کو ضبطِ تحریر میں لایا گیا تھا۔

"تم تو بڑے باذوق قسم کے ڈاکو ہو۔ تمہارے اس گوشۂ عافیت کو دیکھ کر تو کوئی یقین ہی نہیں کرسکتا کہ اس کی تعمیر میں کسی ڈاکو کا ہاتھ ہے۔" ماہ بانو نے بے ساختہ ہی اسے سراہا۔

"میں کوئی ماں کے پیٹ سے تو ڈاکو پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس زندگی سے پہلے بھی میری ایک زندگی تھی جس میں، میں واپس نہیں جاسکتا لیکن جس کا کچھ حصہ میں نے یہاں اپنے لیے تخلیق کرلیا ہے۔" اس نے یاسیت سے جواب دیا۔

"اپنی اس زندگی کے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ ناں۔" وہ اب اس سے خوف زدہ نہیں تھی اس لیے نہایت اشتیاق سے فرمائش کی۔

"ابھی نہیں۔ ابھی میں مصروف ہوں۔ صرف تمہیں یہاں تک پہنچانے آیا تھا۔ تمہارا جب تک دل چاہے، یہاں رہو پھر واپس آجانا۔ چڑھنے کی نسبت یہاں سے اترنا آسان ہے اس لیے تمہیں خود سے واپس آنے میں مشکل نہیں ہوگی۔ البتہ تمہیں دیر ہوگئی تو پھر میں خود تمہیں لینے کے لیے آجاؤں گا، پریشان مت ہونا۔" اسے ہدایات و تسلیاں دیتے ہوئے اس نے ایک طرف لٹکی دوربین اتار کر اپنے کندھے سے لٹکالی۔ یقیناً وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماہ بانو اس دوربین کی مدد سے زیادہ دور تک کا جائزہ لے سکے۔

"جانے سے پہلے اتنا بتادوں کہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ اس جنگل میں بہت دور دور تک ہمارا راج ہے اور میرے ساتھی جگہ جگہ پہرا دیتے رہتے ہیں۔ بالفرض اگر تم ان سے بچ کر نکلنے میں کامیاب بھی ہو گئیں تو اس جنگل سے نہیں نکل سکوگی اور بھٹک گئیں تو بھوکی پیاسی مر جاؤ گی یا پھر کسی درندے کی بھوک مٹانے کے کام آجاؤ گی۔" جاتے جاتے اس نے اسے تنبیہ کرنا ضروری سمجھا۔ ماہ بانو کو اس کی کسی بات کو ماننے میں کسی قسم کا شک نہیں تھا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ اسے اتنے آرام سے یہاں آزادی سے چھوڑ کر جارہا ہے تو اسی لیے کہ اپنے حفاظتی نظام سے پوری طرح مطمئن ہے۔

"میں یہ سب سمجھتی ہوں۔ تمہیں مجھے دھمکی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے نہایت رسان سے جواب دیا۔

"گڈ گرل! تو پھر ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔" اس نے مچان سے لٹکی سیڑھی پر قدم رکھا۔

"بات سنو۔" اس کے دوسرا قدم نیچے رکھنے سے پہلے ماہ بانو نے اسے پکارا تو وہ اپنی جگہ ٹھہر کر اس کی طرف منتظر نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اپنا نام تو بتادو۔" اس نے فرمائش کی۔

"اسلم... اسلم تمیز ہے میرا نام۔" اس نے جواب دیا اور تیزی سے سیڑھی اتر گیا۔ ماہ بانو اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو اس کی نظریں ایک بار پھر وہاں موجود پھولوں کے پودوں پر بھٹکنے لگیں۔ سرخ، گلابی، کاسنی اور زرد رنگوں کے وہ پھول دار پودے جن ہاتھوں نے اگائے تھے، اس کے صاحبِ دل ہونے پر کوئی شبہ کیا ہی نہیں جاسکتا تھا مگر اس دل والے کی زندگی میں کون سا حادثہ رونما ہوا تھا کہ وہ رنگ برنگی پھولوں کی دنیا سے نکل کر آگ اور خون کی ہولی کھیلنے والوں میں شامل ہوگیا تھا۔ اسلم تمیز کی زندگی کے ایسے کسی حادثے کے بارے میں سوچ کر دل ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

دل میں افسردہ ہوتی ہوئی وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔ کھڑے ہونے پر اسے اس پھلواری سے ہٹ کر بھی جنگل کا منظر نظر آ رہا تھا۔

اس کی نظروں کے سامنے جنگل کا جو حصہ تھا، وہاں درختوں کی اتنی زیادہ بہتات نہیں تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس حصے سے درختوں کو کاٹا گیا ہے۔ ایسا یقیناً ان ڈاکوؤں نے ہی کیا ہوگا تاکہ ان کی قیام گاہ تک گزرگاہ بن سکے اور قرب و جوار پر نظر رکھی جا سکے لیکن انہوں نے اتنی چالاکی ضرور کی تھی کہ درختوں سے خالی ہو جانے والی زمین پر خودرو پودوں اور جھاڑیوں کو اگنے سے نہیں روکا تھا۔ اس طرح کوئی باہر کا بندہ اگر وہاں آ بھی جاتا تو گمان نہیں کر سکتا تھا کہ جنگل کے اس حصے میں انسانی ہاتھوں نے کارگزاری دکھائی ہے۔ وہ خود بھی محض اس لیے اندازہ لگا سکی تھی کہ خود یہاں ان ڈاکوؤں کے درمیان قیام پذیر تھی اور کچھ کچھ ان لوگوں کے بارے میں سمجھنے لگی تھی۔ ابھی تک یہاں اس کا اسلم کے سوا ایسے کسی آدمی سے واسطہ نہیں پڑا تھا جسے دیکھ کر یہ گمان ہو کہ وہ مجبوراً یا حادثاتی طور پر ڈاکوؤں کے اس گروہ میں شامل ہوا ہوگا۔

سوچتے سوچتے اور ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا دھیان اپنی کلائی پر محسوس ہونے والی جلن کی طرف گیا۔ اس کی کلائی بہت زیادہ نہیں جلی تھی لیکن پانی میں کام کرنے کی وجہ سے جلی ہوئی جلد کو نقصان پہنچا تھا اور اچھی خاصی جلن محسوس ہو رہی تھی۔ جلن کے اس احساس نے اسے گزرا ہوا ماضی یاد دلا دیا اور بے ساختہ ہی اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بے بے جس نے اسے گود لیا تھا، اس کے کیسے کیسے ناز اٹھاتی تھی۔ کھانے پینے سے لے کر پہننے اوڑھنے اور گھومنے پھرنے تک اس کی ہر بات مانی جاتی تھی۔ دسویں جماعت میں آنے تک بے بے نے اسے گھرداری کے جھمیلوں سے بھی دور رکھا تھا لیکن پھر ارد گرد کی عورتیں اسے ٹوکنے لگیں۔ بے بے کو محلے والیوں کی یہ بات سمجھ آ گئی اور انہوں نے اسے گھرداری کی تربیت دینا شروع کر دی۔ وہ خود ہمیشہ سے بے بے اور ابا کی خدمت کرنے کی خواہش مند رہا کرتی تھی چنانچہ خوشی خوشی گھرداری کے ہنر سیکھنے لگی۔ اس کی تربیت کا دوسرا ہی ہفتہ شروع ہوا تھا کہ ایک شام اس نے بے بے سے ضد کی کہ آج رات کی روٹیاں میں پکاؤں گی۔ اس کی ضد کے آگے بے بے مجبور ہو گئیں اور وہ ان کی زیر نگرانی روٹیاں پکانے بیٹھ گئی۔ کوئی تجربہ تو تھا نہیں۔ شومئی قسمت وہ پہلی آڑی ترچھی روٹی بیل کر توے پر ڈالنے لگی تو ہاتھ گرم توے سے جا ٹکرایا

پھر تو اس کی ہائے ہائے ...۔ تھی اور بے بے کی تدبیریں کہ کسی طرح اس کی تکلیف کم ہو جائے۔ رات میں ابا اپنے کام سے فارغ ہو کر گھر پہنچا تو وہ متاثرہ ہاتھ پر مرہم کی تہ جمائے بیٹھی تھی اور آنکھوں میں ڈھیروں آنسو تیر رہے تھے۔ ابا نے اس کی تکلیف دیکھی تو بے بے کو ڈھیروں باتیں سنا ڈالیں جس نے اس کی لاڈلی سے چولہے ہانڈی کا کام لینے کی جسارت کی تھی۔ پہلے سے دکھی بے بے، ابا کی ڈانٹ کھا کر رونے لگی اور اعلان کر دیا کہ اب ماہ بانو سے گھر کا کوئی کام نہیں لے گی۔

وہ بیتے لمحوں کی گرفت میں آئی تو بے ساختہ ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آنسوؤں کا یہ سیل رواں جانے کب تک جاری رہتا کہ وہ ایک نسوانی چیخ سن کر چونک پڑی۔ یہ چیخ بہت زوردار نہیں تھی لیکن کہیں قریب ہی سے ابھری تھی اس لیے اس کی سماعتوں نے اسے واضح طور پر سنا۔ وہ ادھر اُدھر نظریں گھما کر چیخنے والی کو تلاش کرنے لگی۔ مسلسل آوازوں نے اس کی راہنمائی کی۔ چیخنے والی کے انداز میں خوف کے بجائے احتجاج تھا اور لگتا تھا کہ وہ کسی چیز کے خلاف مزاحمت کر رہی ہے۔ ماہ بانو کو اس عورت کو شناخت کرنے میں زیادہ وقت پیش نہیں آئی۔ وہ وہی مدقوق سی عورت تھی جس کے ساتھ مل کر اس نے کل کپڑوں کا ڈھیر دھویا تھا۔ اسے ایک مرد کھینچتا ہوا درختوں کے پیچھے لے جا رہا تھا اور وہ تسلسل سے اسے گالیاں دیتی ہوئی چیخ چلا رہی اس کے ساتھ جانے سے مزاحمت کر رہی تھی لیکن ایک طاقتور مرد کے سامنے اس کی کوئی پیش نہیں چل رہی تھی۔ شاید اپنی اس ناکامی پر ہی اس نے جھنجلا کر مرد کو کاٹ لیا لیکن اس کا یہ احتجاج اسے مہنگا پڑا اور مرد نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ تھپڑ مارنے کے بعد وہ اسے بالوں سے گھسیٹتا ہوا درختوں کے پیچھے لے گیا۔ سن سی کھڑی یہ سب دیکھتی ماہ بانو کو کچھ دیر تک تو سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ وہ اسی جگہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی۔ عورت ذات کی جتنی تذلیل اس نے اس جگہ دیکھی تھی، اس سے کہیں اور سابقہ نہیں پڑا تھا۔

وہاں موجود کل دو عورتیں ان سارے مردوں کی جاگیر تھیں۔ اس وقت جنگل میں دن دہاڑے یقیناً یہی گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ خود اس کے ساتھ ایسی کوئی زیادتی نہیں ہوئی تھی لیکن وہ خوف زدہ تھی کہ درندوں کے درمیان رہ کر کب تک محفوظ رہ سکے گی؟ اگرچہ اسلم تنیوا اس کے لیے ایک ڈھال بنا ہوا تھا لیکن درندوں پر بھروسا تو بہرحال نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے کوئی اپنے سفلہ جذبات سے مغلوب ہو کر

اس پر ٹوٹ پڑتا تو شاید اسلم کے لیے بھی اس کا دفاع کرنا ممکن نہیں رہتا۔ یہی سب سوچتی ہوئی وہ ایک بار پھر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور اس کی نظریں درختوں کے اس جھنڈ پر بھٹکنے لگیں جہاں اس نے ان دونوں مرد و زن کو غائب ہوتے دیکھا تھا۔ چند لمحے ہی گزرے تھے کہ اسے وہاں سے مرد برآمد ہوتا دکھائی دیا۔ وہ کسی بدمست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا چل رہا تھا۔ ماہ بانو نے اسے شناخت کر لیا۔ یہ وہی تھا جو گزشتہ روز کپڑوں کی دھلائی کے دوران اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے وہ بھاری قدموں سے چلتا ہوا اس جانب مڑ گیا جہاں ان لوگوں کی رہائشی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے نظروں سے غائب ہونے کے بعد وہ اپنی جگہ سے حرکت میں آئی اور احتیاط سے سیڑھیاں اتر کر پھلواری سے گزرتی ہوئی درختوں کے اس جھنڈ کی طرف بڑھ گئی جہاں وہ مدقوق سی عورت موجود تھی۔

اس عورت نے اب تک اس کے ساتھ کوئی اچھا رویّہ نہیں رکھا تھا اور بدمزاجی کا مظاہرہ کرتی رہی تھی لیکن اس وقت وہ اس کا ہر رویّہ بھلائے اس کی ہمدردی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی سمجھ آ رہا تھا کہ عورت کے خراب رویّے کے پیچھے اس کے حالات کارفرما ہیں۔ وہ یہاں جو ذہنی اور جسمانی مشقت اٹھا رہی تھی، اس کے بعد یقینی طور پر اس لائق نہیں ہو سکتی تھی کہ کسی سے خوش اخلاقی و خوش گفتاری کا مظاہرہ کر سکے۔ عورت کے حالات کا تجزیہ کر کے اس سے مزید ہمدردی محسوس کرتی ہوئی وہ درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئی تو اس کے دل کو دھچکا سا لگا۔ عورت زمین پر آڑی ترچھی پڑی ہوئی تھی اور اس کے بال اس بُری طرح نوچے کھسوٹے گئے تھے کہ وہ بُری طرح بکھر کر رہ گئے تھے۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے نزدیک پہنچی اور اپنی انگلیوں سے اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہٹایا۔ وہاں ایک اور دردناک منظر اس کا منتظر تھا۔ عورت کے چہرے پر جگہ جگہ زخم کے نشان تھے اور ان سے رسنے والا خون اس کی تھوڑی پر بہہ رہا تھا۔ وہ بے ہوش نہیں تھی لیکن بالکل بے دم سی پڑی آنکھیں بند کیے ہولے ہولے سسک رہی تھی۔

"سنو! آنکھیں کھولو۔" اس نے دھیرے سے عورت کے رخسار تھپتھپاتے ہوئے اسے پکارا تو اس نے قدرے چونکتے ہوئے آنکھیں کھول دیں اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ان پوری کھلی ہوئی آنکھوں کو قریب سے دیکھنے پر ماہ بانو پر انکشاف ہوا کہ وہ آنکھیں اپنی ساخت کے اعتبار سے بڑی خوب صورت ہیں جو یقیناً کبھی عورت کے سراپا کو بہت

پُرکشش بنا دیتی ہوں گی لیکن اب آنکھوں میں ڈیرے ڈال کر بیٹھی ویرانی نے ان کی ساری خوب صورتی اور کشش کو ماند کر دیا تھا۔

"تمہارے ساتھ جو ہوا، مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو ان سارے درندوں کو لائن میں کھڑا کر کے گولی مار دیتی۔" عورت سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے اپنے دلی جذبات بھی بیان کیے۔

"تم کیوں افسوس کر رہی ہو؟ یہ درندے تمہیں تو کچھ نہیں کہتے۔ تم تو اسلم کی چہیتی ہو اور اپنی چہیتی کی طرف وہ کسی کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھنے دے گا۔" اس نے کچھ جلے کٹے لہجے میں اسے جواب دیا۔ لہجے کی یہ تپش شاید اپنی بدقسمتی اور ماہ بانو کی خوش قسمتی کی وجہ سے تھی۔ وہ دونوں عورتیں تھیں لیکن ایک کسی کی منظورِ نظر ہونے کی وجہ سے محفوظ و مامون تھی تو دوسری سب کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی تھی۔

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں۔ مجھے اپنے ارد گرد کے لوگوں کا ہمیشہ بہت خیال رہتا ہے۔ تم بے شک میرے لیے اجنبی ہو لیکن ہو تو میری ہم جنس ہی اور اب ہم ایک جگہ ہی رہ رہے ہیں۔ اس لیے مجھے تمہارے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔" عورت کی بات کا بُرا مانے بغیر اس نے رسان سے جواب دیا۔

"خالی خولی ہمدردی سے مجھے کیا ملتا ہے۔ تمہاری یہ ہمدردی میرے حالات تو نہیں بدل سکتی۔" وہ رونا ترک کر چکی تھی اور اب اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ماہ بانو نے سہارا دے کر اس کی اس کوشش کو کامیاب بنایا۔ اس کے اس طرح سہارا دینے پر قدرتی طور پر عورت کا دل اس کی طرف سے قدرے نرم پڑ گیا اور وہ آہستہ سے بولی۔ "شکریہ۔"

"کوئی بات نہیں۔ انسان ہی انسان کے کام آتے ہیں۔"

"ایک مدت گزری، لگتا ہے انسانوں سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔" یاسیت زدہ لہجے میں بولتے ہوئے اس نے ایک درخت کے تنے سے پیٹھ ٹکا لی۔

"تم یہاں ان ڈاکوؤں کے درمیان کیسے پہنچیں؟" ماہ بانو کے تجسس نے اسے سوال کرنے پر اکسایا۔

"قسمت کو تو دوش نہیں دوں گی، میری اپنی ہی کوتاہیاں تھیں جو مجھے یہاں لے آئیں۔" اس کے بے رونق چہرے پر پچھتاوے رقص کر رہے تھے۔

"اگر تم چاہو تو مجھے اپنے حالات بتا سکتی ہو۔ میں بے

WWW.PAKSOCIETY.COM

شک تمہاری مدد نہ کرسکوں لیکن کبھی کبھی کسی سے اپنا حال کہہ دینے سے بھی دل کا بوجھ اتر جاتا ہے۔" ماہ بانو نے نرمی سے اس کے بازو پر ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

"میرا بوجھ تو قیامت تک نہیں اترنے والا... ہاں، میں تمہارا تجسس دور کرنے کے لیے اپنے حالات سنا سکتی ہوں۔" اس کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ جھلک دکھا کر غائب ہوگئی۔

"تجسس تو مجھے واقعی ہے کیونکہ جن حالات سے گزر کر میں یہاں پہنچی ہوں، ان کو سامنے رکھتے ہوئے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم بھی غیر معمولی حالات میں ہی یہاں تک پہنچی ہو گی۔ تمہاری بات چیت کے انداز سے یہ تو صاف ظاہر ہے کہ تم ان ڈاکوؤں سے الگ ہو اور کہیں باہر سے ہی یہاں لائی گئی ہو۔"

"تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے تو میری خودسری اور نافرمانی یہاں تک لے آئی، ورنہ میں تو بڑے عزت دار ماں باپ کی اولاد تھی۔ میرے والد نے میری پیدائش پر بہت محبت سے میرا نام غزالہ رکھا تھا، میری آنکھیں بہت خوب صورت تھیں نا اس لیے۔ میرے والد بڑا شاعرانہ مزاج رکھنے والے ایک پڑھے لکھے شریف آدمی تھے۔ انہیں ادب سے بہت لگاؤ تھا اور وہ ایک پرائیویٹ کالج میں اردو کے استاد تھے۔ میرے بعد دو بہنیں اور تھیں لیکن میں بڑی اولاد ہونے کی وجہ سے اپنے والد کی بہت زیادہ لاڈلی تھی۔ امی بھی مجھ سے محبت کرتی تھیں لیکن انہوں نے مجھے باقی دونوں بہنوں پر کبھی فوقیت نہیں دی تھی۔ وہ اولاد میں مساوات کی قائل تھیں۔ ان کے مقابلے میں ابو مجھے بہت زیادہ چاہتے تھے۔ گھر میں آنے والی ہر اچھی چیز پر سب سے پہلے میرا حق ہوتا تھا، اس کے بعد ہی چھوٹی دونوں بہنوں کو مل پاتا تھا۔ اس ترجیحی سلوک نے مجھے اچھا خاصا ضدی اور خودسر بنا دیا تھا لیکن میں پڑھائی میں بہت اچھی تھی اس لیے میرے مزاج کے باوجود دونوں بہنوں کے مقابلے میں ہر جگہ مجھے ہی اہمیت دی جاتی تھی۔ پڑھائی کے علاوہ میں غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ خاندان، محلے اور کالج میں میری خوب صورتی اور ذہانت کے چرچے تھے۔ کالج میں کوئی فنکشن ہوتا تو میں سب سے نمایاں ہوتی۔ ایک بار سالانہ فنکشن کے موقع پر میں نے ایک ڈرامے میں حصہ لیا اور انارکلی کا کردار ادا کیا۔ ہر ایک کا کہنا تھا کہ میں اس کردار کے لیے انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ تھی۔ فنکشن میں شریک ایک فلم پروڈیوسر نے اس بات کی تصدیق بھی کردی۔ وہ میرا پتا حاصل کرکے ہمارے گھر تک آپہنچا اور مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر کی۔ اس نے یہ آفر ابو کے سامنے ہی کی تھی۔ ابو بڑے وضع دار آدمی تھے۔ انہوں نے پروڈیوسر کی خاطر مدارات تو خوب کی لیکن میرے کام کرنے سے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ہم سیدھے سادے عزت دار لوگ ہیں اور مجھے قطعی اچھا نہیں لگے گا کہ میری بیٹی فلموں میں ناچنے گانے کا کام کرے۔ اس پر اس پروڈیوسر نے بتایا کہ وہ خود فلم انڈسٹری کی زبوں حالی کی وجہ سے اب فلموں پر زیادہ سرمایہ کاری کرنے کے بجائے دوسری طرف دھیان دے رہا ہے اور سائڈ بزنس کے طور پر ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھول رکھی ہے۔ ابو اجازت دیں تو وہ مجھے کمرشلز میں بک کرسکتا ہے۔ اس نے ابو کو لالچ بھی دیا کہ کمرشلز میں کام کرکے میں بہت کم وقت میں اتنا کماسکتی ہوں کہ گھر کے حالات بدل جائیں گے۔ ایک چند ہزار کی نوکری کرنے والے استاد کے لیے جس کے سر پر تین تین بیٹیوں کا بوجھ ہو، یہ ترغیب بڑی کشش رکھ سکتی تھی لیکن ابو نے اپنا فیصلہ بدلنا پسند نہیں کیا۔

"ابو کے فیصلے کے سامنے میں بھی بظاہر چپ رہی لیکن حقیقت میں مجھے یہی لگا کہ ابو نے مجھے زندگی میں ملنے والا ایک بہترین چانس میرے ہاتھ سے نکال دیا ہے۔ اپنی دوستوں سے جب میں نے اس بات کا ذکر کیا تو ان میں سے اکثر نے افسوس کیا کہ میں اتنا سنہری موقع ضائع کر رہی ہوں۔ اپنی ذاتی خواہش اور دوستوں کے تبصروں نے مجھے اکسایا کہ میں خود اس فلم پروڈیوسر سے رابطہ کروں۔ اپنا وزیٹنگ کارڈ وہ دے کر ہی گیا تھا۔ میں نے اس پر چھپے نمبر پر کال کی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ٹی وی کمرشل میں کام کرنا چاہتی ہوں۔ وہ بہت خوش ہوا اور اس بات پر بھی راضی ہوگیا کہ جب تک میں اپنے گھر والوں سے یہ بات چھپانا چاہتی ہوں، وہ کالج ٹائمنگ میں مجھ سے کام لے گا۔ بس پھر اس دن سے یہ ہونے لگا کہ میں گھر سے تو کالج کے لیے نکلتی لیکن وہاں پہنچنے کے بجائے ایڈورٹائزنگ ایجنسی پہنچ جاتی۔ ابتدا میں میری گرومنگ کی گئی اور ایک ماڈل کی طرح چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے کے آداب سکھائے گئے۔ اس کے بعد میرا حلیہ تبدیل کیا جانے لگا۔ بے شمار فیس سروسز کے ساتھ ساتھ کٹنگ کرکے میرا ہیئر اسٹائل بھی تبدیل کردیا گیا۔ امی ان تبدیلیوں پر چونکیں اور مجھ سے پوچھ تاچھ کی۔ میں نے بہانہ بنا دیا کہ میری ایک دوست پارلر کا کورس کر رہی ہے، اسے پریکٹس کے لیے کسی لڑکی کی ضرورت تھی اس لیے اس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے میرے ساتھ یہ سب کر ڈالا۔ امی تب بھی بہت خفا ہوئیں کہ کیا ضرورت تھی پیٹی کی محبت میں اپنا یہ حال کر دینے کی۔ انھیں میرا ماڈرن حلیہ قطعی پسند نہیں آ رہا تھا۔

”اس موقع پر ابّو میری ڈھال بن گئے اور مجھے امی کے عتاب سے بچایا لیکن جس دن ٹی وی پر میرا پہلا کمرشل چلا، ابّو ہی سب سے زیادہ دکھی ہوئے۔ صدمے کی وجہ سے وہ دو دن تک کچھ کھا پی سکے، نہ ڈھنگ سے سوئے۔ دو دن بعد انھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور سمجھایا کہ تم نے ایک کمرشل میں کام کر کے اپنا شوق پورا کر لیا ہے لیکن آئندہ اس طرف کا رخ نہ کرنا لیکن مجھ پر تو نئی نئی شہرت اور پیسے کا نشہ طاری ہو چکا تھا۔ میں نے ابّو کی بات کا کوئی اثر نہیں لیا اور اپنی من مانی کرتی رہی۔ اب چھپ چھپا کر بھی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں دھڑلے سے سرِ شام تیار ہو کر گھر سے نکلتی۔

میری اس خودسری نے ابّو کو سانپ سونگھا دیا، البتہ امی خوب باتیں سناتیں اور بڑبڑاتیں۔ انھوں نے دونوں بہنوں کو بھی مجھ سے بات چیت کرنے سے روک دیا تھا لیکن ان دنوں مجھے کسی کی کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ میں بن ٹھن کر گھر سے نکلتی اور رات گئے واپس آتی۔ مجھے واپس گھر پہنچانے کی ذمے داری پروڈیوسر نے اپنے ذمے لی ہوئی تھی۔ ایک رات ڈیڑھ دو بجے کے قریب میں اس کے ساتھ اس کی گاڑی میں شوبز کی ایک تقریب سے واپس آ رہی تھی تو ایک سنسان سڑک پر ڈاکوؤں نے ہمیں گھیر لیا اور اغوا کر کے یہاں لے آئے۔ اصل میں تو ان کا شکار وہ پروڈیوسر ہی تھا جسے انھوں نے تاوان کے لیے اغوا کیا تھا۔ میں مالِ غنیمت کے طور پر ان کے ہاتھ لگ گئی اور انھوں نے اس مالِ غنیمت سے خوب خوب استفادہ کیا۔ بعد میں پروڈیوسر کے گھر والوں نے منہ مانگا تاوان ادا کر کے اسے تو چھڑوا لیا لیکن میں یہیں پھنس گئی۔ سردار نے تاوان کی وصولی کے ساتھ ساتھ اس کی رہائی کے لیے یہ شرط بھی رکھ دی تھی کہ وہ یہاں سے جانے کے بعد کسی کو یہ نہیں بتائے گا کہ اغوا کے وقت اس کے ساتھ میں بھی تھی۔ اسے اپنی جان پیاری تھی چنانچہ بڑی آسانی سے یہ شرط مان گیا۔ ویسے بھی میں اس کی کیا لگتی تھی جو وہ میرے لیے فکر مند ہوتا۔ پہلے بھی اس نے اپنے فائدے کے لیے مجھے غزالہ سے للی بنا کر استعمال کیا تھا اور مجھے چند ہزار دے کر خود لاکھوں کمائے تھے۔ جب اپنی جان پر بنی تو وہ میری قربانی دے کر خود اڑن چھو ہو گیا۔ ظاہر ہے، زندگی رہتی تو وہ مجھ جیسی شوبز کی چکاچوند سے اندھی ہو جانے والی دوسری کئی لڑکیوں کو پھنسا کر تاوان میں دی گئی رقم سے زیادہ کما لیتا۔

”وہ مجھے یہاں چھوڑ کر چلا گیا اور اب میں اپنے ماں باپ کا دل دکھانے کی سزا بھگت رہی ہوں۔“ غزالہ عرف للی کی داستان بڑی افسوسناک اور سبق آموز تھی اور خود وہ عبرت کا نشان بن کر رہ گئی تھی۔

ماہ بانو کو اس کی داستان سن کر دلی افسوس ہوا۔ اس نے اپنی نافرمانی و خودسری کی بہت بڑی سزا پائی تھی اور مسلسل اذیت میں مبتلا تھی۔ کچھ دیر قبل اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، کسی عورت کے لیے اس سے بڑی تکلیف اور ذلت کی کوئی اور بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ شہرت کی بلندیوں کو چھونے کی خواہش مند وہ لڑکی اتنے گہرے پاتال میں گری تھی کہ اب شاید وہاں سے نکلنا بھی ممکن نہیں تھا۔ حساس دل ماہ بانو کو چپ سی لگ گئی۔

”تم نے تو دل پر ہی لے لیا۔ اتنی افسردہ نہ ہو۔ میں نے اپنے حالات کو اپنے کیے کی سزا سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ پہلے پہل روتی دھوتی تھی، اب تو چپ چاپ ہر بات اس اذیت سے گزر جاتی ہوں۔ اس کتے کو برداشت کرنا بہت مشکل ہے، اب میرے اندر بڑی برداشت آ گئی ہے لیکن اس کمینے سے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اسے تو وہ موٹی حمیداں ہی سہہ سکتی ہے۔“ اس کا اشارہ یقیناً ڈیرے پر موجود اس دوسری عورت کی طرف تھا۔

”حمیداں یہاں کیسے ہے۔ دیکھنے میں تو وہ بڑی مردمار عورت لگتی ہے اور اس کی یہاں موجود ان ڈاکوؤں سے بنتی بھی خوب ہے۔ تمہاری طرح وہ اس ماحول سے بیزار بھی نہیں لگتی؟“

”وہ کیوں ہوگی بیزار؟ اس کا اپنا مرد اس گروہ میں شامل تھا۔ وہ اپنے مرد کے ساتھ مزے سے یہاں رہتی تھی۔ ایک واردات میں وہ مارا گیا تو یہ سب کی بیوی بن گئی۔ ایک بیٹا بھی ہے اس کا۔ شہر میں ہاسٹل میں رکھ کر پڑھا رہی ہے۔ ادھر جو خدمتیں کرتی ہے، اس کے بدلے بیٹے کو بھر بھر کر نوٹ بھیجتی ہے۔ سال میں ایک بار اسے مہینے بھر کی چھٹی بھی ملتی ہے، ان چھٹیوں میں وہ شہر جا کر بیٹے کے ساتھ رہتی ہے اور خوب موجیں کرنے کے ساتھ ساتھ مال دار پارٹیوں کے بارے میں کھوج بھی لگا کر آتی ہے۔ اس کی مخبری پر ان لوگوں نے بڑے بڑے ڈاکے مار کر خوب مال کمایا ہے۔ وہ تو چہیتی ہے ان لوگوں کی۔“ للی نے قدرے طنز اور نفرت کے ساتھ حمیداں کے بارے میں بتایا تو زندگی کے نئے نئے بھیدوں کے خود پر کھلنے پر حیران ماہ بانو اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اس نے اپنی زندگی کے سترہ سال بڑی بے خبری میں

معصوم معصوم خواہشوں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے گزارے تھے لیکن اب زندگی عجیب ہی ڈھنگ کے ساتھ اس پر منکشف ہو رہی تھی۔ وہ جہاں جاتی تھی، وہاں زندگی کا ایک حیران کن روپ دیکھنے کو ملتا تھا۔

”تو تم یہاں بیٹھی ہو۔ میں سمجھا کہ میرے سمجھانے کے باوجود کوئی ایڈونچر کرنے نکل کھڑی ہوئی ہو اور اب جنگل میں بھٹکتی پھر رہی ہوگی۔“ اسلم کب وہاں آیا، اسے اور للی کو پتا نہیں چلا۔ وہ اس کی آواز سن کر ہی چونکیں۔

”میں بے وقوف نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر یہاں سے بھاگنا اتنا آسان ہوتا تو کوئی بھی عورت یہاں رہ کر ذلت اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔“ وہ سمجھ گئی تھی کہ اسلم پہلے اسے اپنی بنائی ہوئی پھلواری میں دیکھنے گیا ہوگا اور اس کے وہاں نہ ملنے پر تشویش زدہ ہو کر اسے ادھر ادھر ڈھونڈنے نکلا ہوگا۔

”اب واپس چلو، کافی دیر ہوگئی ہے۔“ اسلم نے ایک بے نیازانہ نظر دگرگوں حالت میں بیٹھی للی پر ڈالی اور بلا تبصرہ اس سے بولا۔

ماہ بانو نے خاموشی سے اس کے حکم کی پیروی کی اور اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ اسلم سے بگاڑ کر وہ اپنے اتنے بڑے سپورٹر سے محروم ہونا برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس کی بات ماننے میں ہی بھلائی تھی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے درختوں کے اس جھنڈ سے نکلتے چلے گئے۔ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھی للی کی ان کی پشت کو گھورتی آنکھوں نے اس پل جتنے رنگ بدلے، وہ ان دونوں کو ہی نظر نہیں آئے۔

☆☆☆

”چودھری کی حویلی سے کوئی خبر ملی عبدالمنان؟“

”فی الحال تو ایسی کوئی خبر نہیں ہے جو ہمارے لیے کارآمد ثابت ہو سکے۔ میں نے حویلی کی جس ملازمہ کو مخبری پر لگایا ہوا ہے، اس نے صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ چودھری صاحب آج کل بہت غصے میں ہیں اور انھیں ابھی تک اس شخص کی تلاش ہے جس نے حویلی کے ملازموں کی مدد سے ماہ بانو کو وہاں سے نکالا ہے۔ شروع میں وہ آپ پر ہی شک کر رہا تھا لیکن اب اسے کسی وجہ سے یہ یقین آ چکا ہے کہ آپ کا اس معاملے سے تعلق نہیں ہے اس لیے وہ دن رات اپنے قریبی ملازموں پر برس رہا ہے کہ اصل مجرم کا سراغ لگانے کے ساتھ ساتھ ماہ بانو کو بھی تلاش کریں لیکن فی الحال وہ لوگ بھی ناکام ہیں۔“ عبدالمنان نے اسے تفصیلی جواب دیا۔

نئی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کے شمارے

اپریل 2011ء
کی ایک جھلک

شہنشاہ فن
پاکستان کی شان، ایک باکمال شخص کا زندگی نامہ جس کے فن کی قدر و قیمت سے ہم کلی طور آگاہ نہیں ہیں

کالی موت
وہ بیماری جس نے پوری دنیا کا نظام تہ و بالا کر دیا تھا کیسے اور کس طرح پھیلی؟

بے نوا مسافر
اس شاعر خوش نوا کا مختصر سا تعارف نامہ جس کے اشعار دل میں گدگدی پیدا کرتے ہیں

علاج
اگر عقل سے کام لیا جائے تو گھر کبھی نہیں اجڑتا
ایک ایسی سچ بیانی جو مدتوں یاد رہے گی

فلم و ادب کے تشنہ گوشوں پہنچی داستانیں کبھی ان کہی باتیں، سراب جیسی مقبول طویل سرگزشت

بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں،
آپ یقیناً گرویدہ ہو جائیں گے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"سمجھ نہیں آتا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ ادھر کراچی سے بھی کوئی خوش کن اطلاع نہیں مل رہی ہے۔ ڈاکٹر طارق اور اس کی بہن کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ ان کے والدین کے گھر پر ریڈ کروا کر بھی دیکھ لیا اور ان کے والد کو پولیس کسٹڈی میں لے کر بھی۔ پولیس نے ان کے والد سے ٹھیک ٹھاک تفتیش کی ہے لیکن ان کا یہی جواب ہے کہ انہیں اپنے بیٹے اور بیٹی کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے۔ میں نے جس بندے کو اس کام پر لگایا ہے، اس کا کہنا ہے کہ مجھے بڑے میاں سچے لگ رہے ہیں۔ وہ کافی اچھی شہرت رکھنے والے آدمی ہیں جن کی شرافت کی آس پڑوس والوں نے بھی گواہی دی ہے۔ کسی شریف آدمی کا عموماً پولیس کی تفتیش کے سامنے زیادہ دیر ٹھہرنا ممکن نہیں ہوتا اور اسے سچ اگلنا ہی پڑتا ہے۔"

"آپ پریشان نہیں ہوں سر! انشاء اللہ کوئی نہ کوئی بہتری کی صورت نکل ہی آئے گی۔" عبدالمنان نے اسے تسلی دی۔

"امید تو میں بھی یہی رکھتا ہوں لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنا بھی مجھے پسند نہیں۔ ہم کوشش کریں گے تب ہی تو اللہ بھی ہماری بہتری کرے گا۔ بے عمل انسان تو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

"ممکنہ کوششیں تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ اللہ کامیابی بھی ضرور عطا کرے گا، بس اس کا طے کیا ہوا وقت آجائے۔ جیسے آج بھی ایک اچھی خبر آپ کی منتظر ہے۔"

"کون سی اچھی خبر؟" شہریار چونکا۔

"میں آپ کو وہ خبر سنانے کے بجائے دکھانا پسند کروں گا۔" عبدالمنان ایک دم اٹھ کر آفس سے باہر نکل گیا، پھر دو منٹ بعد وہ دستک دے کر اندر آیا تو اکیلا نہیں تھا۔

"مشابرم خان۔" عبدالمنان کے ساتھ کھڑے شخص کو دیکھ کر وہ چونک پڑا۔

"جی سر جی! یہ ہم ہے۔" وہ خوش دلی سے مسکراتا ہوا بولا۔

"تمہیں دوبارہ اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے لیکن میں حیران ہوں کہ تم اتنی اچانک کیسے رہا ہو گئے۔ مجھے تو اس سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔" اس نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

"مہربانی تو آپ کی ہی ہے صاحب! آپ کی کوششیں شامل نہیں ہوتیں تو ان سے ہماری جان اتنی آسانی سے کہاں چھوٹتی۔ بس اللہ کا کرم یہ ہوا کہ ادھر میجر ذیشان بھی ہماری مدد کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔ ہمارے ہاتھ صاف تھے اس لیے سب کی کوششیں کامیاب رہیں۔ میجر ذیشان نے ہی ہم سے کہا تھا کہ اپنے سی صاحب کو پہلے سے خبر دینے کے بجائے اچانک ان کے سامنے پہنچ جاؤ تو وہ زیادہ خوش ہوں گے۔" مشابرم خان نے اپنے مخصوص انداز میں بتایا۔ اس کی صحت کافی متاثر ہوئی تھی۔ شمال کے پہاڑوں کے درمیان موجود شدت پسندوں کا خفیہ ٹھکانا تباہ ہوتے ہوئے جہاں بہت سی انسانی زندگیوں کا چراغ بجھ گیا تھا، وہاں مشابرم خان بھی کافی زخمی ہوا تھا۔ بعد میں علاج معالجہ تو ہوا لیکن اسے وہاں اپنی موجودگی کے اسباب بیان کرنے اور اپنی صفائی دینے کے لیے کافی عرصہ تحقیقاتی اداروں کی تفتیش کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اگر ماہ بانو اس کے حق میں گواہی نہیں دیتی اور شہریار اس کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے متحرک نہ ہوتا تو وہ بری طرح پھنس گیا تھا۔

"تو تم نے اور میجر صاحب نے مل کر مجھے سرپرائز دیا ہے۔" شہریار مسکرا کر بولا۔ حقیقتاً اسے مشابرم خان کو سامنے دیکھ کر اتنی خوشی ہو رہی تھی کہ وہ وقتی طور پر اپنی ساری ٹینشن فراموش کر بیٹھا تھا۔

"ہم نے جو کیا، وہ میجر صاحب کے کہنے پر کیا ورنہ ہمیں یہ سرپرائز ورپرائز کا کیا خبر؟" مشابرم خان شرمایا۔ "میجر صاحب نے کہا تھا کہ اپنے صاحب سے کہنا مجھ سے رابطے میں رہیں۔" اس نے اس تک پیغام پہنچایا۔

"اوکے! میں انہیں فون کر لوں گا۔" شہریار نے اسے جواب دیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ عبدالمنان نے کال ریسیو کی اور آپریٹر سے بات کرنے لگا۔

"سر! کوئی منشا صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی غیر موجودگی میں بھی ان کا فون آیا تھا لیکن انہوں نے کوئی پیغام دینا پسند نہیں کیا تھا۔" آپریٹر کی بات سن کر اس نے شہریار کو اطلاع دی۔

"بات کرواؤ۔" شہریار نے فوراً اجازت دی۔ اسے معلوم تھا کہ ماسٹر آفتاب کا قلمی نام اے اے منشا ہے اور اس کے بار بار فون کرنے سے ظاہر تھا کہ اسے کوئی خاص کام ہے۔

"اوکے سر۔" عبدالمنان نے آپریٹر سے لائن ملانے کا کہا اور شہریار کے اشارے پر ریسیور اسے تھما کر مشابرم خان کو لے کر باہر نکل گیا۔

"ہیلو۔" شہریار کال ملتے ہی اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"السلام علیکم سر! آپ نے مجھے پہچان تو لیا ہوگا؟" دوسری طرف سے آفتاب کی آواز سنائی دی۔

"وعلیکم السلام۔ کہو آفتاب، کیسے یاد کیا ہے؟" اس نے اپنے جواب سے باور کروا دیا کہ اس کی یادداشت اتنی کمزور نہیں ہے کہ وہ اس کا قلمی نام بھول گیا ہو۔

"آپ کو ایک بہت اہم اطلاع دینی تھی۔ کیا آپ کے دفتر کا نمبر محفوظ ہے؟" وہ بہت محتاط لگ رہا تھا۔ شہریار اس کے انداز پر چونک گیا۔ وہ آفتاب کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ غیر ضروری باتیں کرنے والا کم عقل آدمی نہیں تھا۔ اگر وہ اس کے دفتر کے نمبر کے محفوظ ہونے کے بارے میں تذبذب کا شکار تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس کے پاس واقعی کوئی بہت ہی اہم خبر موجود ہے۔

"تم کہاں ہو؟ مجھے اپنا نمبر دو، میں خود تم سے رابطہ کرتا ہوں۔"

"میرے پاس اپنا ذاتی فون نہیں ہے۔ میں آپ کو پی سی او سے کال کر رہا ہوں۔" اس نے اپنی مجبوری بتائی۔

"کوئی تو ایسا نمبر ہوگا جس پر تم سے رابطہ کیا جا سکے؟"

"نمبر..." شہریار کے پوچھنے پر وہ ایک پل کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ "میں آپ کو ایک بک شاپ کا نمبر دے دیتا ہوں۔ آپ پانچ منٹ بعد مجھے اس نمبر پر کال کر لیں۔ مجھے یہاں سے اس شاپ تک پہنچنے میں بس دو تین منٹ ہی لگیں گے۔ وہاں آپ مجھے احمد کے نام سے بلوائیے گا۔" اس نے ایک نمبر نوٹ کروا دیا۔ شہریار نے پانچ منٹ کے وقفے کے بعد اس نمبر پر اپنے موبائل سے رابطہ کیا۔ کال کسی اجنبی نے ریسیو کی۔

"مجھے احمد صاحب سے بات کرنی ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اس نمبر پر مجھے ملیں گے۔" اس نے اجنبی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

"جی، وہ انتظار کر رہے ہیں۔ آپ بات کر لیں۔" فون آفتاب کے ہاتھ میں منتقل کر دیا گیا۔

"اگر تمہارے نزدیک بات بہت زیادہ اہم ہے تو ابھی کچھ مت بتاؤ۔ میں تمہیں اپنا خفیہ موبائل نمبر دیتا ہوں۔ کسی محفوظ جگہ سے اس نمبر پر کال کر لو۔" آفتاب کی آواز سنائی دیتے ہی اس نے بلاتمہید اس سے کہا۔

"آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں۔" آفتاب کے مختصر جواب نے ظاہر کر دیا کہ بات بہت اہم ہے۔

"اوکے... نوٹ کرو۔" شہریار نے اسے اپنا نمبر نوٹ کروا دیا۔ وہ اپنے اس موبائل نمبر کے سلسلے میں بہت محتاط رہتا تھا اور چند لوگوں کے سوا یہ نمبر کسی کے پاس نہیں تھا اسی لیے اس نے بک شاپ پر بھی اس نمبر سے کال کرنے سے اجتناب کیا تھا۔ آفتاب نے نمبر نوٹ کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ دس منٹ بعد شہریار کے خاص موبائل نے وائبریٹ ہو کر کال آنے کا اشارہ کیا۔

"اب ہم آپس میں بات کر سکتے ہیں سر۔"

"ٹھیک ہے۔ تم بتاؤ کہ تمہارے پاس میرے لیے کیا اہم خبر ہے؟" شہریار نے اسے اجازت دی۔

"آپ کا ایک مفرور مجرم اتفاق سے مجھے مل گیا ہے۔"

"کون...؟" وہ چونکا۔ مفرور مجرم کا سن کر اس کا ذہن فوری طور پر ورما کی طرف ہی گیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ حیرت بھی تھی کہ آفتاب اس کے بارے میں کیسے جانتا ہے۔

"پیر آباد کی مسجد میں مولوی غلام محمد بن کر رہنے والا خبیث آدمی۔" آفتاب کی دی گئی اطلاع بھی کم اہم نہیں تھی۔ غلام محمد بھی یقینی طور پر ورما کا ہی ایجنٹ تھا۔ اگر وہ ہاتھ آجاتا تو اس سے ورما کا ٹھکانا اگلوایا جا سکتا تھا۔

"تم نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ مجھے اس کا پتا بتاؤ۔" وہ فوراً پرجوش ہو گیا۔ جواب میں آفتاب نے اسے پوری تفصیل کہہ سنائی کہ کہاں، کب اور کیسے اس نے غلام محمد کو شناخت کیا۔

"اوکے، تم محتاط رہنا۔ میں جلد از جلد اس موذی کو پکڑنے کا کوئی انتظام کرتا ہوں۔ تم مجھے اپنا مکمل ایڈریس بتا دو۔" ساری تفصیل سن کر اس نے آفتاب سے کہا تو اس نے اسے اپنا پتا نوٹ کروا دیا۔ پتا لینے کے بعد اس نے لائن منقطع کر دی اور خود سوچ میں پڑ گیا۔ اس بار اسے کوئی ایسا انتظام کرنا تھا کہ مجرم ہاتھ آئے تو پھر کسی صورت فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

☆☆☆

چودھری اپنے سامنے رکھے کاغذ کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کاغذ پر جھک بک شاپ، واہ کینٹ کے الفاظ کے علاوہ ایک فون نمبر بھی لکھا تھا۔ اسے یہ پتا اور فون نمبر لکھا کاغذ اس اطلاع کے ساتھ پہنچایا گیا تھا کہ اس بک شاپ سے آفتاب کا کوئی نہ کوئی تعلق ہے اور اگر وہ اسے اور کشور کو پکڑنا چاہتا ہے تو اس کلیو سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ وہ تو عرصے سے انتظار میں تھا کہ اپنی غیرت کو للکارنے والے معمولی ماسٹر اور اپنی باغی بیٹی کو ان کے کیے کی سزا دے سکے چنانچہ حاصل شدہ معلومات سے فائدہ اٹھانے کی سوچ رہا تھا۔

"آپ نے کچھ سنا چودھری صاحب؟" ابھی وہ کوئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

حتمی فیصلہ نہیں کرسکا تھا کہ وڈی چودھرائن ہانپتی کانپتی وہاں پہنچی اور اس کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے پرجوش انداز میں سوال کیا۔ وہ اتنی زیادہ پرجوش تھی کہ قاعدے کے مطابق چودھری کے کمرے میں آنے سے قبل اس سے اجازت بھی نہیں لی تھی۔ چودھری نے اس کی اس جسارت پر اسے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔

"کی گل اے چودھرائن! ایسی کون سی خبر سنانی ہے جس کے لیے تو یوں دوڑی چلی آرہی ہے؟"

"خبر ہی ایسی ہے چودھری صاحب! آپ سنیں گے تو سن کر آپ کو بھی یقین نہیں آئے گا۔"

"کیوں خوامخواہ پہیلیاں بجھوا رہی ہے۔ جو بھی گل ہے دس دے۔" چودھری کے سامنے اتنا اہم مسئلہ زیر غور تھا اس لیے اسے چودھرائن کی یہ بے وقت آمد بے حد ناگوار گزر رہی تھی۔

"اپنے بہزاد شاہ کی گھر والی ماں بننے والی ہے۔" وڈی چودھرائن نے اپنی دانست میں دھماکا کیا۔

"تو فیر؟" چودھری نے اسے گھورا۔

"آپ کو سن کر حیرت نہیں ہوئی چودھری صاحب؟" چودھرائن بے چاری پہلے خود پر ہونے والے انکشاف پر حیران تھی اور اب چودھری کے پرسکون رہنے پر حیرت زدہ ہو رہی تھی۔

"تو تو ایسے حیران ہو رہی ہے جیسے فریدہ کے بجائے بہزاد کے حاملہ ہونے کی خبر سن لی ہو۔ دنیا کی ہر عورت ماں بنتی ہی ہے، اس میں نیا کیا ہے؟" چودھری مکمل تجاہل برت رہا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے پر بہزاد کا بچہ..." چودھرائن نے اپنے ادھورے جملے سے پورا مفہوم ظاہر کر دیا۔

"کیوں... بہزاد کا بچہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ مرد ہے وہ۔ تھوڑا دماغ کمزور ہے، پر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ پوری طرح ناکارہ ہے۔" اس بار چودھری اس پر چڑھ دوڑا۔ چودھری کی بلند آواز کے سامنے اس کی مجال نہیں تھی کہ مزید کچھ کہہ سکتی چنانچہ چپ سادھ کر بیٹھ گئی ورنہ یقین تو اسے ابھی بھی نہیں تھا کہ فریدہ بہزاد شاہ کے بچے کی ماں بننے جا رہی ہے۔ ایک ملازمہ سے یہ خبر سننے کے بعد وہ فریدہ کے پاس بھی گئی تھی اور اس پر شک ظاہر کرتے ہوئے دھمکانے کی کوشش بھی کرتی رہی تھی لیکن فریدہ اس کی دھمکیوں پر ذرا بھی ہراساں نہیں ہوئی اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ جو چاہو کر ڈالو۔ وڈی چودھرائن کو اس کی اس جرأت نے بہت پریشان کیا تھا اور وہ فوراً ہی چودھری کو اطلاع دینے پہنچ گئی لیکن اس کا ردعمل بھی اس کی توقعات کے برخلاف تھا اور وہ خاصی مایوس ہوئی تھی۔

"ہور کچھ کہنا ہے تجھے؟" چودھری نے اس کی لٹکی ہوئی شکل دیکھی، اس کے باوجود کھردرے لہجے میں دریافت کیا۔ وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔

"تو فیر جا ادھر سے، ہور آئندہ خیال رکھنا کہ ایسے ہی منہ اٹھا کر میرے نال نہ آجانا۔ میں کوئی فارغ بندہ نہیں ہوں کہ بیکار کی بکواس سن کر تم زنانیوں کی طرح ان پر مغز کھپاتا رہوں۔" وہ ایسی کوئی کسر نہیں رہنے دینا چاہتا تھا کہ چودھرائن پھر دوبارہ اس موضوع پر گفتگو کر سکے۔ اگر اس کا شک برقرار رہتا تو وہ کھوج میں لگ سکتی تھی اور اس کا کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ اصل بات تک پہنچ جاتی۔ اصل بات معلوم ہوتی تو خود چودھری پکڑا جاتا۔ طوائفوں اور مزارعوں کی عورتوں کی بات الگ تھی لیکن ذہنی طور پر پسماندہ بیٹے کی بیوی کے ساتھ اگر اس کا تعلق ظاہر ہو جاتا تو چودھرائن بھلے اس کا کچھ بگاڑ نہیں پاتی، پر وہ اس کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو جاتا۔

فی الحال تو نتیجہ اس کی حسب توقع ہی نکلا تھا اور چودھرائن سر جھکائے مایوسی کے عالم میں وہاں سے نکل گئی تھی لیکن چودھری نہیں جانتا تھا کہ اس کے اس جھکے ہوئے سر میں موجود دماغ میں کیا خیالات سرسرا رہے تھے۔ وڈی چودھرائن کے نام سے پکارے جانے والی کا دل بالکل بھی بڑا نہیں تھا اور وہ اپنی اولاد کے سوا کسی کو اس جاگیر میں حصے دار بنانے کی روادار نہیں تھی۔ بہزاد شاہ تو اس کی اس سوکن کا بیٹا تھا جس سے اسے سب سے زیادہ حسد رہا تھا۔ اب تک اس نے بہزاد شاہ کو برداشت کیا تھا تو صرف اس لیے کہ اسے اس ذہنی مریض لڑکے سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن اب جبکہ وہ باپ بننے جا رہا تھا تو اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر ڈالے۔ اگر اسے جاگیر کا ایک اور وارث برداشت ہی کرنا ہوتا تو ماہ پارو کو کیوں یہاں سے نکلوانے کا انتظام کرتی۔

"میں نے ساری حیاتی تیرے کرتوتوں کو بہت سہہ لیا چودھری! پر یہ طے ہے کہ اس جاگیر پر صرف میری اولاد اور ان کے بچے راج کریں گے۔ میں کسی ہور سانجھے دار کو اس دنیا میں ساہ ہی نہ لینے دوں گی۔" زیر لب بڑبڑا کر اپنے زہریلے خیالات کا اظہار کرتی وہ عورت کے بجائے ایسی زہریلی ناگن لگ رہی تھی جو کسی کو بھی لمحے میں ڈس سکتی تھی۔

☆☆☆

"کیا بات ہے، آپ کو نیند نہیں آرہی کیا؟" آفتاب نے غنودگی بھری آواز میں اپنے پہلو میں لیٹی کشور سے پوچھا۔ وہ آج پنڈی تک جا کر واپس آیا تھا اور اس کے بعد لکھنے کا بھی ٹھیک ٹھاک کام کیا تھا چنانچہ تھکن کی وجہ سے سونے کے لیے بستر پر لیٹتے ہی نیند غالب آگئی اور وہ سو گیا لیکن پھر کروٹ بدلتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ لیٹی کشور ابھی تک جاگ رہی ہے۔ اس کی اس بے چینی کا سبب جاننے کے لیے ہی اس نے کشور سے سوال کیا۔

"پتا نہیں کیوں عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ میں اتنی کوشش کر رہی ہوں، اس کے باوجود سو نہیں پا رہی۔" اس نے بے بسی سے اپنی کیفیت کا اظہار کیا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی... کہیں کوئی مسئلہ تو نہیں؟" آفتاب فوراً ہی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ کشور جس حالت میں تھی، اسے اس کی ہر وقت فکر لگی رہتی تھی۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس گاؤں میں طبی سہولیات تقریباً نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اگر چودھری کا ڈر نہیں ہوتا تو وہ کبھی اسے اس حالت میں یہاں نہیں رکھتا۔ اب بھی ارادہ یہی تھا کہ آخری دنوں میں کسی ایسی جگہ منتقل ہو جائے گا جہاں بہترین طبی سہولیات موجود ہوں لیکن اگر اس وقت کشور کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوتی تو اس کے لیے بہت مشکل ہو جاتی۔ یہاں سے شہر تک پہنچنا اتنا آسان نہیں تھا۔ سب سے پہلے تو رات کے اس پہر سواری کا انتظام کرنا ہی مسئلہ بن جاتا۔

"کیا کہیں درد ہو رہا ہے؟" وہ کشور کو چھو چھو کر اس کی تکلیف کا اندازہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"آپ پریشان مت ہوں۔ مجھے صحت کا کوئی مسئلہ نہیں۔ صرف دل گھبرا رہا ہے۔" اس کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے کشور نے اسے تسلی دی۔

"دل بلاوجہ تو نہیں گھبراتا۔" آفتاب کی تشویش برقرار تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں صرف حالات کی وجہ سے تشویش میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ مجھے فکر ہے کہ کہیں غلام محمد کو پکڑوانے کے چکر میں ہم سامنے نہ آجائیں۔ بڑی مشکل سے کوئی ایسی جگہ ملی ہے جہاں ہم سکون سے دن گزار رہے ہیں۔" اس نے اپنی پریشانی کی وجہ آخر کہہ ہی ڈالی۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آپ اپنے ذہن پر زور مت ڈالیں۔ زیادہ ٹینشن لینا آپ کے لیے ویسے بھی ٹھیک نہیں ہے۔" آفتاب نے اسے سمجھایا۔

"میں جان کر یہ سب نہیں سوچ رہی ہوں، بس خود بخود ہی خیالات ذہن میں آتے چلے جا رہے ہیں۔" وہ بے بسی سے بولی۔

اہم بات

ایک بہت ہی موٹی عورت پلنگ پر سو رہی تھی کہ اچانک زلزلہ آگیا اور وہ عورت دھڑام سے پلنگ سے نیچے گر گئی۔ پاس ہی اس کا شوہر سو رہا تھا۔ اس کی بھی آنکھ کھل گئی۔ وہ فوراً بولا۔ "بیگم زلزلہ آنے سے تم گری ہو یا تمہارے گرنے سے زلزلہ آیا ہے؟"

امتیاز احمد کا شگوفہ

"خود کو سوچ سوچ کر ہلکان مت کریں۔ ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔ شہریار صاحب بہت محتاط اور سمجھ دار آدمی ہیں۔ وہ ہرگز اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے ایسی کوئی پلاننگ نہیں کریں گے جس سے ہم پر آنچ آئے۔ انہیں ہمارے حالات کا اچھی طرح علم ہے اس لیے وہ ہمارے تحفظ کا پورا پورا خیال رکھیں گے۔" آفتاب نے اسے تسلی دی۔

"اتنا بھروسا ہے آپ کو ان پر؟" کشور نے مسکرا کر پوچھا۔

"مخلص آدمی ہمیشہ بھروسے کے لائق ہوتا ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو میں بھی پریشان نہیں ہوتی اور آرام سے سو جاتی ہوں۔ آپ بھی سو جائیں، صبح اٹھ کر آپ کو اپنے ناول پر کام کرنا ہے اس لیے ضروری ہے کہ ٹھیک سے نیند لیں۔ فریش موڈ کے ساتھ کام کریں گے تو زیادہ اچھا لکھا جائے گا۔" اس نے آفتاب کو لیٹنے پر مجبور کر دیا اور پھر خود اس کے بازو پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ آفتاب نے اپنا دوسرا بازو اس کے گرد حمائل کر کے اسے خود سے اور بھی قریب کر لیا۔ اس کی پلکیں نیند سے بوجھل تھیں لیکن وہ فقط اس لیے نہیں سو رہا تھا کہ کشور جاگ رہی ہے۔ اس کی اس کیفیت کو محسوس کر کے کشور نے اپنی آنکھیں موند لیں اور آنکھوں سے نیند کوسوں دور ہونے کے باوجود سوتی بن گئی۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر جلد ہی آفتاب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

کشور بھی کوشش کرنے لگی کہ کسی طرح نیند مہربان ہو جائے۔ اس کی یہ کوشش کسی حد تک کامیاب ہونے لگی تھی اور وہ ہلکی ہلکی سی غنودگی محسوس کر رہی تھی کہ جھٹکے سے کھٹکے کی آواز نے اسے ایک بار پھر پوری طرح بیدار کر دیا۔ اسے بالکل

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایسا محسوس ہوا کہ کوئی دبے قدموں سے چلتا ہوا اس طرف آرہا ہے۔ وہ کان لگا کر غور کرنے لگی کہ اس کا احساس درست ہے یا پھر وہ کسی واہمے میں مبتلا ہے۔ کسی حتمی نتیجے سے قبل ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر کشور کے منہ سے بے ساختہ ہی ایک چیخ برآمد ہوئی۔ اس کی چیخ سن کر آفتاب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور پھر بنا کسی سوال کے خود ہی اس کے چیخنے کا سبب سمجھ گیا۔ سیاہ چست لباس میں ملبوس، چہرے کو نقاب میں چھپائے وہ شخص اپنے دائیں ہاتھ میں پسٹل پکڑے بالکل سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس کے پسٹل کا رخ انہی کی طرف تھا۔

"کون ہو تم؟" اس نے تھرتھر کانپتی کشور کو خود سے لگاتے ہوئے آنے والے سے پوچھا۔ درحقیقت اس مسلح آدمی کو اپنی خواب گاہ میں دیکھ کر وہ خود بھی تھوڑا سا گھبرا گیا تھا۔

"حیرت ہے، تم نے مجھے نہیں پہچانا ورنہ میں تو یہی سمجھا تھا کہ تم مجھے پہچان چکے ہو اسی لیے میرا سامنا نہیں کر رہے۔" اس شخص نے استہزائیہ لہجے میں اسے جواب دیا۔ اس کے الفاظ اور آواز نے آفتاب کو بتا دیا کہ وہ کون ہے؟

"اگر میں نے تمہیں پہچان بھی لیا ہے تو تمہیں کیا پریشانی ہے۔ جس طرح میں تمہیں پہچان کر خاموشی سے بیٹھا ہوں، تم بھی انجان بن جاؤ۔ ہم دونوں ہی کو اپنے پکڑے جانے کا ڈر ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے سے اجنبی بن کر یہاں خاموشی سے رہتے رہیں تو کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔" آفتاب سمجھ گیا تھا کہ اس نے جس طرح اس مفرور غلام محمد کو پہچان لیا تھا، اسی طرح وہ بھی اسے شناخت کر چکا تھا۔

"مجھے تم پر بھروسا نہیں ہے۔ تم اپنے نبی شہریار کے چہیتے ہو اور اسے میری یہاں موجودگی کی خبر ضرور دو گے۔"

"اگر مجھے ایسا کرنا ہوتا تو پہلے ہی کر چکا ہوتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ ایسا کرنے کی صورت میں، میں خود بھی محفوظ نہیں رہوں گا اور میرے دشمن مجھ تک پہنچ جائیں گے۔" آفتاب نے دلیل دے کر اسے اپنے بے ضرر ہونے کا یقین دلانے کی کوشش کی۔

"تمہیں یہاں دیکھ کر میں خود بھی حیران ہوں۔ آخر تم یہاں کیوں رہ رہے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"یہ بھی کہانی ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ پیر آباد کے چودھری صاحب کسی وجہ سے میرے جانی دشمن بن گئے ہیں اور میں ان سے اپنی جان بچا کر ادھر ادھر چھپتا پھر رہا ہوں۔" اسے یقین دلانے کے لیے آفتاب نے زور دے کر کہا۔

"شاید اس کی وجہ یہ خوب صورت لڑکی ہے۔ کہیں تم چودھری کی کُڑی کو تو نہیں لے اڑے؟" کشور کی طرف اشارہ کر کے سوال کرتے ہوئے اس نے بالکل درست اندازہ لگایا۔ جواب میں آفتاب خاموش رہا۔

"گاؤں والوں کی زبانی یہ سن کر کہ کوئی شہری بندہ جو لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہے... یہاں آکر رہ رہا ہے، میں بہت حیران ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کوئی شہری باشندہ بلاوجہ تو اس پسماندہ گاؤں میں آکر نہیں رہ سکتا۔ ضرور کوئی ایسی وجہ ہوگی جو تم یہاں آکر رہنے پر مجبور ہو گئے ہو۔ وہ وجہ جاننے کے لیے میں نے تم سے ملاقات کی خواہش کی لیکن تم یقیناً پہلے ہی مجھے دیکھ کر پہچان چکے تھے اس لیے میرا سامنا کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ایک آدھ بار کے بہانے پر تو میں نے یقین کر لیا لیکن پھر سمجھ گیا کہ تم جان کر ایسا کر رہے ہو۔ مجھ پر دھن سوار ہوئی کہ کسی طرح تم سے سامنا ہو جائے۔ آج صبح بھی میں نے ایک آدمی تمہارے پاس بھیجا تھا۔ معلوم ہوا کہ تم شہر گئے ہوئے ہو اور شام تک واپس آؤ گے۔ میں عصر کے بعد ہوا خوری کے بہانے نکل کھڑا ہوا اور بس اڈے سے تمہارے گھر کی طرف آنے والے راستے پر انتظار کرنے لگا۔ بسیں چونکہ مقررہ اوقات پر ہی یہاں آتی جاتی ہیں اور میں حساب کتاب لگا کر ہی نکلا تھا، اس لیے مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تم نے اپنا حلیہ کافی تبدیل کر لیا ہے اور پہلی نظر میں تمہارا کوئی جاننے والا تمہیں پہچان نہیں سکتا لیکن میری نظروں سے تمہاری اصلیت چھپی نہیں رہ سکی۔ تمہیں دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ تمہارا زندہ رہنا میرے لیے خطرناک ہے۔ میں چاہتا تو اسی وقت تمہیں گولی مار سکتا تھا لیکن اس صورت میں تمہاری بیوی بچ نکلتی اور میں ایسے کسی فرد کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا جو میرے لیے مشکلات پیدا کر سکے۔ اب تم مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

اس نے ایک پل کے لیے بھی ان دونوں کو پسٹل کے نشانے پر سے نہیں ہٹایا تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے سنگین لہجے میں بولتے ہوئے اس نے ٹریگر پر اپنی انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ اس کی باتیں سنتے ہوئے آفتاب مسلسل اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچتا رہا تھا کیونکہ غلام محمد بے شک نہیں جانتا تھا کہ وہ اسے ایک بدکردار اور قاتل کے علاوہ را کے ایجنٹ کی حیثیت سے بھی جانتا ہے لیکن خود اسے معلوم تھا کہ را کے ایجنٹس کتنے شقی القلب ہوتے ہیں۔ وہ اپنی کوششوں سے اپنے لیے تھوڑی مہلت تو حاصل کر سکتا تھا لیکن جان بخشی کی اسے کوئی امید نہیں تھی۔ اس کے لیے اسے خود ہی کوئی تدبیر کرنی تھی اور تدبیر اس نے یہ کی کہ مطالعے کے لیے سرہانے رکھی بھاری

کتاب اٹھا کر اس کے پسٹل پر دے ماری۔ اس کی یہ تدبیر اس اعتبار سے کارگر رہی کہ پسٹل غلام محمد کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن پسٹل ہاتھ سے نکلنے سے قبل وہ گولی چلا چکا تھا۔ آفتاب کے حرکت میں آجانے کی وجہ سے اسے تو گولی نہیں لگی لیکن اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھی کشور زد میں آگئی۔ گولی جسم میں پیوست ہوتے ہی اس کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلی۔ اس کی چیخ اور پھر ابل ابل بہتے خون نے آفتاب کو سخت مشتعل کر دیا۔ وہ سیدھا سادہ آدمی تھا اور اس کا لڑنے بھڑنے سے کبھی واسطہ نہیں رہا تھا لیکن اس پل وہ جنونی ہو کر غلام محمد سے جا بھڑا۔

اس نے اپنے سر کی ایک زوردار ٹکر غلام محمد کے پیٹ میں ماری۔ ٹکر زوردار تھی جس نے اسے اپنی جگہ سے ہلا دیا اور وہ پیچھے دروازے کے ساتھ جا کر ٹکرایا لیکن اس نے فوراً ہی اپنا آپ سنبھال لیا اور آفتاب پر چھلانگ لگا کر اسے اپنے نیچے دبا کر رگیدنے لگا۔ وہ اسے ٹکر مار کر دور جا گرنے والے پسٹل کو اپنے قبضے میں... لینے کے چکر میں تھا۔ غلام محمد اس پر سوار ہوا تو اسے یوں لگا کہ اس کا جسم کسی پہاڑ کے نیچے دب گیا ہو۔ اس کے جنون کی را کے تربیت یافتہ ایجنٹ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ وہ پسٹل ہاتھ میں آجانے کے باوجود کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ غلام محمد نے اس کے سینے پر سوار ہو کر اسے رگیدنے کے ساتھ ساتھ اب اس کا نرخرا بھی اپنے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا تھا اور وہ اپنی رکتی سانسوں کے ساتھ خرخر کی آوازیں نکالنے کے سوا کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کا وقت پورا ہو چکا ہے اور اب وہ اس دنیا میں چند سانسوں کا مہمان رہ گیا ہے۔ اسے کشور کی بھی کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی اور وہ مذبذب میں مبتلا تھا کہ جانے وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ اپنی اور کشور کی زندگی بچانے کی ایک آخری کوشش کرتے ہوئے اس نے اپنی تمام تر توانائیوں کو مجتمع کیا اور اپنی داہنی ٹانگ موڑ کر گھٹنے کو پوری قوت سے غلام محمد کی ناف کے نیچے ضرب لگائی۔ موت کے بالکل قریب کھڑے شخص کی زندگی کے ساتھ جڑے رہنے کے لیے یہ بالکل آخری کوشش تھی جس نے کام دکھایا اور اس کے جسم پر سے غلام محمد کے جسم کا دباؤ کم ہونے کے علاوہ اس کا نرخرا بھی اس کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ لیکن وہی بات تھی کہ اس کا واسطہ ایک تربیت یافتہ ایجنٹ سے پڑا تھا جو ذرا سا ڈگمگایا تو ضرور لیکن پھر سنبھل کر حملہ آور ہوا اور نہایت ہوشیاری سے اس کے ہاتھ سے پسٹل چھین لیا۔ پسٹل ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر آفتاب کا سارا جوش و خروش دھیما پڑ گیا۔

وہ جس گھر میں رہائش پذیر تھے، وہ گاؤں کی دوسری آبادی سے اتنا ہٹ کر بنا ہوا تھا کہ وہ یہ بھی امید نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں ہونے والے ہنگامے کو سن کر کوئی ان کی مدد کے لیے آئے گا... مگر خدا بھی اپنے وجود کو ایسے ہی لمحے میں منواتا ہے جہاں بندہ مایوس ہو جاتا ہے۔ غلام محمد نے پسٹل ہاتھ میں آجانے کے بعد اس پر گولی چلانے کے لیے تانا ہی تھا کہ اس کے ہاتھ کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ غلام محمد نے ایک نظر اپنی ہتھیلی میں ہو جانے والے سوراخ اور اس سے بہتے خون پر ڈالی اور پھر پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک لمبا چوڑا آدمی کھڑا تھا جسے وہ تو نہیں پہچان سکا لیکن آفتاب کے چہرے پر رونق آگئی۔

"سیدھی طرح کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو ورنہ ہم دوسرا گولی تمہارے بھیجے میں مارے گا۔" نڈر اور بے خوف مشابرم خان نے اسے اس لہجے میں دھمکایا کہ اسے یقین ہو گیا کہ اگر اس نے اس کے کہے پر عمل نہیں کیا تو وہ اپنی دھمکی پر عمل کر گزرے گا۔ اس نے آفتاب کو چھوڑ کر کھڑے ہو جانے میں ہی عافیت جانی۔ اس کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی آفتاب بستر پر پڑی کشور کی طرف لپکا اور اس کی نبض چیک کی۔ وہ بے ہوش تھی لیکن وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ سانسوں کا سلسلہ کب تک جاری رہ سکے گا۔

"تم آفتاب اور اس کی بیوی کو لے کر فوری طور پر اسپتال کے لیے روانہ ہو جاؤ مشابرم خان۔ یہاں کی صورت حال کو ہم خود ہینڈل کر لیں گے۔" مشابرم خان کے پیچھے سے نمودار ہونے والے شہریار کے الفاظ نے جہاں آفتاب کے چہرے کو رونق بخشی، وہیں غلام محمد کا چہرہ بالکل تاریک پڑ گیا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ شہریار تنہا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ جدید اسلحے سے لیس چند دوسرے افراد بھی موجود ہیں اور وہ جتنا بھی اچھا فائٹر سہی، بہرحال اس محدود کمرے کے اندر اتنے سارے مسلح افراد سے تنہا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

"آپ ابھی تک سوئے نہیں بابا؟" ادھیڑ عمر آدمی کتاب پر سے نظر ہٹا کر بولنے والے کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اس کی جواں سال بیٹی تھی جو رات کے اس پہر بھی اس کے جاگنے پر سوال کر رہی تھی۔

"بس بیٹی یہ حصہ مکمل کر لوں تو پھر سوتا ہوں۔ اصل میں کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ اسے چھوڑ کر سونے کا دل ہی نہیں چاہ رہا۔" اس نے مسکراتے ہوئے بیٹی کو جواب دیا۔

"میں نے آپ کی طرح کسی دوسرے شخص کو کتابوں کی محبت میں گرفتار نہیں دیکھا۔ دن بھر کتابوں میں گھرے رہتے ہیں پھر بھی دل نہیں بھرتا۔ گھر آ کر بھی انہی میں گم رہتے تھے۔" اس نے قدرے خفگی کا اظہار کیا۔

"کیا کروں بیٹی! میں نے زندگی میں دو ہی چیزوں سے محبت کی ہے، ایک تم سے اور دوسری کتابوں سے۔ اس محبت نے ہی تو مجھے مہک بک شاپ کھولنے پر مجبور کیا تھا۔ تم پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں، اس سے پہلے میں نے ذرا چھوٹے پیمانے پر یہ شاپ کھولی تھی اور شاپ کا نام رکھتے ہوئے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اگر میرے گھر بیٹی ہوئی تو اس کا نام مہک رکھوں گا۔" اس نے سیکڑوں بار کی بتائی ہوئی بات بیٹی کے سامنے دہرائی۔

"میں جانتی ہوں بابا لیکن آپ کو اپنی صحت کا بھی تو خیال رکھنا چاہیے۔ پچھلے کئی روز سے آپ کا بلڈ پریشر مسلسل ہائی رہ رہا ہے۔ اگر آپ نے اپنے آرام کا خیال نہیں رکھا تو آپ کا بی پی کیسے کنٹرول ہوگا؟"

"او کے میری جان! بس دس منٹ اور دے دو پھر میں سو جاؤں گا۔" اس نے بیٹی کو منانے کی کوشش کی۔

"صرف دس منٹ... یاد رکھیے گا۔" اس نے انگلی اٹھا کر باپ کو تنبیہ کی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ صبح اسے کالج جانا تھا اس لیے زیادہ دیر تک جاگ نہیں سکتی تھی۔ بیٹی کے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بیٹی سے اس نے دس منٹ کا وعدہ کیا تھا لیکن کتاب پڑھنے میں مشغول ہوا تو وقت کا پتا ہی نہیں چلا اور ڈیڑھ گھنٹا یوں گزرا کہ اسے لگا فقط چند منٹ ہی گزرے ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد بھی وہ دروازے کی گھنٹی بجنے پر چونکا۔ اس نے دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا۔

"اس وقت کون آ گیا؟" حیرت سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے دروازے کا رخ کیا۔

"کون؟" دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے احتیاطاً پوچھا۔

"آپ شفیق صاحب ہیں نا؟" دوسری طرف سے اپنا تعارف کروانے کے بجائے اس سے پوچھا گیا۔

"جی ہاں، مسٹر آپ کون؟" اس نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اگر آنے والا اس کا کوئی واقف کار ہوتا تو یہ سوال ہرگز بھی نہیں کرتا۔

"میں آپ کو اطلاع دینے آیا تھا کہ آپ کی بک شاپ میں آگ لگ گئی ہے اور کوشش کے باوجود بجھائی نہیں جا رہی۔" یہ اطلاع ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنے ہوش و حواس قائم رکھ پاتا۔ اس نے فوراً ہی تڑپ کر دروازہ کھول دیا۔ فوراً ہی دو افراد اسے دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

"کک... کون ہو تم لوگ؟" اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"اندر چلو، پھر بتائیں گے۔" ان میں سے ایک نے بیرونی دروازہ بند کر دیا اور اسے دھکیلتے ہوئے اندر کی طرف لے گئے۔

"دیکھو تم لوگوں کو جو کچھ چاہیے، لے لو اور خاموشی سے واپس چلے جاؤ۔ میں تم لوگوں کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں کھڑی کروں گا۔" رات کے اس پہر گھر میں داخل ہونے والے مسلح افراد کو وہ ڈاکو ہی سمجھ سکتا تھا چنانچہ اسی حساب سے ان سے بولا۔

"ہمیں روپیا پیسا نہیں بلکہ ماسٹر آفتاب کا پتا چاہیے۔" جواباً اس سے جو مطالبہ کیا گیا، وہ اسے سن کر حیران رہ گیا۔

"کون ماسٹر آفتاب؟"

"وہی جس کے لیے آج تمہاری دکان پر نور کوٹ سے اے سی شہریار کا فون آیا تھا۔"

"یقین کرو، میں ایسے کسی شخص کو نہیں جانتا۔ میرے بے شمار کسٹمرز ہیں جن میں سے کئی دکان کا فون بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی ماسٹر آفتاب بھی ہو لیکن میری اس شخص سے ذاتی واقفیت نہیں۔" وہ سچ کہہ رہا تھا کہ اسے آفتاب کے بارے میں علم نہیں۔ آفتاب نے اس سے اپنا تعارف احمد کے نام سے کروایا تھا چنانچہ وہ کیسے انہیں کچھ بتا سکتا تھا۔

"ہمیں یہ ساری بکواس نہیں سننی۔ ہمیں تم سے صرف ماسٹر آفتاب کا پتا چاہیے۔" اس کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ مارا گیا۔ تھپڑ اتنا شدید تھا کہ اس کی باچھوں سے خون بہہ نکلا۔ پھر اسی ایک تھپڑ پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ وہ لوگ اسے بے تحاشا مارتے ہوئے ایک ہی مطالبہ کرتے رہے کہ انہیں ماسٹر آفتاب کا پتا بتایا جائے۔ ہائی بلڈ پریشر اور عارضۂ قلب کے مریض شفیق کے لیے وہ مار سہنا ممکن نہیں تھا۔ اس کا پہلے سے بڑھا ہوا بلڈ پریشر یک دم ہی شوٹ کر گیا اور وہ سینہ مسلتے ہوئے نیچے گر کر تڑپنے لگا۔

"یہ بڈھا تو کام سے گیا۔" ان میں سے ایک بڑبڑاتا ہوا اپنے ساتھی سے بولا۔

"بہتر ہے ہم ادھر سے نکل چلیں۔ اس کی حالت تو اب ایسی نہیں ہے کہ اس سے کچھ بھی معلوم کیا جا سکے۔" شفیق کی حالت دیکھ کر وہ سمجھ گئے تھے کہ اسے دل کا دورہ پڑا ہے چنانچہ وہاں مزید رکنا بے کار جانا اور راہِ فرار اختیار کر لی۔ فرش پر گرے زندگی سے دور جاتے شخص سے انہیں کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ بس اس کی خوشنودی کے خواہاں تھے جس کے کہنے پر انہوں نے پنڈی میں آفتاب کی تلاش کی مہم شروع کی تھی۔ وہ اس شخص تک آفتاب کو زندہ یا مردہ پہنچا کر خود سرخ رو ہونا چاہتے تھے۔

☆☆☆

"آپا حمیداں! تمہارا بیٹا کس جماعت میں پڑھتا ہے؟" آٹا گوندھتے گوندھتے اس نے یک دم ہی آگ جلانے کے لیے چولہا تیار کرتی حمیداں سے پوچھا۔ چھوٹی بڑی لکڑیوں کو مخصوص ترتیب سے رکھ کر چولہا تیار کرتی حمیداں اس سوال پر چونک پڑی۔

"تجھے کس نے میرے پتر کے بارے میں بتایا ہے؟"

"میں بھی تو یہاں تم لوگوں کے درمیان ہی رہ رہی ہوں۔ جو بات دوسروں کو معلوم ہے، وہ مجھے بھی آخر کار پتا چلنی ہی تھی۔" اس نے للی کا نام لینے کے بجائے گول مول جواب دیا۔

"اسلم نے ہی بتایا ہوگا۔ وہ تجھ پر بڑا فدا ہے۔ ایسے تیرے ناز اٹھاتا ہے جیسے تو اس کی رکھیل کے بجائے گھر والی ہو۔ ہاہ... یہ بھی سب نصیبوں کے کھیل ہیں ورنہ تو لوگ اپنی نکاحی بیوی کو بھی پیر کی جوتی بنا کر رکھتے ہیں۔" وہ اس کی قسمت پر رشک کر رہی تھی جبکہ وہ خود اپنے لیے رکھیل کا لفظ سن کر اندر تک سلگ کر رہ گئی۔

"رکھیل ہونے سے پیر کی جوتی بن کر رہنا اچھا ہے اور رکھیل بھی وہی عورت بنتی ہے جو اندر سے کمزور کردار کی ہوتی ہے۔ عزت دار عورت اپنی اس تذلیل سے پہلے جان دینا پسند کرتی ہے۔" اس نے حمیداں کو جتا دیا کہ وہ اس کے لیے رکھیل کا لفظ غلط استعمال کر رہی ہے۔ اس کا اسلم سے جو بھی تعلق ہو لیکن وہ اس کی رکھیل نہیں ہے۔

"تو تو برا مان گئی... پر یاد رکھ، مرد کے پاؤں کی جوتی بن کر رہنا بھی بڑا اوکھا کام ہے۔ مرد پیار کرنے والا اور عزت دینے والا نہ ہو تو عورت خود اپنے لیے چور راستے ڈھونڈ لیتی ہے۔" ماہا نو کے اخلاقی اصول اس کی زندگی کے تجربات سے متصادم تھے چنانچہ اختلاف کرتے ہوئے بولی۔

"اس بحث کو جانے دو اور مجھے اس بات کا جواب دو جو میں نے تم سے پوچھی ہے۔" اس نے حمیداں کو ٹوکا۔

"بارھویں میں پڑھتا ہے میرا پتر۔ آگے اس نے وکیل بننے کا سوچا ہے۔ رب اس کی تمنا پوری کرے۔" بڑے فخر سے بتاتے ہوئے اس نے دعا بھی کی۔

"چلو اچھا ہے... اگر کبھی تمہارا یہ گروہ پکڑا گیا تو کوئی مقدمہ لڑنے والا تو ہوگا۔ آخر جن کی کمائی پر تمہارا بیٹا پڑھ لکھ رہا ہے، ان کا نمک بھی تو حلال کرنا ہوگا۔ ویسے معلوم نہیں کہ حرام کی کمائی کرنے والوں کا نمک حلال کرنا ضروری بھی ہے یا نہیں؟" وہ اس طرح کی گفتگو کرنے کی عادی نہیں تھی لیکن پھر بھی طنز کا تیر چلا گئی۔

"ایسی گل نہ کر کڑیے۔ وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کب بندے کا کس طرح امتحان لے۔" حمیداں نے اسے ٹوکا تو وہ چپ ہو کر رہ گئی۔ واقعی وقت کا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب آدمی کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ گفتگو کے دوران آٹا گوندھنے کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ حمیداں نے چولہے پر توا رکھا اور وہ دونوں مل کر روٹیاں پکانے لگیں۔

"اسلم تجھ سے محبت کرنے لگا ہے نا؟" روٹی توے پر ڈالتے ہوئے حمیداں نے اس سے سوال کیا۔

"معلوم نہیں۔" اس نے تجاہل برتا۔ اسلم کی محبت سے بہت سی رعایتیں حاصل کرنے کے باوجود وہ اس کی محبت کو قبول کرنے سے گریزاں تھی۔ وہ دل جو پہلے ہی کسی کا اسیر ہو وہ بھلا کسی دوسری محبت کو کہاں قبول کر سکتا ہے۔

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں
صحافت
فوٹو گرافی
اسلام آباد اکیڈمی

WWW.PAKSOCIETY.COM

''تجھے نہیں معلوم تو میں تجھے بتا رہی ہوں۔ اسے برسوں سے اسے دیکھ رہی ہوں۔ کبھی اسے کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھاتے نہیں دیکھا لیکن تیرے پیچھے تو وہ سردار کے سامنے اڑ گیا۔ میں نے اسے عورت تو کیا، کبھی کسی چیز کے پیچھے بھاگتے نہیں دیکھا۔ وہ تو کسی واردات کے بعد اپنے حصے کی رقم کی پروا نہیں کرتا، پر تیرے لیے تو جیسے اس نے ضد باندھ لی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے سردار کو منانے کے لیے اب تک جمع ہونے والا اپنا سارا مال بھی سردار کے قدموں میں ڈال دیا۔ اس کی ضد دیکھ کر سردار کو اس کی بات ماننی ہی پڑی۔'' حمیداں اسے جو کچھ بتا رہی تھی، وہ اس کے لیے ایک انکشاف کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسلم نے اسے بھی اپنی پسندیدگی سے آگاہ کیا تھا اور سردار سے اسے اپنے لیے مانگنے کا بھی بتایا تھا لیکن اسے پانے کے لیے وہ اپنا سب کچھ لٹا چکا ہے، یہ نہیں بتایا تھا۔ اس کی ایسی شدت کی چاہت کا سن کر وہ ساکت سی رہ گئی۔ ایسی محبت جس میں سامنے والا اپنا سب کچھ لٹا دے اور بدلے میں کچھ طلب نہ کرے، کتنا بلند مقام رکھتی ہے اور کتنی قابلِ قدر ہوتی ہے، وہ جانتی تھی لیکن مجبور تھی کہ اس چاہت کو شرفِ قبولیت نہیں بخش سکتی تھی۔ بعد میں حمیداں اس سے کیا کچھ کہتی رہی اور بتاتی رہی لیکن وہ سن نہیں سکی، بس ایک معمول کی طرح روٹیاں پکانے میں اس کا ساتھ دیتی رہی۔

اس کام سے فارغ ہوئی تو اسلم کی بنائی پھلواری کا رخ کر لیا۔ رنگ برنگے پھولوں کے درمیان بیٹھ کر اس نے یہاں اسلم کے ساتھ اپنی پہلی بار کی آمد کو یاد کیا۔ اس پھلواری اور اوپر لگی مچان پر رکھی کتابوں کو دیکھ کر اس نے اسلم کو سراہتے ہوئے صاحبِ ذوق قرار دیا تھا لیکن اب وہ سوچ رہی تھی کہ وہ صرف صاحبِ ذوق نہیں، صاحبِ دل بھی تھا۔ کتابوں اور پھولوں سے محبت کرنے والے لوگ کوئی عام لوگ ہوتے بھی نہیں پھر جانے اسلم کے ساتھ کیا حادثہ گزرا تھا کہ وہ اپنے اصل سے ہٹ کر ان ڈاکوؤں میں شامل ہو گیا۔ محبت نہ سہی، وہ اس شخص کے لیے اپنے دل میں ایک انسیت سی محسوس کر رہی تھی اور عجیب سے احساسات میں گھری وہاں ان پھولوں کے درمیان ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے اس کی اس کیفیت سے نسوانی چیخوں کی آواز نے باہر نکالا۔ یہ آواز اس کے لیے اجنبی نہیں تھی اور وہ یہ بھی اندازہ کر سکتی تھی کہ آواز درختوں کے اسی جھنڈ کی طرف سے آ رہی ہے جہاں اس نے پہلے بھی جمرو کو للی کو لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ للی کی چیخیں بتا رہی تھیں کہ آج بھی اس کے ساتھ وہی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

وہ طیش کے عالم میں اٹھی اور پھلواری سے نکل کر حتی المقدور تیزی سے جھنڈ کی طرف بڑھی۔ راستے میں اسے درخت کی ایک مضبوط شاخ پڑی نظر آئی تو وہ بھی اٹھا لی۔ جھنڈ میں داخل ہوتے ہی اسے جمرو اور للی نظر آ گئے۔ ان دونوں کے درمیان جاری کشمکش بتا رہی تھی کہ جمرو پر آج بھی دورہ پڑا ہے اور للی اس کی بات ماننے سے گریزاں ہے۔ عورت کی اتنی تذلیل اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے ان دونوں کے قریب پہنچ کر اپنا ہاتھ گھمایا اور عقب سے جمرو کے سر پر سوکھی شاخ کا وار کرنے کی کوشش کی۔ اسے اپنی اس کوشش میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی کیونکہ اس سے دست و گریباں للی نے عین وقت پر جمرو کو زوردار دھکا دے ڈالا۔ ماہ بانو کا پوری قوت سے کیا وار بس پھسلتا ہوا ہی جمرو کے بازو پر پڑا مگر وہ اس معمولی چوٹ پر بھی غضب ناک ہو کر للی کو چھوڑ کر اس کی طرف جھپٹا۔

''مجھے روکتی ہے کتیا... تیرے سر پر اس کی ہمدردی کا بھوت چڑھا ہے تو پھر ٹھیک ہے، اس کی جگہ تو ہی آ جا۔ بڑا بچا کر رکھا ہے نا تجھے اسلم نے... پر آج تو مجھ سے نہیں بچ سکے گی۔'' وہ طیش کے عالم میں بولتا ہوا اس کے قریب آیا اور ایک ہی جھٹکے میں اس کے ہاتھ سے شاخ چھین کر دور پھینک دی۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اپنے کہنے پر عمل بھی کر گزرے گا۔ ماہ بانو کو اندازہ تھا کہ وہ جسمانی قوت سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اگر ایک بار وہ اس کے ہاتھ لگ جاتی تو پھر وہ اسے اپنے تنومند جسم کے نیچے کسی حقیر چیونٹی کی طرح رگڑ ڈالتا۔ اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے بہترین حل فرار ہی تھا چنانچہ وہ سمت کا تعین کیے بغیر بھاگ کھڑی ہوئی۔ پیروں میں بندھی زنجیر کی وجہ سے بھاگنا یوں بھی بہت مشکل تھا۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ اس کے ساتھ ہی دوڑ پڑنے والی للی یک دم ہی اس سے ٹکرا گئی۔ ٹکرانے کے بعد وہ دونوں ہی زور سے گریں۔

ماہ بانو نے کوشش کی کہ سنبھل کر دوبارہ کھڑی ہو سکے لیکن اس کے اٹھنے سے قبل ہی جمرو نے اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے رگیدتا ہوا دور تک اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کے بدبودار وجود کی گرفت میں بے بسی سے مچلتی ماہ بانو کو لگا کہ کچھ دیر قبل اس نے حمیداں کے سامنے جتنے بڑے بول بولے تھے، ان کی سزا آج اور ابھی جمرو کی صورت میں اسے ملنے والی ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا ہے اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ پیر آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہریار کا سہارا پاکر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ آفتاب اور کشور خفیہ نکاح کر لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چودھری اسے اغوا کروا لیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شہریار اپنے ڈرائیور مشابرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاغان منتقل کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کر لیتے ہیں۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چودھری ماہ بانو کی تلاش میں ہے، وہ اسے ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے مگر عمران ایک جگہ ایوالانچ کی زد میں آجاتا ہے اور اس میں دب کر اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ ادھر مشابرم خان ماہ بانو کی تلاش میں اس برف زار تک پہنچ جاتا ہے اور دشمنوں کا پتا لگا لیتا ہے اور وہاں ایمونیشن بلاسٹ ہونے سے کافی جانی نقصان ہوتا ہے۔ چودھری افتخار کو کشور کے غیاب کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چودھری، ماسٹر آفتاب کو اغوا کرا لیتا ہے۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کلا نمبر ہوتا ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ادھر مشابرم خان لڑائی کے دوران زخمی ہو جاتا ہے اور پاکستان آرمی والوں کے وہاں پہنچنے سے ان کی تحویل میں پہنچ جاتا ہے۔ شہریار ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جگو کا سہارا لیتا ہے اور جگو آفتاب کو چودھری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ ماہ بانو کو بچانے والا مہربان شخص اپنے واقف کار کے توسط سے اسے ایک میجر سے ملوا دیتا ہے جو ماہ بانو کی فراہم کردہ معلومات کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہریار کو بھی اس واقعے کی اطلاع میجر کے ذریعے مل جاتی ہے اور شہریار فوراً اسکردو پہنچ جاتا ہے اور مشابرم خان اور ماہ بانو کو آرمی کی کسٹڈی سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ماہ بانو کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے کراچی منتقل کر دیتا ہے۔ صحافی افضل قاتلانہ حملے میں مارا جاتا ہے۔ ماہ بانو کراچی میں میڈیکل کالج میں مہرین کے نام سے داخلہ لے لیتی ہے۔ وہاں اسے راحیلہ نامی ایک لڑکی ملتی ہے جو اس سے کافی گھل مل جاتی ہے۔ کشور اور آفتاب افضل کے ایک دوست بابر کی مدد سے اسلام آباد میں اس کی خالہ کے گھر پناہ گزیں ہو جاتے ہیں مگر کشور کو یہاں بھی سکون میسر نہیں آتا۔ خالہ کا اوباش بیٹا اسے تنگ کرتا ہے۔ ماہ بانو کو اس کی سہیلی راحیلہ اپنے بھائی سے ملوانے گھر لے جاتی ہے۔ وہاں ماہ بانو پڑوس کے بنگلے میں جہاگرد کو دیکھتی ہے اور شہریار کو مطلع کرتی ہے۔ شہریار فوراً کراچی آجاتا ہے۔ نگرانی کے دوران اسے سرمد نظر آتا ہے۔ وہ اس سے مل کر جہاگرد کا پتا لگاتا ہے اور ماہ بانو کی مدد سے اس پر قابو پا لیتا ہے۔ ادھر چودھری کے کارندے بابر کو مار کر آفتاب اور کشور کا پتا لگا لیتے ہیں لیکن وہ وہاں سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ ادھر کشور کی ملازمہ خاص ساتی کا منگیتر اکو جنگل میں پوست کی کاشت کا پتا لگا لیتا ہے۔ اسے وہاں چودھری کے کارندے دیکھ لیتے ہیں اور اس کا پیچھا کر کے اسے مار دیتے ہیں۔ جہاگرد (ورما) کے لوگ ایک سینئر ڈاکٹر کی فیملی کو یرغمال بنا کر ڈاکٹر کو ساتھ دینے پر آمادہ کرتے ہیں اور ورما کو اسپتال سے نکال لے جاتے ہیں۔ ادھر شہریار کے ماموں لیاقت رانا پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ شہریار خبر سن کر پریشان ہو جاتا ہے اور انہیں دیکھنے کے لیے لاہور جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر ماریا بھی اس کے ساتھ لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے۔ راستے میں ڈاکٹر ماریا کی طبیعت کی خرابی کے باعث انہیں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں مختصر قیام کرنا پڑتا ہے اور اسی قیام کے دوران وہ ماریا کے قریب ہو جاتا ہے۔ ماہ بانو شہریار کے رویے پر پریشان ہوتی ہے اور اسی کیفیت کے زیرِ اثر اسے نیند نہیں آتی۔ اس کی روم میٹ اسے ٹرنکولائزر دے دیتی ہے جسے کھا کر وہ نیند کی وادی میں اترتی چلی جاتی ہے۔ آنکھ کھلنے پر ماہ بانو خود کو مانوس سی جگہ پر پاتی ہے اور اسے پتا چل جاتا ہے کہ وہ ایک بار پھر چودھری کے ہتھے چڑھ چکی ہے۔ ادھر شہریار اپنے قدم بہکنے پر خود کی اور ماریا کی نظروں میں گر جاتا ہے اور ماریا کی طنزیہ گفتگو سن کر اس سے شادی کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ وڈی چودھرائن اپنے داماد سے ماہ بانو کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کرتی ہے اور اشرف شاہ ماہ بانو کو چودھری کی قید سے نکال کر ڈاکوؤں کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ چودھری سمجھتا ہے کہ اس ساری کارروائی کے پیچھے شہریار کا ہاتھ ہے۔ ادھر آفتاب جمعے کی نماز کے لیے جاتا ہے تو وہاں اسے امام مسجد کا چہرہ شناسا لگتا ہے اور کسی کی صورت ذہن میں آنے کے بعد وہ اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہے۔ ماہ بانو ڈاکوؤں کے چنگل میں ہوتی ہے اور ان کے کام کاج کرتی ہے۔ وہ تھک ہار کر لیٹتی ہے تو اسے نیند آجاتی ہے مگر ایک احساس اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس احساس کو سمجھتے ہی اسے جیسے ڈنک لگتا ہے اور وہ اچھل کر اٹھ بیٹھتی ہے۔ وہ انسانی ہاتھ کا لمس تھا اور اس کے ہاتھ کی پشت پر متحرک تھا۔ وہ وہی پینٹ شرٹ میں ملبوس ڈاکو تھا۔ ماہ بانو اس سے سختی سے اپنی جھونپڑی میں آنے کی وجہ پوچھتی ہے۔ اس کے مطابق اس نے سردار سے ماہ بانو سے متعلق اجازت لے لی ہوتی ہے کہ ماہ بانو پر صرف اس کا حق ہے۔ مگر وہ ماہ بانو کو غلط نظر سے نہیں دیکھتا۔ وہ ماہ بانو کو پسند کرنے لگتا ہے۔ وہ ماہ بانو کو کھلی فضا میسر کرنے کے لیے اپنی بنائی ہوئی ایک پھلواری میں لے جاتا ہے۔ ادھر شہریار ماہ بانو کی تلاش کے سلسلے میں کوشاں رہتا ہے مگر اسے ناکامی ہوتی ہے۔ مشابرم خان آرمی کسٹڈی سے چھوٹ کر واپس آجاتا ہے۔ آفتاب شہریار کو فون کر کے اسے را کے ایجنٹ کی وہاں موجودگی کا بتاتا ہے۔ ایک رات غلام محمد نامی را کا ایجنٹ آفتاب کے گھر پر دھاوا بول دیتا ہے۔ اس لڑائی میں کشور کو گولی لگتی ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے تاہم غلام محمد پکڑا جاتا ہے۔ شہریار، مشابرم خان اور ..... فورس کی مدد سے اس پر قابو پاتا ہے۔ ادھر ماہ بانو پھلواری میں بیٹھی ہوتی ہے کہ اسے نسوانی چیخوں کی آواز آتی ہے۔ وہاں موجود ڈاکو جمرو، لالی نامی عورت کی عزت پامال کر رہا ہوتا ہے۔ ماہ بانو اسے اس سے چھڑانے کی کوشش کرتی ہے۔ جمرو، لالی کو چھوڑ کر ماہ بانو کو پکڑ لیتا ہے۔ اس کے بدبودار وجود کی گرفت میں بے بسی سے مچلتی ماہ بانو کو لگتا ہے کہ جمرو کی صورت میں اسے سزا ملنے والی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جمرو کے بوجھ تلے اس کا نازک بدن حرکت کرنے سے بھی قاصر تھا لیکن پھر بھی وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح خود کو اس گرفت سے آزاد کروا سکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہاتھ پیر چلانے کی بہت کوشش کی لیکن ایک گرانڈیل مرد کے آگے اس کی کوششوں کی کیا حیثیت تھی۔ وہ بس مچل کر رہ گئی۔ دوسری طرف جمرو کی ہمت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے ماہ بانو کی قمیص کو اس زور سے جھٹکا دیا کہ قمیص شانے پر سے پھٹ گئی اور اس کا شانہ عریاں ہو گیا۔ اپنی عریانیت کے احساس پر وہ اندر سے کٹ کر رہ گئی اور جھنجلاہٹ میں جمرو کے ہاتھوں کی گرفت میں جکڑے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو جنبش دے کر اس کی بڑی بڑی مونچھوں کو پکڑ کر کھینچ لیا۔ اس کے اس عمل میں اتنی شدت تھی کہ جمرو کی مونچھوں کے کئی بال اکھڑ کر اس کے ہاتھ میں آگئے اور وہ بلبلا کر رہ گیا اور غصے میں اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس کے رخسار پر ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ طمانچہ اتنا شدید تھا کہ اس کی انگلیوں کے نشان ماہ بانو کے نرم و شفاف رخسار پر ثبت ہو کر رہ گئے اور اس کے ہونٹوں سے ایک زوردار چیخ نکل پڑی۔

"میں تو اسلم کی وجہ سے مجبور ہو کر تیرے قریب نہیں آرہا تھا لیکن تو نے خود اپنے لیے مصیبت کھڑی کر لی ہے۔ اب تو مجھ سے کسی صورت نہیں بچ سکتی۔" وہ خوں خوار لہجے میں کہہ کر اس پر ٹوٹ پڑا۔ عزت اور زندگی دونوں ہی داؤ پر لگتی دیکھ کر اس کے حلق سے پے در پے چیخیں بلند ہوتی چلی گئیں لیکن پھر جمرو کا آہنی ہاتھ اس کے منہ پر آجما اور اس کی چیخوں کا گلا گھٹ کر رہ گیا۔ جمرو نے اپنا ہاتھ کچھ اس انداز سے اس کے منہ پر رکھا تھا کہ منہ کے ساتھ ساتھ ناک بھی اس کے بڑے سے ہاتھ کے نیچے دب گئی تھی۔ منہ اور ناک دونوں پر جمے اس آہنی ہاتھ کی وجہ سے اسے سانس لینے میں دشواری پیش آرہی تھی اور یوں لگ رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے بے ہوش ہو جائے گی۔ جسم کو توانائی فراہم کرنے والی آکسیجن کے رک جانے کے باعث وہ اب ڈھنگ سے مزاحمت بھی نہیں کر پا رہی تھی اور قریب تھا کہ کسی بھی لمحے بے بس ہو جائے گی کہ اچانک ہی اس کے بدن پر موجود بوجھ ہٹ گیا اور تازہ ہوا نے رک جانے والی سانسوں کا سلسلہ بحال کر دیا۔ اس نے نیچے زمین پر پڑے پڑے ہی اس تبدیلی کی وجہ جاننے کی کوشش کی اور اس کی نظر اسلم پر پڑی۔ وہ اس کے قریب کھڑا کینہ توز نظروں سے کچھ فاصلے پر پڑے زمین چاٹتے جمرو کو گھور رہا تھا۔ جمرو اور اسلم کے جثے کا ظاہری تقابلی جائزہ لیا جاتا تو یہ بات ناقابلِ یقین لگتی تھی لیکن حقیقت یہی تھی کہ دبلے پتلے نظر آنے والے اسلم نے تنومند جمرو کو ماہ بانو پر سے اٹھا کر دور پھینک دیا تھا۔

ماہ بانو نے یہ منظر دیکھا اور ہمت کر کے اٹھ بیٹھی۔ چند ہی لمحوں میں جمرو نے اسے بُری طرح رگید ڈالا تھا۔ اس کا نازک بدن ایک طرف جمرو کے وزن تلے آکر کچل سا گیا تھا تو دوسری طرف جنگل کی زمین پر بچھی جھاڑ جھنکاڑ نے اس کے جسم پر کئی خراشیں ڈال دی تھیں مگر اس وقت وہ ان تکالیف سے زیادہ اپنے عریاں ہو جانے والے شانے کے باعث خود کو مجروح محسوس کر رہی تھی۔ مردوں کے اس معاشرے میں وہ جہاں بھی گئی تھی، کسی نہ کسی مرد نے اس سے اس کے عورت ہونے کا خراج لینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اپنے گھر کی محفوظ چار دیواری کو اپنی مرضی سے نہیں چھوڑا تھا لیکن قسمت کے گرداب میں پھنس کر جب سے اس چار دیواری سے نکلی تھی، قدم قدم پر اس سے اس کی چادر چھیننے کی کوشش کی جاتی رہی تھی۔ اپنی اس بے بسی کو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور وہ آنکھوں سے بہتے اس پانی کے پار اس دھندلائے منظر کو دیکھنے لگی جس میں اسلم اور جمرو آپس میں نبرد آزما تھے۔

وہ دونوں ہی یقیناً غضب کے لڑاکے تھے اور بڑھ بڑھ کر ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے لیکن اسلم کے حملوں میں ایک جنونی سی کیفیت تھی۔ وہ مسلسل بڑبڑاتا ہوا جمرو پر تابڑ توڑ وار کر رہا تھا۔ جمرو کی کوشش تھی کہ اس کا وار روکنے کے ساتھ ساتھ اسے جوابی ضرب بھی لگا سکے۔ کبھی وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا اور کبھی ناکام رہتا۔ کامیابی اور ناکامی کے اس سلسلے میں وہ دونوں ہی لہولہان ہو رہے تھے لیکن دونوں میں سے ایک بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک دوسرے سے گتھم گتھا وہ جانی دشمنوں کی طرح لڑ رہے تھے۔

اچانک ہی جمرو کا داؤ چل گیا اور اس نے اسلم کو اٹھا کر دور پھینک دیا۔ اسلم ایک درخت کے تنے سے جا کر ٹکرایا۔ ٹکرانے سے اس کی کمر پر چوٹ لگی اور وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ یہ لڑھکنا اس کی جان بچا گیا کیونکہ جمرو نے موقع ملتے ہی اپنا پسٹل نکال لیا تھا اور پے در پے کئی فائر بھی کر ڈالے تھے۔ اسلم کا جسم متحرک ہونے کی وجہ سے اس کا ہر نشانہ خطا گیا اور اسلم کو موقع مل گیا کہ خود کو ایک درخت کی آڑ میں چھپا

WWW.PAKSOCIETY.COM

سکے۔

"باہر آجا اسلم ورنہ میں تیری اس معشوقہ کو گولی ماردوں گا۔" اسے چھپتے دیکھ کر جمرو نے اپنے پسٹل کا رخ ماہ بانو کی طرف کرلیا اور دھمکی دی۔ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر وہ فوراً ہی سامنے آگیا۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر جمرو مسکرا دیا اور پسٹل کا رخ اس کے سینے کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

"تو تو مجنوں کے کنبے کا بندہ لگتا ہے۔ معشوقہ کی جان خطرے میں دیکھ کر کس بے جگری سے سامنے آگیا۔ ایسی بے وقوفی تو کوئی دیوانہ ہی کرسکتا ہے۔ چل تجھے اپنی دیوانگی مبارک۔ آج تو بھی محبت کے شہیدوں میں شامل ہوجائے گا اور اس کے بعد تیری یہ معشوقہ ہم سب کا دل بہلانے کے کام آئے گی۔ یہ نیا آسٹم دیکھ کر دل خوش ہوگیا تھا لیکن تو اکیلا ہی اس کا مالک بن بیٹھا تھا۔ اب مزہ آئے گا۔" وہ خباثت کا مظاہرہ کررہا تھا۔ ایک طرف کھڑی ماہ بانو اس صورتِ حال پر سخت متوحش تھی۔ اس نے جمرو کی دھمکی پر اسلم کا اپنی جان کی پروا کیے بغیر فوری طور پر سامنے آجانا بھی دیکھا تھا اور ایک بار پھر حیران ہوئی تھی کہ اس شخص کے دل میں اس کے لیے کتنی شدید چاہت ہے کہ وہ اپنا سارا مال اس کے لیے لٹا دینے کے بعد اب جان بھی قربان کرنے کو تیار ہے۔

اسلم کے جذبے کی اس شدت کو محسوس کرتی وہ موجودہ صورتِ حال میں اپنے کردار کا تعین کرنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ اس نے یکدم ہی اسلم کو گولی کی سی تیزی سے جمرو کی طرف چھلانگ لگاتے دیکھا۔ وہ بھی پوری طرح تیار تھا۔ چنانچہ اس کے حرکت میں آتے ہی لبلبی دبا دی۔ فضا میں فائر کی آواز گونجی لیکن ماہ بانو یہ دیکھ کر متحیر رہ گئی کہ اسلم نے فضا میں ہی قلابازی کھا کر اپنا رخ بدل ڈالا اور جمرو کی چلائی ہوئی گولی اسے چھوئے بغیر ہی گزر گئی۔ ناکامی پر جمرو نے ایک فائر اور کرنا چاہا لیکن پسٹل سے گولی کے بجائے ٹھک کی آواز نکل کر رہ گئی۔ اسلم جس کے قدم زمین سے لگ چکے تھے، فوری طور پر جمرو پر جھپٹا۔ گولیاں ختم ہوجانے پر گھبرا جانے والا جمرو فوری طور پر اپنی طرف بڑھنے والی اس آندھی سے بچاؤ کے لیے کچھ نہیں کرسکا اور اسلم نے اس کے بال جکڑ کر اس کا سر ایک درخت کے تنے سے ٹکرا دیا۔ اس نے یہ کام بہت زیادہ قوت سے کیا تھا لیکن جمرو کی خوش قسمتی سے درخت کا تنا کھوکھلا تھا جو اس کے سر کے ٹکرانے سے چرر کی آواز سے ٹوٹتا چلا گیا اور اس کی کھوپڑی ٹوٹنے سے محفوظ رہی۔

"میں آج تیری یہ کھوپڑی ہی توڑ دوں گا تاکہ تو پھر کوئی شیطانی بات سوچ ہی نہیں سکے۔" جنون میں مبتلا اسلم نے ایک بار پھر اسے بالوں سے جکڑ کر اس کا سر کہیں ٹکرانا چاہا لیکن ایک گونجیلی آواز اس کے ارادے کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔

"رک جاؤ اسلم!" آواز میں رعب اور اتنا تحکم تھا کہ اسلم جہاں کا تہاں رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے منظر میں ایک سیاہ پوش داخل ہوا۔ اس کے پیچھے چند اور مزید افراد بھی تھے۔

"یہاں کیا ہورہا ہے؟" اس سیاہ پوش نے اسلم اور جمرو کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اس اسلم کے بچے کے سر پر عشق کا بھوت سوار ہوگیا ہے سردار! اپنی معشوقہ کی خاطر یہ میری جان لینے پر تلا ہوا ہے۔" جمرو نے پہل کی اور اپنی باچھوں سے بہنے والا خون آستین سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے سردار... واقعی میرے سر پر بھوت سوار ہے اور یہ بھوت اس خبیث کی جان لے کر ہی اترے گا۔" اسلم نے جمرو کو کینہ توز نگاہوں سے گھورتے ہوئے بے خوفی سے جواب دیا۔

"دیکھا سردار... یہ خود اپنے منہ سے مان رہا ہے۔" جمرو کو تو جیسے موقع مل گیا اپنی بات ثابت کرنے کا۔

"مان رہا ہوں، بالکل مان رہا ہوں کیونکہ میں تیری طرح بزدل اور حریص نہیں ہوں جو دوسروں کے مال پر نظر رکھوں۔" اسلم نے دوبدو جواب دیا۔

"تیری اس گل کا کیا مطلب ہے اسلم؟" سردار نے جمرو کے کچھ کہنے سے قبل اس سے پوچھا۔

"مطلب صاف ہے سردار! میں نے اس لڑکی کو اپنے لیے تم سے اس شرط پر مانگا تھا کہ گروہ کا کوئی دوسرا فرد اسے انگلی بھی نہیں لگائے گا اور تم نے میری شرط قبول کرکے سارے گروہ کو حکم دیا تھا کہ کوئی اس پر نظر نہ رکھے لیکن اس جمرو کمینے نے اس پر ہاتھ ڈالا۔ اگر میں ٹھیک وقت پر یہاں نہیں پہنچ جاتا تو یہ اپنا گھناؤنا ارادہ پورا کر چکا ہوتا۔" اس نے سردار کو مختصراً سارا قصہ بتایا۔ ایک طرف بدن چرائے کھڑی ماہ بانو اپنے بارے میں کی گئی ناشائستہ گفتگو سن رہی تھی۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ یہ لڑکی خود میرے پیچھے آئی تھی۔ میں تو صرف ہوا خوری کے لیے ادھر آیا تھا لیکن اس نے میرے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔ کہتی تھی اسلم جیسے نامرد کے ساتھ میرا جی نہیں لگتا۔ بس تو پھر میں بھی بہک گیا۔ عورت خود بلائے تو کون انکار کرسکتا ہے۔" جمرو نے نہایت خباثت سے کہانی بنا کر سنائی۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں تو اسلم کی پھلواری میں بیٹھی تھی کہ مجھے للی کے چیخنے کی آواز آئی۔ میں اس کی آواز سن کر دوڑی تو دیکھا یہ شخص اس کے ساتھ زبردستی کررہا تھا۔ میں پہلے بھی اس کی للی کے ساتھ بدتمیزی کو دیکھ چکی تھی اس لیے مجھے غصہ آگیا اور میں نے للی کو اس سے بچانے کی کوشش کی جس پر یہ غصے میں مجھ پر ہی حملہ آور ہوگیا۔ اگر اسلم وقت پر یہاں پہنچ کر مجھے اس سے نہیں بچاتا تو یہ اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہوجاتا۔" جمرو کے صاف جھوٹ پر اب تک خاموش تماشائی بن کر کھڑی ماہ بانو خاموش نہیں رہ سکی اور تڑپ کر فوراً ہی بولی۔

"للی کہاں ہے؟" اس کا بیان سن کر سردار نے سوال کیا تو اسے پہلی بار للی کی غیر موجودگی کا احساس ہوا جس کے لیے اس نے خود کو مشکل میں ڈالا تھا۔ وہ اس کی مشکل میں کوئی مدد کرتی ہوئی نظر نہیں آئی تھی بلکہ سرے سے منظر سے ہی غائب ہوگئی تھی۔

"تھوڑی دیر پہلے تو وہ یہیں تھی۔ شاید کسی کو مدد کے لیے بلانے گئی ہو۔" اس نے خوش گمانی سے کام لیا۔

"تم تینوں میرے ساتھ آؤ۔" سردار نے اسلم، جمرو اور ماہ بانو سے کہا اور پھر اپنے ساتھ آنے والوں میں سے ایک کی طرف پلٹ کر بولا۔ "للی کو دیکھو کہاں ہے۔ اس سے کہو کہ فوراً میرے پاس پہنچے۔" احکامات صادر کرنے کے بعد وہ لمحہ بھر بھی وہاں ٹھہرے بغیر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہاں کوئی اس کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کرے گا۔ جس آدمی کو اس نے للی کو بلانے کے لیے بھیجا تھا، وہ فوراً ہی روانہ ہوگیا اور باقی نے ان تینوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ تینوں خاموشی سے ان کے ساتھ چل پڑے۔ اسلم نے اپنی جیکٹ ماہ بانو کو پہننے کے لیے دے دی تھی تاکہ اس کا عریاں جسم چھپ سکے۔ جب وہ لوگ جنگل سے نکل کر اس مقام پر پہنچے جہاں ان کی رہائشی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں اور زندگی کا دیگر کاروبار بھی جاری رہتا تھا تو ادھر اُدھر بکھرے اپنے کاموں میں منہمک لوگ پلٹ پلٹ کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی نگاہوں میں حیرت اور تجسس تھا۔ یقیناً وہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ سب کیا تھا لیکن ان میں سے کسی نے زبان سے سوال کرنے کی جرأت نہیں کی۔ وہ سب خاموشی سے چلتے ہوئے سردار کی رہائش گاہ تک پہنچ گئے۔ رہائش گاہ بھی جھونپڑی کی طرز کی بنی ہوئی تھی۔ سردار ان سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا اور ایک رنگین پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ اس نے ان تینوں کو ہاتھ سے اشارہ کرکے ایک طرف بیٹھنے کا حکم دیا تو وہ زمین پر بچھی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ زندگی کے اتنے لوازمات کے ساتھ ان ڈاکوؤں کے جنگل میں قیام سے صاف ظاہر تھا کہ یہاں باقاعدگی سے ساز و سامان پہنچتا رہتا ہے اور ظاہر ہے ایسا بیرونی امداد کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

انہیں انتظار میں بٹھا کر سردار خود نائو نوش میں مصروف ہوگیا۔ یقیناً وہ للی کے انتظار کے لمحات کو بوریت سے بچانا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس وہ تینوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے پر مجبور تھے۔ اسلم اور جمرو البتہ وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کو کینہ توز نظروں سے دیکھ لیتے تھے۔ سردار کے حکم کے باعث وہ للی کی آمد تک وہاں ایک ساتھ بیٹھنے پر مجبور تھے اور للی تھی کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ جانے وہ کہاں تھی اور اس آدمی کو مل بھی سکی تھی یا نہیں جو اسے بلانے کے لیے گیا تھا۔ آخر اللہ اللہ کرکے ان کا یہ انتظار ختم ہوا اور للی وہاں پہنچ گئی۔ اس کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے اور ان سے قطرہ قطرہ پانی بہہ کر اس کی پشت کو بھگو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے ابھی ابھی غسل کیا ہو اور سردار کے بلانے پر بغیر بال خشک کیے سیدھی یہاں چلی آئی ہو۔

"کدھر تھی للی... آنے میں اتنی دیر کیوں کردی؟" سردار نے انگور کی بیٹی کا جام ایک سانس میں چڑھا کر اس سے پوچھا۔

"نہا رہی تھی سردار! نورے نے تمہارا پیغام دیا تو بغیر بال خشک کیے جو ہاتھ لگا پہن کر سیدھی یہاں پہنچ گئی۔" اس نے اٹھلا کر جواب دیا۔ اس کی ادائے بے نیازی دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ یہاں جو عدالت لگی ہے، اس میں وہ اپنے گواہ کے کردار سے قطعی ناواقف ہے۔

"اس سے پہلے تو کدھر تھی؟" سردار نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اپنی جھونپڑی میں جاکر ذرا دیر لیٹ گئی تھی۔ چولہا جلانے کے لیے لکڑیاں کاٹتے کاٹتے کمر اکڑ گئی تھی، میں نے سوچا ذرا دیر لیٹ کر کمر سیدھی کرلوں۔" اس نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر لہراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی ان اداؤں کو دیکھتے ہوئے ماہ بانو حیران تھی کہ کیا یہ وہی عورت ہے جس نے اس کے سامنے اپنی مظلومیت کا رونا رویا تھا۔ اس وقت تو وہ کسی ستم زدہ سے زیادہ مردوں کو لبھانے کے لیے ادائیں دکھانے والی طوائف لگ رہی تھی۔

"کیا جمرو تجھے اپنے ساتھ زبردستی جنگل میں لے کر گیا تھا؟"

"پر وہ کس لیے؟ جمرو کو بھلا میرے ساتھ زبردستی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' سردار کے سوال پر اس نے بے پناہ حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو کچھ کہا، اسے سن کر ماہ بانو دنگ رہ گئی۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو لالی؟ میں نے خود جمرو کو تمہارے ساتھ زبردستی کرتے دیکھا تھا۔ تمہیں بچانے کے لیے غصے میں اس پر وار بھی کر دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ تمہارے ساتھ ایسا کر چکا ہے۔ اس وقت بھی میں اسلم کی پھلواری میں موجود تھی اور تمہاری چیخ و پکار سن کر وہاں پہنچی تھی تو تم نے روتے ہوئے مجھے اپنے سارے حالات سنائے تھے کہ کیسے تم یہاں تک پہنچیں اور یہاں تمہارے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے۔'' وہ گویا لالی کی کھو جانے والی یادداشت کو واپس لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تم کدھر کی باتیں کر رہی ہو؟ کہیں تم نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا؟ میں نے تمہیں اپنے یہاں پہنچنے کا قصہ ضرور سنایا تھا لیکن جنگل میں نہیں بلکہ کپڑے دھونے کے دوران بات چیت کرتے ہوئے۔'' وہ کسی بک جانے والے گواہ کی طرح جھوٹ پر جھوٹ بول رہی تھی۔

''تم سچ کیوں نہیں بول رہی ہو لالی؟ کیا تمہیں کسی کا ڈر ہے؟'' ماہ بانو کی خوش گمانی اسے یہ قبول کرنے سے روک رہی تھی کہ وہ لالی کو جھوٹا سمجھ سکے۔

''میں کسی سے کیوں ڈرنے لگی؟ جو سچ ہے وہی بول رہی ہوں۔'' اس نے ماہ بانو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا تو وہ بالکل ہی گنگ ہو گئی۔ اتنے سفید جھوٹ کے سامنے اس کا سچ بھلا کہاں چل سکتا تھا لیکن وہ حیران تھی کہ لالی ایسا کیوں کر رہی ہے۔ اس نے تو اس کے ساتھ بھلائی ہی کی تھی اور اس بھلائی کا یہ صلہ ہرگز بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اسے سردار کے سامنے یوں جھوٹا ثابت کیا جاتا۔

''جو ہم دونوں کو بتانا تھا وہ ہم بتا چکے ہیں سردار! اب تمہاری مرضی ہے کہ تم ہمیں سچا مانو یا نہیں۔ فیصلہ اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' ماہ بانو، لالی کو سچ بولنے پر اکسانے کے لیے شاید کچھ اور بھی کہتی لیکن اسلم نے یک دم ہی دخل اندازی کرتے ہوئے اسے ہاتھ کے اشارے سے بولنے سے روکا اور خود سردار سے مخاطب ہو کر بولا۔ سردار ان سب کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ اس نے گفتگو کے دوران کسی قسم کی دخل اندازی قطعی نہیں کی تھی لیکن ہر ایک کا کہا ایک ایک لفظ بہت توجہ سے سنا تھا۔ جب اسلم نے بحث ختم کر کے فیصلے کے لیے بال اس کے کورٹ میں ڈال دی تو وہ جمرو اور لالی کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم دونوں کو کچھ اور کہنا ہے؟'' اس نے ان سے پوچھا۔ دونوں نے ہی نفی میں گردن ہلا دی۔

''تم لوگوں کے درمیان کیا ہوا اور کیا نہیں، اس کی حقیقت جاننے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی میں تم میں سے کسی ایک کو سچا اور دوسرے کو جھوٹا ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ مجھے اپنے گروہ میں پھوٹ نہیں چاہیے۔ تم لوگ زنانیوں کے پیچھے آپس میں لڑو مرو گے تو میں اگلی واری کوئی گل سنے بغیر ان زنانیوں کو ہی گولی مار دوں گا۔'' سردار نے بڑے طمطراق سے مختصر الفاظ میں اپنا فیصلہ سنا ڈالا۔ وہ سب اس کا فیصلہ سن کر سر جھکائے کھڑے رہے۔ جن الفاظ میں فیصلہ دیا گیا تھا، اس سے ظاہر تھا کہ فی الحال ان میں سے کسی کو کوئی سزا نہیں دی جا رہی اور صرف تنبیہ کر کے چھوڑا جا رہا ہے۔

''جاؤ اب جا کر اپنے اپنے دھندوں سے لگو۔'' سردار کا بارعب حکم ان سب کے لیے پروانۂ آزادی تھا۔ فیصلہ سن لینے کے باوجود ان میں سے کسی کی مجال نہیں تھی کہ سردار کی طرف سے اجازت ملے بغیر وہاں سے جا سکے۔ اجازت ملتے ہی وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے وہاں سے باہر نکل گئے۔ باہر نکل کر جمرو تو تیز تیز قدموں سے چل کر آگے بڑھ گیا لیکن اسلم نے لالی کو جا لیا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف گھمایا۔

''آئندہ ایسی اوچھی حرکت مت کرنا۔'' وہ لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرایا۔

''محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے ڈارلنگ۔'' اس نے ایک آنکھ دبا کر اسے جواب دیا۔

''تو پھر جان لو کہ میں سب سے پہلے تمہارا قتل جائز سمجھوں گا۔'' اسلم نے قہر آلود لہجے میں دھمکی دی۔

''تمہارے ہاتھوں ماری بھی گئی تو غم نہیں ہوگا۔'' اس پر جیسے اسلم کے غصے کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''تجھے نہ سہی پر یہ جو تیرے اتنے سارے خصم ہیں انہیں تو غم ہوگا۔ کیوں بے موت مر کر ان ساروں کو رنڈوا کرے گی؟'' اسلم کے لہجے میں واضح طنز اور حقارت تھی۔ لالی کے چہرے کا رنگ پل بھر کے لیے بدل گیا پھر وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''اگر کسی ایک نے ہمیں اپنا لیا ہوتا تو آج یہ طعنہ نہیں سننا پڑتا۔'' اس کا جواب سن کر اسلم کی اس کے بازو پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

''جو کچھ ہوا، اس کا کم سے کم اتنا فائدہ تو ہوا کہ تم نے تھوڑی دیر کے لیے سہی ہمارا ہاتھ تو تھاما۔'' اسلم کو ڈھیلا پڑتا

دیکھ کر وہ یک دم شوخ ہو گئی۔

''ذرا سا منہ کیا لگا لو سالی گلے ہی پڑنے لگتی ہے۔'' وہ بُرا سا منہ بنا کر بڑبڑاتا ہوا اسے دھکا دے کر وہاں سے ہٹ گیا۔

''مار ڈال ظالم! تیرے ہاتھوں مری تو سمجھوں گی کہ امر ہو گئی۔'' وہ ایک سسکاری سی لے کر بولی اور خود فراموشی کے عالم میں اپنا وہ بازو نہایت پیار سے سہلانے لگی جو کچھ دیر قبل اسلم کی گرفت میں تھا۔ اس سارے قصے میں خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتی ماہ بانو ہکا بکا سی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ لالی کی شخصیت کے عجیب و غریب رنگوں نے اسے حیران کر دیا تھا۔ وہ عورت بیک وقت شعلہ و شبنم تھی لیکن کس کے لیے کب شعلہ ثابت ہوگی اور کس کے لیے شبنم، یہ جاننا ذرا مشکل تھا۔

☆☆☆

آفتاب پریشانی کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ رات میں کشور کو لے کر یہاں پہنچا تھا اور ابھی تک کوئی تسلی بخش جواب سننے کو نہیں ملا تھا۔ ہر بار سوال کرنے پر عملے کی طرف سے یہی جواب ملتا تھا کہ ہم اپنی کوشش کر رہے ہیں، آپ دعا کریں۔ مریضہ کا خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے اس لیے فی الحال ان کی حالت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ گھنٹوں سے کسی اچھی اطلاع کے انتظار میں اسپتال کے کوریڈور میں ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک جاتا تو کچھ دیر کے لیے کسی بینچ پر بیٹھ جاتا۔ گزری رات کا ہر پل کسی بھیانک خواب کی طرح اس کے ذہن سے چمٹا ہوا تھا۔ را کے مبینہ ایجنٹ غلام محمد کا چوری چھپے رات گئے ان کے گھر میں داخل ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ عجیب معاملہ تھا کہ وہ اور غلام محمد دونوں اپنی شناخت چھپا کر اس چھوٹے سے گاؤں میں آ بسے تھے اور دونوں کا ہی ایک دوسرے کو شناخت کر لینا ان کے اپنے اپنے حساب سے ضرر رساں ثابت ہو سکتا تھا۔ ان کے درمیان فرق تھا تو یہ کہ آفتاب اور کشور اپنے دشمنوں سے چھپ کر یہاں آ بسے تھے اور غلام محمد دشمنی کرنے کے لیے یہاں رہ رہا تھا۔ را کے ایجنٹ کی حیثیت سے وہ ہر پاکستانی کا دشمن تھا اور دشمنی کے اس رشتے کو نبھانے کے لیے اس نے بہت چالاکی سے ایک پارسا اور پرہیزگار آدمی کا روپ اختیار کیا تھا۔ وہ ان لوگوں سے زیادہ خطرناک تھا جو دوسروں پر گولیاں چلا کر انہیں قتل کر ڈالتے ہیں۔ گولیاں چلانے والے تو صرف انسانی جسموں کے قاتل تھے جبکہ وہ ذہن اور روح کو قتل کر ڈالنے میں مصروف تھا۔ جانے اس نے کتنے لوگوں کے ذہنوں پر قبضہ کر کے ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے انہیں اپنا معمول بنا ڈالا تھا۔ اس شخص نے پیر آباد میں بھی یہی کارنامہ انجام دیا تھا اور اب اس گاؤں میں بھی یہی کر رہا تھا۔

آفتاب نے اسے شناخت کر لیا تھا اور چاہتا تھا کہ شہریار کو اطلاع دے کر اس کے خلاف کوئی کارروائی ہونے تک خود کو اس کی نظروں سے اوجھل رکھے لیکن اس کی اسی احتیاط نے غلام محمد کو کھٹکا دیا اور وہ اس کے بارے میں جاننے کے لیے رات گئے خاموشی سے اس کے گھر میں داخل ہو گیا۔ اس نے آفتاب کو اس کے بدلے ہوئے حلیے کے باوجود شناخت کر لیا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی آفتاب کے بجائے کشور کو جا لگی۔ کشور کو زخمی دیکھ کر آفتاب جنون میں اس سے جا ٹکرایا لیکن اس کا اور ایک تربیت یافتہ ایجنٹ کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ عین موقع پر شہریار اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تو نہ صرف غلام محمد پر قابو پا لیا گیا بلکہ کشور کو بھی طبی امداد کے لیے پنڈی کے اس اسپتال تک پہنچانا ممکن ہو سکا۔ اس کے ساتھ اسپتال آنے والے شہریار کے ساتھیوں نے ہی اسپتال کے معاملات نمٹائے۔ اب وہ جس پریشانی میں مبتلا تھا، وہ کشور کے بارے میں خوش خبری سنے بغیر کسی صورت ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ رشتوں کے معاملے میں بہت مفلس آدمی تھا۔ والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے باعث وہ ان کے انتقال کے بعد اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ کشور اس کا واحد رشتہ تھی اور اپنے وجود میں پلتے بچے کے ذریعے اسے ایک اور خوب صورت رشتہ دینے جا رہی تھی۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو وہ ان دونوں رشتوں سے محروم ہو جاتا۔ اس نے کشور کو پانے کی خاطر بہت کچھ کھویا تھا اور اب اسے کھونے کے لیے کسی طور تیار نہیں تھا لیکن اس کی بے دستور تشویش ناک حالت کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ اس وقت وہ ایک نڈر اور بے باک صحافی کے بجائے ذرا سہا خوف زدہ انسان تھا جو اپنی خواہش کے خلاف کچھ نہیں سننا چاہتا تھا۔

خوف اور پریشانی کے اس عالم میں بیٹھے نہ جانے کتنے لمحے بیت گئے تھے کہ نسوانی سسکیوں کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس نے نظر اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی جو اس کے ساتھ والی بینچ پر بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔ یہ اسپتال تھا اور اسپتال میں ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے ہی رہتے ہیں۔ لوگ اپنے پیاروں کی زندگیاں بچانے کے لیے اسپتالوں میں لاتے ہیں لیکن ہر ایک زندگی کی نوید لے کر جائے، یہ ضروری نہیں ہوتا۔ اس بے چاری کے ساتھ بھی یقیناً ایسا ہی کچھ ہوا ہوگا اور یہ کوئی اتنی غیر معمولی

WWW.PAKSOCIETY.COM

بات نہیں تھی کہ وہ اس کی طرف مستقل متوجہ رہتا۔ اس کی توجہ اصل میں ان دو پولیس والوں نے کھینچی تھی جو اس لڑکی کے ساتھ تھے۔

"یہ پانی پی لو بی بی اور ذرا حوصلے سے کام لے کر بتاؤ کہ تمہارے والد کے ساتھ کیا ہوا اور انہیں کن لوگوں نے قتل کیا؟" وہ جوان العمر پولیس انسپکٹر کافی مہذب تھا جو اس کی حالت کو سمجھ کر اس سے نرم لہجے میں مخاطب تھا ورنہ پولیس کی نوکری میں ہر طرح کے کیسز بھگتاتے وہ لوگ عموماً اتنے سخت دل ہو جاتے ہیں کہ کسی کے مرنے جینے سے قطع نظر انہیں بس اپنا کام نمٹانے سے غرض ہوتی ہے۔ پولیس انسپکٹر کی ہدایت پر لڑکی نے بہ مشکل خود پر قابو پاتے ہوئے اس کے ساتھی کا بڑھایا ہوا گلاس تھاما اور مشکل سے دو گھونٹ پانی پی کر گلاس واپس کر دیا لیکن پانی کے یہ دو گھونٹ بھی کافی کارآمد ثابت ہوئے تھے اور اس کی سسکیاں بہت دھیمی پڑ گئی تھیں۔

"تمہارا نام کیا ہے بی بی؟" اسے بہتر حالت میں پا کر پولیس انسپکٹر نے سوال کیا۔ فاصلہ زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے آفتاب ان کی ساری گفتگو آسانی سے سن رہا تھا۔

"مہک... مہک شفیق۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا۔

"تمہارے والد کے ساتھ جو ہوا اس کے بارے میں تم جو کچھ بھی جانتی ہو بتا دو۔"

"میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ تو ایک بہت سیدھے سادے اپنے کام سے کام رکھنے والے آدمی تھے۔ ان کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی پھر بھی جانے وہ کون ظالم تھے کہ ان کی جان لے گئے۔" اس نے رقت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

"تم ہمیں واقعے کی تفصیل بتاؤ، باقی مجرموں تک پہنچنا ہمارا کام ہے۔" انسپکٹر نے مثالی تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک اور زاویے سے اپنا سوال دُہرایا۔

"رات کو جب میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں گئی تو بابا کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ مجھے یونیورسٹی جانا تھا اس لیے میں سو گئی۔ نیند میں مجھے ایسا لگا کہ ہمارا دروازہ بج رہا ہے لیکن نیند کے غلبے کی وجہ سے میں نے دھیان نہیں دیا پھر شاید مجھے کچھ لمحوں کے لیے جھپکی سی آ گئی اور دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے گھر کے اندر قدموں کی چاپ سنی۔ یہ ایک سے زیادہ افراد کے چلنے کی آواز تھی اس لیے مجھے حیرت ہوئی اور میں یہ دیکھنے کے لیے کہ اتنی رات گئے کون بابا سے ملنے آیا ہے، اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ آوازوں سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ آنے والوں کو بابا اپنے کمرے میں ہی لے گئے ہیں چنانچہ میں اس طرف ہی چلی گئی لیکن پھر یہ سوچ کر کہ آنے والے جانے کون ہیں اور بابا میرا ان کے سامنے آنا پسند بھی کریں گے یا نہیں، میں باہر ہی رک گئی اور اندر کی آوازیں سننے لگی۔ وہ لوگ بابا سے کسی ماسٹر آفتاب کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔" لڑکی کا یہ جملہ سن کر آفتاب بُری طرح چونکا اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ اس کے لیے قطعی اجنبی تھی۔ اس نے اپنے باپ کا جو نام بتایا تھا، اس نام کے کسی شخص سے بھی وہ واقف نہیں تھا پھر وہ لوگ کیوں اس کا اتا پتا معلوم کرنے وہاں پہنچ گئے تھے؟ یا پھر وہ کوئی دوسرا ماسٹر آفتاب تھا جسے تلاش کیا جا رہا تھا؟ اس کے اندر اٹھتے سوالوں سے بے خبر لڑکی اپنا بیان دینے میں مصروف تھی۔

"بابا نے انہیں بتایا کہ وہ کسی ماسٹر آفتاب کو نہیں جانتے لیکن انہوں نے بابا کی بات نہیں مانی اور ان کے ساتھ مار پیٹ شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر میں بہت خوف زدہ ہو گئی تھی لیکن پھر بھی میں نے ہمت سے کام لیا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی تاکہ پولیس کو فون کر سکوں۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے پہلے لینڈ لائن سے فون کرنے کی کوشش کی لیکن ریسیور اٹھاتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ ہمارا فون کل سے ڈیڈ پڑا ہے اور کمپلین کروانے کے باوجود ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا ہے۔ گھبراہٹ میں مجھے اپنا سیل فون بھی نہیں مل رہا تھا۔ میں کمرے میں اِدھر اُدھر اسے تلاش کرتی رہی پھر مجھے اپنے بیگ میں دیکھنے کا خیال آیا۔ بیگ میں مجھے اپنا سیل فون مل گیا۔ سیل فون ملتے ہی میں نے جلدی سے ایمرجنسی نمبر پر کال کر کے آپ لوگوں کو اطلاع دی۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ آنے والے واپس جا رہے ہیں۔ میں نے کمرے سے باہر نکل کر دیکھا، وہ دو آدمی تھے جو بھاگتے ہوئے باہر جا رہے تھے۔ میں جلدی سے بابا کے کمرے میں گئی تاکہ انہیں دیکھ سکوں، وہ نیچے فرش پر گرے ہوئے تھے اور صاف لگ رہا تھا کہ ان پر تشدد کیا گیا ہے۔ میں نے ان کے قریب جا کر انہیں بہت آوازیں دیں لیکن انہوں نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔" بہت حوصلے سے پورا واقعہ سناتی لڑکی اس مقام پر آ کر ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس سے آگے کا ماجرا سمجھنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ لڑکی نے باپ کے زندہ ہونے کی امید پر کسی نہ کسی طرح انہیں اسپتال پہنچانے کا بندوبست کیا ہوگا اور وہ بے چارہ آدمی نہ جانے گھر پر ہی مر گیا تھا یا اسپتال پہنچ کر زندگی کی بازی ہارا تھا اور اب اس کی بیٹی بیٹھی پولیس والوں کو اپنا بیان ریکارڈ کروا رہی تھی۔ آفتاب اس کے بیان سے اندازہ لگا چکا تھا کہ ان باپ بیٹی کے علاوہ گھر میں کوئی دوسرا فرد نہیں تھا، جب ہی وہ لڑکی تنہا ساری صورت حال سے نمٹ رہی تھی۔ اسے اس پر بڑا رحم آیا۔ کسی اکیلی لڑکی کا اس طرح کے حالات سے نمٹنا بہت مشکل تھا۔ وہ تو پھر بھی غنیمت تھا کہ اس کا بیان لینے والا پولیس انسپکٹر معقول آدمی تھا ورنہ تو پولیس والے تو اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیتے ہیں، ایک لڑکی کی ان کے سامنے حقیقت ہی کیا تھی۔ کشور کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ اس معاملے میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اس نے اپنے بیان میں ماسٹر آفتاب کا نام استعمال کیا تھا۔ جانے وہ ماسٹر آفتاب وہ خود تھا یا کوئی اور؟ حقیقت جاننے کے لیے اسے کوشش تو کرنی ہی تھی۔ اگر شفیق کے قاتل واقعی اسے ڈھونڈ رہے تھے تو اس کا مطلب تھا کہ وہ اور کشور، چودھری کی پہنچ سے زیادہ دور نہیں ہیں۔

"کیا تم خود کسی ماسٹر آفتاب نامی شخص کو جانتی ہو؟" لڑکی کی حالت سے قطع نظر پولیس کے لیے کیس کی تحقیق زیادہ ضروری تھی چنانچہ انسپکٹر نے اس سے پوچھا۔ جواب میں لڑکی نے رخسار پر بہتے آنسوؤں کو انگلیوں سے صاف کرتے ہوئے محض نفی میں سر ہلا دیا۔

"تمہارے والد کی کسی سے کوئی دشمنی تھی کیا؟"

"نہیں، وہ دشمنیاں پالنے والے آدمی نہیں تھے۔ وہ تو اپنے نام ہی کی طرح بہت شفیق تھے۔" لڑکی نے بڑے دل گیر لہجے میں جواب دیا۔

"پھر بھی، ہو سکتا ہے کوئی کاروباری دشمنی ہو؟" پولیس انسپکٹر نے اسے اکسایا۔

"ایک بک شاپ چلانے والے آدمی کی کسی سے کیا کاروباری دشمنی ہو سکتی ہے؟" لڑکی کا جواب سن کر آفتاب کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ شفیق نامی ایک شخص کو جانتا ہے۔ وہ شخص مہک بک شاپ کا مالک تھا لیکن عموماً لوگ اسے خان صاحب کہہ کر پکارتے تھے اس لیے اس کے ذہن میں فوری طور پر اس کا خیال نہیں آیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آ گیا کہ انسپکٹر کے پوچھنے پر لڑکی نے اپنا نام مہک بتایا تھا۔ باپ نے بیٹی کی محبت میں اپنی بک شاپ کا نام بیٹی کے نام پر رکھ ڈالا تھا۔ اسے یہ بھی سمجھ آ گیا کہ اسے ڈھونڈنے والے شفیق خان کے گھر کیوں پہنچے۔ اس نے شہر یار کو رابطے کے لیے مہک بک شاپ کا ہی کنٹی فون نمبر دیا تھا۔ یقیناً اس کے دفتر میں چودھری کا کوئی مخبر تھا جس نے اس کے اور شہر یار کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر نمبر چودھری تک پہنچا دیا اور اس کے گرگے فوراً ہی اسے ڈھونڈتے ہوئے شفیق کے گھر پہنچ گئے لیکن بے چارہ شفیق خان کیسے انہیں کسی ماسٹر آفتاب کے بارے میں بتا سکتا تھا؟ وہ اسے اس نام سے جانتا ہی نہیں تھا۔ اس سے تو آفتاب نے خود کو احمد کے نام سے متعارف کروایا تھا اور اس تعارف نے جہاں اسے اور کشور کو بچا لیا تھا، وہیں بے چارہ شفیق خان بے قصور مارا گیا تھا۔ شفیق کی موت پر دلی رنج محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے دل میں شہر یار کی معاملہ فہمی کو بھی سراہا۔ اس نے اسے اپنے دفتر کے نمبر پر زیادہ تفصیلی بات کرنے ہی نہیں دی تھی اور فون نمبر لے کر موبائل سے کال کی تھی۔ اگر وہ یہ احتیاط نہیں کرتا تو غلام محمد کے معاملے جیسا حساس ایشو بھی کھل سکتا تھا۔

"مبارک ہو سر! آپ کی مسز اب خطرے سے باہر ہیں اور آپ کا بے بی بھی سیو ہے۔" وہ اس معاملے پر غور و فکر کر ہی رہا تھا کہ ایک نرس نے قریب آ کر اسے خوش خبری سنائی۔

"تھینکس گاڈ۔" آفتاب کے لبوں سے بے ساختہ ہی شکرانے کے الفاظ نکلے۔ اطلاع لے کر آنے والی نرس مسکراتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔

"شکر ہے میرے مالک تُو نے مجھے ایک بڑی مشکل سے نکال دیا۔ آگے بھی تُو ہی میری مدد فرما۔" نرس کے جانے کے بعد وہ دل ہی دل میں اللہ سے مخاطب ہوا کیونکہ اس سے بہتر بھلا کون جانتا تھا کہ بے شک فی الحال کشور خطرے سے نکل آئی ہے لیکن چودھری نام کا خطرہ تو بہرحال مسلسل ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔

☆☆☆

"میں لٹی کو سمجھ نہیں سکی۔ بڑی عجیب و غریب عورت ہے۔ اپنے یہاں تک پہنچنے کی جو داستان اس نے سنائی تھی، اسے سن کر تو یہی لگا تھا کہ وہ بہت مظلوم ہے لیکن سردار کے سامنے اس نے جس طرح رنگ بدلا، میں حیران رہ گئی۔ اس کے اور جمرو کے درمیان جو کچھ ہوا، وہ اسے نہ جانے کیوں سردار سے چھپا گئی۔ وہ جمرو سے ڈرتی ہے یا اس نے اور جمرو نے مل کر کوئی ڈراما کھیلا تھا، مجھے بالکل سمجھ نہیں آیا۔ آخر اسے ضرورت ہی کیا پڑی تھی میرے ساتھ یہ ڈراما کرنے کی؟" وہ اسلم کے ساتھ اس کی لگائی کئی پھلواری میں بیٹھی تھی اور اس سے گزرے ہوئے واقعے پر بات کر رہی تھی۔

"تمہاری سب سے خاص بات ہی یہ ہے کہ تم بہت خالص ہو اور اپنے اس خالص پن کی وجہ سے دوسروں میں موجود کھوٹ کو پہچان نہیں سکتیں۔" اسلم نے پورے وثوق

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے تبصرہ کیا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟ تم تو مجھے ڈھنگ سے جانتے بھی نہیں ہو۔" اسلم کی بات سن کر اس نے ذرا جھینپتے ہوئے گویا اس کا خود پر کیا جانے والا تبصرہ قبول کرنے سے انکار کیا۔

"کسی کو جاننے کے لیے ماہ و سال کی گنتی بے کار ہے، خاص طور پر تمہارے بارے میں تو بہت آسانی سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اتنی شفاف اور حیادار آنکھیں تو بس اسی انسان کی ہو سکتی ہیں جو اندر سے بہت خالص ہو۔" اس کے پاس اپنی رائے کے حق میں دلیل موجود تھی جسے سن کر وہ مزید جھینپنے پر مجبور ہو گئی۔ اسلم کے اپنے لیے جذبات اب اس کے لیے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اسے کتنی شدت سے چاہتا ہے اور قسمت کی اس ستم ظریفی پر حیران بھی تھی۔ جس شخص کی چاہت کے لیے اس کے دل نے تمنا کی تھی، وہ تو کبھی اس پر کھلا نہیں تھا اور یہاں اس جنگل بیابان میں ایک شخص اس حد تک اس کی محبت میں گرفتار ہوا تھا کہ اپنا سب کچھ اس پر لٹا دینے کے لیے تیار تھا۔

"میرے بارے میں تبصرہ کرنا چھوڑو اور مجھے للی کے بارے میں بتاؤ۔ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟" اسلم کو مزید کسی طرح کے اظہار سے روکنے کے لیے اس نے للی کو ہی موضوعِ گفتگو بنائے رکھنے کی کوشش کی۔

"للی نے اپنے ماضی کے بارے میں تمہیں جو کچھ بھی بتایا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس میں جھوٹ شامل نہیں ہوگا۔ وہ واقعی ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے اندر برائی کا عنصر بھی موجود ہے جو موقع ملتے ہی بڑی شدت سے ابھرتا ہے۔ ماں باپ کی نافرمانی کر کے شوبز کی رونقوں کو اپنا لینے کا فیصلہ کوئی سیدھی سادی اور نیک فطرت لڑکی کسی صورت نہیں کر سکتی۔"

"ایسا تو بہت لڑکیاں کر جاتی ہیں اور عموماً یہ وہی لڑکیاں ہوتی ہیں جو بہت معصوم اور سادہ ہوتی ہیں اور گھاگ شکاری انہیں آسانی سے شکار کر لیتے ہیں۔" اس نے اسلم کے للی کے بارے میں کیے گئے تبصرے کو قبول کرنے سے انکار کیا۔

"چلو پہلی بار کے لیے میں اسے رعایت دے دیتا ہوں لیکن یہاں آنے کے بعد وہ جس طرح مردوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنی، اس بارے میں تم کیا کہو گی؟ آئی ایم شیور کہ اتنی ذلت بھری زندگی تو کسی طوائف کو بھی منظور نہیں ہو گی، کسی شریف لڑکی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شریف لڑکیاں تو ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتی ہیں۔" وہ للی کے بارے میں اپنی رائے پر ثابت قدمی سے ڈٹا ہوا تھا۔

"اگر تمہیں میری بات غلط لگ رہی ہے تو بتاؤ کہ کیا تم اپنے لیے ایسی زندگی کو قبول کر لیتیں؟"

"ہرگز نہیں۔ میں ایسی زندگی کے بجائے اپنے لیے موت کو قبول کرتی۔" اس نے اسلم کے سوال کا تیزی سے جواب دیا۔

"تو پھر ثابت ہوا کہ للی ایک کرپٹ عورت ہے۔"

"میں تمہیں للی کو کریکٹر سرٹیفکیٹ ایشو کرنے کا نہیں کہہ رہی ہوں۔ میں صرف اس کے رویے کی وجہ جاننا چاہتی ہوں۔" اسلم کی بات سن کر اس نے قدرے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وجہ میں ہوں۔" وہ بڑی فرصت میں تھا چنانچہ بڑے اطمینان سے گفتگو کر رہا تھا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"بات بہت واضح ہے۔ للی کے مطابق وہ میری محبت میں مبتلا ہے۔ جب وہ یہاں آئی تھی تو شروع میں اس نے مجھ پر ڈورے ڈالنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ مجھے عورت ذات سے اس حد تک دلچسپی نہیں ہے کہ نفس کی تسکین کے لیے کسی بھی عورت کو قبول کر لوں۔ للی بھی میرے مطلب کی عورت نہیں ہے اس لیے اسے میری طرف سے مایوسی اٹھانی پڑی۔ مایوس ہو کر اس نے میرے پیچھے پڑنا بھی چھوڑ دیا لیکن جب سے تم یہاں آئی ہو، اس کی میرے لیے سوئی ہوئی محبت پھر جاگ گئی ہے۔ درحقیقت وہ تم سے جیلس ہے اور اسی جیلسی میں اس نے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اور جمرو دونوں مل کر اپنے اپنے مفاد کے لیے ڈراما کر رہے تھے۔ میرے ساتھیوں میں جمرو عورت کے بارے میں سب سے زیادہ ندیدہ ہے۔ تم یہاں پہنچی تھیں تو تمہیں دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگی تھی لیکن جب سردار نے میری فرمائش قبول کر لی تو وہ بُری طرح تلملایا۔ یقیناً وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی طرح تمہیں حاصل کر سکے اور اس کے لیے یہ موقع للی کے سازشی ذہن نے پیدا کر دیا۔ تمہیں جمرو کے ہاتھوں ذلیل کروا کر وہ مجھے نیچا دکھانا چاہتی تھی۔ اگر وہ اپنی سازش میں کامیاب ہو جاتی تو مجھ سے بڑے طنز سے کہتی کہ جس عورت کو تم نے بہت پاکیزہ سمجھ کر اپنے لیے منتخب کیا تھا، اب وہ بھی میلی ہو گئی ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ میں عین وقت پر وہاں پہنچ گیا اور جمرو اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو جیسے ابھی للی نے سردار کے سامنے اس کا ساتھ دیا تھا، ویسے ہی تب بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ اس کے حق میں گواہی دیتی اور کہتی کہ جو کچھ ہوا، تمہاری مرضی سے ہوا۔ اس طرح ان دونوں کا مقصد بھی پورا ہو جاتا اور کسی کو سزا بھی نہیں بھگتنی پڑتی۔'' اسلم نے جس طرح صورت حال واضح کی، اسے سن کر وہ ہکابکا رہ گئی۔ اس نے تو ہمیشہ یہی سنا تھا کہ چوروں اور ڈاکوؤں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں اور وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ سختی سے اپنے اصولوں پر کاربند رہتے ہیں لیکن اس کی سنی سنائی کے برخلاف یہاں بھی سازش کا بازار گرم تھا۔

''اتنی گم صم کیوں ہو گئیں؟'' اس کی کیفیت دیکھ کر اسلم نے اسے ٹوکا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ للّی نے میرے ساتھ اتنی بڑی دشمنی باندھ لی ہے۔''

''تم ہو ہی ایسی کہ یا تو آدمی تمہاری محبت میں گرفتار ہو جائے یا پھر حسد میں مبتلا ہو کر دشمنی پر اتر آئے۔'' اسلم نے پُرمزاح انداز میں کہتے ہوئے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

''لیکن میں نہ تو کسی سے دشمنی کر سکتی ہوں اور نہ ہی کسی کی محبت کا جواب محبت سے دے سکتی ہوں۔'' ماہ بانو نے سوچا کہ اسلم پر واضح کر دے کہ وہ اس کے لیے وہ جذبات نہیں رکھتی جو وہ اس کے لیے رکھتا ہے۔

''دشمنی تو میں جانتا ہوں کہ تم جیسی لڑکی کے بس کا کام نہیں لیکن محبت... محبت سے کیوں گریز ہے تمہیں؟'' اس نے بڑے اچنبھے سے پوچھا۔

''مجھے محبت سے گریز نہیں ہے لیکن اپنا یہ جذبہ میں نے ایک شخص کے لیے مختص کر دیا ہے۔ میری محبت اس کی امانت ہے۔ اگر زندگی نے موقع دیا تو میں اسے اس کی یہ امانت سونپ دوں گی ورنہ یہ خزانہ میرے دل میں ہی دفن رہے گا۔'' وہ اسلم کو خود سے مایوس کر دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

''کون ہے وہ خوش نصیب؟'' اس نے بڑی حسرت سے پوچھا۔

''یہ راز میں اپنے دل میں ہی رکھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے بڑی صاف گوئی سے جواب دیا۔ اسلم کا پل پل بدلتا رنگ چہرہ گواہ تھا کہ وہ بڑی تکلیف محسوس کر رہا ہے لیکن اسے تاریکی میں رکھنا مزید بڑا ظلم ہوتا۔

''اور اگر تمہیں یہاں سے نکل کر اس شخص تک پہنچنے کا موقع نہ ملا تو؟'' اسے شاید اب بھی کوئی امید تھی۔

''میں اس سوال پر اس صورت میں غور کرتی کہ اگر میں نے اسے پانے کا سوچا ہوتا۔ میری محبت پانے نہ پانے کی قید سے آزاد ہے۔''

''تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہو؟'' وہ کچھ جھنجلایا ہوا نظر آنے لگا۔

''اس لیے کہ میں نہیں چاہتی کہ تم بہت زیادہ آگے تک جاؤ۔'' اس نے اپنی صاف گوئی کو جاری رکھا۔

''دور تو میں بہت نکل گیا ہوں اور اب مشکل ہی ہے کہ اپنے قدم واپس موڑ سکوں۔ ہاں، اتنی کوشش ضرور کروں گا کہ تمہاری طرح بے لوث محبت کر سکوں۔'' وہ اپنی بات کہہ کر وہاں رکا نہیں اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا پھلواری سے باہر نکل گیا۔ اس کے لیے اپنے دل میں درد محسوس کرتی ہوئی ماہ بانو کی نظریں اردگرد کھلے پھولوں پر بھٹکنے لگیں۔ آج ان پھولوں کے رنگوں کی شوخی بھی ماند تھی۔ شاید وہ اس شخص کے لیے اداس تھے جس کے ہاتھوں نے انہیں سینچا اور سنوارا تھا۔

☆☆☆

''ہاں بھئی آفتاب کیا حال ہے؟ تمہاری مسز تو خیریت سے ہیں نا؟'' غلام محمد کی گرفتاری کے بعد وہ اب پہلی بار آفتاب سے بات کر رہا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے سر... سب خیریت ہے۔ بہت سیریس حالت تھی کشور کی... اگر انہیں بروقت اسپتال نہیں پہنچایا جاتا تو جان بچنا مشکل تھی۔ مجھے تو اس واقعے کے بعد اللہ کی قدرت پر مزید یقین ہو گیا ہے۔ اتنی ٹائمنگ سے اپنے بندے کی مدد کا بندوبست وہی کر سکتا ہے۔ اگر آپ لوگوں کو پہنچنے میں دو تین منٹ اور لگ جاتے تو شاید میں غلام محمد کے ہاتھوں مارا جاتا۔''

''اس کا نام اشیش ہے آفتاب! غلام محمد کا تو اس نے صرف بہروپ بھرا تھا۔'' ایک مکروہ کردار کے مالک کا فرشخص کا غلام محمد کے نام سے پکارا جانا دل کو ناگوار گزر رہا تھا اس لیے شہریار نے دھیمے لہجے میں آفتاب کو بتایا۔

''تو اس نے اپنی اصلیت اگل دی؟'' اس کے جملے سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے آفتاب جوش سے بولا۔

''ابھی صرف اس کا نام سامنے آیا ہے۔ باقی معلومات حاصل کرنے کے لیے اس پر خاصی محنت کرنی پڑے گی۔ کسی تربیت یافتہ ایجنٹ سے اس کی حقیقت اگلوانا آسان نہیں ہوتا... لیکن مجھے امید ہے کہ ہمیں اشیش سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''میرے خیال میں وہ اچھا خاصا سخت جان ثابت ہو گا۔'' آفتاب نے قیاس آرائی کی۔

''یقیناً اس طرح کے لوگ بہت ڈھیٹ واقع ہوتے ہیں۔'' شہریار نے پچے تلے انداز میں کہا۔ ''اور ہاں، میرے خیال میں تم اپنی رہائش کے لیے کسی پسماندہ گاؤں کے بجائے چھوٹے شہر کا انتخاب کرو۔ گاؤں میں تم جیسے آدمی کا رہنا اس لیے مناسب نہیں کہ تمہارا جو کام ہے، وہ گاؤں کے لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے اور تم وہاں زیادہ نمایاں ہو جاتے ہو۔ کسی چھوٹے شہر میں رہنے کا ایک دوسرا فائدہ یہ بھی ہو گا کہ تم کم از کم ٹیکنالوجی سے تو فائدہ اٹھا سکو گے۔'' اس نے آفتاب کو مشورہ دیا۔

''میں خود بھی ایسا ہی کچھ سوچ رہا ہوں سر! موجودہ جگہ تو اب ویسے بھی ہمارے لیے محفوظ نہیں رہی ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ کب چودھری کے بندے وہاں پہنچ جائیں۔ پنڈی تک تو انہوں نے ہمارا کھوج لگا ہی لیا ہے۔''

''وہ کیسے؟ کیا تمہیں پنڈی میں چودھری کے کرگے نظر آئے تھے؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''نہیں لیکن وہ مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں نے آپ کو جس بک شاپ کا فون نمبر دیا تھا، وہ لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے اس بک شاپ کے مالک تک پہنچ گئے تھے۔'' اس نے اسپتال میں اتفاقیہ قلم میں آجانے والی مہک بک شاپ کے مالک شفیق خان کے قتل کی تفصیلات شہریار کے گوش گزار کر دیں۔ شہریار دھیان سے سب سنتا رہا۔ جو کچھ آفتاب بتا رہا تھا، اس سے تو یہی ظاہر تھا کہ اس کے دفتر سے مخبری ہوئی ہے۔ وہ تو اس کی احتیاط پسندی کام آگئی تھی ورنہ بات مہک بک شاپ کے فون نمبر سے آگے نکل گئی ہوتی۔ اب بھی جو کچھ ہوا تھا، وہ خاصا افسوس ناک تھا۔ ایک بے گناہ آدمی قتل ہو گیا اور اس کے قتل کے بعد اس کی اکلوتی بیٹی یقیناً بہت مشکل میں پڑ گئی تھی لیکن چودھری جیسے لوگوں کا انسانیت سے تعلق ہی کہاں ہوتا ہے جو وہ کسی انسان کی زندگی لیتے ہوئے جھجکیں۔

''تم نے مجھے بہت اہم بات بتائی ہے۔ اب میں اپنے دفتر میں اس کالی بھیڑ کو تلاش کروں گا جو یہاں کی خبریں چودھری تک پہنچا رہا ہے۔'' اندرونی طور پر بہت غضب ناک ہونے کے باوجود اس نے ہموار لہجے میں اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ آفتاب جواب میں خاموش رہا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے شہریار کو کوئی مشورہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر بہت سے مسائل خود ہی حل کر لیتا ہے۔ اس نے تو موجودہ حالات میں بھی اتنی حاضر دماغی سے کام لیا تھا کہ اشیش کی گرفتاری جیسے اہم معاملے میں الجھنے کے

وضاحت

نیا شادی شدہ جوڑا سڑک پر ٹہلتا ہوا جا رہا تھا کہ سامنے سے سنہرے بالوں والی ایک خوب صورت لڑکی نمودار ہوئی۔

''ہیلو جارج ڈارلنگ!'' اس لڑکی نے کہا پھر اس کی نظر جارج کی بیوی پر پڑی اور وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔

''یہ منحوس کون تھی؟'' نئی نویلی دلہن نے غصے سے پوچھا۔

''فضول سوال مت کرو۔'' شوہر نے جواب دیا۔ ''تمہیں کیا پتا کہ مجھے تمہارے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے کس مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

سلمان احمد کی بے بسی، ضلع جہلم سے

باوجود اس بات کا بندوبست کر دیا تھا کہ آفتاب کے پاس ایک نیا سیل فون سم سمیت پہنچ جائے تا کہ وہ جب چاہے اس سے رابطہ کر سکے۔

''اوکے پھر تم اپنا خیال رکھو اور اردگرد سے باخبر رہنے کی کوشش کرو۔ کشور کے سفر کے قابل ہوتے ہی تم اپنی شفٹنگ کر لینا۔ اس سلسلے میں اگر میری مدد درکار ہو تو مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔'' اس نے آفتاب کو ہدایات دیتے ہوئے کال منقطع کر دی اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ نورکوٹ اب زیادہ دور نہیں تھا لیکن بہرحال اتنا وقت تھا کہ وہ میجر ذیشان سے بات کر سکے۔ یہ میجر ذیشان ہی تھا جس کے تعاون سے وہ اشیش کی گرفتاری اتنے خفیہ طور پر کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ میجر ذیشان نے تو اسے یقین دلایا تھا کہ یہ کام اس کے آدمی آرام سے کر سکتے ہیں لیکن وہ اس موقع پر خود موجود رہنے کا خواہش مند تھا۔ اس کا اصرار دیکھتے ہوئے میجر نے اس کے سفر کے انتظامات کروا دیے تھے۔ وہ نورکوٹ سے لاہور تک اپنی ہی گاڑی میں گیا تھا لیکن اس سے آگے کے سارے انتظامات میجر ذیشان نے کیے تھے۔ اس مشن سے مشابرم خان کے سوا کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ مختصر عرصے میں اپنی ایمان داری اور وفاداری کو منوا لینے والا مشابرم خان اس کے ساتھ ساتھ رہا تھا اور اب بھی وہی اس کی گاڑی چلا رہا تھا۔ اسے مشابرم خان پر اتنا اعتماد تھا کہ اس کے سامنے کوئی بھی بات کرتے

ہوئے یہ خدشہ نہیں ہوتا تھا کہ بات لیک آؤٹ بھی ہوسکتی ہے۔ اس وقت بھی اس نے پورے اطمینان سے آفتاب سے بات کی تھی اور اب میجر ذیشان کا نمبر ملا رہا تھا۔

''جی میجر صاحب! کچھ بتایا اشیش نے؟'' دوسری طرف سے کال ریسیو کیے جاتے ہی اس نے رسمی علیک سلیک کے بجائے براہِ راست سوال داغا۔ وہ اس معاملے میں اتنا پُرجوش تھا کہ اشیش کو اپنی کسٹڈی میں رکھنا چاہتا تھا لیکن میجر ذیشان نے اس کا یہ مطالبہ ماننے سے انکار کردیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اشیش ایک جاسوس ہے اور اس کا انٹیلی جنس کے قبضے میں رہنا ہی بہتر ہے۔ البتہ اس نے شہریار سے اتنا وعدہ ضرور کرلیا تھا کہ اشیش سے حاصل ہونے والی معلومات کو اس سے ضرور شیئر کرے گا چنانچہ اب وہ اسے فون کرکے یہی جاننا چاہتا تھا کہ اب تک اشیش سے کیا کچھ اگلوایا جاسکا ہے۔

''فی الحال تو ہم اس سے کچھ خاص معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ ہاں، اس نے گاؤں کے اس لڑکے کے قتل کا اعتراف ضرور کرلیا ہے۔'' میجر ذیشان کا اشارہ اس لڑکے کی طرف تھا جسے اشیش نے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کردیا تھا۔ جمعے کی نماز میں اس بچے کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی تھی اور اسی موقع پر آفتاب نے اشیش کو شناخت کرلیا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے حیرآباد میں ماہ بانو کے چھوٹے بھائی کو بھی زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کرڈالا تھا۔

''اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرنی ہے میجر صاحب! آپ کوئی بھی طریقہ استعمال کریں لیکن اس شخص سے سب کچھ اگلوا کر چھوڑیں۔ اور ہاں، یاد رکھیے گا کہ اس سے ورما کا پتا معلوم کرنے کے بعد آپ مجھے ضرور بتائیں گے۔'' اس نے ایک بار پھر میجر ذیشان کو یاددہانی کروانا ضروری سمجھا۔

''مجھے اپنا وعدہ یاد ہے لیکن میں آپ کو یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ آپ جو کچھ کررہے ہیں، اس کے بارے میں اچھی طرح سوچ سمجھ لیں۔ آپ کی نیک نیتی اپنی جگہ لیکن قانونی طور پر یہ سب کرنے کی اتھارٹی نہیں ہے آپ کے پاس۔ یہ نہ ہو کہ آپ اپنوں کے ہاتھوں ہی دھر لیے جائیں۔'' میجر ذیشان نے اسے سمجھایا۔

''اپنی نیک نیتی کی وجہ سے ہی مجھے اس بات کا یقین ہے کہ میں گرفت میں نہیں آسکوں گا اور اگر پھنس بھی گیا تو میرے پاس یہ اطمینان ہوگا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کے بجائے میں نے اپنے اور اپنے ملک کے دشمنوں کے خلاف جدوجہد کی تھی۔ آپ شاید میری کیفیت کو پوری طرح سمجھ نہ سکیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی نے مجھے ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں پہنچ کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا ہوں کہ ہر کام قھرو پراپر چینل ہو، یہ ضروری نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ جن لوگوں کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ ایسے عناصر پر گرفت کریں، وہ یا تو خود ان کے محافظ بن کر بیٹھے ہیں یا پھر بے پروائی برت رہے ہیں۔ آٹے میں نمک کے برابر کچھ ایمان دار لوگ بھی ہیں لیکن اتنے سارے بے ایمانوں کی وجہ سے وہ ناکام ہوکر رہ جاتے ہیں۔'' یہ سب کہتے ہوئے اس کی نظروں کے سامنے شیبا اور سجاد درانا کی لاشیں گھوم رہی تھیں۔ ان دونوں کے قاتل ابھی تک پکڑے نہیں جاسکے تھے۔ مختار مراد آئی جی پنجاب ہونے کے باوجود اپنے داماد اور نواسی کے قاتلوں تک پہنچنے میں ناکام تھے اور ایسا صرف اس لیے تھا کہ ان کا ماتحت عملہ ان کے ساتھ پوری طرح تعاون نہیں کررہا تھا۔

''شاید آپ کا نظریہ درست ہی ہے۔'' میجر آفتاب نے کھوئے ہوئے لہجے میں اس سے اتفاق کیا۔ وہ خود بھی تو شہریار کے ساتھ تعاون کرکے ایک طرح سے غیر قانونی کام ہی کررہا تھا لیکن اسے اطمینان تھا کہ جو کچھ ہورہا ہے، وہ غلط نہیں ہورہا۔ طریقہ کار چاہے جو بھی تھا، شہریار بہرحال ملک دشمن عناصر کے خلاف ہی جنگ لڑ رہا تھا۔ اگر اس کا ایملی کے نام سے ملنے والی لبنٰی اسے واسطہ نہیں پڑا ہوتا تو شاید وہ خود بھی کبھی اس طرح سے شہریار کا ساتھ نہیں دیتا جیسے اب دے رہا تھا۔ لبنٰی نے اسے اپنے حُسن کے جال میں پھنسا کر ایسا کام دکھایا تھا کہ وہ خفیہ معلومات اگل بیٹھا تھا۔ ایک عورت کے ہاتھوں چوٹ کھا کر وہ اندر سے بُری طرح تلملایا ہوا تھا اور بس نہیں چلتا تھا کہ ہر ملک دشمن کو نیست و نابود کرڈالے۔ اس کی اسی کیفیت نے اسے شہریار کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور کیا تھا۔ ان کا یہ ساتھ کس حد تک اور کب تک رہتا... یہ تو آنے والا وقت ہی بتانے والا تھا۔

☆☆☆

فریدہ نے بیڈ پر رکھے زرق برق سبز رنگ کے لباس کو دیکھا اور عجیب سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ یہ لباس اسے وڈی چودھرائن نے بھجوایا تھا۔ لباس لے کر آنے والی عورت وہ ملازمہ تھی جو بہزاد شاہ کی خدمت اور اس کی چھوٹی موٹی ضروریات کا خیال رکھنے پر مامور تھی۔ ملازمہ نے اسے لباس اس اطلاع کے ساتھ پہنچایا تھا کہ وڈی چودھرائن نے کہا ہے، کل اس لباس کو پہن کر تیار رہیں، آپ کی گودبھرائی کی رسم ادا کی جائے گی۔ وڈی چودھرائن کا یہ حکم سن کر وہ حیران بھی ہوئی تھی اور خوش بھی۔ وہ جب سے بہزاد شاہ کے نام سے بیاہ کر اس حویلی میں آئی تھی، یہ پہلا موقع تھا کہ اسے کسی قابل سمجھا گیا تھا ورنہ اس سے قبل وہ کسی معاملے میں شریک نہیں کی گئی تھی۔ اسے حویلی کی بالائی منزل پر یہ الگ تھلگ گوشہ دے کر سب سے کاٹ دیا گیا تھا۔ صرف ملازمہ تھی جس سے وہ تھوڑی بہت بات چیت کرلیا کرتی تھی اور جس کے ذریعے اسے اردگرد کے حالات کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔

''چل فریدہ... آج یہ دن بھی دیکھ لے کہ کیسے وڈی چودھرائن اپنے شوہر کے ناجائز بچے کی ماں کی گودبھرائی کرتی ہے۔'' سبز زرتار لباس پر نظریں جمائے وہ آہستہ سے بڑبڑائی پھر ہاتھ بڑھا کر لباس اٹھالیا۔ لباس کی تبدیلی کے بعد اس نے وہ زیورات بھی پہن لیے جو اس کے ساتھ ہی بھیجے گئے تھے اور آئینے کے سامنے کھڑی ہوکر گنگناتے ہوئے میک اَپ کرنے لگی۔ آج اس کی تیاری بڑی بھرپور تھی۔ اسے یاد آیا کہ آخری بار اتنے بھرپور طریقے سے وہ اس دن تیار کی گئی تھی جب اس کا اور بہزاد شاہ کا ولیمہ ہوا تھا لیکن اس دن میں اور آج کے دن میں بڑا فرق تھا۔ اس دن اسے خود پر بڑا جبر کرنا پڑا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ جسم سے ایک ایک زیور اور لباس نوچ کر پھینک دے۔ سنگھار کے وہ سارے لوازمات اسے چودھری کے ہاتھوں اٹھائی گئی شکست اور ذلت کی یاد دلا رہے تھے۔ آج کا سنگھار اس لحاظ سے مختلف تھا کہ آج وہ چودھری کو اپنے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرچکی تھی۔ آج جب وہ بن ٹھن کر چودھری کے سامنے جاتی تو وہ اندر ہی اندر جلبلا کر رہ جاتا۔ اسے شدت سے اپنی بے بسی کا احساس ہوتا کیونکہ فریدہ نے اسے اپنے امید سے ہونے کی خبر ہی اتنی دیر سے دی تھی کہ وہ کسی طور اس بچے سے جان نہیں چھڑا سکتا تھا۔ اس کے پاس دوسرا حل یہ تھا کہ وہ فریدہ کو ہی جان سے مار ڈالے لیکن اس کے لیے بھی اس نے چودھری کو باور کروادیا تھا کہ اس کی موت کی صورت میں کچھ لوگ متحرک ہوجائیں گے جو نہ صرف اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرواکے اس کے حاملہ ہونے کا پتا چلالیں گے بلکہ یہ راز بھی ساری دنیا کے سامنے فاش کردیں گے کہ بے شک فریدہ منکوحہ بہزاد شاہ کی تھی لیکن درحقیقت چودھری نے اسے اپنی رکھیل بنا رکھا تھا۔ اس نے چودھری کو بتادیا تھا کہ اس کا تحریری بیان ایک معتبر شخصیت کے پاس بطور امانت موجود ہے جو اس کی موت کی صورت میں اس بیان کو میڈیا کے سامنے پیش کردے گا۔ اپنی ان ساری باتوں کے جواب میں اس نے چودھری کے چہرے پر غصے اور بے بسی کی جھلک دیکھی تھی اور دل ہی دل میں بڑی محظوظ ہوئی تھی۔ آنے والے کل میں جب چودھری کی اپنی اولاد اس کے پوتے کی حیثیت سے حویلی میں پلتی بڑھتی تو وہ یقیناً اور بھی جھنجلاتا۔

''آہ... ہاں۔ تم دلہن بنی ہو۔'' اچانک ہی بہزاد شاہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور اسے یوں تیار دیکھ کر تالی بجاتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا۔ اس نے آئینے میں اپنے عکس کے پیچھے موجود بہزاد شاہ کے عکس کو دیکھا اور دھیرے سے مسکراتی ہوئی اس کی طرف پلٹی۔

''تم وڈی سوہنی لگ رہی ہو۔'' اس نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور قریب آکر اس کی کلائی میں پڑی جڑاؤ چوڑیوں کو چھو چھو کر دیکھنے لگا۔ یہ ایک بچکانہ سی ادا تھی۔ اس دیوانے کو ذرا بھی شعور نہیں تھا کہ سامنے بن ٹھن کر کھڑی یہ بھرپور عورت اس کے نام سے اس حویلی میں لائی گئی ہے اور وہ نہ صرف اس کا شوہر کہلاتا ہے بلکہ آنے والے وقت میں اس کے بچے کا باپ بھی کہلائے گا۔ فریدہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تاسف بھرا ایک گہرا سانس لیا۔ خود اس تجربے سے گزر جانے کے باوجود اسے اب تک یہ یقین کرنا مشکل لگتا تھا کہ کوئی شخص اتنا گرا ہوا اور مکروہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنے نفس کی تسکین کے لیے اپنے ذہنی معذور بیٹے کو استعمال کرے۔ وہ جن حالات میں چودھری کے ہاتھ لگی تھی وہ چاہتا تو اس کے بھائی چودھری بختیار سے اس کے لیے خود اپنا رشتہ بھی مانگ سکتا تھا۔ چودھری بختیار اس وقت اتنا بے بس ہوچکا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ہامی بھرنی پڑتی لیکن شاید ایک طرف تو چودھری اپنی گھریلو زندگی میں کوئی نیا ہنگامہ نہیں کھڑا کرنا چاہتا تھا اور دوسری طرف اسے اس کے بھائی چودھری بختیار کو زیادہ سے زیادہ ذلیل کرنا مقصود تھا جو یہ گھٹیا طریقہ کار اختیار کیا۔

''تم کہاں جارہی ہو دلہن؟'' بہزاد شاہ شاید اپنے سوال کو کئی بار دُہرا چکا تھا اور وہ خیالات میں ڈوبی ہونے کی وجہ سے سن نہیں سکی تھی اس لیے اس نے اس بار زور سے ہلا کر دریافت کیا۔

''کہیں نہیں۔ ادھر حویلی میں ہی ایک دعوت ہے۔'' اس نے نرمی سے جواب دیا۔ چودھری کی اولاد ہونے کے باوجود وہ ذہنی پسماندہ لڑکا اسے کبھی بُرا نہیں لگا تھا اور نہ ہی کبھی وہ اس سے سختی سے پیش آسکی تھی۔ ہاں، ابتدا میں یہ ضرور ہوا تھا کہ اس نے سوچا تھا کہ بہزاد شاہ کے ذریعے چودھری کو مروا

WWW.PAKSOCIETY.COM

دے گی۔ ایک ذہنی معذور شخص اگر چودھری کو بلندی سے دھکا دے دیتا یا اس کے سر پر کسی بھاری شے سے وار کر کے اس کی کھوپڑی توڑ ڈالتا تو کوئی اسے کس طرح الزام دے سکتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے بہزاد شاہ کو خود سے قریب کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی یا کوئی کھیل کھیلنے لگ جاتی۔ گھر والوں کی توجہ کو ترسا ہوا، ملازموں کے سہارے پروان چڑھنے والا بہزاد شاہ اس کی توجہ پا کر کھل اٹھتا۔ فریدہ نے یہ بھی نوٹ کیا تھا کہ بہزاد شاہ اس کا ہر حکم بڑی فرماں برداری سے بجا لاتا تھا۔ یہ اس کے منصوبے کے لیے بڑی خوش آئند بات تھی لیکن اس سے قبل کہ وہ اس پر عمل کرتی، اسے اپنے پریگننٹ ہونے کا احساس ہو گیا اور پھر اس نے اپنا لائحہ عمل بدل ڈالا۔ اس نے سوچا کہ یہ بچہ ضرور پیدا کرے گی اور اس کے ذریعے چودھری کو بلیک میل کرے گی۔ ڈاکٹر ماریا کی زبانی اسے یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ اب سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ایک ٹیسٹ کے ذریعے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ بچے کا باپ کون ہے۔ ڈاکٹر ماریا دو تین بار ہی اس کے پاس آئی تھی لیکن اس نے اسے بہت تسلی دی تھی اور وقت پڑنے پر مدد کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اسی کی وجہ سے وہ اس لائق ہو سکی تھی کہ چودھری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔

”حویلی میں دعوت ہے۔ پھر تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ وڈے پروہنے آئیں گے۔ میں سب سے ہاتھ ملاؤں گا۔“ حویلی میں دعوت کا سن کر بہزاد شاہ بہت خوش ہوا اور ساتھ ہی اپنا پروگرام بھی ترتیب دے ڈالا۔

”تم دعوت میں نہیں جا سکتے۔ ادھر صرف عورتیں ہوں گی، ہور پروہنے بھی زیادہ نہیں آ رہے۔ بس تمہاری اماں اور بہنوں کے علاوہ دو تین زنانیاں ہور ہوں گی۔“ اس نے بہزاد شاہ کو سمجھایا۔

”یہ بھی کوئی دعوت ہوئی۔ دعوت تو وہ ہوتی ہے جس میں ڈھیر سارے لوگ آتے ہیں جیسے دادا جی کے عرس پر جمع ہوتے ہیں۔ تم ہی جاؤ ایسی بکواس دعوت میں۔“ وہ ذہنی طور پر معذور تھا لیکن حویلی میں ہونے والی دعوتوں کو تو بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا اس لیے فریدہ کی زبانی ہونے والی دعوت کا حال سن کر اسے کچھ مزہ نہیں آیا اور وہ فوراً ہی دعوت میں شرکت کے مطالبے سے دست بردار ہو گیا۔

”آپ کی تو وڈی دوستی ہے چھوٹے شاہ جی کے ساتھ۔“ اسی وقت ایک ادھیڑ عمر ملازمہ ہاتھوں میں ایک تھال اٹھائے وہاں پہنچی اور فریدہ کو بہزاد شاہ کے ساتھ باتوں میں مصروف دیکھ کر بولی۔ یہ ادھیڑ عمر ملازمہ ماسی رحمتے کے بعد وڈی چودھرائن کے سب سے زیادہ قریب تھی اور رحمتے کے منظر سے غائب ہوتے ہی اس نے ان کی جگہ سنبھال لی تھی۔ رحمتے تو اپنی دونوں جوان بیٹیوں کو کھونے کے بعد حواسوں میں ہی نہیں رہی تھی۔ چھمی اور شادو جو کبھی اپنی ماں کے ساتھ وڈی چودھرائن کی ناک کا بال بنی رہتی تھیں اور حویلی میں ہونے والے ہر واقعے کی کھوج میں رہتی تھیں، کشور کے فرار کے بعد معتوب ٹھہری تھیں اور چودھری کی طرف سے موت کی سزا پا کر اپنے انجام کو پہنچی تھیں۔ ان دونوں بہنوں اور ان کی ماں رحمتے نے مل کر کشور کے لیے بڑی مشکل پیدا کر رکھی تھی۔ اگر اس کی وفادار ملازمہ رانی کا ساتھ نہ ہوتا تو ان تینوں ماں بیٹیوں کی جاسوسی کے نتیجے میں کشور ابتدا میں ہی پھنس جاتی اور اسے جیتے جی حویلی کے زنداں سے نکلنے کا موقع نہیں ملتا۔

”یہ کیا لائی ہو ماسی؟“ فریدہ نے ملازمہ کے ہاتھوں میں موجود تھال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ تھال میں پھول ہی پھول بھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

”یہ پھول وڈی چودھرائن نے آپ کے لیے بھجوائے ہیں۔ لائیں میں آپ کو پہنا دوں۔“ اس نے تھال ایک تپائی پر رکھا اور اس میں رکھا پھولوں کا زیور ایک ایک کر کے اسے پہنانے لگی۔ گجرے، کنگن اور بازو بند جسم پر سجے تو فریدہ سچ مچ دلہن لگنے لگی۔ ملازمہ نے اسے پھولوں کے زیورات پہنانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک بڑا سا گجرا بھی اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ بھاری لباس اور زیورات کے ساتھ اس گجرے کو بھی سنبھالنے کے لیے فریدہ کو اپنے دونوں ہاتھ استعمال کرنے پڑے۔ اس فراوانی سے اسے پھولوں سے لادنے کے باوجود ملازمہ کے پاس پھولوں کا ذخیرہ ختم نہیں ہوا تھا اور تھال میں اب بھی اچھے خاصے پھول بغیر پروئے ہوئے یا پتیوں کی صورت میں موجود تھے۔

”ان کا کیا کرو گی؟“ فریدہ نے ملازمہ سے دریافت کیا۔

”وڈی چودھرائن کا حکم ہے کہ جب آپ اوپر سے نیچے اتریں تو میں آپ کے پیچھے پیچھے یہ پھول برساتی ہوئی آؤں۔“ ملازمہ نے جواب دیا جسے سن کر فریدہ کے دل میں خواہش ابھری کہ کاش وہ اس حویلی میں کسی ڈھنگ کے شخص کے ساتھ بیاہ کر آئی ہوتی اور کسی کے جائز بچے کی ماں بن رہی ہوتی تو یقیناً آنے والے مہمان کی اس پذیرائی پر کھل اٹھتی۔

”چنگی گل ہے۔“ اپنی اداس ہوتی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور پھر ملازمہ سے پوچھا۔ ”کیا اب چلیں؟“

”ہاں بی بی!“ اس نے جواب دیا پھر اس کی اور بہزاد شاہ کی ملازمہ کی طرف رخ کر کے بولی۔ ”میں بی بی کو رسم کے لیے نیچے لے جا رہی ہوں تو چھوٹے شاہ جی کا خیال رکھنا۔ یہ نہ ہو کہ وہ شوق میں نیچے آ جائیں اور پھر کوئی ہنگامہ کریں۔ یاد ہے نا ایک بار انہوں نے وڈے سرکار کے پروہنوں کے سامنے جا کر کیسی توڑ پھوڑ مچائی تھی، ہور بعد میں وڈے سرکار نے اس ملازمہ کی کھال ادھیڑ ڈالی تھی جس کی غفلت سے چھوٹے شاہ جی نیچے اترے تھے۔“

”فکر نہ کرو ماسی۔ میں چھوٹے شاہ کا خیال رکھوں گی۔“ بیس بائیس سالہ ملازمہ نے خوف زدہ سے لہجے میں جواب دیا۔

”چلیں بی بی!“ بہزاد شاہ کی طرف سے مطمئن ہو کر وڈی چودھرائن کی چہیتی ملازمہ نے فریدہ کو مخاطب کیا تو وہ حرکت میں آ گئی۔ بھاری شرارہ نما لباس پہن کر چلنے میں اسے دشواری پیش آ رہی تھی۔ سیڑھیوں پر یہ مشکل اور بھی بڑھ گئی۔ ایک تو لباس بار بار پیروں میں آ کر الجھ رہا تھا، دوسرے دونوں ہاتھوں میں موجود پھولوں کی وجہ سے وہ اسے سنبھال بھی نہیں سکتی تھی۔ پیچھے اس سے ایک قدم کے فاصلے سے پھول برساتے ہوئے سیڑھیاں اترتی ملازمہ کو گویا اس کی مشکل کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ بڑے مگن سے انداز میں پھول برسانے کے ساتھ ساتھ کوئی دعائیہ گیت الاپنے میں مصروف تھی۔ اس مگن کیفیت میں اچانک ہی اس کا پیر مڑا اور وہ خود سے آگے چلتی فریدہ سے جا ٹکرائی۔ فریدہ کے پاس سنبھلنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ اس کا پیر پھسلا اور وہ سیدھی سیڑھیوں سے نیچے کی طرف لڑھکتی چلی گئی۔ سیڑھیوں کے اختتام پر وڈی چودھرائن کے علاوہ اس کی دونوں بیٹیاں تاجور، صنوبر اور چھوٹی چودھرائن اس کے استقبال کے لیے کھڑی تھیں۔ فریدہ سیڑھیوں سے لڑھکی تو ان سب کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ ان چیخنے والیوں میں سے کس کس کی آنکھوں سے مسرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی ہیں، یہ دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

”تم ان لوگوں میں کیسے شامل ہوئے اسلم؟“ وہ اسلم کی لگائی پھلواری میں درخت پر بنی مچان پر اس کے ساتھ موجود تھی۔ مچان سے دور تک نظر آتا جنگل کا منظر دیکھنا اسے بہت اچھا لگتا تھا لیکن اس منظر سے وہ بہت کم ہی لطف اندوز ہو پاتی تھی۔ اس کی وجہ اس کے پیروں میں موجود زنجیر تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

دونوں پیروں کے درمیان موجود اس زنجیر کی وجہ سے وہ بغیر کسی سہارے کے مچان تک پہنچانے والی سیڑھیاں چڑھنے سے معذور تھی چنانچہ صرف اسی وقت مچان تک پہنچ سکتی تھی، جب اسلم اس کے ساتھ ہو۔ جب سے جمرو والا واقعہ پیش آیا تھا، وہ پھلواری میں بھی اکیلے آنے سے گریز کرنے لگی تھی۔ خود اسلم نے بھی اسے ہدایت کی تھی کہ آئندہ اگر پھلواری تک جاؤ تو پہلے مجھے اطلاع دے دینا تاکہ میں نظر رکھ سکوں لیکن وہ احتیاطاً اس طرف آئی ہی نہیں تھی۔ آج اسلم نے خود اسے چلنے کی پیشکش کی تو وہ مان گئی اور اب وہ دونوں وہاں موجود تھے۔

اسے یہاں لانے کے بعد اسلم اس سے بے نیاز ہو گیا تھا اور ایک کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا تھا۔ خاموش طبع تو وہ تھا ہی لیکن ماہ بانو نے محسوس کیا تھا کہ جب سے اس نے اسلم کے سامنے اپنے کسی اور کی محبت میں گرفتار ہونے کا اظہار کیا تھا، اس کی خاموشی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے بھی بالکل الگ اور کٹا کٹا سا رہنے لگا تھا۔

اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے ماہ بانو نے اپنے دل میں اس کے لیے سخت افسوس محسوس کیا تھا لیکن وہ بھی کیا کرتی؟ دل کے معاملات میں زبردستی یا مروت کی گنجائش نہیں ہوتی۔ وہ اخلاقاً بھی اسلم کی محبت کی پذیرائی نہیں کر سکتی تھی۔ اخلاقاً مروتاً تو رہا ایک طرف، وہ تو مصلحتاً بھی ایسا نہیں کر سکتی تھی ورنہ یہاں سے نجات کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے لیے اسلم کے جذبات کا فائدہ اٹھاتی اور اسے بے وقوف بنا کر یہاں سے نکلنے کی راہ ہموار کر لیتی۔ اس جیسی لڑکی کے لیے کسی کے سچے جذبات کو اس طرح کا دھوکا دینا گوارا نہیں تھا۔ اسلم کی اس کے لیے محبت بہت خالص تھی اور ایسی محبت کی اگر پذیرائی نہ کی جا سکے تو رسوائی بھی نہیں کرنی چاہیے۔ ہاں اگر وہ نفس کا مارا کوئی ہوس پرست آدمی ہوتا تو پھر اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جا سکتا تھا۔

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟“ وہ جو ابھی تک جنگل کے مناظر پر ہی نظر جمائے ہوئے تھی، اسلم کی طرف سے جواب نہ پا کر رخ موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کا سر ابھی تک کتاب پر ہی جھکا ہوا تھا لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ پڑھ نہیں رہا ہے۔

”تم یہ جان کر کیا کرو گی؟“ آخرکار اس نے اپنی زبان کھولی لیکن جواب دینے کے بجائے الٹا سوال داغ دیا۔

”کرتو شاید کچھ نہیں سکتی لیکن میرے اندر ایک تجسس سا ہے کہ تم جیسا آدمی ان ڈاکوؤں کے درمیان کیسے پہنچا؟ تم ان سب سے بہت مختلف ہو اور کوئی حادثہ ہی تمہیں ان تک پہنچا سکتا ہے۔“

”جیسے تم حادثاتی طور پر یہاں پہنچ گئیں ورنہ شاید اس شخص کے ساتھ ہوتیں جسے تم نے اپنے دل میں بسا رکھا ہے۔“ وہ اداسی سے مسکرایا۔

”جسے چاہو اس کا ساتھ بھی مل جائے، یہ ضروری نہیں ہوتا۔“ اس نے حسرت زدہ سے لہجے میں جواب دیا۔ اسلم سمجھ نہیں سکا کہ اس نے اپنی محرومی بیان کی ہے یا اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

”تو تم مجھے اپنے بارے میں نہیں بتاؤ گے؟“ ماہ بانو نے یک دم ہی سر جھٹک کر اپنی کیفیت سے باہر نکلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”تم اتنا اصرار کر رہی ہو تو بتا دوں گا ورنہ سچ پوچھو تو میں خود بھی یاد نہیں رکھنا چاہتا کہ میں یہاں کس طرح پہنچا۔“

”اگر وہ بات دُہرانے سے تمہیں تکلیف محسوس ہو رہی ہے تو رہنے دو۔ میری طرف سے کوئی زبردستی نہیں ہے۔“ اسلم کا جواب سن کر اس کے تجسس پر جذبۂ ہمدردی غالب آ گیا اور وہ اپنی خواہش سے دست بردار ہو گئی۔

”اپنی زندگی کے اس حادثے کو میں کبھی بھول ہی نہیں سکا اس لیے دُہرانے نہ دُہرانے سے تکلیف کے کم زیادہ ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔“ اس کی آنکھوں میں سرخی سی اترنے لگی۔

”میں اور میری بہن آمنہ اپنے والدین کی بس دو ہی اولاد تھے۔ ہمارے والد تلی تھے۔ جب میں تقریباً تیرہ چودہ سال کا تھا تو ان کا ریل کے ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ میں تھر کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ ہمارے علاقے میں زندگی کی سہولیات کا بہت فقدان ہے۔ یہاں تک کہ پانی جیسی بنیادی ضرورت کی بھی بے حد قلت ہے۔ وہاں لوگ بارش کا پانی ذخیرہ کر کے اسے استعمال کرتے ہیں اور جب یہ ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے تو پھر وہاں لوگوں کا دارومدار جیکب آباد سے آنے والی اس ریل گاڑی پر ہوتا ہے جس میں آٹھ سے دس واٹر ٹینک ہوتے ہیں۔ یہ ریل گاڑی ہر چار دن بعد آتی ہے۔ تم خود سوچو کہ تقریباً ایک ہزار کی آبادی والے اس گاؤں کے لوگوں کے لیے پانی کی اتنی محدود مقدار میں گزارہ کرنا کتنا مشکل ہو گا۔ پانی کی کمی کی وجہ سے ہمارا گاؤں کھنڈر بنتا جا رہا ہے۔ آبادی بھی اسی وجہ سے اتنی گھٹ گئی ہے۔ میرے والد اسی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے اور انہیں اپنے گاؤں سے بہت محبت تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا گاؤں خوش حال ہو اور سدا آباد رہے۔ وہ خود تو ایک معمولی

سے تلی تھے اور جانتے تھے کہ اس حیثیت میں وہ اپنے گاؤں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے اس لیے انہوں نے اپنی ساری امیدیں مجھ سے باندھ لی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں پڑھ لکھ کر کوئی بڑا افسر بن جاؤں اور اپنے گاؤں کے لیے کچھ کروں۔ اپنی محدود آمدنی کے باوجود وہ میری تعلیم پر پوری توجہ دیتے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو مجھے لگا کہ اب ان کا کوئی خواب پورا نہیں ہو سکے گا اور مجھے اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا پڑے گا لیکن اس موقع پر میری ماں اور بڑی بہن نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ وہ دونوں سلائی کڑھائی کے فن میں ماہر تھیں۔ خصوصاً سندھی کڑھائی تو انہیں اتنی عمدہ آتی تھی کہ دیکھنے والے داد دیے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ گاؤں کی کسی دوسری عورت کے ہاتھ میں میری ماں کے ہاتھ جیسی صفائی نہیں تھی اور آمنہ کو بھی ماں سے یہ مہارت ورثے میں ملی تھی۔ ان دونوں نے اپنے اس ہنر کو ذریعۂ معاش بنا لیا۔ وہ دونوں خوب صورت و خوش رنگ کڑھائی والے کپڑے تیار کرتیں اور ایک ایجنٹ کے ذریعے دوسرے شہروں میں بکوا دیتیں۔ ماں، بہن کی دن رات کی محنت کے عوض میری تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ میں نے انٹر کرنے کے بعد کراچی جا کر پڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ میری خواہش تھی کہ میں یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد سی ایس ایس کا امتحان دوں اور کوئی نمایاں پوزیشن حاصل کروں۔ یہ ایک لمبا پروسیجر ضرور تھا لیکن میں سمجھتا تھا کہ میرے والد میرے حوالے سے جو خواب دیکھتے تھے، وہ اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ میں حکومتی مشینری کا حصہ بن جاؤں۔ میری ماں اور بہن نے بھی میرے اس فیصلے کی تائید کی اور یوں میں نے کراچی کے لیے رختِ سفر باندھا۔

”میرے گاؤں سے روانہ ہونے سے قبل میری بہن کی منگنی گاؤں کے ہی ایک لڑکے سے کر دی گئی۔ وہ لوگ ہمارے مقابلے میں خاصے خوشحال تھے اور لڑکا بھی دیکھنے میں معقول لگتا تھا اس لیے میں بہن کے اس رشتے پر بہت خوش تھا۔ شادی کے لیے یہی طے کیا گیا تھا کہ کم سے کم میں بی اے کر لوں تو پھر ہی یہ فریضہ انجام دیا جائے گا۔ میں دل میں بہت سے عزائم لے کر کراچی چلا گیا اور نہایت محنت سے کام لے کر بی اے آنرز کا امتحان فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ میں نے ٹیوشنز کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا تاکہ اپنے اخراجات خود اٹھا سکوں۔ میں اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا تھا بلکہ کچھ رقم جوڑ کر بہن کی شادی کے لیے بھی چند چیزیں خرید لی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ

میرے اخراجات کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ماں نے آمنہ کی شادی کے لیے رقم جوڑنا شروع کر دی تھی، چنانچہ امید یہی تھی کہ ہم عزت کے ساتھ اسے اس کے گھر رخصت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میں نے اپنا ایم اے میں داخلے کا فارم جمع کروایا اور آمنہ کے لیے خریدے گئے تحائف لے کر گاؤں پہنچ گیا۔ میری طرح ماں کا بھی یہی خیال تھا کہ اب آمنہ کی شادی ہو جانی چاہیے۔ اس کے سسرال والوں سے اس سلسلے میں عندیہ لیا گیا۔ وہ لوگ بھی شادی کے لیے تیار تھے لیکن بالکل اچانک ہی انہوں نے ہمارے سامنے جہیز کی ایک لسٹ رکھ دی اور واضح کر دیا کہ شادی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب مطلوبہ اشیا فراہم کی جائیں گی۔ میں اور ماں اس صورتِ حال پر بھونچکے رہ گئے۔ تقریباً تین سال قائم رہنے والی منگنی کو توڑنا بھی آسان نہیں تھا۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ ہم نے محسوس کر لیا تھا کہ آمنہ اس رشتے کو ختم کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ نہیں ہے۔ ایک عام گھریلو لڑکی کی طرح اس نے منگنی ہوتے ہی اپنے سارے خواب اپنے منگیتر سے وابستہ کر لیے تھے۔ منگنی ٹوٹتی تو نہ صرف اسے زبردست دھچکا لگتا بلکہ ہمیں بھی اس کے لیے کوئی دوسرا بر ڈھونڈنے میں بڑی مشکل پیش آتی۔ ایک تو پہلے ہی ہماری روایات کے خلاف اس کی شادی میں بہت تاخیر ہو گئی تھی۔ دوسرے ہمارے ہاں کسی لڑکی کی منگنی ٹوٹ جانا ایک طرح سے اس کا عیب دار ہو جانا تھا۔“

یہاں تک اپنی داستان سنا کر اسلم خاموش ہو گیا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ماہ بانو نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور بھی گہری ہو گئی تھی اور چہرے کی لکیروں میں درد کروٹیں لیتا نظر آ رہا تھا۔ ماہ بانو نے محسوس کیا کہ یہی وہ مقام تھا جہاں سے اسلم کی زندگی نے ایک نیا موڑ لیا ہو گا۔ ایک ایسی بہن جس نے اپنی زندگی کے کئی قیمتی ماہ و سال بھائی کی خاطر محنت کرتے ہوئے گزار دیے تھے، جب زندگی کے نازک ترین دور سے گزر رہی ہو گی تو کیا بھائی کا دل نہیں چاہا ہو گا کہ اب وہ اپنے حصے کا فرض ادا کرے اور بہن کی جھولی خوشیوں سے بھر دے...

”میں نے ماں سے کہا کہ لڑکے والوں سے شادی کے لیے کچھ مہینے کی مہلت لے لو۔ میں کوشش کروں گا کہ اس عرصے میں کہیں سے رقم کا بندوبست کر سکوں۔ ماں نے ایسا ہی کیا۔ لڑکے والے بھی مہلت دینے پر راضی ہو گئے اور میں واپس کراچی لوٹ گیا۔ میری ایم اے کی کلاسز شروع ہو چکی تھیں لیکن ہمیشہ کی طرح میں پڑھائی پر توجہ نہیں دے پا رہا

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ سارا وقت ذہن میں یہی سوال گونجتا رہتا کہ کہاں سے اتنی رقم کا بندوبست کروں کہ بہن کے سسرالیوں کے مطالبات پورے ہوسکیں۔ کبھی خیال آتا کہ تعلیم چھوڑ کر کوئی ملازمت کرلوں لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ ملازمت کر کے بھی میں چند ہزار سے زیادہ جمع نہیں کرسکوں گا جبکہ ضرورت لاکھوں کی تھی۔ ایک دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں کسی سے قرض لے لوں اور بعد میں آہستہ آہستہ اتارتا رہوں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ قرض مانگا کس سے جائے؟ میری اس الجھی ہوئی کیفیت کو سب ہی محسوس کررہے تھے۔ کئی کلاس فیلوز اور ٹیچرز نے مجھ سے پوچھا بھی کہ اسلم کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔ میں سب کو مسکرا کر ٹال جاتا لیکن جب میرے ایک کلاس فیلو راشد ڈوگر نے مجھ سے یہ سوال کیا تو میں اسے ٹال نہیں سکا۔ راشد نے سب کی طرح مجھ سے سرسری لہجے میں یہ سوال نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ زبردستی کینٹے ٹیریا تک لے گیا تھا اور وہاں چائے اور سموسوں سے میری تواضع کرنے کے بعد بڑی ہمدردی سے یہ سوال کیا تھا۔ راشد پڑھنے میں تو بس گزارے لائق تھا لیکن اپنی شوخ اور ہمدرد طبیعت کی وجہ سے سارے ڈپارٹمنٹ میں بہت مقبول تھا۔ اس کے رہن سہن سے لگتا تھا کہ وہ خاصے خوش حال گھرانے کا فرد ہے۔ بعض اوقات یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ اس نے کسی کے پاس رقم نہ ہونے کی صورت میں اس کی سمسٹر فیس جمع کروادی یا کسی اور طرح کی مالی معاونت کردی۔ جب اس نے مجھ سے اتنی ہمدردی سے میرا مسئلہ پوچھا تو مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ راشد سے ہی بہن کی شادی کے لیے قرض مانگ لوں۔ میں نے اسے اپنا مسئلہ بتا دیا اور ساتھ ہی جھجکتے ہوئے قرض کے لیے بھی درخواست کردی۔ میری بات سن کر وہ تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔

”دیکھ جگر! مجھے تجھ سے ہمدردی ہے لیکن میں تجھے اتنی بڑی رقم قرض نہیں دے سکتا۔ آٹھ دس ہزار کی بات ہوتی تو میں تیرے کہنے سے پہلے ہی دے دیتا لیکن ڈیڑھ دو لاکھ بہت ہوتے ہیں۔ میرے ابا کے کوئی کارخانے نہیں چل رہے جو میں اتنی بڑی رقم ہمدردی میں کسی کو تھما دوں۔“ مجھے راشد سے اس طرح کے جواب کی توقع نہیں تھی لیکن اپنی ضرورت کو دیکھتے ہوئے میں نے اس سے گزارش کی کہ وہ مجھے یہ رقم دے دے اور واپسی کے بارے میں فکر نہیں کرے۔ میں تھوڑا تھوڑا کر کے اس کی ساری رقم واپس کردوں گا۔ میری یہ بات سن کر وہ ہنسا اور بولا۔

”تو جتنا عرصہ لگائے گا رقم واپس کرنے میں اتنے عرصے میں تو ہوسکتا ہے میں دوسری دنیا سدھار جاؤں... اور صاف صاف بات ہے میرے بھائی کہ میں اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اس لیے پیسا نہیں کماتا ہوں کہ دوسروں کے کام نکلتے رہیں۔ میں اپنی موج مستی کے لیے ہاتھ پیر چلاتا ہوں۔ تجھے بھی اگر بہن کی شادی کرنی ہے تو خود ہاتھ پیر مار... دوسروں کے آگے رونے گانے مت بیٹھ۔“

اس کا جواب سن کر میرے ذہن میں تجسس پیدا ہوا کہ آخر وہ ایسا کیا کام کرتا ہے جس کے ذریعے اس کی اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ وہ یوں ٹھاٹ باٹ سے رہتا ہے۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ اس کا باپ کوئی بزنس مین یا اعلیٰ عہدے دار ہے لیکن راشد نے خود صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے باپ کے مال پر عیش نہیں کررہا بلکہ اس کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ میں نے اس سے اس کا ذریعۂ آمدنی پوچھا۔ میرا سوال سن کر اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر بولا۔

”اگر میں تجھے اپنے کام کے بارے میں بتا دوں تو کیا تُو وہ کام کرے گا؟“ میں نے کہا کہ بالکل کروں گا کیونکہ مجھے چند مہینوں کے اندر بہن کی شادی کے لیے رقم جوڑنی ہے۔ اس نے پوچھا۔ ”تو اپنی بہن کی خاطر کیا کرسکتا ہے؟“

میں نے جواب دیا کہ بہن کے لیے میں اپنی جان بھی دے سکتا ہوں اس پر وہ ہنس کر بولا۔ ”یہ تو بڑی اچھی بات ہے کیونکہ جو کام میں کرتا ہوں اس میں جان خطرے میں ڈالنی پڑتی ہے۔“

میں حیران ہوا کہ ایسا بھلا کون سا کام ہے۔ میری حیرت دیکھ کر راشد اور بھی زیادہ زور سے ہنسا اور پھر بہت دھیمی آواز میں بولا۔ ”میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ڈاکے مارتا ہوں۔“ اس کی بات سن کر میرا منہ کھلا رہ گیا۔ مجھے لگا کہ شاید مجھے سننے میں کچھ غلطی ہوئی ہے لیکن راشد بالکل سنجیدہ تھا۔ اس نے مجھے کچھ اور کھل کر بتایا کہ وہ اور اس کے ساتھی مل کر لوگوں کے موبائل، پرس اور گاڑیاں چھیننے سے لے کر شاپنگ مالز میں ڈاکے مارنے تک سارے کام کرتے ہیں۔ ظاہر ہے میں ایک شریف لڑکا تھا اور پڑھ لکھ کر سیدھے راستے سے ایک باعزت مقام حاصل کرنے کے خواب دیکھتا تھا۔

فوری ردعمل کے طور پر میں نے اس کے ساتھ شامل ہونے سے انکار کردیا۔ میرا انکار سن کر وہ طنز سے بولا۔ ”ابھی تو تم بہن کی خاطر جان دینے کا دعویٰ کررہے تھے اور اب ایک منٹ میں تمہاری ہوا کھسک گئی۔“ میں نے کہا کہ واقعی میں بہن کی خاطر اپنی جان دے سکتا ہوں لیکن جس طرح کا کام تم کرتے ہو وہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ جواب میں وہ بولا۔

”تو پھر لکھ لو کہ تم اپنی بہن کو اس کے گھر رخصت کر کے نہیں بھیج سکتے۔ اس ایک طریقے کے علاوہ نہ تو تم کسی اور طریقے سے اتنی جلدی اتنی رقم کما سکتے ہو اور نہ ہی کوئی تمہیں اتنا قرض دے گا۔“ اس کا کہنا بھی درست تھا۔ میں چپ سادھ گیا۔ میری خاموشی دیکھ کر وہ بولا۔ ”آج کی رات اچھی طرح سوچ لو جگر! بہن پیاری ہے تو ہمارے ساتھ شامل ہو جانا ورنہ ساری عمر اسے اپنے گھر بٹھا کے رکھنا۔“ میں تب بھی چپ رہا۔ اس نے بھی مجھے مزید نہیں چھیڑا اور چائے سموسوں کا بل ادا کر کے وہاں سے رخصت ہونے لگا۔ جاتے جاتے وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ”اگر تم ہمارے ساتھ شامل ہونا چاہو تو ہم تمہیں کھلے دل سے خوش آمدید کہیں گے لیکن اگر تمہارا موڈ نہ بنے تو جو کچھ ابھی مجھ سے سنا ہے، اسے بھول جانا کیونکہ اگر تم نے زبان کھولنے کی کوشش کی تو پھر ہمیں تمہارے ہمیشہ کے لیے خاموش رہنے کا بندوبست کرنا پڑے گا۔“ اس کا لہجہ اتنا خوف ناک تھا کہ میں اندر سے کانپ گیا۔ مجھ جیسا سیدھا سادہ لڑکا جو کبھی ہاف ٹائم میں اسکول سے نکل کر بھی نہ بھاگا ہو، اس طرح کے آدمی کا بھلا کہاں مقابلہ کرسکتا تھا۔ راشد ڈوگر نے مجھ سے جس لہجے میں بات کی تھی، اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی دھمکی پر عمل کرنے میں بھی دیر نہیں لگائے گا۔ ایک خوش مزاج اور ہمدرد نظر آنے والے شخص کا یہ روپ دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد جب میں شاک سے باہر آیا تو واپس اپنے ہاسٹل چلا گیا۔ سارا دن اور رات میں نے راشد اور اس کی پیشکش کے بارے میں سوچتے ہوئے وقت گزارا۔ ایک طرف میرا دل کہتا تھا کہ جو راہ راشد نے دکھائی ہے وہ غلط ہے اور اس پر چل کر میں اپنی زندگی تباہ کرلوں گا لیکن دوسری طرف بہن کی زندگی کا سوال تھا۔ راشد نے صحیح کہا تھا کہ میں کسی اور طریقے سے بہن کی شادی کے لیے اتنی بڑی رقم حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ میرے انکار کی خواہش کے آگے بہن کی خوشیاں اور اس کی آس بھری نگاہیں دیوار بن کر کھڑی ہوگئیں۔ جب میں گاؤں سے آرہا تھا تو میری بہن کی آنکھوں میں آس کے دیے روشن تھے۔ اسے امید تھی کہ اس کا بھائی اس کی خاطر کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ بس پھر جب مجھے اس کی وہ نگاہیں یاد آئیں تو میری ساری مزاحمت دم توڑ گئی اور میں نے راشد کے ساتھ شامل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے یہ فیصلہ کرتے ہوئے خود کو تسلی دی تھی کہ بس میں اتنا عرصہ ہی ان لوگوں کے ساتھ شامل رہوں گا جتنے عرصے میں بہن کے جہیز کے لیے رقم جمع ہو جائے لیکن میں خود بھی سمجھتا تھا کہ یہ ایک جھوٹی تسلی ہے۔ میں جس گڑھے میں گرنے جارہا ہوں، اس سے زندگی بھر نکل نہیں سکوں گا۔ بہرحال، میں نے اپنے تمام خدشات کو پس پشت ڈال کر راشد کو اپنی رضامندی کے بارے میں بتا دیا۔ وہ میرا فیصلہ سن کر بہت خوش ہوا اور مجھے اپنے دوسرے ساتھیوں سے ملانے لے گیا۔

”شروع کا ایک مہینا ایک طرح سے انہوں نے میری ٹریننگ کی اور مجھ سے چھوٹی موٹی وارداتیں کرواتے رہے۔ ان وارداتوں سے مجھے رقم تو بہت معمولی ملی لیکن مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ میں فطری طور پر ایک بہادر اور نڈر آدمی ہوں۔ میرے ساتھیوں نے بھی یہ بات بھانپ لی چنانچہ جب میں نے ان سے مطالبہ کیا کہ اتنی معمولی رقوم سے میرا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا اور وہ مجھے کسی بڑی واردات میں شامل کریں تو انہوں نے انکار نہیں کیا۔ چند دن بعد ہم نے ایک سپر اسٹور پر کامیاب ڈاکا مارا۔ اس واردات میں میرے حصے میں چالیس ہزار کی رقم آئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر ایسی ہی تین چار وارداتیں اور کرلی جائیں تو بہن کی شادی کے لیے اچھی خاصی رقم جمع ہوسکتی ہے۔ میں نے ماں کو خط لکھ دیا کہ وہ چھ ماہ بعد شادی کی تاریخ لے لے۔ رقم کے سلسلے میں، میں نے اسے یہ بتایا تھا کہ میرا ایک دوست قرض دینے پر تیار ہوگیا ہے۔ ماں کو خط لکھنے کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں سے مطالبہ کیا کہ اب ہمیں جلدی جلدی بڑا ہاتھ مارنا چاہیے۔ گروپ لیڈر اس بات کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کم وقفے سے کی جانے والی بڑی وارداتیں ہمیں مشکل میں ڈال دیں گی۔ وہ سنبھل کر اور ٹھنڈا کر کے کھانے کا قائل تھا لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ راشد بھی یہ بات سمجھتا تھا چنانچہ اس نے بھی گروپ لیڈر پر زور دیا کہ میرے مسئلے کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ عرصے کے لیے وہ لوگ اپنے اصول سے ہٹ کر طریقۂ کار اختیار کرلیتے ہیں۔ آخرکار فیصلہ میرے حق میں ہوا اور یوں ہم نے جلدی جلدی وارداتیں کرنا شروع کردیں۔ بہن کی شادی سے مہینا بھر پہلے ہم نے جو آخری واردات کی، اس سے اچھی خاصی رقم ہاتھ آنے کی امید تھی۔ یہ رقم مل جاتی تو آمنہ کی شادی کے لیے مطلوبہ رقم پوری ہو جاتی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ یہ میری آخری واردات ہوگی اور اس کے بعد میں آئندہ یہ غلیظ کام نہیں کروں گا۔ مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ اگر میں کراچی میں رہا تو میرے ساتھی میری جان نہیں چھوڑیں گے اس لیے میں نے خاموشی سے یہ بھی انتظام کرلیا تھا کہ میرا ٹرانسفر پنجاب

WWW.PAKSOCIETY.COM

یونیورسٹی میں ہو جائے۔ بہن کی محبت میں، میں نے جرم کا راستہ ضرور اپنایا تھا لیکن اپنے حوالے سے اپنے والد کے خواب کو نہیں بھولا تھا۔ راشد اور میرے دوسرے ساتھیوں کو علم نہیں تھا کہ میں کس علاقے کا رہنے والا ہوں اس لیے بھی مجھے یقین تھا کہ میں اپنے منصوبے میں کامیاب رہوں گا لیکن قسمت کی تیز ہواؤں کی زد پر آ کر میرے یقین کی دھجیاں بکھر کر رہ گئیں۔

''میں جس واردات کو اپنی مجرمانہ زندگی کا اختتام سمجھ رہا تھا، وہ درحقیقت میرے ایک مستقل مجرم بننے کا آغاز بن گئی۔ اپنی طرف سے میں نے اور میرے ساتھیوں نے واردات کی پوری منصوبہ بندی کی تھی۔ ہم جس جیولری شاپ کو لوٹنے جا رہے تھے، اس کے گارڈ اور مالک کے پاس اسلحے کی نوعیت تک کا ہمیں اچھی طرح علم تھا۔ ان دونوں افراد کو ہم نے پہلے ہی مرحلے پر کنٹرول کر لیا تھا۔ کوئی بھی واردات کرتے وقت ہم اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ ہمارے ہاتھوں کسی بندے کی جان نہ جائے۔ قتل کی صورت میں جرم کی نوعیت زیادہ سنگین ہو جاتی ہے اس لیے ہم اس عمل سے دور ہی رہتے تھے۔ جیولری شاپ پر بھی ہم اس مقصد میں کامیاب رہے لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہاں موجود گاہکوں میں سے ایک ریٹائرڈ فوجی افسر بھی ہے۔ وہ افسر مسلح تھا۔ ہماری زیادہ توجہ چونکہ جیولری شاپ کے اسٹاف کی طرف تھی اور ہم نے وہاں موجود گاہکوں کو صرف دھمکا دینا ہی کافی سمجھا تھا، اس لیے اس فوجی افسر کو اپنا اسلحہ نکال کر استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کی فائرنگ کی زد میں جو دو افراد آئے، ان میں سے ایک میں تھا۔ ہم دونوں زخمیوں کو چھوڑ کر ہمارے باقی ساتھی افراتفری میں فرار ہو گئے۔ میری ٹانگ پر گولی لگی تھی۔ میں زخمی حالت میں گرفتار ہوا۔ تعاقب میں لگی بدقسمتی نے اس موقع پر مجھ پر ایک وار اور کیا۔ انہی دنوں میری بہن کا منگیتر اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ کراچی گھومنے پہنچ گیا۔ اس نے نیوز چینلز پر چلنے والی خبروں میں مجھے دیکھ کر شناخت کر لیا اور گاؤں واپس جا کر یہ خبر اپنے گھر پہنچانے کے ساتھ ساتھ پورے گاؤں میں پھیلا دی۔ اس موقع پر وہ لوگ جن کی کمینگی کی وجہ سے میں جرم کی راہ پر چلنے پر مجبور ہوا تھا، سب سے زیادہ عزت دار بن گئے اور انہوں نے یہ کہہ کر منگنی ختم کر دی کہ ہم ایک ڈاکو کی بہن کو اپنے گھر کی بہو نہیں بنا سکتے۔ ایک تو میری مجرمانہ زندگی اور گرفتاری کی خبر نے ہی میری ماں بہن کو ہلکان کر دیا، دوسرے رشتہ ٹوٹ گیا۔ میری بہن نے اس بات کا اتنا صدمہ لیا کہ برداشت نہیں کر سکی اور خودکشی کر لی۔ مجھے حوالات میں اپنی بہن کے مرنے کی اطلاع ملی اور میں نے درخواست کی کہ مجھے ایک بار اپنے گھر جانے کی اجازت دی جائے۔

''میرے کیس کا تحقیقاتی افسر اچھا آدمی تھا۔ میری داستان سن کر اسے افسوس بھی بہت ہوا تھا۔ اس کی خصوصی کوشش سے مجھے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ میں پولیس کی نگرانی میں جب اپنے گاؤں پہنچا تو میری بہن کی تدفین ہو چکی تھی۔ میں نے چاہا کہ ماں کے گلے لگ کر اس کے ساتھ اس غم پر آنسو بہا سکوں اور اس سے اپنے کیے کی معافی مانگوں لیکن ماں نے مجھ سے ملنا گوارا نہیں کیا اور میں اپنے ہی گھر کی دہلیز سے واپس لوٹا دیا گیا۔ جب میں وہاں سے مایوس پلٹ رہا تھا تو مجھے اپنی بہن کا منگیتر اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ کھڑا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اس نے میری یہ حرکت نوٹ کر لی اور جواب میں اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر مجھ پر پھبتیاں کسنے لگا۔ میں پہلے ہی غم و غصے کا شکار تھا چنانچہ برداشت نہیں کر سکا اور اس پر حملہ کر بیٹھا۔ میرے ساتھ آئے ہوئے پولیس کے سپاہی جب تک مجھے سنبھالتے، تب تک میں اس خبیث کو اپنے ہاتھوں میں پڑی زنجیر سے گلا گھونٹ کر ختم کر چکا تھا۔ اس شخص کو ٹھکانے لگانے کے بعد میں وہاں سے فرار ہو گیا اور کئی دن تک بھوکا پیاسا ویرانوں میں بھٹکتا رہا۔ ایک دن جبکہ میں بھوک اور پیاس سے نڈھال ایک سنسان جگہ پر درخت کی چھاؤں میں لیٹا تھا کہ ایک آدمی وہاں چلا آیا۔ میری حالت دیکھ کر وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں اس نے مجھے کھلایا پلایا اور مجھ سے میرے حالات دریافت کیے۔ میں ذہنی طور پر اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اس کی ذرا سی ہمدردی پا کر اسے اپنا سارا احوال کہہ سنایا۔

''میری داستان سن کر وہ بولا کہ اب تمہارا واپس جانا تو ممکن نہیں ہے اگر واپس جاؤ گے تو قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر پھانسی پر چڑھ جاؤ گے اور تمہاری بوڑھی ماں کو جوان بیٹی کے بعد بیٹے کی موت کا صدمہ بھی اٹھانا پڑے گا اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم واپس جانے کے بجائے کسی طاقتور آدمی کی پناہ میں چلے جاؤ۔ اس آدمی نے مجھے بتایا کہ اس کے کچھ ایسے لوگوں سے روابط ہیں جو مجھے اپنے پاس پناہ دے سکتے ہیں۔ پھر اس نے اپنے ذرائع استعمال کر کے مجھے خاموشی سے سندھ سے نکال کر پنجاب پہنچا دیا۔ یہاں پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ میں جرم کے جس تالاب میں گرا تھا، اب اس سے نکل کر سمندر میں پہنچ گیا ہوں۔ قسمت نے مجھ سے عجیب مذاق کیا تھا۔ میں اپنا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے کراچی سے نکل کر پنجاب یونیورسٹی میں ٹرانسفر کروانے کا سوچ رہا تھا اور ٹرانسفر ہو گیا جرائم کی یونیورسٹی میں۔ اپنی کم اعصاب زدگی میں، میں نے اس صورتِ حال کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور ان ڈاکوؤں کے ساتھ شامل ہو گیا۔'' اپنی داستان کے اختتام پر اسلم کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے جنہیں ماہ بانو سے چھپانے کے لیے وہ رخ موڑ کر بیٹھ گیا۔

''اور تمہاری ماں... تمہیں ان کی کچھ خبر ہے؟'' اس کے لیے دل میں گہرا درد محسوس کرتے ہوئے ماہ بانو نے اس سے پوچھا۔

''وہ زندہ ہے یہ مجھے معلوم ہے لیکن میں گاؤں سے فرار ہونے کے بعد اس کی شکل دوبارہ نہیں دیکھ سکا۔ جس شخص کو میں نے قتل کیا تھا، اس کے گھر والے قسم کھا کر بیٹھے ہیں کہ اگر میں ان کے ہاتھ لگ گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں ان کی اس دھمکی سے تو خیر نہیں ڈرا اور ایک بار رات کی تاریکی میں گاؤں پہنچ گیا کہ کسی طرح ماں سے مل سکوں لیکن ماں نے اس وقت بھی مجھے مایوس لوٹا دیا۔ وہ بہت ضدی عورت ہے اور عہد کر کے بیٹھی ہے کہ جیتے جی نہ مجھے اپنی شکل دکھائے گی اور نہ ہی میری شکل دیکھے گی۔ ماں کی اس ضد کی وجہ سے میں دوبارہ گاؤں کا رخ کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اب بری بھلی جیسی بھی میری ان لوگوں کے ساتھ گزر رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی تاریک رات جب میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ واردات کے لیے نکلوں تو پھر واپس نہ آ سکوں اور جرم کی اس دنیا سے نکل کر موت کی آغوش میں سکون سے سو جاؤں۔'' پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ یہ جملے ادا کرتے ہوئے اسلم کے چہرے پر اتنا درد تھا کہ ماہ بانو کو اپنا دل کٹتا ہوا محسوس ہوا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کیا اسلم جیسا شخص واقعی اس بات کا حق دار ہے کہ تاریک راہوں میں خاموشی سے مارا جائے؟

☆☆☆
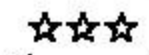
''تجھے کس نے کہا تھا یہ سب کرنے کو؟ وڈے ارمان پھوٹ رہے تھے تیرے دل میں؟'' فریدہ جب سیڑھیوں سے گری یا گرائی گئی تو اس وقت چودھری حویلی میں موجود نہیں تھا۔ منصوبہ بندی کرنے والوں نے اس بات کا خاص طور پر خیال بھی رکھا تھا لیکن قدرت کو ان کی چال ناکام بنانا منظور تھی کہ ادھر فریدہ لڑھکتی ہوئی آخری سیڑھی تک پہنچی، ادھر چودھری کی گاڑی حویلی میں داخل ہوئی۔ حویلی میں ہنگامہ بپا تھا اور ظاہری طور پر سب بڑے پریشان نظر آ رہے تھے لیکن کوئی بھی یہ کوشش نہیں کر رہا تھا کہ فریدہ کو فوری طبی امداد پہنچ سکے۔ چودھری وہاں پہنچا تو فریدہ کو اس حال میں دیکھ کر اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ جو کچھ ہوا، وہ اس کے لیے مشکل کھڑی کر سکتا تھا۔ فریدہ اسے پہلے ہی دھمکی دے چکی تھی کہ اس کی حادثاتی موت کی صورت میں اس کے ہمدرد متحرک ہو جائیں گے اور چودھری کو کہیں کا نہیں چھوڑیں گے۔ اس دھمکی کے باعث وہ خود چاہنے کے باوجود فریدہ کے خلاف کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اب جو یہ منظر دیکھا تو اسے اپنی فکر پڑ گئی۔ فوری طور پر اس نے ڈاکٹر ماریا کو فون کر کے صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے حویلی پہنچنے کی درخواست کی۔

ڈاکٹر ماریا شادی کے سلسلے میں چند چھٹیاں کرنے کے بعد دوبارہ مرکزِ صحت پر ڈیوٹی دینے آنے لگی تھی۔ چودھری کا فون ملتے ہی وہ فوراً حویلی پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ ایک مڈوائف بھی تھی اور وہ ضرورت کا تمام دستیاب سامان بھی اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ اس وقت وہ مڈوائف کے ساتھ حویلی کے ایک کمرے میں فریدہ کی جان بچانے کی کوشش میں مصروف تھی جبکہ باہر چودھری وڈی چودھرائن سے الجھ رہا تھا۔

''میں نے کچھ نیا تو نہیں کیا چودھری صاحب! حویلی کی ریت ہے یہ۔ بھلے سے فریدہ آپ کے دشمن کی بہن ہے لیکن بہزاد شاہ تو حویلی کے وارثوں میں سے ہے۔ بے شک اسے ہوش نہیں پر ہمیں تو ہوش ہے نا کہ اس کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے۔ میرے لیے تو وہ اپنے مراد شاہ کی طرح ہی ہے۔ بھلے آپ یقین کرو نہ کرو لیکن میں نے کبھی مراد شاہ اور بہزاد شاہ میں فرق نہیں سمجھا ہے۔ اگر بہزاد شاہ کی ماں زندہ ہوتی تو ہور گل تھی لیکن ابھی تو مجھے ہی ساری رسمیں ریتیں پوری کرنی تھیں، پر مجھے کیا ملوم تھا کہ ایسی مصیبت سر پر آ پڑے گی... ہور کڑی سیڑھیوں سے گر جائے گی۔''

وہ چونکہ سب کچھ طے شدہ منصوبے کے مطابق کر رہی تھی اس لیے اسے چودھری کے سامنے وضاحتیں پیش کرنے میں مشکل پیش نہیں آئی۔ چودھری کا عین وقت پر حویلی پہنچ جانا البتہ اس کے منصوبے کے خلاف تھا ورنہ وہ فریدہ کو طبی امداد تو ضرور پہنچاتی لیکن اتنی تاخیر سے کہ پھر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اب بھی وہ پُرامید تھی کہ اسے کامیابی حاصل ہو گی اور بے شک فریدہ کی جان بچ جائے لیکن اس کی کوکھ میں پلتا بچہ نہیں بچ سکے گا۔ اس کی اصل دشمنی بھی اس بچے سے تھی۔ وہ زندہ رہتا تو اس کی اولاد کے ساتھ جائیداد کا وارث اور حصے دار ٹھہرتا جبکہ وہ کسی صورت اپنی اولاد کے سوا کسی اور کو اس جائیداد پر عیش کرتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"میرے سر پر دس مصیبتیں پڑی ہیں، ہور تجھے رسموں رتوں کی پڑی ہے۔ کیا دیا ہے مجھے حویلی کے ان وارثوں نے۔ ایک کو کسی گل کا ہوش نہیں ہے، ہور دو جا بیوی بچوں کے ساتھ امریکا جا کر بیٹھ گیا ہے۔ دو دھیاں عزت سے بیاہ دی تھیں اور تیسری کے لیے سوچا تھا کہ اس کے جوڑ کا برخاندان میں نہیں تو کوئی گل نہیں۔ میرے نال کوئی کمی تو ہے نہیں کہ دھی کو کھلا پہنا نہ سکوں۔ حویلی میں عیش سے رہ کر ساری حیاتی گزار لے گی لیکن وہ تو میری ناک ہی کٹوا کر چلی گئی۔ جب تک میں اسے ہور اس کے اس نامراد عاشق کو پکڑ کر ٹوٹے ٹوٹے نہیں کر ڈالتا، اس حویلی پر ساری خوشیاں حرام ہیں۔ کان کھول کر سن لے چودھرائن کہ اب یہاں خوشی کے شادیانے تب ہی بجیں گے جب کشور کا جنازہ اٹھے گا۔" غضب ناک چودھری نے حکم صادر کیا۔

"ہاں چودھری صاحب جو آپ کا حکم۔" چودھرائن نے فرماں برداری کا مظاہرہ کیا لیکن اس وقت درحقیقت اس کا ذہن اس کمرے کی طرف لگا ہوا تھا جہاں فریدہ اور اس کے بچے کی زندگی کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ دوسری طرف چودھری دُہرے ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ اسے کشور اور آفتاب کے سلسلے میں مہک بک شاپ کا جو کلیو ملا تھا، وہ بے کار گیا تھا۔ اس کے آدمی بک شاپ کے مالک شفیق کی جان لے کر بھی کچھ معلوم نہیں کر پائے تھے۔ مالک کے علاوہ انہوں نے دکان کے ملازمین کو بھی کھنگالا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی ماسٹر آفتاب نامی شخص سے واقف نہیں تھا۔ اس کے آدمیوں نے بک شاپ کے مالک کی بیٹی مہک کی نگرانی کر کے بھی دیکھ لیا تھا کہ اگر آفتاب ان لوگوں کا واقف کار ہے تو شفیق خان کی موت پر اس کی بیٹی سے تعزیت کرنے ضرور آئے گا لیکن یہ نگرانی بھی بے سود گئی تھی۔ آفتاب گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔

ان حالات میں چودھری اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ یا تو اسے ملنے والا کلیو غلط تھا یا پھر آفتاب کوئی اور نام اختیار کر کے رہ رہا تھا جس کی وجہ سے کوئی اسے نام سے شناخت نہیں کر پا رہا تھا۔ حقیقت جو بھی تھی لیکن وہ اپنی ناکامی پر بُری طرح بلبلایا ہوا تھا۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ آفتاب اور کشور اس کے چنگل میں آتے آتے بچ نکلے تھے۔ قسمت ان دونوں کا ساتھ دے رہی تھی اس لیے وہ ہر بار ہاتھ آتے آتے رہ جاتے تھے۔ دوسری طرف وہ ماہ بانو کے حویلی سے غائب ہو جانے پر برافروختہ تھا۔ اسے ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ وہ حویلی سے نکلنے میں کس طرح کامیاب ہوئی۔ جن ملازمین نے اسے نکلنے میں مدد دی تھی، وہ مُردہ پائے گئے تھے۔ چودھری اپنا غصہ ان ملازمین کے بچوں کو بے عزت کر کے ان کی ہلاکت کی صورت میں ہی نکال سکا تھا لیکن ماہ بانو کا پتا ہنوز نہیں چل سکا تھا اور اب یہ فریدہ کی مصیبت سر پر آ پڑی تھی۔ عام حالات میں اسے فریدہ یا اس کے بچے کی موت زندگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن فریدہ کی دھمکی تلوار کی صورت اس کے سر پر لٹکی ہوئی تھی۔ وہ کسی صورت میڈیا کی یلغار کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"مبارک ہو چودھری صاحب! آپ کے ہاں پوتا ہوا ہے اور فریدہ کی زندگی بھی بچ گئی ہے۔" چودھری اور وڈی چودھرائن اپنی اپنی فکروں اور سوچوں میں غلطاں کسی خبر کے منتظر بیٹھے تھے کہ ڈاکٹر ماریا نے وہاں آ کر مسکراتے ہوئے انہیں اطلاع دی۔ اس اطلاع پر جہاں چودھری نے سکون کا سانس لیا، وہیں چودھرائن کے سینے میں آگ لگ گئی لیکن وہ اپنے دلی جذبات چھپاتے ہوئے منافقانہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"مبارک ہو چودھری صاحب! آپ کی نسل جاری رکھنے والا ایک ہور پتر آ گیا۔ میں ابھی منشی جی کو کہلواتی ہوں کہ درگاہ پر صدقے کی دیگیں چڑھوا دیں۔" وہ جوش و خروش سے اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

"آپ کو جو کچھ کرنا ہے کریں لیکن میں آپ پر واضح کر دوں کہ ماں اور بچے کی جان ابھی مکمل طور پر خطرے سے باہر نہیں ہے۔ فریدہ کا خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے جبکہ بچہ چونکہ پری میچور ہے اس لیے اسے ابھی بہت زیادہ کیئرکی ضرورت ہے۔ مجھ سے وقتی طور پر جو کچھ ہو سکتا تھا، وہ میں کر چکی ہوں لیکن اب آپ کو فوری طور پر ماں اور بچے کو کسی بڑے اسپتال میں شفٹ کرنا ہوگا۔ دونوں کی زندگی بچانے کے لیے یہ بہت اہم ہے۔ دیر کرنے کی صورت میں کوئی بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔" چودھرائن کے جوش و خروش کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ڈاکٹر ماریا نے براہِ راست چودھری کی طرف رخ کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں اسے بتایا۔

"میں ابھی گڈی نکلواتا ہوں۔" اس کی بات سن کر چودھری جلدی سے بولا۔

"اس کے مقابلے میں ایمبولینس زیادہ بہتر رہے گی۔ اس میں آکسیجن سلینڈر اور فوری طبی امداد کا دوسرا سامان موجود ہے۔ راستے میں اگر کوئی پریشانی پیش آئی تو اس سے نمٹا جا سکے گا۔" ماریا نے مشورہ دیا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسا آپ کہیں۔" چودھری کے لیے فریدہ کی زندگی بہت اہم تھی۔

"اور ہاں... خیال رہے کہ فریدہ کے ساتھ اسپتال میں آپ کا کوئی قابلِ اعتماد شخص رہے۔ فریدہ نے شک ظاہر کیا ہے کہ اس کے ساتھ ہونے والا حادثہ اس کے قتل کی سازش بھی ہو سکتی ہے اور آئندہ کے لیے بھی وہ اپنی اور اپنے بچے کی جان خطرے میں محسوس کر رہی ہے۔" یہ جملے کہتے ہوئے ڈاکٹر ماریا کی نظریں چودھری اور وڈی چودھرائن دونوں کے چہروں پر بھٹک رہی تھیں۔ اپنی اپنی جگہ احساسِ جرم میں مبتلا وہ دونوں ہی اس سے نظریں چرا گئے۔ ڈاکٹر ماریا جن دو افراد سے فریدہ کے تحفظ کے لیے اقدامات کرنے کو کہہ رہی تھی، درحقیقت اسے ان دونوں سے ہی سب سے زیادہ خطرہ لاحق تھا لیکن ان دونوں کی فریدہ سے مخاصمت کی وجوہات اتنی مختلف تھیں کہ دونوں ہی ایک دوسرے پر اسے ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔

☆☆☆
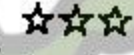
راحیلہ سکتہ زدہ سی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی اور بے یقینی کے عالم میں اس کاغذ کو دیکھ رہی تھی جو اس کے دائیں ہاتھ میں موجود سفید لفافے سے نکلا تھا۔ یہ لفافہ کچھ دیر قبل ہی ایک ویٹر دے کر گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس لفافے میں اس کے لیے کوئی پیغام ہے اور وہ حیران رہ گئی تھی کہ یہاں کون اسے پیغام بھیج سکتا ہے؟ اس کی اس ہوٹل میں موجودگی کا علم تو اس کے ماں باپ کو بھی نہیں تھا۔ بہرحال، اس نے ویٹر سے لفافہ وصول کر لیا تھا کہ لفافے پر واضح طور پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ لفافہ کھول کر اس نے اس میں تہ کر کے رکھا گیا کاغذ کھولا تو تحریر پڑھے بغیر ہی جان گئی کہ اسے یہ پیغام بھیجنے والا اس کا بھائی ڈاکٹر طارق ہے۔ لفافے کے اوپر لکھے نام سے اس نے طارق کی لکھائی کو اس لیے شناخت نہیں کیا تھا کہ وہ اس بات کی توقع ہی نہیں کر رہی تھی کہ برابر والے کمرے میں مقیم طارق اسے کوئی تحریری پیغام بھیج سکتا ہے لیکن اب چند لفظوں کے مقابلے میں باقاعدہ کئی سطور لکھی دیکھ کر تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ طارق کی لکھائی کو شناخت نہ کر سکے۔ گھر میں وہی طارق سے سب سے زیادہ قریب تھی اور اپنی تعلیم سے لے کر دوسرے تمام معاملات تک اسی سے مدد ملتی تھی۔ طارق بھی اسے عموماً اپنے ساتھ ساتھ رکھنا پسند کرتا تھا۔

دونوں بہن بھائی کی اس قدر قربت کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ کراچی چھوڑ کر یہاں اسلام آباد تک آ گئی تھی اور ہوٹل کے اس کمرے میں تقریباً قیدیوں کی سی زندگی گزار رہی تھی۔ طارق نے اس سے یہی کہا تھا کہ اس کا غیر ضروری طور پر باہر نکلنا ان کے لیے مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ یہ شاید زندگی میں پہلا موقع تھا کہ طارق اسے کچھ بھی کھل کر نہیں بتا رہا تھا۔ اس کا انداز بہت پُراسرار تھا اور اب اس نے اسے یہ خط بھیج دیا تھا۔ راحیلہ نے اس کی اس حرکت پر حیران ہوتے ہوئے خط کے الفاظ پڑھے اور مزید حیران ہو گئی طارق نے لکھا تھا۔

"ڈیئر سس!

تم مجھے اپنی ذہانت اور سمجھداری کی وجہ سے ہمیشہ بہت عزیز رہی ہو۔ تم نے کبھی میرے لیے کوئی مشکل کھڑی نہیں کی بلکہ ہمیشہ مجھے تم سے مدد ہی ملی ہے۔ یہ آخری مدد تم نے میری کی ہے، اس کے لیے میں تہ دل سے تمہارا مشکور ہوں کیونکہ اگر یہ سب نہیں ہوتا تو مجھے اپنا مستقبل بنانے کا ایسا سنہری موقع نہ ملتا اور میں فوری طور پر یہاں سے امریکا روانہ ہونے کے قابل نہیں ہو پاتا۔ تم شاید میری بات پوری طرح سمجھ نہیں پا رہی ہو گی... تو چلو میں تمہاری الجھن دور کر دیتا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا جانے کا کتنا شوق تھا۔ میرے اس شوق کی راہ میں وسائل کی کمی رکاوٹ بن کر کھڑی تھی۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے میں نے بڑے ہاتھ پیر مارے، یہاں تک کہ لڑکیوں کی خریداری کرنے والے ایک آدمی کو لڑکیاں سپلائی کرنا تک منظور کر لیا۔ تمہیں میرے ساتھ جاب کرنے والی وہ نرس تو یاد ہو گی جس کی بہن ہمارے گھر آئی تھی اور جس نے دعویٰ کیا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن میرے ساتھ ڈنر پر گئی تھی لیکن واپس گھر نہیں آئی۔ میں نے اس عورت کو غلط قرار دے کر گھر سے روانہ کر دیا تھا لیکن درحقیقت وہ عورت غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ میں نے اس کی بہن کو سپلائی کر دیا تھا لیکن وہ شخص بڑا بے ایمان نکلا اور طے شدہ رقم سے آدھی رقم دے کر مجھے ٹال دیا۔ میں اس کے خلاف کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا اس لیے خاموشی اختیار کرنی پڑی لیکن مجھے کسی نہ کسی طرح باہر تو جانا ہی تھا۔ انہی دنوں تم مہرین کو اپنے ساتھ لے کر گھر آنے لگیں۔ مجھے وہ لڑکی اچھی لگی۔ وہ بہت خوب صورت اور پُرکشش تھی اور میں نے سوچا تھا کہ اسے بھی اپنے جال میں گرفتار کر کے اس آدمی تک پہنچا دوں گا لیکن اس بار میں سودے میں دھوکا نہیں کھانا چاہتا تھا اس لیے مہرین کی تصویریں دکھا کر پہلے ہی اس سے آدھی رقم وصول کر لی تھی۔ باقی آدھی رقم کے لیے میں مہرین کو اپنے جال میں جکڑتا، اس سے قبل ہی حادثاتی طور پر یہ بات علم میں آ گئی کہ وہ لڑکی درحقیقت مہرین نہیں، ماہ بانو ہے اور ایک وڈیرے

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے بچنے کے لیے مہرین بن کر یہاں چھپی ہوئی ہے۔ میں نے اس وڈیرے سے رابطہ کیا اور بھاری رقم کے عوض اسے مہرین یا ماہ بانو جو بھی کہہ لو، اس کا پتا بتا دیا۔ تم نے بھی میرے ساتھ ہی ماہ بانو کی داستان سنی تھی اس لیے یہ بھی جانتی ہو گی کہ ماہ بانو کی پشت پر بھی ایک بااثر شخصیت موجود تھی۔ اس شخصیت سے بچنے کے لیے ہی میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک میں ملک سے باہر نہیں نکل جاتا، تب تک ہمارا چھپ کر رہنا ضروری ہے۔

تمہیں میں اس لیے اپنے ساتھ لے آیا تھا کہ تمہارے ذریعے ان لوگوں کو یہ علم ہو سکتا تھا کہ میں ملک سے باہر جانے کے چکر میں ہوں۔ وہ میرا نام ای سی ایل میں ڈلوا دیتے تو مجھے بڑی مشکل ہو جاتی۔ اب جبکہ تمام مراحل بہ خیر و خوبی طے ہو گئے ہیں اور میں صبح تمہارے جاگنے سے پہلے روانہ ہو چکا ہوں گا تو تمہارے لیے میرا یہی مشورہ ہے کہ فوری طور پر گھر کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ ہوٹل کا بل میں نے جمع کروا دیا ہے۔ تمہارے پاس اتنی رقم بھی ہے کہ اسلام آباد سے کراچی تک کا سفر بہ آسانی کر سکو۔ وہاں جا کر تم میرا یہ خط سب کو دکھا سکتی ہو، اس طرح تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ رہا میں تو مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ میرا اب بھی واپس پاکستان آنے کا ارادہ نہیں ہے۔ تمہارے بے حد تعاون کے لیے ایک بار پھر شکریہ۔

یور لونگ برادر

ڈاکٹر طارق...''

شروع سے آخر تک سارا خط کئی بار پڑھنے کے بعد بھی راحیلہ کی حیرانی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ طارق کے اعترافات نے اسے سُن کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ خود غرض ہے، یہ بات وہ پہلے بھی جانتی تھی لیکن اس خود غرضی میں وہ اپنی سگی بہن کو بھی استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرے گا، یہ بات وہ پہلے بھی نہیں سمجھ پائی تھی۔ طارق کا کہنا تھا کہ کامیابی کے لیے کچھ بھی کر گزرو تو واقعی وہ اپنی اس بات پر عمل کر گیا تھا۔ وہ خود بھی کافی حد تک طارق کے اس مقولے پر عمل کرتی تھی۔ ماہ بانو سے دوستی بھی اس نے اپنی غرض سے کی تھی۔ ماہ بانو کے کالج جوائن کرنے کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں اس نے یہ بات جان لی تھی کہ وہ ایک محنتی اور ذہین طالبہ ہے چنانچہ اس نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ اس دوستی سے بھرپور استفادہ کر سکے گی اور نوٹس وغیرہ تیار کرنے کی زحمت سے بچ جائے گی۔ اس دوستی کو مزید گہرا کرنے اور اس پر اپنا اعتماد زیادہ سے زیادہ قائم کرنے کے لیے وہ اسے لے کر اپنے گھر بھی چلی گئی تھی۔ یہ وہی گھر تھا جوان کے ایک عزیز ملک سے باہر جاتے وقت وقتی طور پر انھیں دے گئے تھے اور اس گھر میں صرف وہ اور طارق رہائش پذیر تھے۔ ان کے والد نے اس گھر میں قیام کرنا پسند نہیں کیا تھا۔ وہ تو صرف بھائی کی محبت اور اچھے گھر میں رہنے کے شوق میں وہاں آ گئی تھی لیکن طارق یقیناً اس لیے وہاں رہ رہا تھا کہ لڑکیوں کو اپنی اچھی مالی پوزیشن دکھا کر متاثر کر سکے تاکہ وہ آسانی سے اس کے جال میں پھنس جائیں۔

بہرحال وہ ایک آدھ بار سے زیادہ ماہ بانو کو اپنے ساتھ گھر لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی لیکن پہلی ملاقات کے بعد ہی طارق نے اس سے اصرار شروع کر دیا کہ وہ اپنی سہیلی کو اپنے ساتھ وہاں لایا کرے۔ اس کے اس اصرار پر اسے خیال گزرا تھا کہ ماہ بانو اسے پسند آ گئی ہے لیکن اب سمجھ آ رہا تھا کہ وہ اسے پسند تو واقعی آ گئی تھی لیکن پسندیدگی کی وجہ کچھ اور تھی۔ وہ اسے بھی اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر کہیں فروخت کرنے کا سوچ رہا تھا لیکن یہ اتفاق ہی ہوا کہ ان کے علم میں یہ بات آ گئی کہ وہ کسی چودھری سے ڈر کر بھاگی ہوئی ہے چنانچہ طارق نے اپنا منصوبہ بدل لیا اور چودھری سے سودے بازی کر لی۔

وہ ان سب باتوں سے واقف نہیں تھی لیکن جب طارق نے اچانک ہی اسے اپنے ساتھ اسلام آباد چلنے کو کہا اور گھر والوں کو بتانے سے بھی منع کر دیا تو وہ چونک پڑی اور اسے اندازہ ہو گیا کہ طارق سے کوئی غلط حرکت سرزد ہوئی ہے۔ وہ طبیعتاً کافی نڈر تھی اس لیے نہ تو گھبرائی اور نہ ہی ساتھ جانے سے انکار کیا۔ اس کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ بھائی کا ساتھ دے کر وہ اس کا اعتماد جیت سکتی ہے تاکہ آنے والے وقت میں بھائی بھی اسے فائدہ پہنچاتا رہے لیکن بھائی اس کی توقعات سے بڑھ کر خود غرض ثابت ہوا اور اسے اس اجنبی شہر میں تنہا چھوڑ کر خود اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے امریکا چل پڑا۔ اس کی اس خود غرضانہ روش پر وہ کچھ دیر تو بے حس و حرکت بیٹھی حیران ہوتی رہی لیکن پھر آخرکار اسے حرکت میں آنا پڑا۔ وہ ہوٹل کے اس کمرے میں تنہا زیادہ دیر تک نہیں رک سکتی تھی۔ اسے واپس اپنے گھر جانا تھا۔ وہ گھر... جو بہت چھوٹا تھا اور اس کے باپ نے اپنی حلال کی کمائی سے بنایا تھا لیکن اس کے بڑے بڑے خواب اس چھوٹے سے گھر میں نہیں سما پائے تھے۔

☆☆☆

''لیجیے یہ ہے آپ کا نیا گھر۔'' دو کمروں کے ایک کشادہ سے صحن والے مکان پر ایک پُرسکون نظر ڈال کر

مسکراتے ہوئے آفتاب نے کشور سے کہا تو اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے نقاہت زدہ چہرے پر یہ مسکراہٹ اور بھی عجیب لگی۔ وہ جس حادثے سے گزری تھی، اس میں اس کی اور بچے کی جان تو بچ گئی تھی لیکن اس کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑا تھا۔ وہ بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد پڑ جانے والے سیاہ حلقے اور پچکے ہوئے رخسار اس کی اس کمزوری کی گواہی دیتے تھے۔ ڈاکٹرز نے اس کے لیے ڈلیوری تک مکمل بیڈ ریسٹ تجویز کیا تھا لیکن وہ لوگ جس مشکل کا شکار تھے، وہ انھیں ایک جگہ سکون سے ٹکنے بھی تو نہیں دیتی تھی۔ چودھری کے گرگوں کے پنڈی تک پہنچ جانے کے بعد وہ پنڈی یا اس کے گرد و نواح میں کہیں بھی رہنے میں خطرہ محسوس کر رہے تھے چنانچہ شہریار کی تجویز قبول کرتے ہوئے سندھ کا رخ کیا اور اب وہ دونوں میرپور خاص میں موجود تھے۔ یہاں تک آنے کے لیے کشور کو پہلے برقع میں ملبوس کراچی تک بائی ایئر سفر کرنا پڑا تھا اور وہاں سے آگے آفتاب اسے ایک جدید سہولیات سے لیس ایمبولینس میں لے کر بائی روڈ یہاں پہنچا تھا۔ گھر کا انتظام کرنے میں شہریار نے اس کی مدد کی تھی اور اپنے کسی ذریعے سے اس کے لیے یہ گھر حاصل کر کے اسے اطلاع دے دی تھی۔ شہر کی حدود میں داخل ہونے کے بعد آفتاب نے اس شخص سے فون پر رابطہ کیا جس کا نمبر اسے شہریار نے دیا تھا۔ اس شخص نے اسے گورنمنٹ گرلز کالج تک پہنچنے کی ہدایت کی اور پھر وہاں سے ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر اس گھر تک پہنچا دیا۔

اس شخص کے روانہ ہوتے ہی کشور نے چہرے پر پڑا نقاب اتار کر پھینکا اور ایک چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔ چارپائی پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ باقی گھر بھی اچھی حالت میں تھا اور وہاں ضرورت کی تمام بنیادی چیزیں موجود تھیں۔ یہ سارا انتظام آفتاب کی استدعا پر کیا گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کشور کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ گھر کا انتظام و انصرام سنبھال سکے۔ وہ خود بھی اس جھنجٹ میں الجھنا نہیں چاہتا تھا اس لیے کچھ زائد رقم خرچ کرنا مناسب سمجھا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کی کتاب کا سیکنڈ ایڈیشن شائع کرنے کا بھی پبلشر نے حال ہی میں ایگریمنٹ کیا تھا اس لیے اسے رقم کی طرف سے زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ اب وہ یکسو ہو کر اپنے کالمز کے ساتھ ساتھ ناول کی تکمیل کا ارادہ رکھتا تھا۔ ناول اختتامی مراحل میں تھا اور اسے پوری امید تھی کہ بچے کی دنیا میں آمد سے قبل اشاعت کے لیے پریس میں چلا جائے گا۔ اس کا پبلشر رائلٹی کا چیک تو مسودہ ہاتھ میں آتے ہی اسے تھما دیتا چنانچہ اسے بے فکری تھی کہ بچے کی پیدائش کے بعد اخراجات کا کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔

اس وقت تو اس کے پیشِ نظر سب سے اہم مسئلہ کشور کی صحت اور زندگی کا تھا چنانچہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ بے فکری اور آرام مہیا کرنا چاہتا تھا۔ اب بھی وہ خود اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے اسکواش کا ٹھنڈا گلاس تیار کر کے لایا تھا اور گلاس اسے تھماتے ہوئے اس سے خوش گوار لہجے میں یہ جملہ کہا تھا لیکن جواب میں کشور کی مسکراہٹ بہت عجیب تھی۔

''شاید آپ کو یہ گھر پسند نہیں آیا؟'' اس کی مسکراہٹ سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''عارضی ٹھکانے کے لیے پسند ناپسند کا کیا سوال؟ میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ جسے آپ میرا نیا گھر کہہ رہے ہیں، جانے مجھے اس میں کتنے دن رہنا نصیب ہو گا۔ زندگی نے عجیب ہی موڑ لیا ہے۔ کہاں تو حویلی کی چار دیواری سے باہر نکلنا نصیب نہیں ہوتا تھا اور کہاں اب سارا وقت اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنا پڑتا ہے۔ آپ کو یاد ہے نا کہ آپ سے ملنے کے لیے مجھے کتنے جتن کرنا پڑتے تھے۔ کبھی رات کی تاریکی میں اپنی جان داؤ پر لگا کر چپکے سے رانی کی مدد سے آپ تک پہنچتی تھی تو کبھی لاہور والی کوٹھی جانے کے لیے بہانے تلاش کرتی تھی۔ ایک خواب تھا دل میں کہ آپ کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں سکون کی زندگی گزاروں گی لیکن ایسا لگتا ہے کہ قسمت کو میرا یہ چھوٹا سا خواب بھی پورا کرنا منظور نہیں ہے۔'' وہ ایک بار پھر ڈپریشن کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے جس دور سے گزر رہی تھی، اس میں عورت ویسے ہی بہت نازک احساسات کی مالک ہو جاتی ہے اور وہ تو پھر بڑے غیر معمولی حالات سے گزر رہی تھی۔

''آپ کو حویلی کی وہ جامد زندگی اچھی لگتی تھی یا میرے ساتھ یوں مارے مارے پھرنا ٹھیک لگتا ہے؟'' آفتاب نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ایک نہایت ہی نازک سوال کیا۔ یاسیت کا شکار کشور اس سوال کو سن کر چونک گئی۔ آفتاب کے سوال سے ظاہر تھا کہ اسے اس کی زود رنجی بُری لگی تھی۔

''آپ کا ساتھ تو مجھے ہر حال میں اچھا لگتا ہے لیکن میری خواہش ہے کہ اب ہم کہیں سکون سے رہ سکیں۔ یہ بھاگ دوڑ بچے کی زندگی کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ پھر بعد میں جب بچہ دنیا میں آ جائے گا تو اور بھی مشکل ہو جائے گی۔ کیا وہ بے چارہ بھی ہمارے ساتھ یونہی اِدھر اُدھر بھاگتا رہے گا؟'' آفتاب کا ہاتھ تھام کر اپنے رخسار سے لگاتے ہوئے اس نے اپنے جذبات کے ساتھ ساتھ خدشات کا بھی اظہار کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”آپ کی ہر خواہش، ہر خواب ضرور پورا ہوگا۔ ہمارا یہ مشکل وقت ہمیشہ ٹھہرا نہیں رہے گا۔ جیسے ہر رات کی صبح ضرور ہوتی ہے اسی طرح ہماری زندگی میں بھی خوشیوں کا سورج ضرور چمکے گا۔“ اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے آفتاب نے دلاسا دیا۔

”شاید ایسا ہی ہو لیکن اس سورج کے نکلنے تک جانے کتنی زندگیوں کے چراغ گل ہو جائیں گے۔ میرے دل پر بڑا بوجھ ہے آفتاب۔ کتنے لوگ ہیں جو ہم پر قربان ہو گئے ہیں۔ رانی، افضل بھائی، بابر، اسلام آباد والی خالہ اور ان کا بیٹا اور اب وہ انجان شخص شفیق خان۔ اپنے باپ کی موت کے بعد تو اس کی بیٹی دنیا میں تنہا ہی رہ گئی ہوگی۔ کیا اس نے اپنے دل میں ہمیں کوسا نہیں ہوگا کہ ہماری وجہ سے اس کے باپ کی جان چلی گئی۔ ہم تو اس بے چاری کو اس کے باپ کی موت کا پُرسہ تک نہیں دے سکے۔“ وہ ٹھیک ٹھاک ڈپریشن کا شکار تھی۔

”میں اس لڑکی سے تعزیت کرنے جانا چاہتا تھا لیکن مجھے خطرہ تھا کہ چودھری صاحب کے آدمی اس کے اردگرد ہی منڈلا رہے ہوں گے۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ اگر میرا شفیق خان سے کوئی تعلق ہے تو میں اس کی موت پر اس کی بیٹی سے ملنے ضرور جاؤں گا بس اسی ڈر اور احتیاط کی وجہ سے میں وہاں نہیں گیا۔ لیکن آپ یقین رکھیں کہ مجھ سے تعزیت اور معذرت دونوں کرنا مجھ پر قرض ہے۔ مجھے زندگی میں جب بھی موقع ملا، میں یہ قرض ضرور ادا کروں گا۔ باقی بھی جو لوگ ہماری خاطر اپنی جان سے گئے، میرے دل میں بھی ان کے لیے گہرا رنج ہے لیکن پھر میں خود کو یہ کہہ کر بہلا لیتا ہوں کہ اللہ نے سب کی موت کے لیے ایک دن مقرر کر رکھا ہے۔ وہ لوگ بھی اپنے وقت پر ہی اس دنیا سے گئے ہوں گے، بس حیلہ ہماری ذات بن گئی۔ اس طرح سوچنے کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے ان لوگوں کی قربانی کا احساس نہیں ہے۔ میں دل سے ان سب کا احسان مند ہوں لیکن میرے پاس اس احسان کو اتارنے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں کہ میں ان کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہوں اور اللہ سے ان کے لیے جنت کے باغوں میں پُرنعمت عطا کر دینے کی درخواست کروں۔“ اس کا اپنا لہجہ بوجھل ہونے لگا۔ جو لوگ مارے گئے تھے اس کے لیے یہ بوجھ سہنا آسان نہیں تھا لیکن وہ برداشت سے کام لے رہا تھا تو صرف کشور کی خاطر وہ ہی حوصلہ چھوڑنے لگی تو اس کے اپنے دل کا درد بھی زبان پر آ گیا۔ کشور نے ذہنی دباؤ کا شکار ہونے کے باوجود اس کی اس کیفیت کو بھانپ لیا اور فوراً ہی خود کو سنبھال کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”آپ اداس نہ ہوں آفتاب! میرا دل بس یونہی ذرا سا گھبرا گیا تھا اس لیے میں ایسی باتیں کرنے لگی تھی۔ میرا مقصد آپ کو پریشانی میں مبتلا کرنا نہیں تھا۔“ آفتاب وہ شخص تھا جسے اس نے بے تحاشا چاہا تھا۔ اس کی کل کائنات آفتاب کی ذات تک محدود تھی۔ وہ اسے کیسے اداس اور پریشان دیکھ سکتی تھی، سو فوراً ہی اس کی دل جوئی کرنے لگی۔

”دل کو سمجھایا کریں نا۔ آپ کا دل پریشان رہے گا تو اس کا اثر ہمارے چھوٹو پر بھی پڑے گا۔ پہلے ہی وہ بے چارہ بال بال بچا ہے۔ اب تو ہمیں اس کی اور بھی زیادہ حفاظت کرنا ہوگی اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ اپنا خیال رکھیں۔ خوش رہیں اور اچھی خوراک لینے کے ساتھ ساتھ آرام بھی کریں۔ آپ کو یاد نہیں کہ ڈاکٹر نے کیا کہا تھا؟ اب آپ کو بہت احتیاط کرنی ہے لیکن آپ خیال نہیں کرتیں اور بے احتیاطی کرتی ہیں۔“ اس نے خود بھی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور کشور کو سمجھانے لگا۔

”میں اپنا خیال کیوں رکھوں؟ آپ ہیں نا میرا خیال رکھنے کے لیے۔“ دل ربائی سے کہتے ہوئے کشور نے اپنا سر اس کے شانے سے لگا دیا۔

”وہ تو میں رکھوں گا ہی۔ آپ مجھے عزیز نہیں ہوتیں تو آج ہم یہاں نہیں ہوتے... لیکن میری جان! آپ کو میرے ساتھ تعاون بھی تو کرنا ہوگا۔ یہ اداس رہنا اور الٹی سیدھی سوچوں میں الجھے رہنا تو ہم دونوں کے لیے مسائل پیدا کر دے گا۔ آپ پہلی بار میں ہی خود کو اتنا نڈھال کر لیں گی تو اس فوج کا کیا ہوگا جو میں نے مستقبل میں تیار کرنے کا سوچ رکھی ہے۔“ اسے سمجھاتے سمجھاتے وہ کچھ شرارت پر اتر آیا تو کشور نے اسے مصنوعی ناراضی سے گھور کر دیکھا۔

”آپ تو مجھے ایسے گھور رہی ہیں جیسے آپ کا تعلق محکمۂ بہبود آبادی سے ہے جنہیں دو سے زیادہ بچے اچھے ہی نہیں لگتے۔“ آفتاب نے اسے ایک بار پھر چھیڑا۔

”بچے تو میرے خیال میں ماں کو کتنے بھی ہوں، اچھے ہی لگیں گے لیکن بچوں کی فوج تیار ہونے کی صورت میں بچوں کے ابّے بُرے لگنے لگتے ہوں گے۔“ وہ بھی شرارت پر اتر آئی۔

”نہ بھئی، یہ تو ہمیں کسی صورت منظور نہیں کہ ہم آپ کو بُرے لگیں اس لیے میرے خیال میں بچے دو ہی اچھے رہیں گے۔“ وہ فوراً تائب ہوا اور پھر دونوں کی ہنسی کی آواز کمرے میں گونج اٹھی۔ اس ہنسی نے اداسی کے وہ بادل چھانٹ دیے جو کچھ دیر قبل وہاں چھائے ہوئے تھے اور زندگی تو نام ہی اس دھوپ چھاؤں کا ہے۔

☆☆☆

”ڈاکٹر طارق کی بہن راحیلہ گھر پہنچ گئی ہے سر! اس کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر طارق اسے اچانک ہی کراچی سے اسلام آباد لے گیا تھا۔ اس نے بہن سے کہا تھا کہ اس کی جان خطرے میں ہے اس لیے فوری طور پر کراچی چھوڑنا ضروری ہے۔ راحیلہ کے مطابق وہ اسلام آباد میں قیام کے دوران مسلسل طارق سے پوچھتی رہی کہ اسے کس سے خطرہ ہے لیکن اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ بعد میں وہ راحیلہ کے نام ایک خط چھوڑ کر خاموشی سے امریکا روانہ ہو گیا۔ راحیلہ نے اپنی بات کے ثبوت کے طور پر وہ خط مجھے دکھایا ہے۔ خط کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ چودھری کو ماہ بانو کی کراچی کے گرلز اسپتال میں موجودگی کی خبر دینے والا ڈاکٹر طارق ہی تھا۔ میں آپ کو خط کی کاپی بھجوا دوں گا، فی الحال اس کے خاص خاص نکات زبانی بتا دیتا ہوں۔“ شہریار نے جس آدمی کو راحیلہ کی فیملی کی نگرانی پر متعین کر رکھا تھا، وہ اسے فون پر رپورٹ دے رہا تھا۔ شہریار خاموشی کے ساتھ لیکن بڑے غور سے اس کی بات سنتا رہا۔

”میرے لیے مزید کیا حکم ہے سر؟“ رپورٹ دینے کے بعد اس آدمی نے دریافت کیا۔

”تم فی الحال چھٹی کرو۔ آئندہ کوئی کام ہوگا تو میں تمہیں بتاؤں گا۔“ ڈاکٹر طارق کے فرار کے بعد کچھ کرنے کے لیے بچا ہی نہیں تھا۔ وہ یہاں ہوتا تو اسے اس حرکت کی پاداش میں سخت سزا بھگتنی پڑتی لیکن خوش قسمتی سے وہ بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اگر اسے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ طارق ملک سے باہر جانے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ ای سی ایل میں اس کا نام ڈلوا دیتا لیکن اسے یہ خیال اس لیے نہیں آیا تھا کہ ایک تو یہ کنفرم نہیں تھا کہ چودھری تک اطلاع پہنچانے والا وہی ہے، دوسرے اس پر شک کرنے کے باوجود وہ یہی سوچ رہا تھا کہ راحیلہ اور طارق معاملہ ٹھنڈا ہونے کے انتظار میں اندرون ملک ہی کہیں عارضی طور پر چھپ کر رہ رہے ہیں اور جلد یا بدیر منظر عام پر آ جائیں گے۔ اس کی توقع کے مطابق ایسا ہوا بھی تھا لیکن صرف راحیلہ سامنے آئی تھی اور طارق نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ موجودہ صورت حال میں وہ طارق کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اور راحیلہ ایک طرح سے بے قصور نظر آ رہی تھی۔ اس کا جو تھوڑا بہت قصور تھا، اس کی سزا بھی وہ بھائی کی طرف سے ملنے والے دھچکے کی صورت میں بھگت چکی تھی چنانچہ نگرانی پر مامور آدمی کو فارغ کرنے کے

نیا شمارہ ہر بک اسٹال پر موجود ہے

مئی 2011ء کی ایک جھلک

خادم اردو
دنیائے ادب کے ایک بلند قامت شخص کا زندگی نامہ

محفوظ عجوبہ
تعمیری غلطی کے سبب عجائبات عالم میں شمار ہو جانے والی عمارت کا احوال

جہنم کدہ
جاپان میں آئے سونامی اور ایٹمی پاور پلانٹ سے جوہری اخراج کا آنکھوں دیکھا حال

آفتاب موسیقی
فن موسیقی کے ایک قیمتی گوہر کا تذکرہ

مشرق مغرب
ایک دل دکھا دینے والی آپ بیتی

اور بھی بہت کچھ

قلم و ادب کے مخفی گوشوں پر مبنی داستانیں، کہی ان کہی باتیں، سراب جیسی مقبول طویل سرگزشت ان کے علاوہ بھی بہت کچھ

بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں، آپ یقیناً گرویدہ ہو جائیں گے۔

خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

"او کے سر! ایز یو وش۔" اس کا جواب سن کر دوسری طرف سے کہا گیا اور پھر سلسلہ منقطع ہو گیا۔ موبائل سیٹ میز پر رکھ کر وہ ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے ایک بار پھر موبائل اٹھایا اور جگو کا نمبر نکال کر اسے ڈائل کرنے لگا۔ ماہ بانو کے مسلسل غیاب نے اس کے دماغ میں چنگاریاں سی بھر دی تھیں اور وہ ہر اس شخص کو سخت سزا دینا چاہتا تھا جو اس معصوم لڑکی کی زندگی کو بے سکون کرنے کا سبب بنا تھا۔ جگو نے دوسری ہی بیل پر اس کی کال ریسیو کر لی۔

"سلام صاحب! فرمایئے کیسے یاد کیا خادم کو؟" اس کے انداز میں انکساری تھی۔ وہ کئی بار اس کے کام آنے کے باوجود اب بھی اس کے اس احسان کو نہیں بھولا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کے بیٹے کی زندگی بچ گئی تھی اور بچہ بروقت اسپتال پہنچ گیا تھا۔

"یاد تو تمہیں ایک کام سے ہی کیا ہے جگو! مجھے جس دشمن کا سامنا ہے، اس پر حملہ کرنے کے لیے تم سے بہتر آدمی نہیں ہے میرے پاس۔" اس نے جگو کے سامنے اعتراف کیا۔

"یعنی چودھری افتخار عالم شاہ کی مزاج پرسی کرنی ہے۔" وہ فوراً ہی سمجھ گیا۔ "آپ حکم دیں کہ اس بار اس کے ساتھ کیا کرنا ہے؟ کام کی گارنٹی میں آپ کو ابھی سے دیتا ہوں۔" وہ بڑا پُراعتماد تھا۔ وہ جس سیاسی پارٹی کے لیے غنڈا گردی کرتا تھا، آج کل اس کا ستارہ عروج پر تھا چنانچہ پارٹی لیڈرز کے علاوہ ان کے کارکنوں اور پالتو غنڈوں کی بھی موجیں ہو رہی تھیں۔ جگو کی تو پھر بات ہی الگ تھی۔ وہ تو پارٹی لیڈر کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔

"کیا کرنا ہے یہ میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ بس مجھے کام ایسا چاہیے کہ چودھری بلبلا اٹھے۔" اس نے اپنی خواہش جگو تک پہنچائی۔ اس وقت وہ اپنے اسٹڈی روم میں تھا اس لیے بہت کھل کر بات کر رہا تھا۔ ماریا پر اعتماد ہونے کے باوجود وہ صرف اس خدشے کی بنیاد پر کہ عورت کا کچھ بھروسا نہیں ہوتا کہ کون سی بات کہاں کہہ ڈالے، اس سے اپنے معاملات پوشیدہ رکھتا تھا۔ راتوں کو بیڈ روم چھوڑ کر کئی کئی گھنٹے اسٹڈی میں گزار دینے کے پیچھے ایک وجہ راز داری تھی جبکہ دوسرا سبب اس کی وہ دلی کیفیت بھی تھی جو ماریا کو اپنا ہم سفر بنا لینے کے باوجود اسے اس کی قربت اختیار کرنے سے روکتی تھی۔ جانے کیوں اس کا دل اچھی خاصی خوب رو ماریا کے لیے کسی قسم کی رغبت محسوس ہی نہیں کرتا تھا۔

"میں سمجھ گیا سر! اطمینان رکھیں... کام آپ کی مرضی کے عین مطابق ہوگا۔" دوسری طرف سے جگو اسے تسلی دے رہا تھا۔

"سچ پوچھو تو میری مرضی تو یہ ہے کہ چودھری جیسے بندے کے بوجھ سے اس دھرتی کو آزاد کر دوں لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ چودھری نہیں ہوگا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا لے لے گا اور یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ یہ سارے ہی ایک جیسے ہوتے ہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کو بار بار ایسی زک پہنچائی جائے کہ ان کا غرور ٹوٹ جائے اور یہ لوگ جو خود کو اس زمین پر خدا سمجھنے لگے ہیں، یہ سوچیں کہ سب کچھ ان کی مرضی سے ہی ہونا ممکن نہیں ہے۔" جگو جس طرح اس سے تعاون کر رہا تھا، وہ اس سے گھٹیا ہونے کے باوجود اپنے دلی جذبات شیئر کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"یہ زمینی خدا تو ہر جگہ ہیں سر! جس کا جہاں زور چلتا ہے وہ اپنا کام دکھا دیتا ہے۔ کون سا میدان ہے جو..." جگو اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا لیکن ایک احساس نے شہریار کی توجہ اس کی بات کی طرف سے ہٹا دی۔ اسے یوں لگا تھا کہ اسٹڈی کے دروازے سے باہر کوئی موجود ہے۔ بہت معمولی سی آہٹ محسوس ہوئی تھی۔ رات کے اس پہر کسی ملازم کی وہاں موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ملازمین رات دس بجے تک فارغ ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں تک محدود ہو جاتے تھے اور صرف اسی صورت میں متحرک ہوتے تھے کہ انہیں حکم دیا جائے۔ پھر وہ کون تھا جو اسٹڈی کے باہر موجود تھا؟ کیا اس کا کوئی ملازم چھپ کے اس کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا؟ دفتر کے فون پر ہونے والی گفتگو لیک آؤٹ ہو جانے کے بعد سے وہ سخت کانشس ہو گیا تھا اور ہر ایک کو شک کی نظروں سے دیکھ رہا تھا چنانچہ اب گھر میں موجود قابلِ اعتماد ملازمین بھی پہلے کی طرح قابلِ بھروسا نہیں لگتے تھے۔

وہ اپنی جگہ سے آہستگی سے اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا اسٹڈی کے دروازے کی طرف بڑھا تا کہ وہ جو کوئی بھی ہے، اسے پکڑ سکے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے ہینڈل پر دباؤ ڈالا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے جو منظر تھا، وہ اس کے لیے قطعی ناقابلِ یقین تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے سامنے ماریا کھڑی تھی۔ اس کے جسم پر سفید رنگ کی نہایت مہین کپڑے کی نائٹی تھی۔ یہ نائٹی کچھ اس انداز میں سلی ہوئی تھی کہ اس میں آستینوں کا نام ونشان بھی نہیں تھا اور شانے پر دو پتلی پتلی ڈوریوں کی مدد سے ٹکی ہوئی تھی۔ ایک تو اس کا حلیہ، دوسرے اس کی دروازے پر موجودگی نے شہریار کا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ ان دونوں کی شادی جیسے بھی حالات میں ہوئی تھی لیکن اب حقیقت یہ تھی کہ وہ اس کی بیوی کہلاتی تھی اور وہ ہرگز بھی یہ بات پسند نہیں کر سکتا تھا کہ اگر کوئی ملازم اتفاق سے اس طرف آجائے تو اس حلیے میں اس کی نظر اس کی بیوی پر پڑے۔ دوسرے اس کے ذہن میں یہ اندیشہ بھی سرسرایا کہ کیا ماریا چپکے سے میری گفتگو سننے کی کوشش کر رہی ہے؟

''تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اس نے نہایت سرد لہجے میں ماریا سے پوچھا۔

''یہ تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہیے اے سی صاحب کہ آپ اس وقت یہاں اسٹڈی میں کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔

''تمہارے اس سوال کا میں کیا مطلب سمجھوں؟'' اس کا لہجہ بدستور سرد ہی تھا۔

''مطلب بہت واضح ہے۔ آپ کو رات کے اس پہر اسٹڈی میں نہیں، اپنے بیڈروم میں ہونا چاہیے۔''

''مجھے کب کیا کرنا ہے، یہ میں خود طے کرتا ہوں۔ مجھے اپنے کاموں کے لیے کسی سے ڈکٹیشن لینا پسند نہیں۔'' اس نے گویا ماریا کو اس کی حدود کے اندر رہنے کی تنبیہ کی۔

''لیکن میں کسی نہیں ہوں۔ آپ نے مجھ سے شادی کی ہے اور آپ کو میرے حقوق ادا کرنے ہوں گے۔'' وہ تلملا کر بولی۔

''کون سے حقوق..... میں نے تمہیں کیا نہیں دے رکھا؟ زندگی کی ہر سہولت تو حاصل ہے تمہیں۔'' اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر ماریا کو اندر آنے کا راستہ دیا اور خود پر نہایت ضبط کرتے ہوئے لہجے کو قدرے نرم کر کے اسے جواب دیا۔

''مجھے آپ حاصل نہیں ہیں شہریار! میرے پاس ہر شے موجود ہے لیکن آپ مجھے نہیں ملتے۔'' وہ ہسٹیریٹ ہونے لگی۔

''بیٹھو۔'' شہریار نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ اب وہ کچھ کچھ ماریا کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ رات کے اس پہر، اس قسم کے لباس میں اس کے پاس کیوں آئی ہے۔ اس نے جو نائٹی پہن رکھی تھی، اس میں سے اس کا شاداب جسم چھلکا پڑ رہا تھا۔ وہ اپنے حسن کا جلوہ دکھا کر شوہر کو اپنی طرف راغب کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اس طرح کی اداؤں کے جال میں پھنسنے والا آدمی تھا ہی نہیں۔ اسے عریانیت میں کبھی حسن محسوس ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک بار بھی جانے کیسے ماریا کے سامنے بے بس ہو گیا تھا۔ آج بھی اسے جب بھی وہ رات یاد آتی تھی تو وہ حیران رہ جاتا کہ آخر اتنی بڑی غلطی اس سے سرزد کیسے ہوئی؟ اس رات جانے اس کا نفس اتنا سرکش کیسے ہو گیا کہ اس نے ماریا کے وجود کو روند ڈالا۔ اپنی اس غلطی، اس گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اس نے کوئی قلبی لگاؤ نہ ہونے کے باوجود ماریا کو اپنی زندگی کا ساتھی بنا ڈالا لیکن اپنی تمام تر اچھائی کے باوجود اسے وہ محبت اور توجہ دینے سے قاصر تھا جس کی وہ ایک بیوی کی حیثیت سے طلب گار و حق دار تھی۔ اس وقت بھی وہ جس طرح اس کے جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کرنے آئی تھی، اس پر اس کی کوشش کا بالکل بھی اثر نہیں ہوا تھا بلکہ عریانیت کے اس مظاہرے پر اسے بے ساختہ ہی نیلے پھولوں والی سیاہ چادر کے حلقے میں لپٹا وہ سادہ سا چہرہ یاد آیا تھا جو بنا ہار سنگار کے بھی اس کے دل کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ ماہ نور..... جانے کہاں تھی وہ چھوٹی سی لڑکی جس سے وہ اپنی زندگی میں حقیقی معنوں میں متاثر ہوا تھا لیکن اسے یہ بات بتا نہیں سکا تھا اور اب حالات اس نہج پر تھے کہ وہ مل بھی جاتی تو وہ اسے کچھ بتا نہیں سکتا تھا۔ اسے اپنے دل کی بات اب ہمیشہ اپنے دل میں ہی رکھنی تھی۔ ماہ نور دل کے چاہے جتنے بھی قریب تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اب صرف ماریا کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اس کی توجہ اور محبت کی حق دار ٹھہرے۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اگر اسے محبت نہیں بھی دے سکتا تھا تو خوش خلقی سے پیش آنا تو اس کا فرض تھا۔ چنانچہ ماریا کے کرسی پر بیٹھنے کے بعد خود بھی ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر نہایت رسان سے بولا۔

''دیکھو ماریا! تم ایک پڑھی لکھی اور سمجھدار عورت ہو۔ تم جانتی ہو کہ میں جس پوسٹ پر کام کر رہا ہوں، وہ کس قدر ذمے داری کی حامل ہے۔ اپنی ان ذمے داریوں کو نبھانے کے لیے مجھے زیادہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے اور میرے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ میں ایک عام آدمی کی طرح گھر اور بیوی کو وہ توجہ دے سکوں جس کی تم مجھ سے خواہش کر رہی ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ مجھے تمہیں یہ بات سمجھانی نہیں پڑے گی لیکن آج

WWW.PAKSOCIETY.COM

تم نے مجھے بڑا مایوس کیا ہے۔"

"میں آپ کی مجبوریوں کو سمجھتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ ایک بے حد مصروف آدمی ہیں۔ میں آپ کی اس روٹین کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کی پوری کوشش کرتی بھی رہی ہوں لیکن مجھے آپ کا اپنے آپ کو بالکل ہی اگنور کر دینا اچھا نہیں لگتا۔ یہ رویہ مجھے احساس دلاتا ہے کہ آپ نے مجھے مجبوراً اپنا لائف پارٹنر بنایا ہے۔" اس نے اپنے دل میں پلتا شکوہ اس سے بیان کیا۔

"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟ میں نے تو کبھی تمہارے ساتھ کوئی مس بی ہیو نہیں کیا۔"

"میں مس بی ہیویر کی بات کر بھی نہیں رہی ہوں۔ میں اگنورینس کی بات کر رہی ہوں۔ آپ مجھے بتائے بغیر شہر سے باہر تک چلے جاتے ہیں اور پھر وہاں سے ایک فون تک کرنا گوارا نہیں کرتے۔" اس نے شکایت کی تو وہ سمجھ گیا کہ ماریا اس کے پچھلے دنوں لاہور جانے کا ذکر کر رہی ہے...... بلکہ لاہور کا تو نام ہی تھا، حقیقت میں تو وہ اشتیش کمار کی گرفتاری کے لیے اس پسماندہ گاؤں گیا تھا جہاں آفتاب اور کشور نے چودھری سے چھپنے کے لیے پناہ لے رکھی تھی۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جو وہ ماریا سے کسی صورت شیئر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ماریا کو ایک اچھی عورت سمجھنے کے باوجود ابھی تک ایسا کوئی موقع نہیں آیا تھا کہ وہ اس کی سچائی اور ایمان داری کو آزما سکے چنانچہ فی الحال اس سے سب کچھ پردے میں رکھنا ہی مناسب تھا۔

"سوری ڈیئر! مجھے بہت ایمرجنسی میں جانا پڑا تھا اس لیے تمہیں نہیں بتایا تھا لیکن عبدالمنان سے تو میں نے کہہ دیا تھا کہ تمہیں انفارم کر دے۔ کیا اس نے تمہیں انفارم نہیں کیا تھا؟" اپنے لہجے کو پہلے سے کہیں زیادہ نرم کر کے اس نے اس کے سامنے اپنی صفائی دیتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں، اس نے مجھے انفارم کیا تھا کہ آپ لاہور گئے ہیں لیکن جب میں نے رانا ہاؤس فون کر کے آپ کے بارے میں پوچھا تو وہاں سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ وہاں پہنچے ہی نہیں ہیں۔ میں آپ سے آپ کے موبائل پر بھی رابطہ کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ بھی نہیں ہو سکا۔ آخر آپ ایسی کس جگہ پر تھے جہاں کوئی آپ سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا؟" وہ کچھ جھنجلاہٹ کا شکار نظر آ رہی تھی۔

"میں لاہور گیا ضرور تھا لیکن ماموں جان اور ممانی سے ملنے کے لیے نہیں۔ مجھے اپنے کچھ آفیشل کام نمٹانے تھے لیکن تم یہ بتاؤ کہ تمہیں مجھ سے ایسا کیا کام تھا جو اتنی شد و مد سے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں؟" اس نے سرسری سی وضاحت دے کر اس سے پوچھا۔

"میرے اور آپ کے درمیان جو رشتہ ہے، وہ مجھے حق دیتا ہے کہ میں بغیر کسی کام کے بھی آپ سے رابطہ کر سکوں۔" ماریا نے اسے جتایا۔

"میں مانتا ہوں۔ چلو اب چل کر سو جائیں ورنہ یہیں بیٹھے بیٹھے گلے شکوے کرنے میں رات گزر جائے گی۔ صبح مجھے آفس بھی جانا ہے۔" اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ماریا کو دونوں شانے تھام کر کھڑا کیا اور اپنے بازو کے حلقے میں لے کر اسٹڈی سے باہر نکلا۔ قلبی جذبات جو بھی تھے، اسے اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے میں ڈالے جانے والے ڈھول کو بہرحال بجانا تو تھا ہی۔ فی الحال تو وہ اس لیے بھی ریلیکس ہو گیا تھا کہ ماریا کو اسٹڈی کے دروازے کے باہر پا کر جن شکوک و شبہات نے جنم لیا تھا، وہ دور ہو گئے تھے چنانچہ اب وہ محبت کو ترسی ہوئی اس عورت کو جو قسمت کے الٹ پھیر سے اس کی بیوی کے عہدے پر فائز ہو گئی تھی، بہلانے کا فریضہ سرانجام دینے جا رہا تھا۔

☆☆☆

"آپ کے لیے کچھ اہم خبریں ہیں سر!" شہریار کو دفتر پہنچے دیر نہیں گزری تھی کہ عبدالمنان اس کے کمرے میں چلا آیا اور کچھ جوش سے بولا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کے پاس جو بھی خبریں ہیں، وہ بڑی زبردست ہیں۔ شہریار نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"ماہ بانو کے بارے میں علم ہو گیا ہے کہ وہ کہاں ہے۔" اسے متوجہ دیکھ کر عبدالمنان نے سنسنی خیز لہجے میں انکشاف کیا۔

"کہاں ہے؟" شہریار کا جسم یہ خبر سن کر تن گیا اور اس نے سرسرائے لہجے میں پوچھا۔

"جنگل میں ڈاکوؤں کے ڈیرے پر۔"

"وہ وہاں کیسے پہنچ گئی؟" عبدالمنان کے جواب نے اسے حیران کیا۔

"حویلی میں کی جانے والی زنانہ سازشوں کے نتیجے میں۔"

"کیا مطلب؟ کھل کر بتاؤ۔" اس نے وضاحت چاہی۔

"آپ کو یہ تو علم ہے ہی کہ میں نے حویلی کی ایک ملازمہ کو وہاں ہونے والی گفتگو اور واقعات کی سن گن لینے پر لگا رکھا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ماہ بانو حویلی سے غائب ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ حویلی ہی کا کوئی مکین اس کام میں شامل ہے۔ میری ہدایت پر وہ ملازمہ کوشش میں لگی رہی کہ اسے کسی طرح کچھ علم ہو جائے لیکن شروع میں اس کا زیادہ زور سر دانے پر تھا اس لیے وہ کچھ پتا نہیں کر سکی لیکن پھر بہزاد شاہ کی بیوی فریدہ کے ساتھ ہونے والے حادثے نے اسے لیڈیز پارٹی کی طرف متوجہ کر دیا۔ فریدہ والے معاملے کا تو آپ کو علم ہو گا ہی؟" بات کرتے کرتے اس نے سوال کیا۔

"ہاں، مجھے ماریا سے معلوم ہوا تھا۔" اس نے مختصر جواب دیا۔ رات کو ہی تو اسے ماریا نے بتایا تھا کہ فریدہ سیڑھیوں سے پھسل کر گر گئی تھی جس کی وجہ سے اس کے ہاں قبل از وقت بچے کی پیدائش ہوئی ہے اور اس نے دستیاب وسائل کے ساتھ کامیاب ڈیلیوری کروانے کے بعد ماں اور بچے دونوں کو لاہور کے کسی بڑے اسپتال میں منتقل کروا دیا ہے۔ ماریا نے شک ظاہر کیا تھا کہ فریدہ کے ساتھ پیش آنے والا حادثہ کسی سازش کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ شہریار خود بھی اس بات سے متفق تھا اور اب عبدالمنان بھی اسے کچھ بتانے جا رہا تھا۔

"میں نے جس ملازمہ کو ذمے داری سونپ رکھی تھی، اس نے بتایا ہے کہ جب فریدہ سیڑھیوں سے گری، اس وقت وہ خود بھی وہاں موجود تھی اور اس نے صاف یہ بات محسوس کی تھی کہ فریدہ کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اتر کر آنے والی ملازمہ نے جان بوجھ کر خود کو اس انداز میں گرایا تھا کہ اس کا دھکا لگنے سے فریدہ بھی گر پڑے۔ یہ حرکت کرنے والی ملازمہ بڑی چودھرائن کے بہت قریب ہے چنانچہ میرے لیے کام کرنے والی عورت تجسس میں مبتلا ہو گئی کہ کسی طرح حقیقت معلوم کرے۔ اس نے کوشش شروع کر دی کہ وڈی چودھرائن کے آس پاس رہ کر اس کی باتیں سن سکے۔ اس کی یہ کوشش کامیاب رہی اور چودھرائن اور اس کی بیٹیوں کی گفتگو سے اس پر یہ انکشاف ہوا کہ ان ماں بیٹیوں نے مل کر یہ سازش کی تھی کہ کسی طرح فریدہ کا ہونے والا بچہ ضائع ہو جائے۔ ان ماں بیٹیوں کی خواہش تھی کہ ان کے اور ان کی اولادوں کے سوا چودھری کا کوئی اور وارث پیدا نہ ہو سکے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ بہزاد شاہ کے ہاں اولاد ہونے والی ہے، انہوں نے سازش تیار کی کہ کسی طرح بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے لیکن وہاں وہی معاملہ پیش آیا کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ فریدہ اور اس کے بچے کے بچ جانے پر ماں بیٹیاں بہت پچھتائی ہوئی تھیں اور ارادہ ظاہر کر رہی تھیں کہ اگر بچہ اسپتال سے صحت یاب ہو کر واپس حویلی آ بھی گیا تو کسی نہ کسی طرح اسے ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ اسی گفتگو کے دوران ان بیٹیوں کے درمیان ماہ بانو کا بھی ذکر چھڑ گیا۔ اس ذکر سے چوری چھپے گفتگو سننے والی ملازمہ کو علم ہوا کہ ماہ بانو سے چودھری کے شادی کرنے کا ارادہ جان کر وڈی چودھرائن کو یہ تشویش ہو گئی تھی کہ کہیں ماہ بانو حویلی کو کوئی نیا وارث نہ دے دے چنانچہ چودھرائن نے اپنے بڑے داماد اشرف شاہ کی مدد سے اسے حویلی سے نکال کر ڈاکوؤں کے ڈیرے پر پہنچا دیا۔ ہر طرف اپنی حکمرانی کا سکہ چلانے والے چودھری کو حویلی میں ہونے والی اس سازش کا علم ہی نہیں ہو سکا اور وہ ابھی تک بیٹھا لکیر پیٹ رہا ہے کہ ماہ بانو حویلی سے نکلی تو کس طرح؟"

عبدالمنان نے صبح صبح اسے واقعی بہت زبردست خبریں دی تھیں۔ ایک طرف یہ کنفرم ہوا تھا کہ فریدہ کے ساتھ پیش آنے والا حادثہ سچ مچ ایک سازش کا نتیجہ تھا تو دوسری طرف قطعی لاپتا ہونے والی ماہ بانو کے بارے میں علم ہو گیا تھا۔ ماہ بانو، جو اس کے دل میں بسنے والی ایسی خاموش مکین تھی جس نے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا لیکن دل خود اس کے لیے مطالبے کرتا تھا۔ یہ بڑا عجیب اور انوکھا معاملہ تھا۔ دنیا کا اصول ہے کہ مکین مکان کو سجاتا سنوارتا ہے لیکن یہاں مکان دل خواہش کرتا تھا کہ اس کا مکین ہنستا بستا، خوش و خرم اور آباد رہے۔ اب بھی بظاہر پُرسکون بیٹھے شہریار کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا دل کس بری طرح مچل رہا ہے کہ ابھی اڑ کر جائے اور کسی طرح ماہ بانو کو ڈاکوؤں کی قید سے آزاد کروا لائے۔

"یہ بہت بڑی کامیابی ہے عبدالمنان اور اسے میں تمہاری خلوص نیت کا نتیجہ سمجھتا ہوں ورنہ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ جس سازش کا علم چودھری کو نہیں ہو سکا، وہ ہم جان گئے۔ کوشش تو چودھری نے بھی کم نہیں کی ہو گی لیکن اسے کامیابی نہیں ملی۔ اس نے غصے میں کیا کچھ نہیں کیا۔ مجھے ہرگز بھی وہ بہن بھائی نہیں بھولے جن کے ماں باپ کے جرم کی پاداش میں چودھری نے انہیں بے عزت کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔" اس کا اشارہ اس ملازم جوڑے کے بچوں کی طرف تھا جس نے ماہ بانو کو حویلی کے مہمان خانے سے فرار کروایا تھا اور بعد میں خود بھی مردہ پایا گیا تھا۔

"چودھری کے ظلم کی داستانیں کون بھول سکتا ہے سر! آپ تو ابھی یہاں آئے ہیں، میں تو برسوں سے اس کی فرعونیت کے مظاہرے دیکھ رہا ہوں۔ وہ انسانوں کو اپنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

سامنے جھکائے رکھنے کا شوقین ہے اور جو جھکنے کے لیے تیار نہ ہو، اسے کسی صورت بخشنے کو تیار نہیں ہوتا۔" عبدالستان نے تبصرہ کیا۔

"کوئی بات نہیں عبدالستان! کہتے ہیں نا کہ اللہ نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ اتارا ہے..... تو یقین رکھو کہ چودھری کے لیے بھی وقت یوم حساب لے کر ضرور آئے گا۔ جو سمجھانے پر نصیحت نہیں پکڑتے پھر انہیں عذاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اللہ کچھ لوگوں کی رسّی ڈھیلی ضرور چھوڑ دیتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اپنی مخلوق کی طرف سے غافل ہو گیا ہے۔"

"بے شک سر! اب آپ بتائیں کہ کیا اقدامات کرنے ہیں؟ دونوں ہی لڑکیوں کا معاملہ گمبھیر ہے۔ اگر ہم نے تاخیر کی تو کہیں کچھ بُرا نہ ہو جائے۔" اس کی تائید کرتے ہوئے عبدالستان نے آئندہ کا لائحہ عمل جاننا چاہا۔

"فریدہ کے معاملے میں تو مجھے چودھری مختیار سے بات کرنی ہوگی۔ اپنی بہن کے تحفظ کے لیے اسے خود چودھری سے بات کرنی ہوگی۔ میں دیکھتا ہوں کہ چودھری مختیار اس کام کے لیے راضی ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ راضی ہو گیا تو ہمیں دخل اندازی کی ضرورت نہیں پڑے گی ورنہ دوسری صورت میں ہمیں فریدہ سے بات کر کے اسے قانونی تحفظ فراہم کرنا پڑے گا۔ رہا مسئلہ ماہ بانو کا تو اس کا واحد حل جنگل میں ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن کرنا ہے۔ میں شروع سے اس آپریشن کا خواہش مند رہا ہوں لیکن کچھ مجبوریوں کی وجہ سے اب تک یہ کام نہیں ہو سکا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اب اس معاملے کا مزید ٹالا جانا مناسب نہیں ہے۔" وہ منٹوں میں سارے فیصلے کر چکا تھا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے سر؟" عبدالستان نے دریافت کیا۔

"تم اسٹاف پر نظر رکھو۔ ہمیں اندازہ ہونا چاہیے کہ ہمارے اسٹاف میں سے کوئی اور فرد تو چودھری کا وفادار نہیں ہے۔" جب سے اس کی اور آفتاب کی ٹیلی فونک گفتگو لیک آؤٹ ہوئی تھی، وہ اپنے اسٹاف کے معاملے میں سخت کانشس ہو گیا تھا۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ٹیلی فون آپریٹر چودھری کے لیے جاسوس کے فرائض انجام دے رہا ہے لیکن وہ لوگ اسے چھیڑے بغیر خاموشی سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ ایسا شہریار کی ہدایت پر ہی کیا گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ آپریٹر کے خلاف کوئی کارروائی کر کے دوسروں کو چونکایا جائے۔ اگر اسٹاف میں آپریٹر کے علاوہ بھی کوئی جاسوس تھا تو وہ اس صورت میں ہوشیار ہو جاتا۔

"میں اس سلسلے میں پہلے ہی ایکٹیو ہوں۔ ایک کلرک پر مجھے شک بھی ہے لیکن کنفرم ہونے سے پہلے کچھ کہنا بیکار ہے۔"

"او کے! جیسا تم مناسب سمجھو کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تم یہ معاملہ اچھی طرح سنبھال لو گے۔" اس نے عبدالستان پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔

"تھینک یو سر! میں آپ کے اس یقین کو ٹوٹنے نہیں دوں گا۔" جواباً وہ بڑے عزم سے بولا۔ پھر شہریار کا اشارہ پا کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جانے کے بعد شہریار نے آئی جی مختار مراد کا نمبر ملایا۔ اس کا نام سن کر ان کے پی اے نے فوراً ہی اس کی ان سے بات کروا دی۔

"کیسے ہو شیری بیٹا!" مختار مراد نے کال ریسیو کر کے پُرجوش انداز میں پوچھا۔

"فائن انکل! آپ سنائیں۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ تم کہو کیسے یاد کیا ہے؟" وہ سمجھتا تھا کہ دفتری اوقات میں اس کے کال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کسی نہ کسی خاص کام سے اسے یاد کیا ہے چنانچہ مزید رسمی گفتگو میں الجھنے اور الجھانے کے اس سے دریافت کیا۔

"میں نے آپ سے کافی دن پہلے ایک بات کہی تھی، اسی کی یاددہانی کروائی تھی۔" اس نے تمہید باندھی۔

"کیسی بات؟"

"جنگل میں ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن کی۔"

"کیا پھر کوئی مسئلہ ہو گیا ہے؟" وہ چونکا۔ شہریار کے اس ایشو کو دوبارہ چھیڑنے سے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی نیا واقعہ پیش آیا ہے۔

"جب تک ہم ڈاکوؤں کو ان کے ڈیرے میں آرام سے رہنے دیں گے، مسائل تو پیش آتے رہیں گے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ کافی بڑا آپریشن ہوگا۔ اتنے وسیع علاقے کو کور کرنا اور وہاں ڈاکوؤں کو گھیرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کام کے لیے بہت بڑی فورس اور جدید اسلحے کی ضرورت ہے۔ میں اس معاملے کو بھولا نہیں ہوں۔ یہ کیس انڈر پروسس ہے۔ ہم جلد اس آپریشن کے لیے اپنی تیاری مکمل کر لیں گے۔" مختار مراد نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا۔

"آپ کی تیاریاں مکمل ہونے سے قبل اگر اسے کچھ ہو گیا تو؟" وہ وہی پرانی کہانی سن کر تھوڑا سا چڑ گیا تھا اس لیے جذباتی ہو گیا۔

"کون؟ کس کی بات کر رہے ہو تم؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔ اس کا سوال سن کر اسے اپنے جذباتی پن کا احساس ہوا چنانچہ خود کو سنبھال کر لہجے کو ہموار کیا اور بولا۔ "آپ کو وہ لڑکی تو یاد ہوگی جسے میں نے سجاد بھائی کے گھر میں ٹھہرایا تھا اور جس کے ذریعے ہم شینا تک پہنچے تھے۔"

"ماہ بانو۔" مختار مراد فوراً ہی بولا۔ ماہ بانو کو بھولنے کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہی تو تھی جس نے انہیں اس کی پیاری نواسی تک پہنچایا تھا۔ بس بدقسمتی یہ تھی کہ وہ شینا کو زندہ حالت میں نہیں پا سکا تھا۔ وہ ہندو خواجہ سراؤں کے اس جنونی گروپ کے جنون کا شکار ہو گئی تھی جس کا سرغنہ را کا ایجنٹ ورما تھا۔ ورما خود بھی خواجہ سرا کا روپ دھار کر ان خواجہ سراؤں کا مہا گرو بنا بیٹھا تھا اور عجیب و غریب رسمیں رائج کر کے گروپ کے تمام ارکان کے دل و دماغ اپنے قابو میں کر رکھے تھے۔ وہ ان خواجہ سراؤں کو عیش پرست سرکاری افسران اور دیگر اہم شخصیات کے پاس بھیج کر ان سے جاسوسی کے کام لیتا تھا۔ اس نے ہی یہ رسم رائج کی تھی کہ اگر وہ لوگ پورن ماشی کی رات میں دیوی ماں کے چرنوں میں ایک کنواری لڑکی کو بھینٹ چڑھا کر یہ پرارتھنا کریں گے کہ اب بھگوان ان جیسے نامکمل انسانوں کو اس سنسار میں نہ بھیجے تو بھگوان ان کی سن لے گا۔ اپنی اس رسم کو پورا کرنے کے لیے چند خواجہ سراؤں نے شینا کو کالج جاتے ہوئے راستے میں اغوا کر لیا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ شینا ڈی آئی جی سجاد رانا کی بیٹی اور آئی جی مختار مراد کی نواسی ہے۔ انہوں نے اس ادھ کھلی کلی جیسی لڑکی کی دیوی کے چرنوں میں بھینٹ دے دی۔ ماہ بانو نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ خود بھی ان دنوں ان ظالموں کی قید میں تھی۔ قسمت سے جب وہ اس قید سے فرار ہوئی اور شہریار تک پہنچی تو شینا کی تصویر دیکھ کر اسے شناخت کر لیا۔ اس شناخت کے بعد ان لوگوں کی شینا کو تلاش کرنے کی جدوجہد تو اپنے اختتام کو پہنچی لیکن اس کے قاتلوں کی تلاش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تلاش کے اس سفر میں سجاد رانا اپنی جان سے چلا گیا جبکہ شہریار کی جدوجہد ابھی جاری تھی اور وہ خود کئی بار خطرات سے دوچار ہو چکا تھا۔

"کیا ماہ بانو ڈاکوؤں کی قید میں ہے؟" مختار مراد نے اندازہ لگایا۔

"جی ہاں۔" اس کا جواب مختصر تھا۔

"وہ وہاں کیسے پہنچی؟" اس نے شہریار سے دریافت کیا تو جواباً اس نے مختصراً سارے حالات سمجھا دیے۔

بارش

تاریک برّاعظم افریقا کے ایک علاقے میں کئی ماہ تک بارش نہیں ہوئی..... ٹونے ٹوٹکے آزما لیے گئے۔ جادو جگائے گئے۔ لڑکیوں کو، دیوی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھایا گیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

سارے سردار، سارے پجاری، سارے جادوگر اور سارے سیانے اکٹھا ہوئے کہ بارش ہونے کی کوئی مناسب ترکیب سوچی جائے۔

"جب میں انگلینڈ میں تھا" ایک سیانے نے کہا۔ "اس وقت میں نے وہاں کے لوگوں کو ایک ٹوٹکا کرتے دیکھا تھا۔ اس ٹوٹکے کے نتیجے میں ہمیشہ بارش ہونے لگتی تھی۔ ہم چاہیں تو اسے آزما سکتے ہیں۔"

سب کی سوالیہ نظریں سیانے کے چہرے پر جم گئیں۔

"ٹوٹکے کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے سفید کوٹ پہن کر اور ہاتھوں میں چھ ڈنڈے لے کر دو آدمی میدان میں جاتے ہیں۔ پھر ان ڈنڈوں کو میدان میں گاڑ دیا جاتا ہے۔ سفید کپڑوں میں دو آدمی اور آتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چوڑی لکڑیاں ہوتی ہیں۔ پھر گیارہ آدمی آتے ہیں۔ وہ بھی سفید کپڑے پہنے ہوتے ہیں۔ وہ سب کے سب میدان میں پھیل جاتے ہیں۔ پھر ایک آدمی ہاتھ میں گیند لے کر تھوڑا سا بھاگتا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ گیند پھینکے، بارش شروع ہو جاتی ہے۔"

محمود احمد، سیالکوٹ

"او کے، میں کوشش کرتا ہوں کہ کچھ کر سکوں لیکن ایک لڑکی کے لیے جو کہ کوئی خاص سوشل اسٹیٹس بھی نہیں رکھتی، فوری طور پر اتنا بڑا آپریشن شروع کرنا مشکل ہوگا۔" مختار مراد نے صاف گوئی سے اس پر صورت حال واضح کی۔ اس جواب پر وہ اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اسے نہیں بتا سکا تھا کہ بے شک ماہ بانو کسی خاص سماجی رتبے کی حامل نہیں ہے لیکن خود اس کے لیے بڑی خاص ہے۔

"میں نے تمہیں انکار نہیں کیا ہے، صرف یہ واضح کیا ہے کہ یہ کام مشکل ثابت ہوگا۔ باقی میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔" شہریار کی خاموشی کو محسوس کر کے وہ اس سے بولا۔

"تھینک یو انکل! مجھے آپ سے پورے تعاون کی امید ہے۔" شہریار نے اس پر اپنے بھروسے کا اظہار کیا۔

"اور مجھے امید ہے کہ میں جلد تمہیں خوش خبری سناؤں

WWW.PAKSOCIETY.COM

گا۔‘‘ مختار مراد نے اسے یقین دہانی کرائی۔

’’میں بہت بے چینی کے ساتھ انتظار کروں گا۔‘‘ اس نے یہ کہنے کے بعد اجازت لے کر فون بند کر دیا۔ سلسلہ منقطع کرتے ہی وہ اپنی کرسی کی پشت سے سر لگا کر بیٹھ گیا اور اپنے سامنے موجود دیوار کو گھورنے لگا۔ مختار مراد سے بات کرتے ہوئے اسے اپنی قلبی کیفیات کو چھپانے کے لیے بڑے ضبط سے کام لینا پڑا تھا ورنہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس سے گھڑی کی چوتھائی میں آپریشن کا آغاز کر دینے کی فرمائش کر ڈالے۔ ایسا ہونا ممکن بھی نہیں تھا لیکن دل ایسی باتیں کب سمجھتا ہے۔ اس کا کام تو اپنی بے چینی کو جسم کے باقی حصوں میں منتقل کر دینا ہوتا ہے۔ شہریار کے دل نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ وہ بظاہر پُرسکون بیٹھا ہوا تھا لیکن درحقیقت اس کے سارے عضلات تنے ہوئے تھے اور اس کا دماغ مسلسل گھوڑے دوڑانے میں مصروف تھا کہ ایسی کیا تدبیر کرے کہ ماہ بانو کی آزادی کا سامان ہو سکے۔

☆☆☆

آج صبح سے ماہ بانو کو ڈیرے پر کچھ غیر معمولی سی ہلچل محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی اپنی رائفل کو تیل دے رہا تھا تو کوئی میگزین کی پٹی چیک کر رہا تھا۔ اسلم سمیت آٹھ دس افراد ایسے تھے جو زیادہ مصروف نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے صبح اٹھتے ہی ٹھیک ٹھاک ورزش کی تھی اور پھر ڈٹ کر ناشتا کرنے کے بعد اپنے اسلحے کے ساتھ مصروف ہو گئے تھے۔ دوپہر کا کھانا معمول سے کچھ جلدی کھایا گیا تھا اور کھانے کے بعد قیلولہ کر کے وہ آٹھ دس افراد لباس کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اپنے جسم پر اسلحہ سجانے لگے تھے۔

آج اسلم نے بھی اپنی جینز اور ٹی شرٹ کو ترک کر کے سب کی طرح سیاہ گھیر دار شلوار قمیص پہنا تھا۔ اس تبدیلی کی وجہ صاف سمجھ آ رہی تھی۔ یقیناً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس کے حلیے کی وجہ سے اس کے باقی ساتھیوں سے الگ شناخت کیا جا سکے۔ ان ساری تیاریوں کو دیکھ کر ماہ بانو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ ڈاکوؤں کے ڈیرے پر تھی اس لیے اس کے لیے ان تیاریوں کو دیکھ کر یہ سمجھنا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ وہ لوگ کسی واردات کے لیے جا رہے ہیں۔ اسے اسلم کا اس مہم میں شامل ہونا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اگرچہ حقیقت یہ بھی کہ اسلم بھی ایک ڈاکو تھا اور کافی عرصے سے ان ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر ڈاکے ڈال رہا تھا لیکن اس نے اسلم کا جو اصل روپ دیکھا تھا، اسے دیکھنے کے بعد اس کا دل اسے ڈاکو ماننے کے لیے قطعی تیار نہیں ہوتا تھا۔ حالات کی ستم ظریفی اسے یہاں لے آئی تھی تو یہ بھی ممکن تھا کہ قسمت کی مہربانی اسے یہاں سے نکال لے جاتی۔ قسمت کی اس مہربانی تک اگر وہ اپنے کھاتے میں مزید جرائم درج نہ کرواتا تو یہی بہتر ہوتا لیکن وہ اسلم کو روک بھی کس ناتے سے سکتی تھی۔ بے شک وہ اسے بہت چاہتا تھا اور اس چاہت میں کچھ بھی کر سکتا تھا لیکن کسی کی چاہت سے فائدہ اٹھانے یا اپنی بات منوانے کا حق تو اسی کو ہوتا ہے جو خود بھی جواب میں اسے اتنا ہی چاہے۔ کم از کم ماہ بانو تو یہی سمجھتی تھی چنانچہ اسے اسلم کو روکنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ اسلم خود ہی روانگی سے کچھ دیر قبل اس کے پاس آیا۔ جینز اور ٹی شرٹ کی طرح اس پر سیاہ گھیر دار شلوار قمیص بھی کافی جچ رہا تھا لیکن ماہ بانو نے اسے اس لباس میں پسند نہیں کیا۔ یہ لباس ان ڈاکوؤں کی پہچان تھا جو بلاتفریق ہر کسی کو لوٹ لیتے ہیں۔ لٹنے والا کوئی سرمایہ دار ہے یا وہ ریٹائرڈ باپ جس نے اپنی کل پونجی بیٹی کی رخصتی کے لیے سنبھال رکھی ہے، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔

’’تم سمجھ تو گئی ہو گی کہ یہاں کیا سلسلہ چل رہا ہے۔ بس کچھ دیر بعد میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہونے والا ہوں۔‘‘ اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑا وہ یہ جملے کہتے ہوئے اس سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔

’’تمہارا جانا ضروری ہے کیا؟‘‘ ماہ بانو نے اس سے دھیمی آواز میں پوچھا۔

’’ہاں، ضروری ہے۔ کب کس جگہ کس کس کو جانا ہے، اس بات کا فیصلہ سردار کرتا ہے اور ہم میں سے کوئی سردار کے فیصلے کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔‘‘ اس نے بتایا پھر کچھ چونک کر پوچھنے لگا۔ ’’کہیں تم میرے جانے سے اس لیے تو پریشان نہیں ہو کہ میری غیر موجودگی میں کوئی یہاں تم سے بدتمیزی کرے گا؟‘‘

’’نہیں..... جس سے زیادہ خطرہ رہتا ہے وہ تو تمہارے ساتھ ہی جا رہا ہے۔‘‘ اس کا اشارہ جمرو کی طرف تھا۔ سردار نے اس مہم کے لیے اس کا نام بھی منتخب کیا تھا۔

’’پھر...... پھر تم کیوں نہیں چاہتیں کہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ جاؤں؟‘‘ اس نے حیرت سے پوچھا۔

’’کیونکہ تم جنہیں اپنا ساتھی کہتے ہو، وہ حقیقت میں تمہارے ساتھی نہیں ہیں۔ تم ان سب سے بہت مختلف ہو۔‘‘

’’میں ان سے مختلف تھا لیکن اب نہیں رہا۔ اب تو میں انہی کا حصہ ہوں۔‘‘ اس نے فوراً ہی ماہ بانو کی تردید کی۔

’’تم نے کبھی تیل اور پانی کو ایک ہوتے دیکھا ہے اسلم؟ ان دونوں چیزوں کو اگر ایک برتن میں ڈال بھی دو تو یہ

ایک نہیں ہوتے۔ پانی پر تیل کی تہ الگ نظر آنے لگتی ہے۔ تم بھی ان کے درمیان رہ ضرور رہے ہو لیکن حقیقت میں ان کے ساتھ یکجان نہیں ہوئے ہو۔ تم چاہو تو اب بھی ان سے الگ ہو سکتے ہو۔‘‘ وہ اسے اپنی محبت کا واسطہ دے کر نہیں روک سکتی تھی لیکن جو سچ تھا، وہ تو سمجھا سکتی تھی۔ چنانچہ کہے بغیر رہ نہیں سکی۔

’’میں ابھی اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ ابھی سردار سے آخری ہدایات لینے کے لیے اس کے پاس بھی جانا ہے اس لیے بہتر ہے کہ تم اس بحث کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھو۔‘‘

اسلم نے اس کے پاس مزید گفتگو کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ اس کا جواب سن کر وہ چپ سادھ گئی۔ وہ خود ہی ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ ’’اب اجازت دو۔ جانے پھر دوبارہ ہماری ملاقات ہو بھی سکے یا نہیں۔ میں روانگی سے پہلے تم سے ملنے اسی لیے آیا تھا کہ تمہارا چہرہ اپنی آنکھوں میں سما کر لے جا سکوں۔‘‘ اس کے لہجے میں وہی آنچ تھی جو اس کی دیوانی محبت کا اظہار بن جاتی تھی۔ ماہ بانو کی مجبوری تھی کہ اسے اس محبت سے نظریں چرا کر ہی رہنا پڑتا تھا البتہ اس نے اتنا ضرور پوچھ لیا۔

’’کیا کسی بہت خطرناک کام کے لیے جا رہے ہو؟‘‘

’’ہمارا کام ہے ہی خطرے کا۔ بس اتنا ہوتا ہے کہ کہیں خطرہ زیادہ ہوتا ہے اور کہیں کم۔ آج ہم جہاں جا رہے ہیں، وہاں ذرا زیادہ مشکل پیش آ سکتی ہے۔‘‘ اس نے بتایا۔

’’افسوس کہ میں تمہیں یہ دعا بھی نہیں دے سکتی کہ جس کام کے لیے جا رہے ہو اس میں کامیابی حاصل کرو۔‘‘ ماہ بانو نے تاسف کا اظہار کیا۔

’’میں تمہیں مجبور بھی نہیں کروں گا۔ یوں بھی دعا ہونٹوں پر بہت بعد میں آتی ہے، دل پہلے سے خود ہی دعا گو ہو جاتا ہے اور اصل بات ہوتی ہی دل کی ہے۔ میرا تمہارے دل پر تو یوں بھی اختیار نہیں ہے۔‘‘ وہ اپنی بات کہہ کر فوراً ہی اس کے سامنے سے ہٹ گیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔ ماہ بانو کی نظریں اس کے دور ہوتے وجود پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ خوب صورت شخصیت کے مالک اسلم کے قدموں کی جنبش میں بڑی مضبوطی تھی۔ اس کا اٹھتا ہر قدم بتا رہا تھا کہ وہ اپنے جسم میں شیر کا سا دل رکھتا ہے اور کوئی خطرہ اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ پیدا نہیں کر سکتا۔

’’اے اللہ...... اس شخص کو زندہ سلامت یہاں واپس لانا۔‘‘ ماہ بانو کے دل نے بے ساختہ ہی دعا کی۔ اگر اسلم کو اس کی دعا کی خبر ہو جاتی تو وہ پھولے نہیں سماتا۔ وہ تو اس وقت صرف دو باتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایک آج کی مہم کے بارے میں جو یقیناً کچھ دشوار ثابت ہوتی اور دوسرے ماہ بانو کے بارے میں۔ اگر آج اسے کچھ ہو جاتا تو ماہ بانو کے لیے ڈیرے پر بڑی مشکلات کھڑی ہو جاتیں۔ عورت کے وجود کو ترستے ہوئے اس کے ساتھی اس کی موت کی صورت میں کبھی بھی ماہ بانو کو نہیں بخشتے اور اسلم جانتا تھا کہ اس لڑکی کے لیے اپنی عزت کا جوہر کھو دینا سب سے زیادہ اذیت ناک تجربہ ہو گا۔ سردار کی جھونپڑی میں ہدایتیں سنتے ہوئے بھی اس کا ذہن مسلسل اس مسئلے پر غور و فکر کر رہا تھا۔

’’آج کی کارروائی میں اسلم تم لوگوں کا سردار ہو گا۔‘‘ ساری ہدایات جاری کر دینے کے بعد سردار نے اعلان کیا اور مزید بولا۔ ’’تم میں سے ہر ایک کو اسلم کی کل بالکل ایسے ہی سننی ہو گی جیسے یہ اسلم نہیں میں ہوں۔‘‘ یہ جملہ کہتے ہوئے سردار نے بطور خاص جمرو کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اس ہدایت کو سن کر اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

’’تم سب باہر جاؤ، میں اسلم سے اکیلے میں بات کروں گا۔‘‘ آخر میں سردار نے حکم سنایا تو سب لوگ ایک ایک کر کے باہر نکل گئے۔ صرف اسلم اپنی جگہ پر رکا رہا۔

’’خیال رکھنا اسلم! اس کارروائی میں زیادہ مال ہاتھ آئے یا نہیں، کام اس طرح سے کرنا کہ واردات بڑی نظر آئے۔ اس کام کے لیے اپنا معاوضہ ہم وصول کر چکے ہیں۔ جو مال اوپر سے ہاتھ لگا وہ ہمارا بونس ہو گا۔ اس کے لیے کسی کو بھی زیادہ لالچ میں نہیں پڑنے دینا۔ جمرو اور جیدا ذرا زیادہ لالچی فطرت کے ہیں۔ ان دونوں پر خاص نظر رکھنا۔ عورت کے معاملے میں، میں پہلے ہی سختی سے کہہ چکا ہوں کہ کسی کو لالچ نہیں دکھانا ہے۔ اگر ان لوگوں میں سے کوئی زیادہ سرکشی دکھائے تو میری طرف سے تجھے اجازت ہے کہ اس سے جتنی چاہے سختی سے نمٹنا۔‘‘ سردار نے اسے اختیارات سونپے۔

’’فکر نہیں کرو سردار! جیسا تم نے کہا ہے، سب ویسے ہی ہو گا۔ میں کسی کو تمہاری ہدایات کے خلاف پر بھی نہیں مارنے دوں گا۔ لیکن تمہیں بھی میری ایک بات ماننی پڑے گی۔‘‘

’’وہ کیا؟‘‘ اسلم کا مطالبہ سن کر سردار چونکا۔

’’کوئی زیادہ بڑی فرمائش نہیں ہے۔ میں تم سے ماہ بانو کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’واپس آ کر بات کر لینا۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔'' سردار نے کچھ جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔

''ابھی تو وقت ہے بات کرنے کا۔۔۔۔ بعد میں جانے کیا ہو؟ ہمارے کام کا کوئی بھروسا تو ہے نہیں۔ کیا خبر واپس آنا نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں۔''

''تو ڈر رہا ہے اسلم؟'' سردار نے اچنبھے سے پوچھا۔

''ڈر نہیں رہا، حقیقت پسندی سے کام لے رہا ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اچھا بول، کیا گل ہے؟'' سردار نے بے نیازی سے پوچھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو تم ماہ بانو کا پورا خیال رکھنا۔ میرے بعد اس کی عزت پر کوئی آنچ نہیں آنا چاہیے۔ اگر کبھی تمہیں لگے کہ یہ کام مشکل ہے تو پھر بے شک ماہ بانو کو گولی مار دینا لیکن اسے للی اور حمیداں نہ بنانا۔'' سردار سے یہ سب کہتے ہوئے اسلم کی آواز لرز رہی تھی۔

''تو فکر نہ کر۔۔۔۔ میں خیال رکھوں گا۔ ویسے تو مجھے بھی علوم ہے کہ میرا شیر ناکام نہیں رہے گا۔ ابھی کسی ماں نے وہ لال نہیں جنا جو میرے شیر کے مقابلے میں کھڑا ہو سکے۔ تو جا، میں ادھر تیرا انتظار کر رہا ہوں۔ تجھے تیری ماہ بانو بالکل چنگی بھلی ملے گی۔'' سردار نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر یقین دہانی کروائی تو وہ مطمئن ہو کر باہر نکل گیا۔ باہر اس کے ساتھی اس کے منتظر تھے۔ قریب ہی وہ گھوڑے بھی کھڑے تھے جن پر سوار ہو کر انہیں یہاں سے جانا تھا۔ ان تازہ دم گھوڑوں کو مالش وغیرہ کر کے خصوصی طور پر تیار کیا گیا تھا۔

جیسے ہی اسلم باہر نکل کر اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا، باقی ساتھی بھی الرٹ ہو گئے اور اس کے رکاب میں پیر رکھتے ہی خود بھی اپنے گھوڑوں پر سوار ہونے لگے۔ جنگل کے ماحول سے آشنا گھوڑوں نے تیزی سے اپنا سفر شروع کر دیا۔ رات کا اندھیرا اس سفر میں قطعی رکاوٹ نہیں تھا کہ سواری اور سوار دونوں اس ماحول میں رچ بس چکے تھے اور انہیں ان راستوں پر چلنے کے لیے روشنی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ گھپ اندھیرے میں اپنے تجربے کی بنیاد پر سفر جاری رکھ سکتے تھے اور آج تو خوش قسمتی سے چاندنی رات تھی۔ گھنے جنگل میں درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر آتی چاندنی نے ان کے راستے کو نیم روشن کر رکھا تھا۔

وہ بڑی خاموشی سے سفر کر رہے تھے۔ ان کی منزل طے شدہ تھی اور کام کا طریقہ کار بھی، اس لیے فی الحال انہیں ایک دوسرے سے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جنگل کی ان راہوں میں جنگلی جانوروں کے بولنے اور ہوا کی سرسراہٹوں کے علاوہ اگر کوئی آواز سنائی دے رہی تھی تو وہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز تھی۔ ایک آہنگ سے سنائی دینے والی ان آوازوں نے فطرت کی آوازوں کے ساتھ مل کر موسیقی کا روپ دھار لیا تھا لیکن یہ وہ موسیقی نہیں تھی جس سے سننے والے کو خوشی اور سکون کا احساس ہو۔ یہ ہارر فلموں میں ماحول کی خوفناکی کے تاثر کو مزید گہرا کر دینے والی موسیقی تھی لیکن وہ سارے کے سارے اس کی خوفناکی سے بے نیاز تھے کیونکہ وہ خود بہت خوف ناک تھے اور ان کی دہشت اردگرد کے دیہاتوں کے رہائشیوں کے دل لرزا دیتی تھی۔ وہ جہاں جاتے تھے وہاں کے لوگوں کی جان، مال اور عزت خطرے میں پڑ جاتی تھی۔

ڈیڑھ گھنٹے کے قریب سفر کرنے کے بعد وہ ایک مقام پر رک گئے۔ رکنے کے بعد اسلم نے اپنی جیب سے ٹارچ نکالی اور اس کا رخ شمال کی طرف کر کے وقفے وقفے سے تین بار جلائی بجھائی۔ جب تیسری بار جلنے کے بعد ٹارچ بجھی تو شمال کی طرف سے روشنی کی ایک لکیر سفر کرتی ہوئی ان کی طرف آئی۔ یہ کسی کے ہاتھ میں روشن پنسل ٹارچ کی روشنی تھی۔ اس روشنی کے نظر آتے ہی اسلم اور اس کے دو تین ساتھیوں نے اپنی ٹارچیں روشن کر لیں۔ اب ماحول اتنا روشن تھا کہ وہ ایک دوسرے کی شکلیں بھی دیکھ سکتے تھے۔ پنسل ٹارچ روشن کرنے والا تنہا نہیں تھا، اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی موجود تھا۔

''جیپیں ریڈی ہیں؟'' اسلم نے دریافت کیا۔

''ہنڈریڈ پرسنٹ۔'' جواب ملا اور اس کی طرف چابیاں اچھال دی گئیں۔ اسلم نے پھرتی سے انہیں کیچ کر لیا اور ایک چابی اپنے پاس رکھنے کے بعد دوسری جمرو کی طرف اچھال دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ایک جیپ وہ خود چلائے گا جبکہ دوسری جمرو کو چلانی ہوگی۔ چابیوں کی وصولی کے بعد وہ لوگ گھوڑوں سے نیچے اترے اور ایک طرف کھڑی جیپوں کی طرف بڑھ گئے۔ یہاں سے آگے انہیں جیپوں میں سفر کرنا تھا۔ ان کی واپسی تک ان کے گھوڑے یہیں رہتے۔ جن افراد نے انہیں جیپیں فراہم کی تھیں وہ ان کی واپسی تک گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتے اور پھر ان کے حوالے کر دیتے۔ یہ ان لوگوں کا مخصوص طریقہ کار تھا۔ اگر انہیں اردگرد کے کسی دیہات میں کارروائی کرنی ہوتی تو اپنے گھوڑوں پر دندناتے ہوئے دیہاتوں میں گھس جاتے لیکن اگر دیہاتوں سے ہٹ کر کسی چھوٹے یا بڑے شہر میں جانا ہوتا تو جیپوں کا استعمال لازمی تھا۔ ان جیپوں کا انتظام وہ کسی نہ کسی طرح کر لیتے تھے۔ ان کے اپنے ذرائع بھی تھے اور کبھی کام لینے والی پارٹی بھی سہولت فراہم کر دیتی تھی۔ اسلم نے اشارہ کیا تو وہ سب ایک ایک کر کے جیپوں میں سوار ہونے لگے۔ اسلم کھڑا نگرانی کرتا رہا اور آخر میں ان دونوں افراد سے جنہوں نے انہیں جیپیں فراہم کی تھیں، ہاتھ ملا کر خود بھی ایک جیپ میں سوار ہو کر اس کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ کچھ دیر کے لیے رک جانے والا ان کا سفر دوبارہ شروع ہوا تو بے شک سواری بدل گئی تھی لیکن ان کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ سب اب بھی بالکل خاموش تھے۔ ماحول کی ہولناکی بھی قائم تھی، فرق پڑا تھا تو صرف اتنا کہ اب گھنے درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اور چونکہ وہ جنگل سے باہر نکلتے جا رہے تھے اس لیے جنگلی جانوروں کی آوازیں آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھیں اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی جگہ انجن کی گھرر گھرر نے لے لی تھی۔ وہ اپنے اس سفر کو اتنا خفیہ رکھنا چاہتے تھے کہ انہوں نے احتیاطاً ہیڈ لائٹس بھی آن نہیں کی تھیں اور صرف چاند کی روشنی میں سفر کر رہے تھے۔ تیز رفتار جیپیں راستے کی طوالت کو بڑی خوبی سے طے کرتی چلی جا رہی تھیں۔

آخر کار وہ نورکوٹ کی حدود میں داخل ہو گئے۔ نورکوٹ میں ان کا رخ اس بنگلے کی طرف تھا جس میں شہریار رہائش پذیر تھا۔ بنگلے سے کچھ فاصلے پر انہوں نے اپنی جیپیں روک لیں۔ دونوں جیپیں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھیں۔ چونکہ وہ طے شدہ منصوبے پر عمل کر رہے تھے اس لیے انہیں کسی پریشانی کا سامنا نہیں تھا۔ جس جیپ کو جمرو ڈرائیو کر رہا تھا، اس میں سے تین افراد اترے اور بنگلے کی عقبی دیوار کی طرف بڑھ گئے۔ دیوار کی اونچائی اچھی خاصی تھی اور کوئی شخص اکیلا اپنے بل بوتے پر اسے نہیں پھلانگ سکتا تھا۔ ان تین میں سے ایک اکڑوں بیٹھ گیا اور دوسرا اس کے شانوں پر پیر جما کر کھڑا ہو گیا۔ اکڑوں بیٹھا ہوا شخص آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے کھڑے ہونے کے نتیجے میں اس کے شانوں پر سوار آدمی کے ہاتھ بلند دیوار کی منڈیر کو پکڑنے کے لائق ہو گئے لیکن دیوار پر خاردار تار بچھے ہوئے تھے چنانچہ جیسے ہی اس نے منڈیر کو پکڑ کر خود کو اوپر اٹھانا چاہا، اس کی انگلیوں میں لوہے کے کئی تار چبھ گئے۔ اس نے زیر لب ایک بڑی سی گالی دیتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو جھٹکے سے پیچھے ہٹایا اور پھر اپنے سر پر موجود بڑے سے پگڑ کو کھولنے لگا۔ پگڑ کھول کر اس نے اسے دیوار پر بچھایا۔ پگڑی کے تہ دار کپڑے نے کافی آسانی پیدا کر دی اور وہ زور لگا کر اوپر کی طرف اٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ دیوار کے اوپر تھا۔

دیوار پر چڑھنے سے قبل اس نے بنگلے کے گیٹ پر بجنے والی گھنٹی کی آواز سنی تھی اور وہ سمجھ گیا تھا کہ فرنٹ پر موجود اس کے ساتھی حرکت میں آ گئے ہیں۔ ڈور بیل بجانے کا مقصد بنگلے کے چوکیدار کا دھیان بٹانا تھا۔ چوکیدار کے بارے میں انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ رات بھر بنگلے کے احاطے کا وقفے وقفے سے چکر کاٹتا رہتا ہے۔ بیل کی آواز سن کر وہ مین گیٹ کی طرف چلا جاتا تو وہ آسانی سے عقبی دیوار پھاند کر بنگلے کے احاطے میں داخل ہو جاتا۔

بنگلے میں چوکیدار ہی وہ واحد شخص تھا جو مسلح رہتا تھا۔ باقی ملازمین روزمرہ کے کام انجام دیتے تھے اور انہیں اسلحہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چوکیدار کے علاوہ مزید حفاظتی عملہ رکھنا شہریار نے خود پسند نہیں کیا تھا چنانچہ انہیں بس اسے ہی سب سے پہلے قابو کرنا تھا۔ عقبی سمت میں چوکیدار کی غیر موجودگی کی یقین دہانی ہو جانے کے بعد اس نے دیوار پر سے چھلانگ لگا دی۔ یہ ایک نپی تلی چھلانگ تھی چنانچہ معمولی سی ہی آواز پیدا ہوئی۔ اس کے دیوار پھلانگ جانے کے بعد

قابل شرم

نئی نویلی دلہن کو اپنے شوہر سے محبت تو بہت تھی لیکن اسے یہ بات کچھ زیادہ اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی کہ ہر جگہ اسے سرکار میاں کی دلہن کہا جائے۔

ایک روز اس نے شوہر کے دفتر میں اپارٹمنٹ کے کرائے کے لیے فون کیا۔ اتفاق سے شوہر موجود نہیں تھا۔ فون دفتر کے بوڑھے سپرنٹنڈنٹ نے وصول کیا۔

پوری بات سن کر اس نے کہا۔ ''اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو مجھے سرکار میاں کی دلہن سے گفتگو کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔''

نئی نویلی دلہن نے بگڑ کر کہا۔ ''میرا نام افروزہ ہے۔'' اور فون رکھ دیا۔

سرکار میاں دفتر واپس آیا تو اسے میز پر سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ کا پرچہ رکھا ہوا ملا، لکھا تھا۔

''کسی افروزہ نے تمہیں اپارٹمنٹ کا کرایہ ادا کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ کتنی شرم کی بات ہے۔ میں تو تمہیں اچھا آدمی سمجھتا تھا۔''

عمران اللہ، ایبٹ آباد

WWW.PAKSOCIETY.COM

ان کا تیسرا ساتھی بھی اسی ترکیب کے مطابق اوپر چڑھا اور اس کے قریب ہی چھلانگ لگا کر بنگلے کے اندر پہنچ گیا۔ اب ان کا رخ بنگلے کے مین گیٹ کی طرف تھا۔ وہ دبے قدموں سے چلتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ چند قدم آگے جاتے ہی انہیں چوکیدار نظر آ گیا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا ان شریر لڑکوں کو کوس رہا تھا جن کو رات کے اس پہر بھی چین نہیں تھا۔ اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ اس طرح گھنٹی بجا کر اسے گیٹ تک دوڑانے والے علاقے کے شریر لڑکے نہیں بلکہ گھاگ ڈاکو ہیں۔ اپنی ہی دھن میں چلتا ہوا وہ بالکل بے خبری میں گھات لگا کر بیٹھے ان ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا جو اس کے لیے پروانۂ اجل بن کر آئے تھے۔ ان میں سے پہلے دیوار پھلانگنے والے نے جھپٹ کر اس کی گردن پکڑی اور اس زور سے جھٹکا دیا کہ وہ دوسرا سانس بھی نہیں لے سکا اور کھٹ کی آواز کے ساتھ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ قاتل ڈاکو لاش کو سنبھال کر ایک طرف دیوار کے ساتھ لٹانے میں مصروف ہو گیا جبکہ اس کا ساتھی تیزی سے مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا اور گیٹ کی کنڈی کھول کر اسے پوری طرح سے وا کر دیا۔ گیٹ کھلتے ہی باہر منتظر ان کے ساتھی ڈاکو تیزی سے اندر آنے لگے۔ اندر آ کر ان میں سے کچھ تو سرونٹ کوارٹرز کی طرف بڑھ گئے جبکہ کچھ نے بنگلے کی مرکزی عمارت کا رخ کیا۔ پیدل اندر داخل ہونے والوں میں اسلم اور جمرو شامل نہیں تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کے اندر آنے کے بعد آخر میں جیپوں سمیت اندر آئے۔ جیپیں اندر آتے ہی گیٹ ایک بار پھر بند کر دیا گیا۔ اسلم اور جمرو جیپوں سے چھلانگ لگا کر اترے اور اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ جا ملے جو مرکزی عمارت کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے پاس موجود ساز و سامان کی مدد سے دروازے کا لاک بڑی مہارت سے کھول لیا تھا اور اب مزید ہدایات کے منتظر تھے۔

"تم دونوں پیچھے کی طرف جا کر دھیان رکھو۔ باقی لوگ میرے ساتھ اندر جائیں گے۔" اسلم نے اپنے دو ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے حکم دیا اور خود دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ اس کے باقی ساتھی اس کے پیچھے تھے۔

"تم کچن کی طرف جاؤ۔" اندر پہنچ کر اس نے جیدے نامی ڈاکو کو حکم دیا۔ جیدے کو اس نے کچن کی طرف اس لیے بھیجا تھا کہ ان کے پاس موجود معلومات کے مطابق ملازمین میں سے صرف بٹلر وہ واحد شخص تھا جو سرونٹ کوارٹرز کے بجائے کچن سے ملحق کمرے میں رہتا تھا اور دن ہو یا رات کے کسی بھی حصے میں خدمت بجالانے کو تیار رہتا تھا۔ بٹلر کی طرف سے کسی گڑبڑ سے بچنے کے لیے اسے پہلے سے قابو کر لینا ضروری تھا۔

"تم لوگ نیچے کے کمروں کی تلاشی لے کر جو بھی قیمتی مال ہاتھ لگے، اسے جمع کر لو۔ ہم تینوں اوپر جائیں گے۔" جمرو اور ایک دوسرے ساتھی کو اپنے ساتھ اوپر جانے کا فیصلہ سنا کر اس نے باقی لوگوں کو حکم دیا تو وہ سب خودکار انداز میں حرکت میں آ گئے۔ اسلم نے اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد خود اوپر کا رخ کیا۔ جمرو اور دوسرا فرد اس کے حکم کے غلام بنے اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

وہ ابھی سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچے ہی تھے کہ انہیں شب خوابی کے لباس میں ملبوس شہریار ایک کمرے کے دروازے سے باہر آتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹے سائز کا پسٹل تھا۔ یقیناً اس نے بنگلے میں جاری سرگرمیوں کے نتیجے میں ہونے والی معمولی کھٹ پٹ کی آہٹ پالی تھی اور اب پسٹل ہاتھ میں لیے جائزہ لینے باہر نکل رہا تھا۔ باہر آتے ہی اس کی نظر اسلم اور اس کے ساتھیوں پر پڑ گئی تھی۔ تین نقاب پوشوں کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹکا اور قریب تھا کہ ردعمل کے طور پر فوراً فائر کر دیتا کہ اسلم نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اس کی چلائی ہوئی گولی نے شہریار کے ہاتھ میں موجود پسٹل کو دور جا گرایا۔ فائر بے آواز تھا اس لیے کسی بیرونی مداخلت کا امکان پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"اسمارٹ بننے کی ہرگز بھی کوشش مت کیجیے گا اے سی صاحب! میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ آپ کو اپنی کسی بھی حرکت کے نتیجے میں گولی کھانی پڑے گی اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ کسی ہتھیار سے نکلنے والی گولی آدمی کے جسم میں چھید کر کے اسے عالم بالا بھی پہنچا سکتی ہے، ورنہ کم از کم بھی زخمی ہونے اور خون بہنے کا امکان تو ہوتا ہی ہے۔" شہریار کی نظروں نے پسٹل ہاتھ سے نکلتے ہی اس سمت میں سفر کیا تھا جہاں پسٹل جا کر گرا تھا۔ چنانچہ اسلم نے فوراً ہی اسے تنبیہ کر ڈالی۔

"کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟" نہایت ہموار لہجے میں اس سے یہ سوال کرتے ہوئے شہریار کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کی دھمکی سے قطعی خوف زدہ نہیں ہوا ہے۔

"ہم کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں یہ آپ ہمارے واپس جانے تک جان لیں گے۔ فی الحال آپ واپس اندر چلیں۔"

اس نے ریوالور کی نال سے اشارہ کرتے ہوئے اسے حکم دیا جس کی شہریار نے خاموشی سے پیروی کی۔ اسلم اور جمرو اسے زد میں لیے ہوئے خود بھی پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے جبکہ ان کا تیسرا ساتھی پہلے ہی اندر جا چکا تھا اور اس نے بیڈ پر ٹانگیں سمیٹ کر خوف زدہ سی بیٹھی ہوئی ماریا کو زد میں لیا ہوا تھا۔ گلابی بھین نائٹی میں اپنے سنہری کھلے بالوں کے ساتھ بیٹھی ماریا کے وجود میں کسی مرد کی توجہ کھینچ لینے کا پورا سامان تھا۔ جمرو کی نظر اس کے وجود پر پڑی تو وہیں چپک کر رہ گئی۔

"لاکر کی چابیاں ہمارے حوالے کر دیں۔ ہم یہاں سے صرف نقدی اور زیور لے کر جائیں گے۔ آپ نے ہمارے کام میں مداخلت نہیں کی تو مالی نقصان کے علاوہ دوسرا کوئی نقصان نہیں اٹھائیں گے۔ دوسری صورت میں ہر قسم کے نتائج کی ذمے داری آپ پر ہی ہوگی۔" رواں لہجے میں بولتا ہوا وہ شہریار کو مسلسل چونکا رہا تھا لیکن اس نے اپنے چہرے کے تاثرات سے اس بات کا اظہار نہیں ہونے دیا اور پُرسکون لہجے میں بولا۔

"او کے، تم جو لے جانا چاہتے ہو لے جاؤ۔ ہم تمہارے لیے کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کریں گے۔" اسلم سے یہ کہنے کے بعد اس نے ماریا کی طرف رخ کیا اور بولا۔

"چابیاں دے دو۔"

اس کا حکم سن کر ماریا نے جھک کر بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی دراز کھولی اور اس میں سے سیاہ رنگ کا اسٹائلش سا پرس نکالا۔ پرس نکالنے کے لیے جھکنے کے نتیجے میں اس کی نائٹی کا کشادہ گریبان مزید کشادہ ہو گیا تھا۔ اس پر نظریں گاڑ کر رکھے جمرو کے جذبات اس نظارے کے بعد مزید متلاطم ہو گئے۔ ماریا نے پرس سے چابیوں کا گچھا باہر نکالا تو اس نے سب سے پہلے جھپٹ کر اس سے چابیاں لے لیں۔ چابیاں لینے سے قبل اس نے جان بوجھ کر ماریا کے ہاتھ کو زور سے دبایا اور نرم گداز ہاتھ کی گرماہٹ سے مزید اپنے جذبات کو برانگیختہ کر بیٹھا۔

"لاکر کہاں ہے؟" جمرو کی حرکت کو نظر انداز کرتے ہوئے اسلم نے ماریا سے پوچھا۔

"اندر ڈریسنگ روم میں۔" اس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ڈاکٹر صاحبہ کے ساتھ ان کے ڈریسنگ روم میں جاؤ اور نقدی اور زیورات لے آؤ۔" یہ حکم بھی جمرو کے لیے تھا۔

"چل بی بی!" اس نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ ماریا کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ وہ کچھ سہمی ہوئی سی اس کے ساتھ چل پڑی۔

"تم لوگ اپنے حق میں کچھ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ شاید تمہیں پوری طرح سے اندازہ نہیں ہے کہ تم نے ڈاکا زنی کی اس واردات کے لیے کس جگہ کا انتخاب کیا ہے۔" جمرو اور ماریا کے دروازے کے پیچھے غائب ہوتے ہی شہریار، اسلم سے مخاطب ہوتا ہوا سنجیدگی سے بولا۔

"آپ ہماری فکر نہ کریں اے سی صاحب! ہم سارا حساب کتاب کر کے ہی اپنا کام کرتے ہیں۔" اسلم نے ناک پر سے مکھی اڑانے والے انداز میں اس کی دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جواب دیا۔

"بعض اوقات آدمی کا حساب غلط بھی ہو جاتا ہے۔" شہریار بولا۔

"ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے کام میں غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی اس لیے بہت محتاط رہتے ہیں۔" اسلم کی طرف سے ترنت جواب آیا۔ شہریار سے باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس پر گہری نظر بھی رکھے ہوئے تھا اور اس کے پاس حرکت کرنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

"احتیاط کے باوجود جانے کب آدمی کی قسمت ساتھ چھوڑ جائے، کچھ کہا تو نہیں جا سکتا۔" شہریار نے اسے ڈرایا۔

"قسمت کے لکھے سے کون بچ سکتا ہے۔ جب سر پہ پڑے گی تو ہم بھی بھگت لیں گے۔" وہاں غضب کا اطمینان تھا۔

اس وقت دو ایسے افراد مدمقابل تھے جو اپنی اپنی جگہ بے حد پُراعتماد تھے اس لیے کوئی کسی کو نہیں ڈرا سکتا تھا۔

شہریار صرف اس لیے ایکشن میں نہیں آیا تھا کہ موجودہ صورتِ حال میں بہادری دکھانا بے وقوفی کے زمرے میں آتا۔ وہ محسوس کر سکتا تھا کہ جو تین افراد اس کے بیڈ روم تک آئے ہیں، ان کے علاوہ بھی کئی افراد بنگلے میں موجود ہیں۔ وہ کسی طرح ان تینوں سے نمٹ بھی لیتا تو باقی کا کیا کرتا؟ اسے ان میں سے کسی کی صحیح پوزیشن تو معلوم نہیں تھی البتہ اتنا طے تھا کہ اس کے بنگلے پر ڈاکا ڈالنے کے لیے وہ لوگ بے حد تیاری کے ساتھ آئے ہوں گے۔ وہ ماریا کی وجہ سے بھی خاموش تھا۔ ڈاکا زنی کی وارداتوں میں خواتین کے ساتھ بدسلوکی کے متعدد واقعات اس کے علم میں تھے چنانچہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کوئی حرکت ان لوگوں کو ماریا کے ساتھ بدسلوکی کا جواز فراہم کر دے۔ لیکن اس کی یہ احتیاط پسندی بیکار گئی اور ڈریسنگ روم سے ماریا کی چیخ سنائی دی۔ شہریار نے مضطرب ہو کر بے ساختہ ہی اس طرف قدم

WWW.PAKSOCIETY.COM

بڑھ جائے۔ اسلم نے اسے روکا نہیں بلکہ خود بھی تیزی سے اس جانب لپکا۔ اندر حسبِ توقع جمرو کی نیت خراب ہوگئی تھی۔ ماریا کی نائٹی کا کشادہ گلا چاک ہونے کے بعد بالکل غائب ہوچکا تھا اور سارے پوشیدہ راز عیاں کر رہا تھا۔ پھر بھی وہ جمرو کی زبردستی سے بچنے کے لیے بھرپور مزاحمت کر رہی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب کو چھوڑ دو۔'' شہریار کے کچھ کرنے سے قبل اسلم نے جمرو پر ہتھیار تانتے ہوئے اسے سرد لہجے میں حکم دیا۔

''تم اس معاملے میں نہ پڑو۔'' عورت کی طلب میں جلا وہ اس کی بات سننے کو قطعی تیار نہیں تھا۔

''تم سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہو اور اس کا انجام اچھی طرح جانتے ہو۔'' اسلم غرایا۔

''سردار کو میں خود جواب دے لوں گا۔ تم میری فکر نہ کرو۔'' اس نے باغیانہ لہجے میں جواب دیا۔

''جواب مجھے بھی سردار کو دینا ہے اس لیے ضروری ہے کہ یہاں کوئی بھی کام اس کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔'' اسلم نے اسے دھمکی دی۔

''مار سکتا ہے تو مار دے۔'' وہ گویا ضد میں آیا ہوا تھا۔ چنانچہ اس کی دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ماریا کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اس کی حرکت پر تلملا کر اسلم نے لبلبی دبا دی۔ اس کے ہتھیار سے نکلنے والی گولی جمرو کے کان کی لو اڑاتی ہوئی ایک الماری میں پیوست ہوگئی۔

''تو جانتا ہے کہ میرا نشانہ خطا نہیں جاتا۔ یہ میں نے تجھے لاسٹ وارننگ دی ہے۔ اگلی گولی تیری کھوپڑی میں چھید کرے گی۔'' کچھ گولی کی دہشت تھی اور کچھ اسلم کے لہجے کی خوفناکی کہ جمرو ماریا کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ خوف زدہ ماریا فوراً ہی ایک طرف سمٹ کر کھڑی ہوگئی۔ شہریار اس ساری کارروائی کے دوران خاموش تماشائی بنا رہا تھا۔ اس کی خاموشی کے پیچھے ایک وجہ تو یہ تھی کہ اسلم خود ہی اس صورتِ حال سے نمٹ رہا تھا اور دوسرے یہ کہ وہ مسلسل ان کے تیسرے ساتھی کے نشانے پر تھا۔ آپس میں جھگڑنے کے باوجود وہ اس کی طرف سے غافل نہیں ہوئے تھے۔

''زیور اور نقدی کہاں ہے؟'' جمرو، ماریا کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا تو اسلم نے اس سے دریافت کیا۔ جواب میں اس نے ایک جانب رکھے بیگ کی طرف اشارہ کر دیا۔

''بیگ اٹھا کر باہر جاؤ۔'' اسلم نے اپنا نیا حکم سنایا جس کی اس نے اندر ہی اندر کھولنے کے باوجود فوراً تعمیل کی۔

اسلم کے انداز نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اس سے اب مزید جھگڑا مول نہیں لیا جاسکتا تھا۔ وہ جس موڈ میں تھا، اسے گولی مارنے سے ہرگز دریغ نہیں کرتا۔

''تعاون کے لیے شکریہ اے سی صاحب! امید ہے کہ آپ نے اپنی بیگم کو شادی میں قیمتی زیورات گفٹ کیے ہوں گے اور ہماری محنت ضائع نہیں جائے گی۔ اب آپ کو ہم سے آخری تعاون کرنا ہوگا، آپ کو بے ہوش ہونا پڑے گا۔ صبح تک آپ دونوں آرام سے ہوش میں آجائیں گے اور ہم بھی بغیر کسی مداخلت کے آپ کی پہنچ سے دور نکل جائیں گے۔'' جمرو کے باہر نکلتے ہی وہ شہریار سے مخاطب ہوا اور بالکل اچانک ہی اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی بوتل باہر نکالی۔

شہریار کچھ سمجھتا، اس سے قبل ہی وہ بوتل کا رخ اس کی طرف کرکے بے ہوشی کی دوا اسپرے کر چکا تھا۔ دوا نہایت سریع الاثر تھی چنانچہ وہ فوراً ہی بے ہوش ہوگیا۔ اس کے بے ہوش ہونے کے بعد انہوں نے ماریا کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا اور پھر تیزی سے الماریوں کو الٹ پلٹ کرنے لگے۔ آدھے گھنٹے بعد جب وہ سب وہاں سے روانہ ہوئے تو اپنے کام کی کوالٹی سے پوری طرح مطمئن تھے اور نقدی اور زیورات کے علاوہ اور بھی کئی قیمتی اشیا اپنے ساتھ مالِ غنیمت کی طرح بٹور کر لے جا رہے تھے۔

☆☆☆

نورکوٹ کی وہ صبح خاصی ہنگامہ خیز تھی۔ اسسٹنٹ کمشنر شہریار کے بنگلے پر ہونے والی ڈاکا زنی کی واردات کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا جسے نظر انداز کیا جاسکتا۔ پولیس کو واردات کی اطلاع کافی تاخیر سے ملی تھی، وہ بھی اس طرح کہ جب شہریار مقررہ وقت پر دفتر نہیں پہنچا تو عبدالستان کو تشویش ہوئی۔ اپنی تقرری کے بعد سے وہ ہمیشہ وقت پر دفتر پہنچا تھا اور اگر کبھی تاخیر کا اندیشہ ہوتا تھا تو پہلے ہی سے فون کرکے آگاہ کر دیتا تھا۔ آج ایسا کچھ بھی نہ ہوا تو تقریباً ایک گھنٹا انتظار کرنے کے بعد عبدالستان نے بنگلے کے فون پر کال کی۔ دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی گئی۔ وہ مسلسل کوشش کرتا رہا لیکن نتیجہ ایک ہی تھا۔ اسے کوئی رسپانس نہیں مل رہا تھا۔ اس نے تشویش محسوس کرتے ہوئے شہریار کا موبائل نمبر ملایا، نتیجہ اب بھی وہی تھا۔ اس بار اس کی تشویش میں کئی گنا اضافہ ہوگیا اور اس نے مشابرم خان کے ساتھ خود بنگلے پر جانے کا فیصلہ کیا۔ دفتر آنے جانے کے لیے شہریار عام طور پر خود ہی گاڑی ڈرائیو کرتا تھا اس لیے اس نے مشابرم خان کو اپنے

بنگلے پر مستقل رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور وہ دفتر ہی میں رہتا تھا۔ راستے میں عبدالستان نے اسے شہریار کے بنگلے کی صورتِ حال بتائی تو وہ بھی تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ دفتر سے بنگلے کا فاصلہ یوں بھی زیادہ نہیں تھا۔ مشابرم خان کی برق رفتاری نے اسے اور بھی مختصر کر دیا۔ بنگلے کے گیٹ پر گاڑی روکنے کے بعد اس نے ہارن دیا لیکن حسبِ معمول اندر سے چوکیدار نے ذیلی دروازہ کھول کر نہیں جھانکا جس سے انہیں مزید یقین ہوگیا کہ اندر کوئی بڑی گڑبڑ ہوچکی ہے۔

''آپ ٹھہریں جناب..... میں اندر دیکھ کر آتا ہوں۔'' مشابرم خان نے عبدالستان سے کہا اور گاڑی سے اتر گیا۔ خود عبدالستان سے بھی اندر بیٹھا نہیں گیا، سو وہ بھی باہر نکل آیا۔ بند گیٹ کے قریب پہنچ کر مشابرم خان نے ذیلی دروازے کو ہلکے سے دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اپنے بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں تھامتے ہوئے وہ محتاط انداز میں اندر داخل ہوا۔ عبدالستان غیر مسلح تھا پھر بھی اس کے پیچھے ہی اندر گھس گیا۔ گیٹ کے قریب چوکیدار کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

''پچھلی طرف جاکر چوکیدار کو دیکھو۔'' عبدالستان نے اسے حکم دیا تو وہ آگے بڑھ گیا۔ خود عبدالستان نے مرکزی عمارت کا رخ کیا۔ یہاں کا دروازہ بھی صرف بھڑا ہوا تھا چنانچہ ذرا سا دھکا دینے پر کھل گیا۔ عبدالستان متذبذب سا اندر داخل ہوگیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے وہاں پھیلی بے ترتیبی نظر آگئی۔ یوں لگتا تھا کہ وہاں کوئی جنگلی جانور گھس آیا تھا جس نے ہر شے تہس نہس کرکے رکھ دی تھی۔ نچلی منزل کا یہ حال دیکھ کر وہ اوپر کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ اچھی طرح واقف تھا کہ شہریار کا بیڈ روم اوپر کی منزل پر ہے اور یہ تو ممکن نہیں تھا کہ نیچے اتنی گڑبڑ ہو تو اوپر سب ٹھیک رہے۔ وہ مضطرب سا سیڑھیوں کی طرف بڑھا پھر اسے بٹلر کا خیال آیا۔ اس کا خیال آنے پر وہ رخ موڑ کر کچن کی طرف مڑ گیا۔ بنگلے میں پھیلی خاموشی سے یہ تو صاف ظاہر تھا کہ یہ ساری تباہی پھیلانے والے وہاں سے رخصت ہوچکے ہیں اور اب ان لوگوں کا حال معلوم کرنا ہے جو اس بنگلے کے رہائشی ہیں۔ وہ کچن کے ساتھ ملحق کمرے میں پہنچا تو وہاں اسے بستر پر بٹلر کی لاش پڑی نظر آئی۔ اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر گولی کا سوراخ تھا جس نے اس کے لباس کو داغ دار کر دیا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ بے چارہ سوتے میں مارا گیا ہے۔ حقیقت میں ہوا بھی یہی تھا۔ اسلم کے حکم پر جیدا اسے بے ضرر بنانے آیا تھا اور لاش میں تبدیل کرکے چلا گیا تھا۔ حالانکہ اس سوتے ہوئے شخص کو ہاتھ پیر باندھ کر یا بے ہوش کرکے بھی گزارہ ہوسکتا تھا لیکن جیدے کی فطرت میں تشدد کا رجحان زیادہ تھا۔ وہ انسانوں کی اس قسم سے تعلق رکھتا تھا جن کے منہ کو خون لگ جاتا ہے اور وہ انسان کے بجائے درندے بن جاتے ہیں بلکہ شاید درندوں سے بھی زیادہ گئے گزرے..... کہ درندے بھی بہرحال بے وجہ قتل نہیں کرتے۔ ان کے پیشِ نظر بھی اپنے پیٹ کی آگ بجھانا یا محسوس ہونے والے خطرے سے نمٹنا ہوتا ہے۔ جیدے نے تو بے چارے بٹلر کو بے وجہ ہی قتل کر ڈالا تھا۔

''باہر چوکیدار کی لاش پڑی ہے جناب۔ اسے گردن کی ہڈی توڑ کر ہلاک کیا گیا ہے۔'' وہ بٹلر کی لاش کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ مشابرم خان وہاں پہنچ گیا اور اسے اطلاع دی۔ پھر اس کی نظر بھی لاش پر پڑ گئی۔

''خانہ خراب..... یہ بھی گیا۔'' وہ بے ساختہ ہی بولا۔

''ہاں، آؤ اوپر چل کر اے سی صاحب اور ان کی بیگم کو دیکھتے ہیں۔'' عبدالستان نے گہری سنجیدگی کے ساتھ جواب دیتے ہوئے ایک بار پھر اس راستے کا رخ کیا جہاں سے وہ سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر جاسکتے تھے۔ اس بار مشابرم خان اس کی پیروی کرتے رہنے کے بجائے نہایت پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس کی شہریار سے بے پناہ محبت کا تقاضا بھی یہی تھا اور یہ محبت یونہی نہیں تھی۔ شہریار نے خود کو اس کا اہل بھی ثابت کیا تھا۔ یہ وہی تھا جو اس کی... غیر موجودگی میں بلتستان کے اسپتال میں زیرِ علاج اس کی ماں کو

کنوارا خاندان

لارڈ خاندان کے معزز فرد کو اپنی خاندانی روایات پر بڑا ناز تھا۔ وہ ان کے متعلق ایک دوست سے بات چیت کر رہے تھے اور انہیں بتا رہے تھے کہ ہمارے خاندان میں سیاسی، ثقافتی اور دیگر روایات کیا کیا ہیں۔ ان صاحب کی عمر کوئی چالیس سال تھی مگر وہ اب تک کنوارے تھے۔ دوست نے دریافت کیا۔ ''اور کیا اس عمر تک شادی نہ کرنا بھی آپ کی خاندانی روایات میں شامل ہے؟''

لارڈ نے نہایت فخر سے برجستہ جواب دیا۔ ''آپ نے خوب سمجھا، میرا باپ بھی کنوارا تھا..... اور دادا پردادا تک کنوارے ہی مرگئے۔''

(مرسلہ: اریبہ کنول، کوئٹہ)

Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسلام آباد کے ایک جدید اسپتال میں لے آیا تھا اور اس کے علاج کے سارے اخراجات اپنی جیب سے ادا کر رہا تھا۔

وہ پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا شہریار کے بیڈ روم تک پہنچا تو اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا، البتہ کمرے کی حالت ضرور تخلی منزل کی طرح خراب تھی۔ اسے بے جان چیزوں سے کچھ لینا دینا بھی نہیں تھا، اصل فکر شہریار کی تھی لیکن وہ اور اس کی بیگم توقع کے خلاف وہاں موجود نہیں تھے۔

''اندر ڈریسنگ روم میں دیکھتے ہیں۔'' کچھ لمحوں کے توقف سے عبدالمنان بھی وہاں پہنچ گیا اور اندر کی صورتِ حال دیکھ کر بولا۔ پھر وہ دونوں ایک ساتھ ڈریسنگ روم کے دروازے کی طرف بڑھے۔ شہریار اور ڈاکٹر ماریا ڈریسنگ روم کے فرش پر رسیوں سے بندھے بے حس و حرکت پڑے تھے۔ کسی نے جاتے جاتے ماریا کے جسم پر ایک چادر ڈال دی تھی جو اسے گردن سے پیروں تک ڈھانپے ہوئے تھی۔ مشاہرم خان تڑپ کر شہریار کی طرف بڑھا۔ اس کے جسم پر کوئی زخم نظر نہ آنے کے باوجود وہ اسے بے حس و حرکت دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ قریب جا کر اس نے اس کی نبض تھامی تو زندگی کے آثار مل گئے۔

''صاحب زندہ ہیں۔ ایمبولینس بلائیں منان صاحب..... انہیں فوراً اسپتال لے جانا ضروری ہے۔'' وہ ہیجان خیز آواز میں چیخا تو پہلی بار عبدالمنان کو اپنی جیب میں موجود موبائل کو استعمال کرنے کا خیال آیا۔ ورنہ یہاں کی صورتِ حال دیکھ کر اس کا دماغ اس بری طرح ماؤف ہو چکا تھا کہ وہ ابھی تک پولیس کو کال کرنے کا بھی نہیں سوچ سکا تھا۔ مشاہرم خان کے کہنے پر اس نے یکے بعد دیگرے اسپتال اور پولیس اسٹیشن فون کر ڈالے۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر بنگلے کی خاموش فضا میں ہنگامے جاگ اٹھے۔ شہریار اور ماریا کو طبی امداد کے لیے لے جانے کے علاوہ چوکیدار اور بٹلر کی لاشیں بھی اسپتال منتقل کر دی گئیں۔ پولیس نے پورے بنگلے کی تلاشی لی تو سرونٹ کوارٹرز میں موجود ملازموں کو بھی نجات ملی۔ ان بے چاروں کو ہتھیاروں کے زور پر بے بس کر کے ہاتھ پیر باندھنے کے بعد منہ میں کپڑا ٹھونس کر معذور کر دیا گیا تھا۔ وہ نہ تو اپنے ہاتھ پیر ہلا سکتے تھے اور نہ ہی مدد کے لیے چلّا سکتے تھے۔ ہوش میں ہوتے ہوئے کئی گھنٹے اس حالت میں پڑے رہنے سے ان پر بہت برا اثر پڑا تھا اور ایک دو تو باقاعدہ آنسوؤں کے ساتھ دہاڑیں مار مار کر رونے لگے تھے۔ خصوصاً چوکیدار اور بٹلر کی موت کی اطلاع نے ملازمین میں خاصی سراسیمگی پھیلا دی تھی۔ پولیس نے ملازمین سے جو بیانات لیے اور بنگلے کی جو صورتِ حال نظر آئی، اس سے وہ یہی نتیجہ اخذ کر سکے کہ بنگلے پر ڈاکا زنی کی بڑی منظم واردات کی گئی ہے۔

اصل صورتِ حال جاننے کے لیے انہوں نے شہریار اور ماریا کے ہوش میں آنے کا انتظار کیا اور ان دونوں کے بیان نے بھی تصدیق کر دی کہ یہ ڈاکا زنی کی ہی واردات تھی۔ پولیس اپنے ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے لگی۔ ایس پی ضلع، شہریار کی آئی جی صاحب سے خصوصی وابستگی سے واقف تھا چنانچہ اس نے اپنی شبیہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں اطلاع کر دی تھی۔ کرنے کو تو عبدالمنان بھی یہ کام کر سکتا تھا لیکن اس نے شہریار کی اجازت کے بغیر ایسا کوئی قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ وہ جانتا تھا کہ شہریار کوئی بھی پریشان کن خبر اپنے فیملی ممبرز سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا تھا لیکن ایس پی کی مہربانی سے مختار مراد کو فوراً ہی خبر مل گئی۔ میڈیا والوں کو فی الحال اس معاملے سے الگ رکھا گیا تھا، اس لیے نیوز چینلز فی الحال خاموش تھے۔ ویسے بھی اس پسماندہ ضلع کی خبریں تفصیل کے ساتھ چینلز پر چلنے تک خاصا وقت لگ جاتا تھا الّا یہ کہ خبر کو نشر کرنے کے لیے خصوصی اہتمام کیا جاتا۔

مختار مراد کو واقعے کی اطلاع ملی تو اس نے فوراً شہریار کو فون کیا۔ وہ ہوش میں آچکا تھا لیکن ابھی اسپتال میں ہی تھا۔ بے ہوش کرنے کے لیے جو دوا استعمال کی گئی تھی، وہ بہت طاقتور تھی اس لیے وہ کئی گھنٹے تک ہوش میں نہیں آسکا تھا اور اب بھی ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ اسے اور ماریا کو کچھ وقت اسپتال میں گزارنا چاہیے۔ اپنی عادت سے ہٹ کر اس نے یہ مشورہ مان لیا تھا چنانچہ اس وقت اسپتال کے ایک بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔

عبدالمنان اس کے ساتھ کمرے میں موجود تھا۔ ماریا کو دوسرے کمرے میں رکھا گیا تھا کیونکہ واقعے کی اطلاع ملتے ہی کئی لوگ شہریار سے ملنے اسپتال کی طرف دوڑے آئے تھے۔ فی الحال کسی کو ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی تھی لیکن چند منٹ کے لیے سہی، اسے ان لوگوں سے ملنا تو پڑتا۔

''کیا بات ہے ینگ مین! یہ ہر تھوڑے عرصے بعد اسپتال کو رونق بخشنے کیوں پہنچ جاتے ہو؟'' مختار مراد کی کال عبدالمنان نے ریسیو کی تھی، اس کے ہاتھ سے موبائل سیٹ شہریار کے ہاتھ میں پہنچا تو اس کی ہیلو سنتے ہی مختار مراد بولا۔

''میں تو نہیں آنا چاہتا لیکن کچھ کرم فرماؤں کی مہربانیاں پہنچا دیتی ہیں۔'' اس نے بھی انہی کے انداز میں جواب دیا۔

''اسی لیے میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ محتاط رہو اور ہر معاملے میں اپنی ٹانگ نہ اڑاؤ لیکن تمہیں بھی تو چین نہیں ہے۔'' انہوں نے محبت بھری خفگی کا اظہار کیا۔

''آپ نے سچ کہا اور یقین جانیں کہ شینا اور سجاد بھائی کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچائے بغیر مجھے کسی صورت چین نہیں آئے گا..... بلکہ سچ پوچھیں تو یہ معاملہ نمٹ بھی گیا تو میں پھر بھی چین سے اس لیے نہیں بیٹھ سکوں گا کہ مجھے اپنے وطن اور ہم وطنوں سے محبت ہے۔ میں ناانصافی اور ظلم کا ساتھ دینے کی اہلیت نہیں رکھتا اس لیے ہمیشہ ظالموں کی نظر میں کھٹکتا رہوں گا۔''

''تم تو جذباتی ہو گئے یار! چلو فی الحال اس بحث کو جانے دو اور حالیہ واقعے پر بات کرو۔ ایس پی نے مجھے جو رپورٹ دی ہے، اس کے مطابق تو یہ خالصتاً ڈاکا زنی کی واردات تھی اور یقیناً اس وجہ سے کی گئی تھی کہ کسی طرح ڈاکوؤں کو یہ بھنک مل گئی ہوگی کہ تمہاری شادی پر ماریا کو بہت قیمتی زیورات چڑھائے گئے تھے۔ ایس پی کے مطابق بنگلے میں کوئی بھی قیمتی شے نہیں چھوڑی گئی ہے۔'' مختار مراد نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے خود ہی گفتگو کا رخ حالیہ واقعے کی طرف موڑ دیا۔

''لیکن میرے خیال میں یہ خالص ڈاکا زنی کی واردات نہیں ہے۔ میرے دشمن نے اس واردات کی آڑ میں مجھے پیغام دیا ہے کہ جس طرح ہم تمہارے گھر میں گھس کر تمہارا مال و اسباب لوٹ سکتے ہیں اور تمہارے ملازمین کو ہلاک کر سکتے ہیں، اسی طرح تمہاری جان اور عزت بھی ہمارے ہاتھ میں ہے۔'' اس نے مختار مراد کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا خیال پیش کیا۔

''تم یہ بات کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟ کیا تمہیں غیر ملکی ایجنسی پر شک ہے؟'' انہوں نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''نہیں، یہ اندر کے دشمنوں کا کام ہے اور میں یہ بات بے بنیاد نہیں کہہ رہا ہوں۔ میرے پاس اس کی ٹھوس وجہ موجود ہے۔ آپ کو وہ واقعہ تو یاد ہوگا جب مجھے اغوا کروا لیا گیا تھا اور میں نے بعد میں یہ شک ظاہر کیا تھا کہ میں جنگل مین ڈاکوؤں کی قید میں تھا؟'' اس نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں..... ہاں بالکل یاد ہے۔ وہ کوئی بھولنے والی بات تو ہے بھی نہیں۔'' مختار مراد نے فوراً جواب دیا۔

''میرے اغوا کے وقت جو شخص اغوا کاروں کو لیڈ کر رہا تھا، وہی شخص حالیہ واردات میں بھی ان کا لیڈر تھا۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''کیا تم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہو؟ میں یہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ تم نے دونوں وارداتوں میں جو بیان دیا ہے، اس کے مطابق تمام ڈاکو نقاب پوش تھے پھر تم کس بنیاد پر یہ دعویٰ کر رہے ہو؟'' اس نے شہریار سے وضاحت چاہی۔

''میں نے اس شخص کو اس کی شکل و صورت کی بنیاد پر نہیں بلکہ لب و لہجے سے پہچانا ہے۔ پہلی بار جب وہ مجھ سے مخاطب ہوا تھا تو میں اس کی گفتگو سن کر چونک گیا۔ اس کا لب و لہجہ صاف بتاتا ہے کہ وہ پنجاب سے تعلق نہیں رکھتا۔ جہاں تک میں اندازہ لگا سکا ہوں، وہ سندھ کے کسی علاقے کا رہنے والا ہے لیکن میں یہ بات بھی پورے یقین سے اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ وہ بہت صاف ستھری اردو بول رہا تھا اور اس کے طرزِ گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ میری رہائش گاہ پر جب وہ دوبارہ مجھ سے ٹکرایا تو میں چونک پڑا اور میں نے اس کی قد و قامت اور باڈی لینگویج پر غور کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی شخص ہے جو میرے اغوا میں بھی ملوث تھا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ڈاکوؤں کے جتھے میں موجود کسی منفرد خصوصیات کے شخص کو شناخت کرنا میرے لیے اتنا مشکل ثابت نہیں ہوا ہوگا۔'' اس نے اپنے دعوے کے حق میں دلائل دیے تو مختار مراد بھی قائل ہو گیا۔

''میں تمہاری بات بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ یہ دشمنی کا وہی سلسلہ ہے جو شاید تم نے اپنی جاب کے پہلے دن سے مول لیا تھا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن میں آپ کو صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ پہلے تو میں نے مصلحتاً کافی مروت سے کام لیا تھا مگر اب میرے پاس ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں اپنے اوپر پے در پے کیے جانے والے اٹیکس کے بعد بھی خاموش رہ کر یہ تاثر نہیں قائم کرنا چاہتا کہ میں کسی سے کمزور ہوں۔ میرے پاس اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے قانونی راستہ بھی ہے اور دوسرا بھی۔ اگر قانون نے میرا ساتھ نہیں دیا تو مجھے مجبوراً دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔'' یہ ایک واضح دھمکی تھی جسے سمجھنا مختار مراد کے لیے مشکل نہیں تھا۔

''کوئی بھی جذباتی قدم نہیں اٹھانا شہریار! میں آپریشن کی تیاریاں کروا رہا ہوں اور یقین کرو کہ تمہارے گھر پر ہونے والی واردات آپریشن کے فیصلے کے لیے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی ہے۔ اب میرے پاس اتنے ٹھوس جواز جمع ہو گئے ہیں کہ کوئی مجھے کارروائی کرنے سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں روک سکتا۔" وہ اسے کسی بھی عمل سے باز رکھنے کے لیے سمجھانے لگا۔

"مجھے آپ سے یہی امید تھی انکل! بس اب آپ جلدی سے ایکشن میں آ جائیں۔ میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے یہاں تیار بیٹھا ہوں۔" اس نے عثمار مراد کے فیصلے کو سراہا اور ایک طرح سے یہ اشارہ بھی دے دیا کہ ان کی طرف سے کارروائی شروع ہونے تک وہ خود خاموش رہے گا لیکن خود اس کا ذہن سوال کر رہا تھا کہ ڈاکوؤں کے ڈیرے پر آئی جی عثمار مراد آپریشن شروع کروا بھی دے گا تو اس سے چودھری کی صحت پر کیا اثر پڑے گا؟ وہ ایک گروہ کی بیخ کنی کے بعد دوسرا گروہ پال لے گا۔ دوسرے یہ کہ آپریشن شروع ہوتے ہوئے بھی کچھ دن لگ جاتے جبکہ وہ چودھری کو فوری طور پر منہ توڑ جواب دینا چاہتا تھا۔ یہ جواب دینے کے لیے اس کے پاس ایک بہت ہی اچھا ہتھیار تھا..... جگنو!

☆☆☆

"سرکار! نور پور سے چودھری بختیار آپ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔" وہ اپنے مخصوص تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے حقے کے کش لے رہا تھا کہ منشی اللہ رکھا نے اسے اطلاع دی۔ اس اطلاع پر اس نے حقے کی نے ہونٹوں سے ہٹا کر پشت پر کھڑے ملازم کی طرف بڑھائی اور کچھ اس انداز میں منشی کی طرف دیکھنے لگا جیسے اس کی بات سن نہ سکا ہو۔

"چودھری بختیار ملاقات کے لیے آیا ہے سرکار!"

اس کی ایک ایک ادا سے واقف منشی نے اطلاع کو دہرایا۔

"میں نے سن لیا ہے منشی، پر اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا کہ سمدھی صاحب خود چل کر حویلی کی چوکھٹ تک آئے ہیں۔ وہ تو اتنے ناک والے ہیں کہ اپنی بہن کا ولیمہ کھانے بھی ادھر نہیں آئے تھے۔" اس کی حیرت پر تمسخر کا رنگ غالب تھا۔

"ناک والوں کی ناک کٹنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے سرکار! چودھری بختیار کی آپ کے آگے اوقات ہی کیا ہے۔ ایک نہ ایک دن تو اسے گھٹنے ٹیکنے ہی تھے۔" منشی نے خوشامدانہ لہجے میں جواب دیا۔

"تو ٹھیک بولا منشی، پر تجھ سے اور مجھ سے کچھ غلطی ہو رہی ہے۔ میں نے کہا وہ خود چل کر حویلی آیا ہے، ہور تو نے گھٹنے ٹیکنے کی گل کی..... پر بے چارہ بختیار تو دونوں ہی کم (کام) نہیں کر سکتا۔ چلنا ہور گھٹنے ٹیکنا اس لنگڑے کے بس میں ہے ہی کدھر؟" اپنی بات کہہ کر اس نے خود ہی زوردار قہقہہ لگایا تو منشی نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

"چل بلا لے اسے۔ ملوم تو ہو کہ وہ لنگڑا کیوں آیا ہے..... پر نہیں، ابھی فوراً نہ بلانا۔ ذرا میں بھی تو انتظار کروا کر ادھر لا۔ میں کوئی ایسا فارغ بھی نہیں بیٹھا کہ ہر ملاقاتی سے فوراً ملنے بیٹھ جاؤں۔" اجازت دیتے دیتے اس نے اچانک اپنا فیصلہ تبدیل کر لیا اور ایک شان سے اپنا بایاں بازو پھیلا دیا۔ حقے کی نے تھام کر ایک طرف ہو جانے والا ملازم فوراً آگے بڑھا اور اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں دوبارہ سے نے تھما دی۔ چودھری بڑی فرصت سے کش لگانے لگا۔ اس کے حقے کی گڑگڑاہٹ سنتا منشی کمرے سے باہر نکل کر اس طرف بڑھ گیا جہاں چودھری بختیار اپنی گاڑی میں اس کا منتظر تھا۔ حویلی پہنچ کر اس نے گاڑی سے اترنا پسند نہیں کیا تھا اور منشی کو اپنی آمد کا مقصد بتا کر گاڑی میں ہی بیٹھا رہا تھا۔ شاید اسے بھروسا نہیں تھا کہ چودھری افتخار اس سے ملنا پسند بھی کرے گا یا نہیں۔ چودھری کی کم ظرفی پر بھروسا کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

"آپ اندر چل کر بیٹھیں، چودھری صاحب اس وقت ذرا مصروف ہیں۔ تھوڑی دیر بعد آپ سے ملاقات کریں گے۔" منشی نے گاڑی کے قریب جا کر اسے اطلاع دی تو وہ کچھ دیر کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد نیچے اترنے کے لیے راضی ہو گیا۔ ویسے بھی یہ بات تو اسے خود بھی تسلیم کرنی پڑ رہی تھی کہ جب یہاں تک آ ہی گیا ہے تو انا کیسی؟ فریدہ سے بے حد ناراضگی کی وجہ سے اس نے یہ فیصلہ کر تو لیا تھا کہ اب ساری زندگی اس سے تعلق نہیں رکھنا ہے لیکن پھر دل میں دبی بہن کی والہانہ محبت نے اسے اپنا یہ فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ فیصلے کی اس تبدیلی میں شہریار کا بھی خاصا ہاتھ تھا۔ اس نے اسے قائل کر لیا تھا کہ فریدہ کتنی بھی قصوروار سہی لیکن ہے تو اس کی بہن ہی، اس لیے اسے کسی طور یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی بہن کو چودھری کی حویلی میں مرنے کے لیے بے یارومددگار چھوڑ دے۔ کچھ بہن کی محبت نے اور کچھ شہریار کے اصرار نے اسے اس حویلی تک آنے پر مجبور کر دیا تھا ورنہ وہ کبھی چودھری افتخار جیسے آدمی سے ملنے آنا گوارا نہ کرتا۔

"آپ کچھ پینا پسند کریں گے؟" منشی اسے ایک بیٹھک میں بٹھا کر غائب ہو گیا تھا۔ کافی دیر بعد واپس آیا تو اس سے دریافت کیا۔ اندر ہی اندر بُری طرح کھولتے چودھری بختیار نے خود پر ضبط کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کی معذوری نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ اپنے ملازم کا سہارا لے کر حرکت کرے چنانچہ اسے ملازم کو بھی اپنے ساتھ بیٹھک تک

WWW.PAKSOCIETY.COM

لانا پڑا تھا لیکن اندر سے سخت خفت محسوس کر رہا تھا کہ اس کا ملازم بھی اس کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کا نظارہ کر رہا ہے۔

”جیسی آپ کی مرضی۔ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ آپ لمبے سفر سے آئے ہیں، پیاسے ہوں گے۔“ بظاہر تو منشی ادب سے ہی بات کر رہا تھا لیکن اس کے مؤدبانہ الفاظ کے ساتھ لہجے میں جو طنز کے تیر پوشیدہ تھے، ان کے گھاؤ چودھری بختیار کس طرح برداشت کر رہا تھا، وہی جانتا تھا۔

”میری پیاس کی فکر نہ کرو اور چودھری صاحب سے جا کر پوچھو کہ اور کتنی دیر لگے گی انہیں فارغ ہونے میں۔ اگر وہ آج سارا دن ہی مصروف ہیں تو میں کل کسی وقت آجاؤں گا۔“ کچھ کھردرے پن سے اس نے منشی کو جواب دیا۔

”کل کا کیا بھروسا؟ چودھری صاحب اتنے مصروف آدمی ہیں، ہوسکتا ہے کل ان کے پاس بالکل ہی وقت نہ ہو۔ آپ تھوڑی دیر انتظار کرلیں، وہ جیسے ہی فارغ ہوتے ہیں میں آپ کو ان سے ملانے لے جاؤں گا۔“ منشی نے اسے تسلی دی اور وہاں سے چلا گیا۔ ناچار اسے ایک بار پھر انتظار کی اذیت سے گزرنا پڑا۔ اس بار منشی پندرہ منٹ بعد واپس آیا۔ کہنے کو یہ اتنا طویل دورانیہ نہیں تھا لیکن چودھری افتخار کی بیٹھک میں بیٹھ کر اسے خاصا طویل لگا۔

”آیئے، چودھری صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ منشی نے اس سے کہا تو وہ اپنے ملازم کے سہارے کھڑا ہوگیا۔ معذور ہونے کے بعد بھی وہ عرصے تک اپنے کام خود ہی کرلیتا تھا اور کسی سے سہارا لینے کی کوشش نہیں کرتا تھا لیکن اب وہ پہلے سی ہمت نہیں رہی تھی۔ خصوصاً فریدہ نے اسے بُری طرح توڑ دیا تھا۔ وہ اس کی بے حد لاڈلی اور چہیتی بہن تھی جسے اس نے بہن سے بڑھ کر بیٹی سمجھا تھا۔ اپنی چہیتی کی وجہ سے اسے پہلا صدمہ اس وقت پہنچا جب اس نے یہ جانا کہ وہ اس کے جانی دشمنوں کے خاندان سے محبت کا ناتا جوڑ بیٹھی ہے۔ ابھی وہ اس صدمے سے سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ فریدہ اس کی عزت اور محبت کا خیال کیے بغیر اس لڑکے کے ساتھ گھر کی دہلیز پار کرگئی۔ یہ اور بات تھی کہ اپنی اس حرکت کے بعد اس نے کچھ بھی نہیں پایا اور وہ لڑکا اسے چودھری کے قبضے میں چھوڑ کر خود الگ ہوگیا اور دوسری جگہ بیاہ بھی رچا بیٹھا۔ لیکن چودھری بختیار اس بے عزتی کو کبھی نہیں بھول سکا تھا جو اس نے فریدہ کی شادی چودھری افتخار کے ذہنی معذور بیٹے سے کرتے ہوئے محسوس کی تھی۔ اپنے طور پر وہ فیصلہ کرچکا تھا کہ اب زندگی بھر فریدہ سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا لیکن خون کی کشش نے اسے مجبور کردیا۔ وہ اپنی بہن کو مرنے کے لیے دوسروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا چنانچہ نہ چاہنے کے باوجود حویلی میں موجود تھا۔

”آؤ چودھری بختیار! یہاں آکر بیٹھو۔ تم میری حویلی میں آئے، سن کر وڈا چنگا لگا۔ آخر تم ہمارے سمدھی ہو، پر تمہاری یہ گل ہمیں اچھی نہیں لگی کہ تم نے ادھر کچھ کھانا پینا پسند نہیں کیا۔“ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی چودھری نے بولنا شروع کردیا۔ وہ اس وقت بھی گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر ہی بیٹھا ہوا تھا اور حقے کی نے تھامے ملازم اس کے اشارے کا منتظر تھا۔

”ہمارے ہاں دھی کے گھر کھانے پینے کا رواج نہیں ہے۔“ چودھری بختیار نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”چلو ٹھیک ہے۔ ویسے مجھے تمہیں دیکھ کر حیرت ہوئی ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ تمہارے ہاں دھی کے سسرال میں آنے جانے کا بھی رواج نہیں ہے۔“ چودھری نے طنز کا تیر چلایا۔

”میں فریدہ کو لے جانے کے لیے آیا ہوں۔“ اس نے کسی بحث میں پڑنے کے بجائے مختصراً اپنا مدعا بیان کیا۔

”اتنے عرصے بعد تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟ تم نے تو شاید فریدہ کے لیے اپنے گھر کے دروازے بند کردیے تھے؟“ چودھری کب باز آنے والا تھا۔

”گھر کے دروازے بند کر بھی لو تو دل کے دروازے بند نہیں ہوتے۔ فریدہ میری وڈی لاڈلی بہن ہے، ہود میں اسے یہاں بے بسی سے مرنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا۔“ اس نے بنا کسی لاگ لپیٹ کے سیدھی سیدھی بات کی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا تم یہ الزام لگا رہے ہو کہ ہم تمہاری بہن کا خیال نہیں رکھتے اور وہ یہاں ظلم و ستم کا شکار ہے؟“ چودھری بُرا مان گیا لیکن اس نے پروا نہیں کی اور کوئی وضاحت دیے بغیر خاموش بیٹھا رہا۔

”ہم ایسے گئے گزرے لوگ نہیں ہیں چودھری بختیار! اگر ہم ایسے ویسے ہوتے تو آج تمہاری بہن اور بھانجا علاج کے لیے لاہور کے مہنگے ترین اسپتال میں داخل نہ ہوتے۔“ اس نے گویا اپنے حق میں دلیل دی۔

”پر میرا خیال ہے کہ اگر اس حویلی میں اتنے گئے گزرے لوگ نہیں ہوتے تو میری بہن اسپتال تک پہنچتی ہی نہیں۔“ چودھری بختیار نے بھی دوبدو جواب دیا۔

”کیا مطلب؟ کیا تم الزام لگا رہے ہو؟“ چودھری طیش میں آیا۔

”صرف الزام نہیں، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ حویلی میں میری بہن کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ کوشش دوبارہ بھی کی جاسکتی ہے، اس لیے میں اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔“ اس نے سکون سے جواب دیا۔

”تم اتنے وثوق سے ایسا کیسے کہہ سکتے ہو؟ آخر یہاں کسی کو فریدہ کو قتل کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟“ چودھری یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

”یہ ضرورت اسی شخص کو پڑ سکتی ہے جو حویلی کے وارثوں میں اضافے کو پسند نہیں کرتا ہو۔ بہر حال، یہ حویلی کا اندرونی معاملہ ہے۔ مجھے تو اپنی بہن اور بھانجے کی زندگی عزیز ہے اس لیے میں انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں اور یہ اطلاع دینے آیا ہوں کہ فریدہ اور اس کے بچے کو میں اسپتال سے سیدھا اپنے گھر لے جاؤں گا۔“ اس نے چودھری کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ دوسری طرف چودھری سوچ میں پڑ گیا تھا۔ فریدہ کے ساتھ ہونے والا حادثہ اب اسے بھی سازش محسوس ہو رہا تھا اور اس سازش کے تانے بانے جوڑنے والی کا نام بھی اس کے ذہن میں آگیا تھا۔

”کیا سوچنے لگے چودھری صاحب! آپ کے پاس سوچنے کی گنجائش نہیں ہے۔ میں چاہتا تو فریدہ کو اسپتال سے بھی سیدھا اپنے گھر لے جاسکتا تھا لیکن میں نے آپ کو پہلے اطلاع دینا مناسب سمجھا۔ اب آپ مجھے اجازت دیں۔ اور ہاں، دوبارہ فریدہ کو اسی وقت لینے آیئے گا جب آپ یہاں اس کی زندگی کی حفاظت کا انتظام کرلیں۔“

یہ وہی چودھری بختیار تھا جس کو کچھ دیر قبل سمدھی کی عزت دینے کے بجائے ایک عام ملاقاتی کی طرح انتظار کی اذیت سے گزارا گیا تھا۔ اب وہ پورے اعتماد کے ساتھ چودھری سے بات کر رہا تھا اور چودھری کوئی جواب دینے کے بجائے سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چودھری بختیار اپنی بات کہنے کے بعد وہاں رکا نہیں اور ملازم کے سہارے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

”میں تجھے چھوڑوں گا نہیں چودھرائن! تو نے مجھے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اگر فریدہ مر جاتی تو آج میں مشکل میں پڑ جاتا۔“ وہ دانت کچکچاتا ہوا اپنے دل میں بولا۔ برسوں کی حکمرانی نے اس کے اندر جو غرور و تکبر بھر دیا تھا، وہ کسی صورت اسے خود کو تباہ دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا لیکن بار بار اسے اسی صورت حال سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ پہلی ناکامیوں اور ذلت کے اس سلسلے کو وہ شہریار سے منسوب کرتا تھا کیونکہ جب وہ اس سے ٹکرایا تھا، تب ہی سے وہ مشکلات کا شکار تھا۔ اس کے خیال میں یہ شہریار ہی تھا جس کی شہ پا کر بہت سے لوگ اس کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کرنے کی جرأت کرنے لگے تھے۔ اگر شہریار نہ ہوتا تو ماہ بانو بہرآباد کی حدود سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ وہ نہ ہوتا تو ماسٹر آفتاب اتنا مضبوط نہ ہو پاتا کہ اس کی بیٹی کو ہی حویلی سے لے اڑتا۔ یہ شہریار ہی تھا جس کی وجہ سے لوگوں میں تعلیم اور صحت کا شعور اجاگر ہونے لگا تھا اور وہ اپنی ضرورتوں اور مسائل کے لیے چودھری کے علاوہ بھی کسی اور طرف دیکھنے لگے تھے۔ پہلے وہ چودھری کو ہی سب کچھ سمجھتے تھے چنانچہ اس کا بدترین سلوک بھی سر جھکا کر سہہ لیتے تھے اب انہیں ایک اور در نظر آنے لگا تھا۔ وہ اپنے اور اپنی اولاد کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ یہ عمل بہت برق رفتار نہیں تھا لیکن چودھری آنے والے وقت کی بُو سونگھ رہا تھا اور اسے لگتا تھا کہ اگر اس نے اپنے دشمن کو کھلی چھوٹ دے دی تو آنے والے وقت میں اس کی حکمرانی کا تختہ الٹ دیا جائے گا۔ وہ اپنے تخت، اپنی حکومت کو بچانے کی کوششوں میں مصروف تھا اور جو تدبیر ذہن میں آتی تھی، اس پر عمل کر ڈالتا تھا لیکن مسائل تھے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

اب یہ چودھری بختیار ایسے ہی تو حویلی نہیں آیا تھا۔ یقیناً اس کے پاس پکی خبر تھی کہ فریدہ کے ساتھ کیا سازش کی گئی اور کمال یہ تھا کہ وہ خود اپنی حویلی میں ہونے والی اس سازش کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کی اپنی بیوی اس کے ساتھ ایسی چال چلے گی لیکن اسے چودھری بختیار کی دلیل میں جان محسوس ہوئی تھی کہ اپنے مفاد کے لیے وہ ایسا کر بھی سکتی تھی۔ اولاد کی محبت کسی سے بھی کچھ بھی کروا سکتی ہے۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جب عورتوں نے اپنی اولاد کو تخت و تاج کا مالک بنانے کے لیے سازش کے خونی جال تیار کیے تھے۔ اس کی حویلی میں کچھ نیا تو نہیں ہو رہا تھا، بس اسے خبر کچھ دیر سے ہوئی تھی اور اب اسے سازشیوں کے لیے سزا تجویز کرنی تھی۔ حقے کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ وہ اس سزا پر غور کر ہی رہا تھا کہ اس کا موبائل گنگنانے لگا۔ اس نے نمبر دیکھے بغیر بٹن دبا کر کال ریسیو کرلی۔

”یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو چودھری؟“ اپنی ”ہیلو“ کے جواب میں اسے دوسری طرف سے یہ جملہ سنائی دیا۔ بات اگرچہ اردو میں ہی کہی گئی تھی لیکن لب و لہجے نے اسے چونکا دیا اور اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دوسری طرف ڈیوڈ

WWW.PAKSOCIETY.COM

موجود ہے اور کافی غصے میں ہے۔

''میں کیا کر رہا ہوں جس پر تمہیں اعتراض ہے؟'' ڈیوڈ کے انداز پر ناگواری محسوس کرتے ہوئے اس نے خود بھی قدرے غصیلے لہجے میں سوال کیا۔ ڈیوڈ کی طاقت اور اس سے ملنے والی رقم اگرچہ اسے اس کے آگے جھکائے رکھتی تھی لیکن تھا تو وہ بہرحال چودھری افتخار عالم شاہ۔۔۔ جس سے کسی اور کا اپنے سامنے اونچی آواز میں بولنا برداشت نہیں ہوتا تھا۔

''میں تمہارے حالیہ کارنامے کی بات کر رہا ہوں۔ تمہیں کیا ضرورت پڑی تھی اے سی کو چھیڑنے کی؟'' ڈیوڈ بدستور غصے میں تھا۔

''یہ میرا پرسنل معاملہ ہے اور اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ تم مجھے جس کام کی پے منٹ کر رہے ہو وہ میں صحیح طریقے سے کروا رہا ہوں۔ باقی میں کیا کرتا ہوں کیا نہیں، اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔'' اس نے اکڑ کر جواب دیا۔

''کیسے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے؟ تمہارے اس کارنامے کی وجہ سے جنگل میں آپریشن کلین اپ شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ میں کیسے چپ رہ سکتا ہوں؟ تمہاری حرکت کی وجہ سے ہمارا اتنا اہم پروجیکٹ خطرے میں پڑ گیا ہے اور تم کہتے ہو کہ مجھے تمہارے معاملات سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔'' ڈیوڈ دہاڑا۔ اس بار چودھری کو بھی اسے فوری طور پر کوئی جواب دینے کی جرأت نہیں ہو سکی۔ اس نے تو شہریار کو نیچا دکھانے کے لیے اس کے بنگلے پر ڈاکا ڈلوایا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا اتنا شدید ردِعمل ایکشن سامنے آئے گا۔

''اب چپ کیوں ہو؟ مجھے بتاؤ کہ تمہاری حماقت کا جو نتیجہ نکلنے والا ہے، اس سے بچاؤ کے لیے کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟'' ڈیوڈ کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''آپ پریشان مت ہوں مسٹر ڈیوڈ۔ جنگل کے جس حصے میں ڈاکو پناہ گزین ہیں اور جہاں ہمارا پروجیکٹ جاری ہے، وہ ایک دوسرے سے بہت الگ الگ ہیں۔'' آخر اسے ڈیوڈ کی تسلی کے لیے ایک دلیل مل ہی گئی۔

''اور اس بات کی کیا گارنٹی دے سکتے ہو تم کہ پولیس جنگل کے صرف اسی حصے تک محدود رہے گی جہاں ڈاکوؤں کا ڈیرا ہے؟ وہ سرچ آپریشن کریں گے تو سرچنگ کے دوران لازمی ہے کہ جنگل کے ہر حصے کو کھنگالیں گے۔ ڈاکوؤں کا ڈیرا ان کی خالہ کا گھر تو ہے نہیں کہ وہ سیدھے وہاں جائیں گے اور سب کو کان سے پکڑ کر لے آئیں گے۔'' ڈیوڈ طنز پر طنز کر رہا تھا۔ ''کیا یہ سوچنے کی بات نہیں ہے کہ جب پولیس آپریشن کے لیے جنگل میں داخل ہوگی تو پھر اس کے قدم کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں؟ تمہیں وہ لڑکا اکو یاد نہیں ہے جو اچانک ہی ہمارے علاقے میں جا نکلا تھا۔ اگر وہ لڑکا عابد انصاری تک پہنچنے کے بجائے کسی اور طرف بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو ہمارا راز کھل جاتا۔ وہ ایک اکیلے لڑکے کا معاملہ تھا اس لیے آسانی سے ہینڈل کر لیا گیا لیکن اتنی بڑی فورس کا کیا کریں گے ہم؟'' وہ پریشان بھی تھا اور غضب ناک بھی اس لیے چودھری سے بلالحاظ بات کر رہا تھا۔

''پولیس فورس کے لیے ڈاکوؤں کا ڈیرا خالہ کا گھر بنایا جا سکتا ہے۔ میں اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں کہ پولیس ناک کی سیدھ میں وہاں جائے گی اور اپنا کام مکمل کرکے ناک کی سیدھ میں ہی واپس آ جائے گی۔'' ڈیوڈ کی غصے بھری تقریر کے جواب میں چودھری نے اسے اطمینان دلایا۔

''اپنی بات کی وضاحت کرو۔'' ڈیوڈ نے اسے حکم دیا۔

''ہمارے ہاں پولیس کا آدھا کام مخبروں کی مدد سے ہوتا ہے۔ میں پولیس کو وہ مخبر فراہم کروں گا جو انہیں سیدھا ڈیرے پر پہنچا دے گا۔ پولیس آسانی سے ڈیرے پر پہنچ گئی تو اسے جنگل میں اِدھر اُدھر منہ مارنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔''

وہ اس قبیل کے لوگوں سے تعلق رکھتا تھا جو اپنے مطلب کے حصول کے لیے دوسرے کے گلے پر چھری پھیرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ ڈاکوؤں سے اگر اس کی دوستی تھی یا وہ اس کے کام آتے تھے تو اس کے نزدیک ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اہمیت تھی تو صرف اس بات کی کہ اس کے اپنے مفاد پر ضرب نہ پڑے۔ جنگل میں پوست کی کاشت سے اسے جتنا بڑا فائدہ حاصل ہو رہا تھا، اتنا ڈاکوؤں سے نہیں تھا۔ چنانچہ اپنے ان ہمدردوں کو آسانی سے بھینٹ چڑھایا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

''آپ ایڈمٹ ہو جائیں۔ آپ کی کنڈیشن ایسی نہیں ہے کہ ہم آپ کو گھر جانے دیں۔'' وہ اپنی طبیعت میں خرابی محسوس کر رہی تھی اس لیے آفتاب اسے چیک اپ کے لیے اسپتال لایا تھا۔ چیک اپ کے فوراً بعد لیڈی ڈاکٹر نے یہ الفاظ ادا کیے تو وہ دونوں میاں بیوی ہی پریشان ہو گئے۔

''کیا کوئی پیچیدگی ہے ڈاکٹر صاحب جو آپ انہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایڈمٹ کرنے کی بات کر رہی ہیں۔ ورنہ ہمارے حساب سے تو ابھی کافی وقت باقی ہے؟'' آفتاب نے پریشانی سے سوال کیا۔

''ظاہر ہے کوئی مسئلہ ہے جب ہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ اس لڑکی کی حالت ایسی ہے کہ اس کے ہاں نارمل ڈلیوری ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ جانے آپ لوگ عورتوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں جو وہ مُردوں جیسی حالت کو پہنچ جاتی ہیں اور پھر اس مُردہ بدن سے آپ اپنی اولادیں بھی پیدا کرواتے ہیں۔ ذرا رحم نہیں آتا آپ لوگوں کو عورت ذات پر۔ یہ سوچنے کی زحمت نہیں کرتے کہ جس کے بطن سے نئی زندگی کو جنم لینا ہے، اس کا بھی خیال رکھا جائے۔ اپنی بیوی کی حالت دیکھی ہے آپ نے؟ ایسا لگتا ہے کہ فاقے کرتی رہی ہے یہ۔ خون تو ہے ہی نہیں اس کے جسم میں۔'' لیڈی ڈاکٹر نے اسے لتاڑ کر رکھ دیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے ڈاکٹر صاحبہ! میرے شوہر بہت خیال رکھنے والے ہیں۔'' کشور نے اپنی طرف سے آفتاب کی صفائی پیش کی۔

''تم چپ رہو بی بی! تم عورتوں کو بہت شوق ہوتا ہے نیک پروین بننے کا۔ تمہاری انہی فضول طرف داریوں کی وجہ سے تو مردوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ اتنا ہی اچھا آدمی ہے تمہارا شوہر تو اب سے پہلے چیک اپ کے لیے یہاں کیوں نہیں لایا؟ آج پہلی بار میں تمہیں یہاں دیکھ رہی ہوں۔'' ڈاکٹر صاحبہ کا تعلق شاید حقوق نسواں کے لیے کام کرنے والی کسی تنظیم سے تھا جو کسی بھی وضاحت و صفائی کو خاطر میں لائے بغیر بے نقط سنا رہی تھیں۔

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں ڈاکٹر صاحبہ! میں اپنے شوہر کی بے جا حمایت نہیں کر رہی ہوں۔ یہ سچ مچ بہت خیال رکھنے والے آدمی ہیں۔ میرا چیک اپ بھی پابندی سے کرواتے رہے ہیں۔ آپ کے پاس ہم پہلی بار اس لیے آئے ہیں کہ ہمیں یہاں اس شہر میں شفٹ ہوئے بہت تھوڑے دن گزرے ہیں۔'' اتنی سی بات کرنے میں کشور کی سانس پھولنے لگی تھی۔ اگر یہ آفتاب کی صفائی دینے کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ ہرگز بھی اتنا نہیں بول سکتی تھی۔

''خیر، جو بھی بات ہو مجھے اس سے کیا۔ میں تو آپ کو صرف یہ بتا رہی ہوں کہ آپ فوری طور پر ایڈمٹ ہو کر چارجز وغیرہ جمع کروا دیں۔ بچے کی دھڑکن بہت کم ہے، ہمیں آپریشن کرنا پڑے گا۔'' ڈاکٹر ان لوگوں میں سے تھی جو ہر حال میں اپنی ہی بات کو اوپر رکھتے ہیں چنانچہ اس کی دی ہوئی صفائی کو قبولیت کا درجہ دینا پسند نہیں کیا اور منہ بناتے ہوئے اپنی ہی کہی۔

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحبہ! آپ فکر نہیں کریں۔ میں ابھی چارجز وغیرہ جمع کروا دیتا ہوں۔ آپ کو جو مناسب لگتا ہے، آپ ویسا ہی کریں۔'' کشور اور لیڈی ڈاکٹر کے دوران ہونے والی بحث اس کے لیے قطعی بے مقصد تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کشور کتنی عزیز ہے۔ باقی کوئی اور اس حقیقت کو تسلیم کرتا یا نہیں، اس بات سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ کشور خود اس کی محبت سے واقف تھی اور اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اب بھی اس نے لیڈی ڈاکٹر کی کسی بھی بات کا بُرا مانے بغیر نہایت معتدل لہجے میں اس سے یہ سب کہا اور خود تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ کشور نے جتاتی ہوئی نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا تو وہ بے نیازی سے منہ موڑ گئی۔

کشور نے بھی تھک کر آنکھیں موند لیں اور اس کا ذہن اپنے آنے والے بچے کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ بچہ اس کی محبت کی نشانی تھا۔ وہ اس نشانی کو ایک تحفے کی صورت آفتاب کو دینا چاہتی تھی۔ یقیناً دنیا کی ہر عورت ماں بننے کے مرحلے سے گزرتے ہوئے اپنے بچے کی خیر و عافیت کی دعا مانگتی ہوگی اور اس کی زندگی کو اپنی زندگی پر ترجیح دیتی ہوگی لیکن اس کی خواہش کی شدت دگنی تھی۔ صرف اپنے بچے کی محبت میں نہیں بلکہ اس شخص کی محبت میں بھی بے تحاشا مبتلا تھی جو اس بچے کا باپ تھا۔ اس کا دل بڑی شدت سے خواہش کرتا تھا کہ وہ آفتاب کو اس کی محبت کے بدلے میں کوئی ایسا تحفہ دے جو انمول ہو اور اولاد سے بڑھ کر انمول نعمت اور کون سی ہو سکتی تھی؟ اپنی ہر سانس کے ساتھ وہ بچے کی سلامتی کی دعا کرتی رہی۔ آخرکار وہ وقت آپہنچا جب اسے آپریشن تھیٹر میں لے جایا جانے لگا۔

''آپ میرے لیے اس دنیا میں موجود ہر شے سے بڑھ کر قیمتی ہیں۔ میں اس یقین کے ساتھ آپ کو اس دروازے کے پار بھیج رہا ہوں کہ جب دوبارہ یہ دروازہ کھلے گا تو آپ میرے بچے کے ساتھ اس دروازے سے باہر آئیں گی۔''

آپریشن تھیٹر کے دروازے پر آفتاب نے اسٹریچر کے قریب کھڑے ہو کر اس کا ہاتھ تھام کر یہ الفاظ کہے تو اس کے سارے وجود میں توانائی کی ایک لہری دوڑ گئی اور آنکھوں میں دیے سے جلنے لگے۔ جواب میں زبان سے کچھ کہے بغیر اس نے اپنے ہونٹوں پر ایک پیاری سی مسکراہٹ سجالی۔ اس مسکراہٹ کی روشنی کے ہالے میں اس کا اسٹریچر پر موجود وجود آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ اس کے نظروں سے غائب ہوتے ہی آفتاب ایک دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور سراپا دعا بن گیا۔ انتظار کا یہ وقت منٹوں پر محیط تھا یا گھنٹوں پر، وہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ خود اس پر تو ایک ایک لمحہ صدی بن کر گزر رہا تھا۔

''مبارک ہو مسٹر! اللہ نے آپ کو بڑی پیاری سی بیٹی دی ہے۔'' آپریشن تھیٹر سے برآمد ہونے والی نرس نے جب یہ خوش خبری سنائی تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ بہتے والے یہ آنسو خود گواہی دے رہے تھے کہ یہ خوشی اور شکر گزاری کا نتیجہ ہیں چنانچہ نرس کو ایسا کوئی شک نہیں گزرا کہ تنگ نظر مردوں کی طرح وہ بھی بیٹی کی پیدائش پر مایوسی اور اداسی میں مبتلا ہے۔

''پھر آپ اسٹاف کے لیے مٹھائی پہنچا رہے ہیں نا سر؟'' اس کی کیفیت کو پوری طرح محسوس کرتی نرس نے اس سے فرمائش کی۔

''کیوں نہیں؟ آپ کی مٹھائی ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گی۔ آپ پہلے مجھے یہ بتائیں کہ میری مسز کا کیا حال ہے اور میں اپنی بچی کو کب دیکھ سکوں گا؟'' اس نے مسکرا کر ہامی بھرتے ہوئے ایک ساتھ دو سوال کیے۔

''آپ کی مسز بالکل ٹھیک ہیں۔ تھوڑی دیر میں انہیں ہوش آجائے گا تو ہم انہیں روم میں شفٹ کر دیں گے..... بے بی کو ابھی نرسری میں رکھا جائے گا۔ بچی کمزور ہے اس لیے کچھ دن اسے وہیں رکھنا ہوگا۔ جیسے ہی بچی وہاں شفٹ ہوتی ہے، میں آپ کو بتا دوں گی۔'' نرس نے بااخلاق لہجے میں اسے جواب دیا اور وہاں سے ہٹ گئی۔

نرس کی باتوں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ابھی اسے اپنی بیٹی اور کشور کو دیکھنے میں کچھ وقت لگے گا چنانچہ خود بھی باہر نکل گیا اور مسجد کا رخ کیا۔ اسپتال کے ساتھ ہی مسجد میں شکرانے کے نفل ادا کرنے کے بعد وہ مٹھائی کی دکان پر گیا اور ڈھیروں مٹھائی کے ساتھ اسپتال واپس لوٹا۔ پہلی بار باپ بننے کے تجربے نے اس کے دل میں مسرت کی کلیاں کھلا دی تھیں اور بس نہیں چل رہا تھا کہ ساری دنیا کو اپنی اس خوشی میں شریک کر لے۔ لیکن افسوس کا مقام یہ تھا کہ وہ اور کشور دونوں ہی عام لوگوں کی طرح اپنے کسی پیارے سے اس خوشی کو نہیں بانٹ سکتے تھے۔ وہ خود رشتوں کے معاملے میں قلاش تھا اور کشور کا اپنا خاندان جانی دشمن بنا ہوا تھا لیکن آج وہ ان سب باتوں کو بھلا کر اپنی خوشی کو منانا چاہتا تھا۔ چنانچہ خوشی خوشی اسپتال پہنچا اور مٹھائی عملے کے افراد کے حوالے کر کے خود نرسری کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر قبل اسے بیٹی کی اطلاع دینے والی نرس نے اس کے واپس اسپتال لوٹتے ہی اسے یہ اطلاع بھی دے دی تھی کہ بچی کو نرسری میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ وہ نرسری پہنچا تو وہاں موجود ایک نرس نے اس کی اس کاٹ تک راہنمائی کی جس میں اس کی بیٹی لیٹی ہوئی تھی۔ وہ کاٹ کے قریب جا کر کھڑا ہوا اور بچی کا جائزہ لینے لگا۔ بہت نازک سی گندمی رنگت والی وہ بچی گلابی تولیے میں لپٹی آنکھیں موندے سو رہی تھی۔ بچی نے اپنی ماں کے نین نقش چرائے تھے اس لیے وہ اسے کچھ اور بھی پیاری لگی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بے حد احتیاط سے اسے کاٹ سے باہر نکالا اور کچھ دیر دیکھتے رہنے کے بعد اس کے ماتھے پر نرمی سے بوسہ دیا۔ باپ کا پیار بھرا لمس پا کر بچی سوتے میں مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ نے آفتاب کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھیر دی اور وہ مسکراتے ہوئے اس کے کان میں اذان دینے لگا۔ اس فریضے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے بچی کو ایک بار اور پیار کیا اور پھر اسے کاٹ میں لٹا کر نرسری سے باہر نکل گیا۔ اب اسے کشور کو دیکھنا تھا۔ جب وہ بچی کو دیکھنے آرہا تھا تو اسے اطلاع دی گئی تھی کہ کشور کو ہوش آچکا ہے اور کچھ دیر بعد اسے روم میں منتقل کیا جا رہا ہے۔

اس کے اندازے کے مطابق اب تک یہ کام ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ پرائیویٹ روم میں پہنچا تو اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ سامنے ہی کشور بیڈ پر سیدھی لیٹی ہوئی تھی اور اس کے دائیں ہاتھ میں پیوست سوئی سے گلوکوز کی شکل میں

ملٹری کے ایک سپاہی کو شراب پینے کے جرم میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا مگر وہ ایک اچھا سپاہی تھا اس لیے کیپٹن نے مناسب سمجھا کہ پیار کے ساتھ اسے سمجھائے۔

''دیکھو ڈیوڈ! ایک دن تم سارجنٹ بن سکتے ہو بلکہ ترقی کر کے لیفٹیننٹ تک بن سکتے ہو، بشرطیکہ تم شراب پینے سے باز آجاؤ۔''

''سچ کہتے ہو کیپٹن۔'' سپاہی نے کہا۔ ''لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ میں حلق سے نیچے چند قطرے اترتے ہی کیپٹن بن جاتا ہوں۔''

ارجمند خان، کاکول

WWW.PAKSOCIETY.COM

قطرہ قطرہ توانائی جسم میں داخل ہو رہی تھی۔ نرس جو گلوکوز کی بوتل میں کوئی دوا انجیکٹ کر رہی تھی، اسے دیکھ کر مسکرائی اور اپنا کام مکمل کر کے باہر نکل گئی۔ اس کے نکلتے ہی وہ کشور کی طرف بڑھا۔

"مبارک ہو، ہم بڑی ہی پیاری بیٹی کے اماں ابّا بن گئے ہیں۔" اس نے ایک ہاتھ سے کشور کا بایاں ہاتھ تھاما اور دوسرے ہاتھ سے اس کے ماتھے پر آئے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے محبت سے بولا۔

"آپ کو بھی مبارک ہو۔" کشور کے ہونٹوں پر مسرت بھری شرمیلی مسکراہٹ تھی۔ "آپ نے بیٹی کو دیکھ لیا۔ کیسی لگی آپ کو؟" شدید نقاہت کے باوجود وہ بڑی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پُراشتیاق لہجے میں اس سے پوچھنے لگی۔

"بہت پیاری۔ بالکل آپ جیسی ہے۔" اس نے برجستگی سے جواب دیا تو وہ مزید شرما گئی۔ خوشی کے یہ پل ایسے تھے جس میں وہ ہر دکھ اور پریشانی کو بھول گئے تھے۔ آج انہوں نے وہ انمول موتی پایا تھا جس سے قیمتی شے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

"اس کا نام کیا سوچا ہے آپ نے؟" کشور نے ایک اور سوال کیا۔

"امید ـــ ہماری بیٹی کا نام امید ہوگا اور ہم اس امید کے ساتھ اس کی پرورش کریں گے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب ہم اپنی بیٹی کے ساتھ بلاخوف و خطر خوشیوں بھری زندگی گزاریں گے۔" اس نے بنا کسی توقف کے جواب دیا پھر کوئی خیال آنے پر چونک کر پوچھنے لگا۔

"آپ کو اس نام پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ اگر آپ کو اس کے سوا کوئی اور نام پسند ہو تو رکھ سکتی ہیں۔ میں بغیر برا مانے آپ کے حق میں دست بردار ہو جاؤں گا۔"

"نہیں، مجھے آپ کے رکھے نام پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ماشاء اللہ سے بہت پیارا نام ہے۔" کشور نے اس کی پسند سے اتفاق کیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

"بچی کو فیڈ کروانا ہے۔" آفتاب کی "کم اِن" کے جواب میں ایک نرس دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور اپنے آنے کی وجہ بتائی۔

"بالکل کروائیں۔ میں باہر جانے ہی والا ہوں۔" نرس کی گود میں موجود بچی پر محبت بھری نظر ڈالتے ہوئے اس نے جواب دیا تو وہ کشور کے بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔ آفتاب ماں بیٹی کو ایک دوسرے کے ساتھ بحفاظت و مگن چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ اسپتال سے باہر اس کا رخ ایک کوریئر سروس کے آفس کی طرف تھا کہ خوشی کی خبر دوستوں کے ساتھ ساتھ دشمن تک نہ پہنچے تو خوشی ادھوری لگتی ہے۔

☆☆☆

اپنے حصے کا کام نمٹانے کے بعد اس نے پھلواری کا رخ کیا تو جسم کا جوڑ جوڑ دکھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ تھکن کے اس احساس کو مٹانے کے لیے ہی پھلواری کی طرف جا رہی تھی۔ اس پورے ماحول میں وہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں جا کر اپنی قید اور بے بسی کا احساس ماند پڑتا محسوس ہوتا تھا۔ رنگ برنگے پھولوں کا نظارہ اور خوشبو کچھ دیر کے لیے ہی سہی، جسم و جان میں تازگی کی لہر دوڑا دیتا تھا۔ اپنی ہی دھن میں چلتی وہ پھلواری کی طرف جانے والے راستے پر چل رہی تھی کہ اچانک ہی جمرو اس کے راستے میں حائل ہو گیا۔ قوی الجثہ جمرو کو اچانک ہی اپنی راہ میں کھڑے ہو کر مونچھوں کو تاؤ دیتا دیکھ کر وہ ٹھٹک سی گئی۔ جمرو اس کے لیے دو رخی دشمن تھا۔ اوّل اس کی ہوس پرست فطرت اس کے حسن کی طرف لپکتی تھی تو دوم وہ اسلم کی من پسند ہونے کے ناتے جمرو کی دشمنی کی حق دار ٹھہری تھی۔ اب بھی اس نے اس کی راہ روکی تو وہ اندر سے ہل کر رہ گئی کہ جانے یہ شیطان فطرت شخص اپنا کیا رنگ دکھاتا ہے لیکن اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کی اور کچھ دیر اسے کینہ توز نظروں سے گھورتے رہنے کے بعد ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ راستے سے ہٹا تو ماہ بانو نے اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ اس کا رخ اب بھی پھلواری کی طرف ہی تھا اور ایسا اس لیے تھا کہ اس نے کچھ دیر قبل اسلم کو بھی اسی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اگر اسے وہاں اسلم کی موجودگی کا یقین نہیں ہوتا تو موجودہ صورتِ حال میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اس طرف قدم بڑھا سکتی۔

"جتنی ملاقاتیں کر سکتی ہے اپنے یار سے کر ڈال۔ ہو سکتا ہے چند دن بعد تو اس کی شکل ہی نہ دیکھ سکے۔" وہ چند قدم ہی آگے چلی تھی کہ اسے اپنی پشت سے جمرو کی آواز سنائی دی۔ وہ ایسے لہجے میں بول رہا تھا جیسے کوئی سانپ پھنکار رہا ہو۔ اسے اپنے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی اور پلٹ کر دیکھے بغیر تیزی سے پھلواری کی طرف بڑھ گئی۔ پیر میں بندھی زنجیر نے اسے مجبور نہ کیا ہوتا تو وہ دوڑتی ہوئی وہاں سے جاتی۔ جمرو کے لہجے نے اس پر ایسی ہی دہشت طاری کی تھی جیسے کسی سانپ کو دیکھ کر محسوس ہوتی ہے۔

"کیا بات ہے کچھ گھبرائی ہوئی سی لگ رہی ہو؟" پھلواری میں اسلم موجود تھا اور ایک پودے کی چھٹائی کر رہا تھا۔ وہ وہاں پہنچی تو اس کی طرف متوجہ ہوا اور ایک نظر میں ہی بھانپ گیا کہ کوئی مسئلہ ہے۔

"ہاں بس..... اصل میں یہاں آ رہی تھی تو جمرو اچانک میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔" اس نے الجھے ہوئے انداز میں بتایا۔

"اس نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی؟" اسلم کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ اپنا کام چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"بدتمیزی تو ایسی کوئی خاص نہیں کی۔ بس راستہ روک کر پہلے گھورتا رہا، بعد میں تمہاری جان لینے کی دھمکی دینے لگا۔" اس نے بتایا۔

"کھسیانی بلی کھمبا نوچنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہے۔ ابھی میرے ہاتھوں کن کٹا ہوا ہے کل کو اپنی انہی حرکتوں کی وجہ سے سر کٹا بن جائے گا۔" مطمئن سے لہجے میں کہتا ہوا وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کے انداز میں ایسی بے نیازی تھی کہ جیسے جمرو کی دھمکی کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔ ماہ بانو البتہ اس کی بات سن کر چونک پڑی۔ جمرو کا زخمی کان اس نے بھی دیکھا تھا اور اسے یہ بھی علم تھا کہ یہ زخم گولی کا ہے لیکن وہ یہی سمجھی تھی کہ وہ لوگ جس واردات کے لیے گئے تھے، یہ اس کی ہی نشانی ہے۔ یہ تو اب اسلم کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ یہ اس کا کارنامہ تھا۔

"تم نے جمرو پر گولی کیوں چلائی تھی؟" اس نے دریافت کیا۔

"حکم کی تعمیل نہ کرنے والوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ مجھے سردار نے اختیار دیا تھا کہ اگر کوئی سرکشی کرے تو میں اس کے ساتھ جو چاہے سلوک کر سکتا ہوں۔ یہ تو تم میری مہربانی سمجھو کہ میں نے جمرو کا صرف کان اڑایا۔ میں چاہتا تو اس کے سینے میں گولی بھی مار سکتا تھا۔" وہ اپنے کام میں مصروف اسی اطمینان کے ساتھ جواب دے رہا تھا۔

"کہیں ایسا تم نے جان بوجھ کر دشمنی نکالنے کے لیے تو نہیں کیا؟" ماہ بانو نے اپنے شک کا اظہار کیا۔

"میں نہ تو اتنا گھٹیا ہوں اور نہ ہی اتنا کمزور کہ اپنے دشمن پر چھپ کر یا دھوکے سے وار کروں۔ مجھے ذاتی دشمنی کی بنیاد پر جمرو کو نقصان پہنچانا ہوا تو علی الاعلان ایسا کروں گا۔" اس نے کچھ بُرا مان کر جواب دیا۔

"تو آخر ایسا کیا ہوا تھا کہ تمہیں اس پر گولی چلانی پڑی؟" وہ بھی بال کی کھال اتارنے پر تلی ہوئی تھی۔

"ہونا کیا ہے؟ حسبِ معمول جمرو کی نیت عورت پر خراب ہو گئی تھی۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا نا کہ میرے ساتھی عورت کے معاملے میں بڑے حریص ہیں اور اگر کسی ڈاکے کے دوران انہیں کوئی جوان عورت بھی مل جائے تو اسے کسی صورت نہیں چھوڑتے۔ لیکن اس بار سردار نے سختی سے تاکید کی تھی کہ صرف مال و اسباب سمیٹنا ہے اور تھوڑی توڑ پھوڑ مچانی ہے لیکن کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھنا، پر جمرو کو یہ بات کہاں سمجھ آتی ہے۔ جوان اور خوب صورت عورت دیکھ کر تو وہ سب بھول جاتا ہے۔ وہاں بھی اس کی نیت خراب ہو گئی اور میرے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود وہ اپنی ہوس پوری کرنے پر اڑا رہا۔ آخر کار مجھے اس کا ایک کان اڑا کر اسے قابو میں کرنا پڑا۔" ایک طرف بیٹھ کر اپنے ہاتھ جھاڑتے ہوئے اس نے ماہ بانو کو ساری تفصیل بتائی۔

"جب تمہارے لوگوں کا معمول ہے کہ وہ زر کے ساتھ زن کو بھی نہیں چھوڑتے تو اس بار سردار نے پابندی کیوں لگائی؟" وہ خود بھی اس کے برابر میں آ بیٹھی اور سوال کیا۔

"یہ سب تو سردار خود ہی جانتا ہوگا۔ ہم میں سے کسی نے سوال نہیں کیا البتہ میرا اندازہ ہے کہ طاقتور پارٹی دیکھ کر سردار نے یہ فیصلہ کیا ہوگا۔ مالی نقصان تو عام طور پر لوگ خاموشی سے برداشت کر لیتے ہیں لیکن عزت پر ہاتھ ڈالا جائے تو انتقامی کارروائی شروع ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ کسی اسسٹنٹ کمشنر کو چھیڑنا جبکہ اس کا تعلق بھی بہت اونچے خاندان سے ہو، کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ سردار نے اے سی کے بنگلے پر ڈاکا ڈالنے کا سوچا ہی کیسے؟ اگر ہمارے ہاں سوال کرنے کی اجازت ہوتی تو میں اس سے یہ بات ضرور پوچھتا۔ ویسے میرا خود کا خیال ہے کہ سردار نے یہ کام کسی اور کے کہنے پر کیا ہوگا۔ کسی دوسری بڑی پارٹی نے سردار کو اس واردات کے لیے ہائر کیا ہوگا۔" وہ قیاس آرائیاں کر رہا تھا جبکہ ماہ بانو کے کان اسسٹنٹ کمشنر کا ذکر سن کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"کس اسسٹنٹ کمشنر کی بات کر رہے ہو تم؟ نام کیا ہے ان کا؟" اس نے بے تابی سے سوال کیا۔

"اسی ضلع کے اے سی ہیں۔ شہریار عادل نام ہے ان کا۔" اسلم نے بتایا۔

"اے سی شہریار عادل....." ماہ بانو نے زیرِ لب وہ نام دہرایا جسے سن کر ہی اس کی دھڑکنوں میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا تھا اور پھر ذرا تحت لہجے میں پوچھنے لگی۔ "تم نے انہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟"

"مالی نقصان کے علاوہ تو کوئی دوسرا نقصان نہیں پہنچایا اور میرے خیال میں اس سے اے سی صاحب کو کوئی فرق نہیں پڑا ہوگا۔ سنا ہے بڑا مال ہے ان کے پاس۔" ماہ بانو کی دلی کیفیت سے بے خبر وہ مزے سے بولتا جارہا تھا۔

"شہریار صاحب کے بنگلے پر عمرو کی نیت کس عورت پر خراب ہوئی تھی؟" وہ جانتی تھی کہ شہریار خاندان کے بغیر تنہا وہاں رہ رہا ہے اس لیے کھوجنے والے انداز میں پوچھا۔

"ان کی بیگم پر۔ بڑی اچھی شکل وصورت کی عورت ہے۔ شاید تم نے خود بھی اسے دیکھا ہو۔ وہ آباد کے مرکز صحت میں کام کرتی ہے۔ ڈاکٹر ماریا نام ہے اس کا۔" اسلم نے گویا اس کی سماعتوں میں کوئی دھماکا کردیا۔

"لیکن اے سی صاحب تو غیر شادی شدہ ہیں۔" اس نے کسی مبہم سی امید کے سہارے یہ جملہ کہا۔

"غیر شادی شدہ تھے، اب نہیں رہے۔ کچھ عرصہ قبل ہی ان کی شادی ہوئی ہے۔ بری میں بہت بھاری زیور چڑھایا تھا انھوں نے اپنی بیگم کو۔ سب کا سب ہم لوگ وہاں سے اٹھا لائے ہیں۔ موقع ملنے پر بیچنے نکلیں گے تو اس کی صحیح قیمت معلوم ہوسکے گی۔" وہ اسے تفصیل بتا رہا تھا لیکن اس کے حواس تو گویا اس خبر کو سن کر ساتھ ہی چھوڑتے جارہے تھے۔ شہریار کو ہمیشہ ناقابل حصول سمجھنے کے باوجود ہر محبت کرنے والے کی طرح اس کے دل میں آس کا دیا جلتا تھا کہ شاید وہ اسے پالے۔ اسلم سے ملنے والی اطلاع نے اس دیے کو بجھا دیا تھا اور نتیجے میں اس کے دل میں دھواں سا بھر گیا تھا۔ یہ دھواں اس کا دم گھونٹ رہا تھا۔ وہ سانس لینے میں مشکل محسوس کررہی تھی۔

"تمہاری باتوں سے مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم اے سی صاحب کو کافی اچھی طرح جانتی ہو۔" اس کی حالت سے بے خبر اسلم نے قیاس آرائی کی لیکن وہ اسے کوئی جواب دینے کے قابل رہی ہی کب تھی۔ رکتی ہوئی سانسوں نے اسے اس حال تک پہنچا دیا تھا کہ وہ مزید بیٹھی نہ رہ سکی اور دھڑام سے گر پڑی۔ اسے اس طرح بے ہوش ہوتے دیکھ کر اسلم بھونچکا رہ گیا اور پھر اسے آوازیں دیتے ہوئے ہلانے جلانے لگا لیکن وہ تو ٹس سے مس نہیں ہورہی تھی۔ پریشان سا اسلم اپنی کوشش میں ناکام ہوکر تیزی سے اس درخت کی طرف بڑھا جس کی شاخوں پر اس نے اپنا مچان نما ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ رسی کی سیڑھی سے مچان پر پہنچنے کے بعد اس نے وہاں رکھی صراحی اٹھائی اور واپس سیڑھیاں اتر کر ماہ بانو کی طرف بھاگا۔ صراحی الٹی کرکے اس نے اس میں موجود سارا پانی ماہ بانو پر انڈیل دیا۔ اتنا ڈھیر سارا پانی چہرے اور جسم پر گرنے سے وہ ہڑبڑا کر بے ہوشی سے ہوش میں آئی لیکن اس کی آنکھیں اب بھی بالکل ویران تھیں اور یوں لگتا تھا کہ وہ آنکھیں کھول لینے کے باوجود ہوش وحواس کی دنیا میں واپس نہ لوٹی ہو۔

"ارے او کے ماہ بانو! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ اچانک تمہیں کیا ہوگیا تھا؟" اس کے رخسار نرمی سے تھپکتے ہوئے اسلم نے دریافت کیا۔

"میں اپنی جھونپڑی میں واپس جاؤں گی۔" اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ کسمساتی ہوئی اٹھ کر بیٹھی اور فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ اسلم نے بھی اسے اس وقت چھیڑنا اور کچھ دریافت کرنا مناسب نہیں سمجھا اور سہارا دے کر پھلواری سے باہر لے آیا۔ اسے ماہ بانو کو اس طرح سہارا دے کر جھونپڑی تک لے جاتے دیکھ کر بہت سی آنکھوں میں سوال جاگے لیکن ان دونوں ہی کے پاس کسی کی نظروں میں موجود سوالوں کو پڑھنے کی فرصت نہیں تھی۔ ایک اپنے سب سے بڑے نقصان کے لیے دل میں ماتم کناں تھا تو دوسرے کو فکر تھی کہ وہ جس لڑکی کو سہارا دے کر لے جارہا ہے، اسے کچھ ہو نہ جائے۔ ماہ بانو کی اچانک بے ہوشی نے اسے بے حد تشویش میں مبتلا کردیا تھا لیکن وہ یہ بھی محسوس کررہا تھا کہ اس وقت اس سے کوئی سوال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مناسب یہی تھا کہ وہ کچھ دیر آرام کرے۔

"تم آرام کرو۔ میں دو گھنٹے بعد آکر تمہاری خیریت معلوم کروں گا۔" جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ کر اس نے مکمل سکوت میں موجود ماہ بانو سے کہا اور خود نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے پلٹنے لگا۔

"ایک منٹ رکو اسلم۔" ماہ بانو کی آواز نے اس کے قدم پکڑ لیے۔

"ہاں بولو، کوئی کام ہے کیا؟" وہ اس کی طرف واپس پلٹا۔

"تم سے ایک بات پوچھنی تھی۔" وہ اس پر نظر جما کر سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

"پوچھو۔" وہ ذرا حیرت زدہ سا ہمہ تن گوش ہوا۔ اگلے ہی لمحے ماہ بانو نے اس سے جو سوال کیا، اس نے اس کی حیرت کو دوچند کردیا اور وہ بھونچکا سا کھڑا سوچنے لگا کہ کیا میری قوت سماعت ٹھیک طرح سے کام کررہی ہے؟

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اسلم؟“

اسلم ابھی تک گومگو کی حالت میں کھڑا تھا جبکہ اسے اپنے سوال کا جواب پانے کی جلدی تھی۔ حیرت اور خوشی کی شدت سے گنگ رہ جانے والے اسلم نے سوال دہرائے جانے پر نظریں اٹھا کر اس کا بھرپور جائزہ لیا۔ کچھ دیر قبل اسلم نے ہوش میں لانے کے لیے اس کے اوپر صراحی بھر کر پانی انڈیلا تھا چنانچہ اب وہ اس کے سامنے بھیگی ہوئی کھڑی تھی لیکن اسلم کو لگ رہا تھا کہ صرف اس کا لباس ہی بھیگا ہوا نہیں ہے بلکہ پلکیں بھی بھیگی بھیگی سی ہیں۔ شاید اس کے اندر کہیں بہت زور کا ساون برس رہا تھا جس نے اس کی پلکوں کو بھی بھگو دیا تھا۔

”تم کچھ بول کیوں نہیں رہے اسلم؟“ اس کی مسلسل خاموشی پر ماہ بانو نے ایک بار پھر اس سے پوچھا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ جو کچھ میں نے سنا ہے، تم نے مجھ سے وہی سوال کیا ہے یا مجھ سے کوئی غلطی ہو رہی ہے؟“ آخر اس نے اپنی خاموشی کو توڑا اور بے بسی سے بولا۔

”اگر تمہیں یقین نہیں آ رہا تو میں اپنا سوال ایک بار پھر دُہرا دیتی ہوں۔ میں نے تم سے پوچھا ہے کہ کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اپنا سوال دُہرایا۔ اپنی زندگی کا یہ اہم ترین فیصلہ اس نے بہت قلیل وقت میں کیا تھا۔ اسلم کے ساتھ پھلواری سے یہاں تک آنے میں جو وقت صرف ہوا تھا، بس اتنے ہی وقت میں اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ پھلواری میں جب وہ شہریار کی شادی کی خبر سن کر فوری صدمے سے سنبھل نہیں سکی تھی اور بے ہوش ہو گئی تھی تو یہ اسلم ہی تھا جو اسے ہوش میں لایا تھا اور پھر بڑی محبت سے سہارا دے کر یہاں تک پہنچایا تھا۔ اسلم کے سہارے یہاں تک آتے ہوئے اس کے دل میں خیال آیا تھا کہ زندگی صرف اپنی خوشیوں اور خواہشوں کے حصول کے لیے جیتے رہنے کا تو نام نہیں ہے۔ اپنی ذات سے دوسرے کو خوشی دے کر بھی تو جیا جا سکتا ہے اور جب سامنے والا شخص اسلم جیسا ہو تو اس کے لیے تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اسلم نے اس کے لیے کیا نہیں کیا تھا؟ یہ اسلم ہی تو تھا جس کی وجہ سے وہ ڈاکوؤں کے اس ڈیرے پر اپنی عزت بچا کر رہ رہی تھی۔ وہ پہلی نظر میں اس کی محبت کا شکار ہوا تھا اور پھر اپنی اس محبت میں اس حد تک آگے گیا تھا کہ اپنا سارا مال و اسباب لٹا ڈالا تھا۔ گروہ میں اپنے لیے دشمن بنا لیے تھے اور ہر دم وہ ہر پل اس پر جان نثار کرنے کو تیار رہتا تھا۔ جسے وہ چاہتی تھی وہ تو اس کی دسترس سے پہلے ہی بہت دور تھا اور اب ڈاکٹر ماریا کا پہنچنے کے بعد مکمل طور پر ناقابلِ حصول بھی ہو گیا تھا۔ ان حالات میں کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ وہ اس شخص کا دامن خوشیوں سے بھر دیتی جو بڑی شدت سے اس کے ساتھ کا خواہاں تھا... اور وہ جانتی تھی کہ اس خواہش میں اتنی شدت ہے کہ وہ اس کی یہ خواہش پوری کرنے کے عوض اس سے اپنی کوئی بھی شرط منوا سکتی ہے۔ خود اس کی اپنی ذات کے لیے کوئی ایسی تمنا نہیں تھی جو اسلم پوری کر سکتا لیکن وہ اسلم کے لیے یہ خواہش رکھتی تھی کہ یہ شخص ڈاکوؤں کے اس گروہ سے الگ ہو جائے اور ایک اچھی شریفانہ زندگی گزارے۔

یہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں تھا۔ اس نے کئی بار خود سے یہ دعویٰ کیا تھا کہ دل جس کی محبت میں مبتلا ہے اس کے سوا کسی دوسرے کا نہیں ہونا لیکن آج وہ اپنے دعوے سے دست بردار ہو گئی تھی تو صرف یہ سوچ کر کہ کسی کو پانے کی تمنا میں ناکام ہونے کے بعد ساری زندگی ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے گزارنے سے کہیں بہتر ہے کہ خود کسی کی بن کر اس کی زندگی سنوار دی جائے۔ وہ اسلم کو بُرائی کی دلدل سے نکال کر شریفانہ زندگی کی طرف لے جاتی تو یہ اس کی اتنی بڑی کامیابی ہوتی جس کی خوشی اسے اپنی ناکام محبت کے دکھ سے نکال دیتی۔ یہ ساری باتیں اس نے ذرا سی دیر میں سوچ لی تھیں اور فوری طور پر اسلم کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ وہ زبان سے تسلیم کرتی یا نہ کرتی لیکن اس حقیقت کو نہیں جھٹلایا جا سکتا تھا کہ اس نے شہریار کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد جذباتی پن میں یہ فیصلہ کیا ہے۔

”تم نے مجھ سے جو سوال کیا ہے، درحقیقت تمہیں یہ سوال کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ تم جانتی ہو کہ میں اول روز سے تمہارا خواہش مند ہوں اور اگر تم میری بن سکو تو میرے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔“ اسلم جو اب تک حیرت سے ساکت تھا، اس کی خواہش کو دُہرائے جانے پر خوشی سے لرزاں آواز میں بولا۔

”لیکن میری ایک شرط ہے۔“ ماہ بانو نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ خود اس کی اپنی یہ کیفیت تھی کہ وہ یک دم ہی ہر احساس سے عاری ہو گئی تھی اور کسی روبوٹ کی طرح غیر جذباتی لہجے میں بول رہی تھی۔

”مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔“ اسلم نے ایک لمحہ لگائے بغیر جواب دیا اور بڑے جذب سے بولا۔ ”تمہارے کہنے پر تو میں اپنی جان بھی بغیر سوچے سمجھے قربان کر سکتا ہوں۔“

”تمہیں میری خاطر اس ڈکیت گروپ کو چھوڑنا ہو گا اور ہم شادی تب کریں گے جب اس جنگل سے نکل کر کسی

مہذب آبادی میں پہنچ جائیں گے۔“ اس نے اپنی شرط بیان کی جسے سن کر اسلم کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ دوسری طرف وہ اسے جواب طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتا، کسی نے اسے پکارا۔ اس نے پکارنے والے کی طرف مڑ کر دیکھا۔

”سردار تجھے بلا رہا ہے۔“ پکارنے والے نے اسے اطلاع دی تو وہ فوری طور پر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ ماہ بانو کی نظریں اس کے تیز رفتار قدموں سے لپٹی اس الجھن میں ہی مبتلا رہ گئیں کہ جانے اسلم کا فیصلہ کیا ہوگا؟

☆☆☆

”مبارک ہو چودھری صاحب! آپ نانا بن گئے ہیں۔ امید ہے آپ کو یہ خبر سن کر خوشی محسوس ہوئی ہوگی۔ ہمیشہ بڑوں کو کہتے سنا ہے کہ اصل سے سود پیارا ہوتا ہے۔ پوتا پوتی اور نواسا نواسی کی محبت اپنی اولاد سے بڑھ کر محسوس ہوتی ہے، چنانچہ میں آپ سے یہ امید کرتا ہوں کہ آپ اپنی نواسی کی خوشی میں ہماری جان بخشی کر دیں گے اور ہمارے پیچھے اپنے آدمیوں کو بھیجنے کے بجائے ہمیں ہماری دنیا میں سکون سے رہنے دیں گے۔“

کوریئر سروس کے ذریعے حویلی پہنچنے والا وہ خط اگرچہ زیادہ طویل نہیں تھا لیکن چودھری پر بُری طرح اثر انداز ہوا تھا اور یہ اثر منفی تھا۔ خط بھیجنے والا کتابوں کی دنیا کا فرد تھا چنانچہ بدترین حالات میں بھی لوگوں سے اچھی امیدیں رکھتا تھا۔ اب بھی اس نے اپنی ایسی ہی امید کے سہارے یہ خط حویلی بھیج ڈالا تھا لیکن اس کی امیدوں کے برخلاف اس خط کو پڑھ کر چودھری سخت طیش میں آگیا۔ اسے ایسا لگا کہ اس خط کے ذریعے آفتاب نے اس کا مذاق اڑایا ہے اور اسے چیلنج کیا ہے کہ لو، دیکھ لو... تمہارے تمام تر اختیارات اور رعب و دبدبے کے باوجود میں نہ صرف تمہاری بیٹی کو تمہاری ناک کے نیچے سے نکال کر لے گیا بلکہ اسے ایک بچی کی ماں بھی بنا بیٹھا ہوں اور تم اپنے اتنے سارے پٹھوؤں کے ہوتے ہوئے میری گرد بھی نہیں پا سکے۔

اس سوچ کے بعد اس کا دماغ پا ہونا لازمی تھا، سو وہ کسی زخم خوردہ درندے کی طرح سرخ آنکھیں لیے ادھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اس تک خط پہنچانے والا منشی اللہ رکھا ایک جانب مؤدب کھڑا تھا۔ اسے تجسس تھا کہ خط کے مضمون کو جانے لیکن چودھری کا غصہ اس کے تجسس کو سوال بن کر زبان پر آنے سے روک رہا تھا۔ اس نے لفافے کی پشت پر واضح طور پر لکھا آفتاب کا نام پہلی ہی نظر میں پڑھ لیا تھا اور اس نام کو پڑھ کر بُری طرح بے چین ہو گیا تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو چودھری کو لفافہ پہنچانے سے قبل خود اسے کھول کر دیکھ لیتا لیکن ظاہر ہے، یہ ممکن نہیں تھا اور اب بھی وہ یہ نہیں جان سکا تھا کہ خط میں کیا لکھا ہے۔ البتہ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ خط میں کوئی ایسی بات تحریر ہے جس نے چودھری کی انا کو ٹھیس لگائی ہے جو وہ یوں بلبلایا ہوا نظر آ رہا ہے۔

”اللہ رکھا...!“ ٹہلتے ٹہلتے چودھری اچانک رکا اور اسے پکارا۔

”حکم سرکار!“ منشی نے فوراً کسی نازک موقع پر اختیار کیے جانے والے مخصوص غلامانہ انداز میں مستعدی سے پکار کا جواب دیا۔

”ذرا وہ لفافہ تو اٹھا کر دے۔“ طیش کے عالم میں اس نے خط کو پڑھنے کے ساتھ ہی پرزہ پرزہ کر کے لفافے سمیت دور اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ خط کے پرزے پنکھے کی ہوا کے زور سے کمرے میں اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے جبکہ لفافہ ایک جانب دیوار کے قریب پڑا ہوا تھا۔ اس کا حکم سنتے ہی منشی پھرتی سے لفافے تک گیا اور جھک کر اسے اٹھانے کے بعد اس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ لفافہ ہاتھ میں لے کر اس نے اس پر چھپے مونوگرام کو غور سے دیکھا۔ وہ ایک مشہور کوریئر کمپنی کا مونوگرام تھا۔ اس مونوگرام کے علاوہ لفافے پر حویلی کا پتا اور آفتاب کا نام درج تھا۔ ظاہر ہے، آفتاب نے اپنے نام کے ساتھ اپنا پتا نہیں لکھا تھا۔ اسے ایسی کوئی ضرورت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لفافے کو دیکھتے ہوئے وہ مشکل ہی سہی لیکن ایسا راستہ ڈھونڈ چکا تھا جس کے ذریعے آفتاب اور کشور تک پہنچا جا سکتا تھا۔

”اس کوریئر کمپنی کے دفتر جا کر چھان بین کرواؤ کہ یہ خط کہاں سے بھیجا گیا ہے۔ علاقے کا معلوم ہو گیا تو ہمارے لیے اس مردود ماسٹر تک پہنچنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔“ اس نے ہم راز دستِ راست منشی کو حکم دیا۔

”جو حکم سرکار!“ منشی بوتل کے جن کی طرح حکم کی بجا آوری کے لیے وہاں سے غائب ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد چودھری نے حویلی کے زنان خانے کا رخ کیا۔ زنان خانے میں اس کی منزل چھوٹی چودھرائن ناہید کا کمرا تھی۔ کشور کے حویلی سے فرار ہونے کے بعد وہ اس کی ماں ہونے کے ناتے سخت معتوب ٹھہری تھی اور سزا کے طور پر اسے حویلی کے معاملات سے عملی طور پر بے دخل کر دیا گیا تھا، چنانچہ اب وہ زیادہ تر اپنے کمرے تک ہی محدود رہتی تھی۔ اس سزا کو اس نے اس لیے زیادہ دل پر نہیں لیا تھا کہ اس کے حویلی میں اختیارات پہلے ہی محدود تھے اور اصل کرتا دھرتا وڈی چودھرائن ہی تھی لیکن اسے کشور کے اقدام سے شدید دکھ پہنچا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ اس جرم کی سزا میں اسے اپنی جان گنوانی پڑے گی اور وہ جیسی بھی سہی ماں تھی۔ اگرچہ اس نے ضرورت سے زیادہ عیش و آرام میں پڑ جانے کے باعث کبھی اپنی اولاد کا خیال رکھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور ہمیشہ اس بات کو کافی سمجھا تھا کہ بے تحاشا دولت اور خدمت گار اس کی اولاد کو آرام پہنچا رہے ہیں لیکن اب اپنی تمام تر بے پروائی اور کاہلی کے باوجود وہ اس غم میں مبتلا رہنے لگی تھی کہ جلد یا بدیر اس کی بیٹی ماری جائے گی۔ اس کا حال اس ملزم کی ماں کا سا تھا جسے عدالت سے سزائے موت سنائی جا چکی ہو اور وہ اس دن کے ٹلنے کی دعا کر رہی ہو جب سزا پر عمل درآمد کا دن آئے گا۔ چودھری اس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اسے دیکھ کر چونک پڑی اور عجلت میں اس کے استقبال کے لیے مسہری سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔

”بیٹھ جا ناہید! مجھے تجھ سے ایک ضروری گل کرنی ہے۔“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے چودھرائن ناہید کو واپس مسہری پر بیٹھنے کا حکم دیا اور خود ایک اونچے پایوں والی منقش کرسی پر بیٹھ گیا۔

”حکم کریں چودھری صاحب!“ چھوٹی چودھرائن ناہید اس کے حکم پر بیٹھ تو گئی لیکن اندر سے وہ سخت تشویش میں مبتلا تھی کہ جانے چودھری کون سی ضروری بات کرنے آیا ہے۔ اس کا دل تو آج کل کشور میں ہی اٹکا رہتا تھا اور وہ اس خیال سے ہولتی رہتی تھی کہ جانے کب کشور کے بارے میں کون سی خبر حویلی پہنچ جائے۔

”حکم وکم کچھ نہیں ہے۔ تجھے ایک خوشی کی خبر سنانی ہے۔“

”خوشی کی خبر...؟“ وہ حیران ہوئی۔ ”وہ کیا؟“

”تو نانی بن گئی ہے۔ ابھی ابھی میرے پاس خبر آئی ہے کہ کشور کے ہاں دھی پیدا ہوئی ہے۔“ چودھری نے اسے خبر سنائی، اسے سن کر وہ بھونچکی رہ گئی۔ وہ بھلا کیسے یقین کر سکتی تھی کہ کل تک جو شخص کشور کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا، آج وہ اس کی بیٹی کی پیدائش کی خبر سن کر خوش ہو سکتا ہے... پھر اسے یہ خبر ملی کیسے تھی؟ کیا وہ کشور تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا؟ یہ خیال آتے ہی اس کا دل بُری طرح دھڑک اٹھا اور اس نے خوف زدہ نظروں سے چودھری کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ جیسی سختی و کرختگی چھائی ہوئی تھی اور کہیں بھی خوشی کی کوئی معمولی سی رمق دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

”آپ کو کیسے معلوم ہوا چودھری صاحب! کیا کشور آپ کو مل گئی ہے؟“ آخر کار وہ اپنے خدشے کو حیرت کی شکل میں سوال بنا کر ہونٹوں پر لے آئی۔

”نہیں، کشور مجھے نہیں ملی۔ یہ خبر جو میں نے تجھے سنائی ہے اس کے شوہر نے خط میں لکھ کر بھیجی ہے۔“ چودھری نے اسے جواب دیا۔ اس جواب کو سن کر ناہید کو کافی سکون محسوس ہوا اور وہ دل ہی دل میں شکر ادا کرنے لگی کہ چودھری خود کشور تک نہیں پہنچ سکا۔

”میرا دل کرتا ہے کہ اس خوشی میں تجھے کوئی تحفہ دوں۔“ وہ جس خوشی کا اظہار کر رہا تھا، اس کی کوئی جھلک اس کے چہرے پر نظر نہیں آ رہی تھی۔

”آپ نے اپنا دل کشور کے لیے نرم کر لیا، میرے لیے یہی کافی ہے۔ ہور کوئی تحفہ نہیں چاہیے مجھے۔“ اس نے چودھری کی بات کے جواب میں کہا۔

”پر میرا جی کرتا ہے کہ میں تجھے کوئی ہور تحفہ بھی ضرور دوں۔ چل ایسا کرتا ہوں کہ اس حویلی کے سارے اختیارات تیرے ہاتھ میں دے دیتا ہوں۔ تو حویلی کے اندر کے سارے معاملات دیکھنا۔ آج سے تیرا حویلی میں وہی مقام ہوگا جو وڈی چودھرائن کا ہے۔“ چودھری کی بات کسی بم دھماکے سے کم نہیں تھی۔ اس بات کو سن کر وہ کچھ دیر تو سکتہ زدہ سی بیٹھی رہ گئی پھر ذرا ہمت کرتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”لیکن چودھری صاحب، وہ وڈی آپا...؟“ اس کے ادھورے جملے میں ہی پورا سوال تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وڈی چودھرائن خود کو اس حویلی کا مالک سمجھتی ہے اور کسی کو بھی اپنے اختیارات میں دخل دینے کی اجازت نہیں دے سکتی۔

”وہ کچھ عرصے آرام کرے گی۔ اسے آرام کی وڈی ضرورت ہے۔“ یہ جواب دیتے ہوئے چودھری کے لہجے میں بھیڑیے کی سی غراہٹ تھی۔ چودھرائن نے اس جواب کو سن کر اپنے اندر ایک سرد سی لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی اور مزید کوئی سوال کرنے کی جرأت نہیں کر سکی۔

☆☆☆

”میرے پاس آپ کو سنانے کے لیے ایک اچھی خبر ہے سر!“ اس کے پاس ایس پی کا فون آیا ہوا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے یہ جملہ کہا تو وہ چونک پڑا۔ جنگل میں جو آپریشن شروع کیا جانے والا تھا، اس کی منصوبہ بندی میں ایس پی کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ چنانچہ اچھی خبر کا سن کر اسے فوراً

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہی یہ خیال آیا کہ خبر کا تعلق آپریشن سے ہی ہے۔

''خبر اچھی ہے تو سنانے میں دیر مت کیجیے ایس پی صاحب! یہاں اچھی خبریں ویسے بھی مشکل سے ہی سننے کو ملتی ہیں۔'' اس نے خوش گوار لہجے میں ایس پی کو جواب دیا۔ یہ ایس پی سابقہ ایس پی معظم تارڑ کے مقابلے میں کافی بہتر آدمی تھا اس لیے وہ اسے پسند کرتا تھا حالانکہ اس شخص نے بعض مواقع پر اسے مایوس بھی کیا تھا خاص طور پر ماسٹر غیب اور اس کے دوسرے ساتھی اساتذہ کے سفاکانہ قتل کے موقع پر وہ جس طرح چودھری کے سامنے بے دست و پا نظر آیا تھا، اس چیز نے اسے کافی تکلیف پہنچائی تھی۔ اس موقع پر ایس پی نے کھل کر اپنا کردار ادا کرنے کے بجائے یہ کوشش کی تھی کہ چودھری اور شہریار کے درمیان صلح ہو جائے اور وہ خود ہاتھیوں کی لڑائی میں روندے جانے سے محفوظ رہے۔ اس نے ایس پی کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا تھا لیکن ساتھ ہی اس کی مجبوری کو بھی قبول کر لیا تھا۔ وہ بے چارہ اس لیے سارے معاملات سے الگ تھلگ رہنا چاہتا تھا کہ اسے اس کی جوان بیٹی کو اغوا کرنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ وہ شخص مجبور اور بزدل تھا لیکن سابقہ ایس پی معظم تارڑ کی طرح کرپٹ نہیں تھا۔ معظم تارڑ تو پولیس کی وردی میں لٹیروں کو تحفظ فراہم کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ کی وجہ سے جنگل سے بڑے پیمانے پر درختوں اور جانوروں کی کھالوں کی اسمگلنگ کی گئی تھی۔ فاریسٹ آفیسر اقبال باجوہ بھی اس جرم میں برابر کا شریک رہا تھا۔ اقبال باجوہ اپنے ہی شریک چودھری کے ہاتھوں موت کے گھاٹ پہنچا اور معظم تارڑ بیرون ملک فرار ہو گیا۔ ان دونوں بے ایمانوں کی جگہ وہ موجودہ ایس پی اور نئے فاریسٹ آفیسر عابد انصاری کو لایا تھا اور ان کی طرف سے خاصا مطمئن بھی تھا۔ خاص طور پر اسے اتنا اطمینان ہو گیا تھا کہ جنگل سے غیر قانونی طور پر درخت کاٹ کر اسمگل نہیں کیے جا رہے ہیں اس لیے اس کے ان دونوں سے تعلقات بھی کافی خوش گوار تھے۔ خاص طور پر وہ عابد انصاری کو خاصا پسند کرنے لگا تھا۔

''خوش خبری یہ ہے جناب کہ ہمیں ایک ایسا مخبر مل گیا ہے جو ہمیں جنگل میں ڈاکوؤں کے ٹھکانے کے متعلق بتا سکتا ہے۔ اس سے ہمیں یہ فائدہ ہوگا کہ ہم جنگل میں اِدھر اُدھر بھٹکنے سے بچ جائیں گے اور افرادی قوت بھی نسبتاً کم ہو جائے گی۔'' ایس پی خود بھی خاصا خوش لگ رہا تھا۔

''خبر تو واقعی اچھی ہے لیکن ایسا کام کا آدمی آپ کے ہاتھ آیا کیسے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا خود ڈاکوؤں سے کوئی تعلق ہو اور وہ ہمیں بھٹکانے کے لیے منظر پر آیا ہو؟'' اس نے شک کا اظہار کیا۔

''ایسا نہیں ہے جناب! اس آدمی کو پولیس والے جانتے ہیں۔ وہ کوئی سادھو قسم کا آدمی ہے۔ سارا وقت اِدھر سے اُدھر بھٹکتا رہتا ہے۔ کبھی آبادی میں نظر آتا ہے تو کبھی مہینوں کے لیے جنگل میں غائب ہو جاتا ہے۔ زیادہ تر خاموش رہتا ہے لیکن جب موڈ میں ہو تو اپنے بارے میں بھی بتانے لگتا ہے۔ اس کی باتوں سے ہی لوگوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے غیاب کے عرصے میں کہاں بھٹکتا رہا... جنگل کے کس حصے میں رہا... کیا کھایا پیا اور کیا کچھ دیکھا۔ لوگ اس کی باتوں کو بہت زیادہ توجہ سے نہیں سنتے تھے۔ یہ تو اتفاق ہے کہ کل شب جب وہ اپنی خاموشی کا روزہ توڑ کر بولنا شروع ہوا اور جنگل میں اپنے بسیرے کی داستان سناتے سناتے ڈاکوؤں کو دیکھنے اور ان کے پیچھے پیچھے ان کے ڈیرے پر پہنچنے کی داستان سنا رہا تھا تو قریب ہی موجود پولیس کے ایک آدمی نے اس کی باتیں سن لیں۔ وہ اس سادھو کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے آیا اور اس سے ڈاکوؤں کے ٹھکانے کے بارے میں خاصی معلومات اگلوا لیں۔'' ایس پی نے جوش و خروش کے ساتھ اسے تفصیل سے آگاہ کیا۔

''آپ کے خیال میں ہم اس قسم کے کسی آدمی کے بیان پر اتنے اہم آپریشن میں اپنا لائحہ عمل طے کر سکتے ہیں؟'' ایس پی کے جوش و خروش کے باوجود وہ بھروسا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''آئی تھنک سر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ میرے آدمیوں نے جو معلومات فراہم کی ہیں، اس کے مطابق سادھو بابا فاترالعقل نہیں ہے۔ وہ بس تنہائی پسند اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا ہے۔ یہ بات اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ ایک بار گاؤں کی ایک بچی گم ہو گئی تھی اور ہر طرف ڈھونڈنے کے باوجود اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ ایسے میں سادھو بابا جنگل سے برآمد ہوا اور اس نے بتایا کہ بچی جنگل میں ہے اور وہاں ایک درخت کے نیچے سو رہی ہے۔ لوگوں نے سادھو سے جگہ کے متعلق معلومات حاصل کیں اور دوڑ پڑے۔ بچی عین اسی جگہ موجود تھی جس کی سادھو نے نشان دہی کی تھی۔''

''اوہ...! اگر ایسا ہے تو ہمارے لیے یہ بہت ہی بہترین ہے۔ آپ کا کیا ارادہ ہے، آپریشن کے دوران اسے اپنے ساتھ رکھیں گے یا نہیں؟'' ایس پی کے بیان پر اسے خود بھی سادھو کی اہمیت کا احساس ہوا اور اس نے سوال کیا۔

''ساتھ تو خیر نہیں رکھ سکتے۔ وہ من موجی آدمی ہے، ہمارے کہنے پر ہمارے ساتھ چلنے کو راضی نہیں ہو سکتا اور اگر راضی ہو بھی گیا تو جانے کب راستے میں ہی اپنا رخ بدل لے کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ جو کچھ اس نے بتایا ہے، اس کی اس سے مزید تصدیق و تفتیش کر لی جائے تاکہ کسی قسم کا کوئی ابہام نہ رہے اور ہم صحیح مقام پر پہنچ سکیں۔'' ایس پی نے ذرا وضاحت کے ساتھ اسے جواب دیا۔

''او کے! جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ لیکن یہ بتائیں کہ سادھو کا آپ کیا کریں گے؟ وہ پولیس کسٹڈی میں ہی رہے گا یا اسے آزاد کر دیا جائے گا؟'' اس نے ذہن میں ابھرنے والے کسی خیال کے تحت ایس پی کو کریدا۔

''جب تک پولیس فورس جنگل میں داخل نہیں ہو جاتی، وہ احتیاطاً پولیس کسٹڈی میں رہے گا۔ اس کے بعد اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ وہ کوئی مجرم تو ہے نہیں کہ اسے قید میں رکھا جائے۔ ہماری فورس کے جنگل میں داخل ہونے کے بعد وہ قطعی بے ضرر بھی ہو جائے گا۔ ویسے بھی اس پر جس طرح خاموشی کے دورے پڑتے ہیں اس کے پیش نظر یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی کو اس بارے میں کچھ بتائے گا یا اگر بتا بھی دے گا تو زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ وہ ڈاکوؤں کے ٹھکانے کے بارے میں جانتا ہے اور اس نے یہ بات پولیس کو بتا دی ہے... تو اس سے ہمارے آپریشن پر کیا فرق پڑ سکتا ہے؟ ہماری اپنی پلاننگ تو کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی نا!'' ایس پی نے اسے مدلل جواب دیا۔

''ٹھیک ہے ایس پی صاحب! آپ مطمئن ہیں یہ کافی ہے۔ اس سارے معاملے کو دیکھنا تو آپ ہی کو ہے۔ باہر سے جو لوگ آپ کی مدد کے لیے آئیں گے وہ تو آپ کے آرڈرز کو ہی فالو کریں گے۔'' اس نے ایس پی پر اپنے بھروسے کا اظہار کرتے ہوئے گفتگو کو سمیٹ دیا۔

''او کے سر! یہ سب آپ کے پرسنل انٹرسٹ کی وجہ سے ہو رہا ہے اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کو اَپ ڈیٹ کر دوں ورنہ آپ کی یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے کہ اس معاملے کو مجھے اور میرے عملے نے ہی دیکھنا ہے۔ اچھا، اب اجازت دیجیے۔ انشاء اللہ اب کامیابی کی خوش خبری کے ساتھ ہی دوبارہ بات چیت یا گفتگو ہوگی۔'' ایس پی نے خوش خلقی سے کہتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ اس کی کال سے فارغ ہوا ہی تھا کہ موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔

''السلام علیکم ممانی جان! کیسے سب خیریت ہے نا۔ آپ کے مزاج تو اچھے ہیں؟'' اسکرین پر آفرین رانا کا نمبر دیکھ کر اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کال ریسیو کی اور خوش دلی سے بات کرنے لگا۔

''میرے مزاج تو اچھے ہیں لیکن میں اور تمہارے ماموں جان تمہاری مزاج پرسی کے لیے پہنچے ہوئے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ گھر کب تک پہنچ رہے ہو؟'' جواباً وہ رعب سے بولیں تو وہ خوش گوار حیرت میں گھر گیا۔

''کیا واقعی آپ دونوں یہاں پر ہیں؟'' اس کی حیرت و خوشی کا اظہار اس کے لہجے سے بھی ہوا۔

''تو تمہارے خیال میں، میں تمہیں بغیر موقع کے اپریل فول بنا رہی ہوں؟'' آفرین رانا نے مصنوعی ناراضی کا اظہار کیا۔

''ناراض مت ہوں۔ میں بس ابھی پانچ منٹ میں گھر پہنچ رہا ہوں۔'' اس نے ہنستے ہوئے ان سے کہا اور لائن کاٹ کر اپنی جگہ سے اٹھ ہی رہا تھا کہ انٹرکام بج اٹھا۔

''سر! فاریسٹ آفیسر عابد انصاری آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔'' دوسری طرف سے عبدالمنان نے اسے اطلاع دی۔

''او کے! انہیں اندر بھیج دو۔'' وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ عابد انصاری ایسا شخص نہیں تھا کہ وہ اس کی ملاقات کی خواہش کو ٹال سکتا۔ چند لمحوں کے بعد عابد انصاری اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے حسب معمول سفاری سوٹ پہن رکھا تھا اور آنکھوں پر نفیس فریم کی عینک تھی۔

''آپ کیا لینا پسند کریں گے انصاری صاحب! ٹھنڈا یا گرم؟'' وہ دفتر میں بیٹھ کر لوگوں کی خاطرداری سے عموماً پرہیز ہی کرتا تھا لیکن عابد انصاری کی بات ذرا الگ تھی۔

''ان تکلفات میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے شہریار صاحب! میں آپ کا زیادہ وقت لینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ایک چھوٹی سی بات کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، وہ کام ہو جائے تو آپ سے اجازت چاہوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ خاصے مصروف آدمی ہیں اس لیے میں آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔'' اس نے بہت رکھ رکھاؤ سے شہریار سے کہا۔

''آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں انصاری صاحب! اب میں ایسا بھی مصروف آدمی نہیں ہوں۔ چلیں ایسا کرتا ہوں کہ چائے منگوا لیتا ہوں۔ ہم دفتری کام کرنے والوں کو تو چائے ہر موسم میں ہی اچھی لگتی ہے اور ایک پیالی چائے پینے میں

...بھی زیادہ نہیں لگتا۔" اس نے بڑے خلوص کے ساتھ ...جواب دیا اور ویٹر کو چائے کا آرڈر دینے لگا۔

"جی اب فرمایئے کہ آپ نے کس چھوٹی سی بات کے ...یہاں تک آنے کی تکلیف فرمائی؟" چائے کا آرڈر دینے ...کے بعد وہ مسکراتا ہوا عابد انصاری سے مخاطب ہوا۔

"بات یہ ہے اے سی صاحب کہ مجھے کچھ درخت ...یہاں سے باہر بھجوانے ہیں۔ آپ کے علم میں یہ بات ہوگی کہ کسی بھی جنگل میں درختوں کی کٹائی اور جانوروں کے شکار پر پابندی ہونے کے باوجود مخصوص اوقات میں محدود پیمانے پر ان دونوں باتوں کی اجازت دی جاتی ہے۔ اسی اصول کے تحت میں نے جنگل سے کچھ درختوں کو کٹوایا ہے اور اب یہ کٹے ہوئے درخت ٹرکوں پر لوڈ ضلع سے باہر جانے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ ٹرکوں کو لے جانے والے افراد کے پاس باقاعدہ پرمٹ موجود ہوں گے اور یہ ایک قطعی قانونی کام ہے۔ اس کے باوجود میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کے علم میں یہ بات لے آؤں تاکہ اول تو میرے عملے کو راستے میں غیر ضروری تفتیش اور چیکنگ کا سامنا نہ کرنا پڑے، دوسرے میری ذات کسی قسم کے شک وشبے کی زد میں نہ آئے کہ شاید میں بھی سابقہ فاریسٹ آفیسر کی طرح درختوں کی اسمگلنگ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" عابد انصاری نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں انصاری صاحب! اگر کوئی کام قانونی طریقے سے کیا جائے گا تو مجھے اس پر بھلا کیا اعتراض ہوگا اور میں کیوں آپ پر کسی قسم کا شک کروں گا؟ آپ بے فکر ہو کر سامان بھجوایئے، میں پولیس اسٹیشن پر پیغام بھیج دوں گا کہ آپ کے عملے کو پریشان نہیں کیا جائے۔" اس نے عابد انصاری کو اطمینان دلایا۔

"میں اس تعاون کے لیے آپ کا شکرگزار رہوں گا۔" اس نے انکساری سے جواب دیا۔

"شکریے کی کوئی بات ہی نہیں ہے، اگر آپ اس کے علاوہ بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کہہ سکتے ہیں۔" اس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

"جی نہیں شکریہ۔" اس نے انکار کیا۔

"تو پھر آیئے چائے پیتے ہیں۔" ملازم اسی وقت دروازے پر دستک دے کر چائے سمیت اندر آیا تو وہ عابد انصاری سے بولا۔ چائے کے دوران وہ دونوں اِدھر اُدھر کے موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ معلومات کی دونوں طرف ... لیے دونوں کو ہی گفتگو میں لطف محسوس ہو رہا تھا۔

"اچھا بھئی! اب اجازت دیجیے۔ میں چند منٹ کی ملاقات کا سوچ کر آیا تھا اور اب اچھا خاصا وقت گزر چکا ہے۔" آخر عابد انصاری کو ہی خیال آیا تو اس نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کیا اور اس سے اجازت چاہی۔

"آپ سے باتیں کرکے بہت اچھا لگا انصاری صاحب۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔" اس نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دیا اور پھر بڑے وقار سے چلتا ہوا وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد شہریار واپس اپنی سیٹ پر بیٹھا نہیں اور خود بھی دفتر سے باہر نکل گیا۔ اسے اچھی طرح سے احساس تھا کہ وہ آفرین رانا سے پانچ منٹ میں گھر پہنچنے کا کہہ کر اچھا خاصا لیٹ ہوگیا ہے۔

"تورکوٹ میں پانچ منٹ اتنے طویل ہوتے ہیں، مجھے نہیں معلوم تھا۔" گھر پہنچ کر وہ سلام دعا کے مرحلے سے فارغ ہوا تو حسب توقع آفرین رانا نے پہلی فرصت میں اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے اس انداز پر وہ مسکرا دیا اور شرارت سے بولا۔

"اصل میں یہاں ہم نے وقت کو اپنے کنٹرول میں کرنے کا جادو سیکھ لیا ہے۔ ہم جب چاہے منٹوں کو گھنٹوں میں اور گھنٹوں کو منٹوں میں بدل سکتے ہیں۔"

"یہاں آکر سیکھ لینے کی کیا بات کر رہے ہو۔ یہ ہنر تو سرکاری افسروں اور سیاست دانوں کی گھٹی میں شامل ہوتا ہے۔ بے وقوف تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو تمہاری بات کا یقین کر لیتے ہیں۔" انہوں نے منہ بنا کر اس کی بات کا جواب دیا تو سب ہنس پڑے پھر لیاقت رانا اس کا شانہ تھپکتے ہوئے بولے۔

"برخوردار! یہ جو تمہاری ممانی جان ہیں انہوں نے اپنی زندگی ان ہی دو کیٹیگریز کے لوگوں کو بھگتتے ہوئے گزاری ہے اس لیے یہ خوب جانتی ہیں کہ ہمارا تمہارا کچا چٹھا کیا ہے۔"

"اسی لیے تو میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری پیاری ممانی جان میری مجبوری کو سمجھ سکتی ہیں۔" وہ بڑے یقین سے بولا اور لاڈ سے آفرین رانا کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

"بلیوی ممانی جان! جب میں نے آپ سے فون پر کہا کہ میں پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں تو یقین کریں میں پانچ منٹ میں ہی یہاں پہنچنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن عین وقت پر ایک ایسے ملاقاتی آفس پہنچ گئے کہ میں کسی صورت انہیں نظرانداز نہیں کرسکتا تھا۔ ان سے فارغ ہوتے ہی میں یہاں پہنچا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا! میں جانتی ہوں ان مسائل کے بارے میں۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" حسب عادت انہوں نے اس کے لیے اپنا دل فوراً ہی کشادہ کرلیا۔ ویسے بھی ان کی ناراضی مصنوعی تھی۔ میکے سے لے کر شوہر کے گھر تک انہوں نے مردوں کی یہی مصروفیات دیکھی تھیں اس لیے اس طرح کی باتوں کو خوب سمجھتی تھیں۔

"کھانا لگ گیا ہے۔ آپ لوگ کھانے کے لیے آجائیں۔" ماریا جو اس گفتگو کے دوران میں خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی، واپس آکر بولی۔

"آپ لوگ چلیں پلیز۔ میں بس دو منٹ میں چینج کرکے آتا ہوں۔" وہ دفتر میں پہنے جانے والے پُرتکلف لباس میں خود کو غیر آرام دہ محسوس کر رہا تھا چنانچہ ان لوگوں سے بولتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ ماریا ان دونوں کو اپنی معیت میں ڈائننگ روم میں لے گئی۔ ڈائننگ ٹیبل پُرتکلف کھانے سے سجی ہوئی تھی۔ ماریا نے اپنے سسرالی رشتے داروں کے لیے خاصا اہتمام کیا تھا۔ اس اہتمام کو دیکھ کر آفرین رانا خوشی سے مسکرائیں۔ شہریار کے ماریا سے شادی کے فیصلے سے وہ جتنی ناخوش تھیں، وہ احساس آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگا تھا۔ ماریا ایک پروفیشنل ڈاکٹر ہونے کے باوجود اچھی خاتونِ خانہ ثابت ہو رہی تھی البتہ ماریا کا غیر مسلم ہونا ان کے لیے اب بھی باعث خلش تھا۔ شہریار ان کے لیے شوہر کے بھانجے سے بڑھ کر بیٹے کی سی حیثیت رکھتا تھا اور وہ تشویش میں مبتلا تھیں کہ اس کی آنے والی نسل ایک غیر مسلم ماں کی آغوش میں پرورش پا کر جانے کس رخ پر چلنے لگے گی۔

"بڑا تکلف کر ڈالا تم نے۔ تمہارے ماموں جان تو پرہیزی کھانا کھاتے ہیں اور خود مجھے کھانے پینے کا اتنا زیادہ شوق رہا نہیں ہے۔" کرسی پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے ماریا سے کہا تو ان کے جملے کے آخر میں اداسی کا وہ رنگ بھی تھا جو ایک جوان بیٹے کو گنوا دینے والی ماں کی گفتگو کا لازمی جز ٹھہرا تھا۔ صبر اور وضع داری کے تقاضے نبھانے کے لیے انہوں نے بے شک خود کو سنبھال لیا تھا لیکن سجاد رانا کی موت نے جو زخم ان کے دل پر لگایا تھا، وہ کبھی مندمل ہونے والا نہیں تھا۔

"آپ لوگ پہلی بار یہاں آئے ہیں۔ اتنی مہمان نوازی تو میرا فرض بنتی ہے۔ انکل کے پرہیز کا مجھے علم ہے اس لیے میں نے ان کے لیے الگ سے کھانا بنوایا ہے۔ باقی آپ کو میری خاطر ہر ڈش ضرور چکھنی ہوگی۔" اس نے محبت بھرے اصرار سے کہا تو وہ سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے مسکرا دیں۔ اپنی قلبی کیفیت جو بھی تھی لیکن وہ بڑی بامروت اور وضع دار خاتون تھیں جنہیں دوسروں کا خیال اپنی ذات سے کچھ بڑھ کر ہی رہتا تھا۔

لیاقت رانا اس گفتگو کے دوران خاموش رہے تھے۔ وہ بہت زیادہ بولنے والے آدمی نہیں تھے۔ شیبا اور سجاد رانا کی موت کے صدمے کے بعد پے در پے گھیر لینے والی بیماریوں نے انہیں بہت کمزور کر دیا تھا اور وہ پہلے کی نسبت اور بھی کم بات کرنے لگے تھے۔

"ارے، آپ لوگوں نے ابھی تک کھانا شروع نہیں کیا؟" شہریار اپنے کہے کے مطابق دو منٹ میں ہی چینج کرکے ڈائننگ روم میں پہنچ چکا تھا۔

"تمہاری بیگم نے اہتمام ہی اتنا کر ڈالا ہے کہ سمجھ نہیں آرہا کہاں سے شروع کریں۔" آفرین رانا نے شگفتگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"یہ مشکل میں آسان کر دیتا ہوں۔" وہ ان کے برابر والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ سے ان کی پلیٹ میں کھانا ڈالنے لگا۔

"آپ بھی شروع کریں نا انکل۔" ماریا نے لیاقت رانا سے کہا تو انہوں نے اپنے سامنے رکھے پرہیزی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ دوسری طرف آفرین رانا اور شہریار کے درمیان لاڈ پیار کا سلسلہ جاری تھا۔

"اتنا کھانا... تمہیں کس نے بتایا ہے کہ میں نے ہفتے بھر سے کچھ نہیں کھایا؟" وہ مختلف ڈشز سے اپنی پلیٹ میں منتقل کیے جانے والے کھانے کو دیکھ کر شہریار سے احتجاج کر رہی تھیں۔

"کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے، آپ کی حالت دیکھ کر پتا چل رہا ہے کہ آپ کافی عرصے سے کھانا کھانے کے بجائے صرف سونگھنے پر اکتفا کر رہی ہیں۔ اگر آج بھی آپ نے اپنی یہ روش برقرار رکھی تو بے چاری ماریا کا دل ٹوٹ جائے گا۔ اس نے اتنا اہتمام آپ ہی کے لیے تو کیا ہے، ورنہ مجھے کہاں اتنا پُرتکلف کھانا کھانے کو ملتا ہے۔" وہ ماموں، ممانی کو اپنے گھر میں پا کر دلی خوشی محسوس کر رہا تھا اس لیے لہجے میں بھی کچھ شوخی آگئی تھی۔ اسے ماریا کا اپنے عزیزوں کا اتنا خیال رکھنا بھی اچھا لگا اور اس کی خوبیوں میں ایک اور پلس پوائنٹ شامل ہوگیا۔

"یہ اتنی باتیں اس کے سامنے بتانا جو تمہیں جاننا نہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہو۔ میں نے تو تمہیں اپنے ہاتھوں سے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے۔ کیا مجھے نہیں معلوم کہ تم کس طرح کا کھانا کھاتے ہو۔ یہ بے چاری اگر تمہارے لیے اہتمام کروا بھی لے تو تم کون سا خوش ہو جاؤ گے۔ تمہیں کہاں اچھے لگتے ہیں یہ کوفتے کباب اور نہاری قورمہ جیسے کھانے۔ تم جو پھیکے سیٹھے ذائقے پسند کرتے ہو وہ تو تمہارے ماموں جان کے پرہیزی کھانے میں ہی مل سکتے ہیں۔'' انہوں نے اس کی اچھی خاصی کھچائی کر دی لیکن کھانے کا سلسلہ بہرحال جاری تھا۔ وہ اپنی عادت اور خواہش کے برخلاف صرف ماریا کو خوش کرنے کے لیے کھانے سے رغبت کا اظہار کر رہی تھیں۔

''آپ لوگ یہاں آ رہے تھے تو مریم بھابی کو بھی ساتھ لے آتے۔ فیملی کے سب لوگ ایک ساتھ جمع ہوں تو اچھا لگتا ہے۔ وہ ہوتیں تو اس وقت فیملی مکمل ہو جاتی۔'' کھانے کے دوران میں اسے خیال آیا تو اس نے آفرین رانا سے کہا۔

''مریم کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ ہمارے ساتھ نہیں آ سکی لیکن تمہاری خواہش اس طرح پوری ہو سکتی ہے کہ تم لوگ ہمارے ساتھ لاہور چلو۔ ہم بھی کچھ دن سکھ سے رہیں کہ ہمارے بچے ہماری نظروں کے سامنے ہیں اور خیریت سے ہیں۔'' اس کی بات سے سِرا پکڑتے ہوئے آخرکار آفرین رانا اپنے مطلب کی بات پر آ گئیں۔

ان کی بات سن کر شہریار نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔ وہ پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ ان دونوں کا یوں اچانک چلے آنا خالی از علت نہیں ہے۔ اب ان کے الفاظ سن کر اسے اچھی طرح سمجھ آ گیا کہ وہ لوگ اس کے بنگلے پر ہونے والی ڈکیتی کی سننے کے بعد پریشان ہو کر یہاں پہنچے ہیں اور لیاقت رانا کی خاموشی سے ظاہر تھا کہ جو کچھ آفرین رانا کہہ رہی ہیں، وہ اس سے متفق نہیں بھی ہیں تو واقف ضرور ہیں۔

''میں کوشش کروں گا کہ فرصت ملتے ہی لاہور پہنچوں۔ فی الحال یہاں کچھ معاملات ایسے ہیں جنہیں میرا دیکھنا ضروری ہے۔ آپ ایسا کریں کہ ماریا کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ یہ کچھ دن آپ کے ساتھ رہ لے گی پھر میں بعد میں اسے لینے آؤں گا تو خود بھی ایک دو دن کے لیے رک جاؤں گا۔'' غیر محسوس انداز میں کھنکھارتے ہوئے اس نے بہت سنبھل کر یہ تجویز پیش کی تا کہ آفرین رانا کو قائل کر سکے۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اپنی اندرونی کیفیت کو اس سے چھپا رہی ہیں اور درحقیقت اندر سے بے حد مضطرب ہیں لیکن وہ اس کے اندازے سے بھی زیادہ جذباتی بحران کا شکار تھیں اور کچھ اور ہی ٹھان کر یہاں آئی تھیں چنانچہ بڑے دو ٹوک انداز میں بولیں۔

''میں تم لوگوں کو چند دن کے لیے لاہور آنے کی دعوت نہیں دے رہی ہوں۔ میں تمہارے لاہور میں مستقل قیام کی بات کر رہی ہوں۔ چھوڑو اس نوکری کو۔ اتنا پیسا چھوڑ کر گئے ہیں تمہارے ماں باپ۔ تمہارے ماموں جان کے پاس بھی جو کچھ ہے، وہ تمہارا ہی ہے۔ اس رقم سے کوئی اچھا سا بزنس کرو۔ ہر وقت کی اس جھک جھک اور مار دھاڑ سے تو جان چھوٹے گی۔'' وہ گویا سب کچھ طے کر کے آئی تھیں۔ ان کی تجویز سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا اور سوالیہ نظروں سے لیاقت رانا کی طرف دیکھا۔ وہ بے بسی سے شانے اچکا کر رہ گئے۔ یعنی جو کچھ آفرین رانا کہہ رہی تھیں، وہ خود ان کی اپنی سوچ تھی اور وہ شاید خاموش رہنے کا وعدہ کر کے آئے تھے۔

''آپ اتنی جذباتی کیوں ہو رہی ہیں ممانی جان! ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا کہ میں نوکری چھوڑ چھاڑ ایک طرف ہو کر بیٹھ جاؤں اور اپنی شکست کا اعتراف کر لوں۔'' آخر جب یہ طے ہو گیا کہ اسے اپنی وکالت خود ہی کرنی ہے تو وہ پوری طرح سنبھل کر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تم مجھے بتا دو کہ اب کیا ہونا باقی رہ گیا ہے؟ جب سے تم نے یہ نوکری کی ہے، کیا کیا نہیں ہوا؟ کئی بار تم زخمی ہوئے۔ تمہیں اغوا کیا گیا۔ دھمکی آمیز فون کالز اور خطوط آنے لگے اور اب رہی سہی کسر اس ڈکیتی نے پوری کر دی۔ کیا تمہاری جان، مال اور عزت تینوں خطرے میں نہیں پڑ گئے تھے؟ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ معاملہ مال پر ہی ٹل گیا۔ اگر اس بچی کی عزت چلی جاتی تو پھر کیا ہوتا؟ تم لاکھ سر پٹختے رہتے لیکن کھوئی ہوئی عزت تو کسی صورت واپس نہیں آتی یا پھر اگر وہ ڈاکو تمہیں قتل کر ڈالتے تو کیا اس نقصان کا کوئی مداوا ہو سکتا تھا؟ ہم نے شینا اور سجاد کو کھویا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اپنی اولاد کو کھونا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جن ہاتھوں سے اولاد کو پروان چڑھایا جاتا ہے، وہ ہاتھ اپنی پلی پلائی اولاد کو قبر میں اتارتے ہوئے کانپ جاتے ہیں اور ہر بار ان ہاتھوں سے اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسو صاف کرتے ہوئے دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔''

وہ اس کے اندازے سے کہیں بڑھ کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ وہ سب لوگ کھانے سے پہلے ہی ہاتھ روک چکے تھے۔ آفرین رانا کی آنکھوں سے آنسو چھلکے تو وہ اپنی جگہ پر سیدھا بیٹھا نہ رہ سکا اور دائیں طرف ذرا سا جھک کر ان کے گرد اپنا بازو پھیلا دیا۔ ماریا بھی لپک کر اپنی جگہ سے اٹھ کر

ان کے بائیں طرف آ کھڑی ہوئی اور ٹشو پیپر کی مدد سے ان کے آنسو صاف کرنے لگی۔

''میرے خیال میں لیونگ روم میں چلتے ہیں۔ کھانا تو اب مزید کسی سے بھی نہیں کھایا جائے گا۔'' لیاقت رانا نے نہایت سنجیدگی سے یہ تجویز پیش کی جس پر سب نے صاد کیا۔ ڈائننگ روم میں بٹلر کا آنا جانا بھی لگا رہتا تھا اور یہ قطعی مناسب نہیں تھا کہ ان کی اتنی نجی نوعیت کی گفتگو کسی ملازم کے علم میں آ جائے۔ ماریا، آفرین رانا کو سہارا دے کر لیونگ روم میں لے آئی اور انہیں پانی پلایا۔ پانی پی کر وہ کچھ پُرسکون محسوس ہونے لگیں۔

''سوری ممانی جان! میری وجہ سے آپ ہرٹ ہوئیں لیکن یقین کریں کہ صورتِ حال اتنی خراب نہیں ہے جتنی آپ محسوس کر رہی ہیں۔'' آفرین رانا لیونگ روم میں ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اس صوفے کے قریب عین ان کے قدموں میں کارپٹ پر بیٹھ گیا اور ان کے گھٹنوں پر رکھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر نہایت رسانیت سے بولا۔ آفرین رانا کے سامنے اس طرح بیٹھا وہ صرف ایک محبت کرنے والا بیٹا محسوس ہو رہا تھا جسے اپنی ماں جیسی ممانی کے قدموں میں بیٹھ کر ساری افسرانہ شان بھول گئی تھی۔

''مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو شیری! یہ ٹھیک ہے کہ میں کبھی عملی میدان میں نہیں اتری اور میں نے اپنی ساری زندگی ایک گھریلو عورت کی طرح گزار دی لیکن یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ مجھ جیسا فیملی بیک گراؤنڈ رکھنے والی عورت اتنی بے وقوف نہیں ہو سکتی کہ حالات کا درست تجزیہ نہیں کر سکے۔ ان علاقوں میں ڈاکوؤں کی سرپرستی کون کرتا ہے اور وہ کس کے اشارے پر کام کرتے ہیں، میں اچھی طرح جانتی ہوں اس لیے تمہارے گھر ہونے والی ڈکیتی کو ایک عام ڈکیتی کی واردات تسلیم نہیں کر سکتی۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ اس موقع پر ڈاکوؤں نے مال و اسباب لوٹنے کے سوا اگر کچھ اور نہیں کیا تو صرف اس لیے کہ تمہارا دشمن تمہیں وارننگ دینا چاہتا تھا۔ اگر تم نے اس وارننگ کو نہیں سمجھا تو آگے چل کر معاملہ اور بھی گمبھیر ہو جائے گا۔'' وہ بالکل درست تجزیہ کر رہی تھیں۔ اس بار شہریار انہیں کوئی طفل تسلی نہیں دے سکا اور مناسب یہی سمجھا کہ ان سے کھل کر بات کر لی جائے چنانچہ ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے بولا۔

''ممانی جان! آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں، میں اس کے درست ہونے سے انکار نہیں کروں گا۔ ڈکیتی کے بارے میں جو اندازہ آپ نے قائم کیا ہے، وہی میرا بھی اندازہ ہے۔ میں نے خود کو دی جانے والی وارننگ بھی اچھی طرح سمجھ لی ہے لیکن میں ڈر کر پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آپ اسے میری ضد یا انا کا معاملہ مت سمجھیے گا۔ اگر یہ ضد ہوتی تو میں آپ کے ایک اشارے پر اس سے دست بردار ہو جاتا لیکن میں جس سوچ کے تحت اپنی جگہ پر ڈٹا ہوا ہوں، وہ مجھے قدم پیچھے ہٹانے نہیں دیتی۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر میں اس سیٹ پر ہوں تو اس ملک کا کم از کم ایک ضلع تو کرپٹ افسر سے محفوظ ہے۔ میرے جیسے چند ایک اور بھی ہوں گے لیکن ان میں سے کسی اور کو میری جیسی سہولیات یا فیملی بیک گراؤنڈ شاید ہی میسر ہو۔ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اگر اس نے مجھے حق و باطل میں فرق کا شعور دیا ہے تو ایسے اسباب بھی بہت مہیا کیے ہیں جن کی مدد سے میں اپنی جنگ کو جاری رکھ سکوں... اور یہ اللہ کا اصول ہے کہ جسے..... نوازتا ہے اسے آزمائش میں بھی..... مبتلا کرتا ہے۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں اس آزمائش میں ناکام ہو جاؤں؟ ہزاروں انسانوں کی بھلائی کو بھول کر صرف اپنی جان کی سلامتی کا سوچوں اور وہ سارے اسباق فراموش کر دوں جو آپ نے مجھ میں جذبہ حب الوطنی پیدا کرنے کے لیے پڑھائے تھے؟ آپ اگر ضد کریں گی تو میں ہو سکتا ہے صرف آپ کی خاطر پیچھے ہٹنے کو تیار ہو جاؤں لیکن کیا یہ بہت سے لوگوں کے ساتھ ناانصافی نہیں ہو گی؟ میں تو اپنی اس بزدلی پر اپنے ضمیر کے طعنے سن سن کر ہی مر جاؤں گا۔'' وہ بات کرتے کرتے خاصا آزردہ ہو گیا۔ اس موقع پر لیاقت رانا نے اس گفتگو میں دخل دیا اور اس کی حمایت میں آواز بلند کرتے ہوئے کہنے لگے۔

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے آفرین! یہ ہمارے ہاتھوں کا پلا ہوا بچہ ہے۔ ہم سے بڑھ کر کون اسے سمجھ سکتا ہے۔ اگر آج ہم نے زبردستی اسے اس کی جاب سے الگ ہونے پر مجبور کر دیا تو اس کے اندر توانائی کا جو سرچشمہ ہے، وہ سوکھ جائے گا۔ ہم اسے اپنے قریب تو رکھ لیں گے لیکن شہریار عادل کے اصل کو کھو دیں گے۔ میری مانو تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اور اسے وہ جنگ لڑنے دو جو شاید ہم میں سے ہر ایک پر فرض ہے لیکن ہم مسلسل ظلم کے آگے سر جھکانے کی روش اختیار کر کے اس جنگ میں شامل ہونے سے کتراتے ہیں۔ یہ جنگ کسی نہ کسی کو تو لڑنی ہے تو پھر وہ ہمارا یہ بیٹا کیوں نہ ہو کہ ہم بھی فخر سے سربلند کر سکیں اور بارگاہِ الٰہی میں سرخرو ہوں کہ ہم نے اس مجاہد کی پرورش کی تھی جو اللہ کے حکم کے عین مطابق باطل کو مٹانے کے لیے لڑا۔ اگر میری مانو تو تم اسے بالکل نہیں روکو کیونکہ یہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے، وہ فرضِ کفایہ ہے جو کسی نہ کسی کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

تو ادا کرنا ہی ہے ورنہ جواب طلبی تو سب ہی سے ہوگی۔"
لیاقت رانا خاموش ہو چکے تھے لیکن ان کے لفظوں کی آنچ اب بھی ہر ایک اپنے دل پر محسوس کر رہا تھا۔ آفرین رانا اپنی جگہ بالکل خاموش اور ساکت بیٹھی تھیں۔

"مجھے اجازت دیں ممانی جان! میں اپنے حصے کا فرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ پر بہت قرض ہیں۔ مجھے اپنے ہم وطنوں کے لیے کچھ کرنا ہے اور... اور ان قاتلوں تک بھی پہنچنا ہے جنہوں نے میری شینا اور سجاد بھائی کی زندگیوں کا چراغ گل کیا۔ ان قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے بغیر مجھے کسی صورت قرار نہیں آئے گا۔" وہ اب بھی آفرین رانا کے قدموں میں بیٹھا تھا اور جلتی آنکھوں سے ان سے مخاطب تھا۔
آفرین رانا نے جواب میں زبان سے کچھ نہیں کہا اور اپنا دایاں ہاتھ اس کے سیاہ گھنے بالوں سے ڈھکے سر پر رکھ دیا۔
یہ ان کا خاموش اجازت نامہ تھا جسے پا کر وہ کھل اٹھا۔

"تھینک یو سو مچ مائی سوئٹ ممانی جان!" اس نے کسی نوعمر لڑکے کی طرح خوشی کا اظہار کیا اور پھر ماریا کی طرف پلٹ کر بولا۔ "ذرا اچھی سی چائے تو بنواؤ۔ ممانی جان کے مان جانے کی خوشی کو ہم خوشبودار و خوش ذائقہ چائے کے ساتھ انجوائے کریں گے۔" اس کے لہجے کی شوخی واپس لوٹ آئی تھی۔ اس ساری صورتِ حال میں خاموش تماشائی کا کردار ادا کرنے والی ماریا حرکت میں آئی اور انٹرکام کی سہولت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہیں سے چائے کے لیے آرڈر دے دیا۔

"او کے! تو پھر ہم اپنے اسی پروگرام پر واپس آجاتے ہیں۔ ماریا آپ کے ساتھ لاہور جائے گی اور میں بعد میں فرصت ملتے ہی وہاں پہنچوں گا۔"
"لیکن میرا ہیلتھ یونٹ؟" ماریا ذرا شپٹاتے ہوئے بولی۔

"تم تو پہلے ہی ڈکیتی کے بعد سے وہاں نہیں جا رہی ہو، کچھ دن اور چھٹی کر لو۔ میں تمہارے کسی متبادل کا بندوبست کر دوں گا۔" وہ اسے حتمی لہجے میں بات کر رہا تھا کہ ماریا کے لیے انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اندر سے سخت جز بز ہونے کے باوجود اسے اس فیصلے کو مسکراتے ہوئے قبول کرنا پڑا۔

☆☆☆
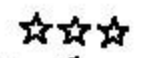
اپنی لگائی پھلواری میں کھڑا اسلم ایک ایک پودے کو الوداعی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ان پھول پتوں سے اسے ایک خاص انسیت تھی۔ یہ اس کی تنہائی کے ساتھی تھے اور انہوں نے اس کے اندر اس گوشے کو سلامت رکھنے میں معاونت کی تھی جو ڈاکو اسلم کے اندر اسلم حنیو کی باقیات تھا۔ ایک ڈاکو کی حیثیت سے وہ جس سفاکی اور بے رحمی پر مجبور تھا، اس پر اس کے اندر کا اسلم حنیو روتا تھا اور وہ اس روتے بلکتے اسلم حنیو کو بہلانے کے لیے اس پھلواری میں لے آتا تھا۔ یہاں نظروں کو تسکین دینے والے ان رنگ برنگے پھولوں کے علاوہ وہ مچان بھی تھی جہاں بیٹھ کر کبھی وہ کسی کتاب کا مطالعہ کرتا تھا اور کبھی دوربین کی مدد سے جنگل میں دور تک کا نظارہ۔ اب اسے یہ سب کچھ چھوڑ کر کسی نئی منزل کی طرف جانا تھا کہ یہی حکمِ یار ٹھہرا تھا۔ ماہ بانو نے بہت اچانک اسے شادی کی پیشکش کرتے ہوئے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ اس سے شادی اسی صورت میں کرے گی جب وہ اس جنگل سے نکل کر کہیں اور شریفانہ زندگی اختیار کرے گا۔
اس نے ماہ بانو کی یہ شرط بنا کسی سوال جواب کے مان لی تھی اور ان شکوک و شبہات کو ذرا خاطر میں نہیں لایا تھا جو اس کے دل میں سر ابھارتے رہے تھے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ابھی کچھ دن قبل ہی ماہ بانو نے اس کی محبت کو قبول کرنے سے صاف انکار کرتے ہوئے خود کے کسی اور کی محبت میں گرفتار ہونے کا اعتراف کیا تھا اور ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ وہ جس سے محبت کرتی ہے، وہ اسے ملے یا نہ ملے وہ اپنی زندگی اسی کے نام پر گزار دے گی... لیکن پھر اچانک ہی اس نے اپنا یہ فیصلہ بدل کر اسے شادی کی پیشکش کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں سے نکلنے کی شرط رکھ دی تھی۔ اس مشروط پیشکش نے اس کے دل میں یہ شک پیدا کیا تھا کہ شاید وہ اس قید سے نجات کے لیے اس کی محبت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے لیکن وہ اپنے دل و دماغ میں ابھرتے اس شک کو خاطر میں نہیں لایا تھا۔ وہ ایسا ہی دیوانہ عاشق تھا جس کا عشق اسے بنا سوچے سمجھے آگ میں کود جانے پر اکساتا تھا۔ اس نے اپنے اندر پیدا ہونے والے شک کو اس دلیل سے دبا دیا تھا کہ ایک نہ ایک دن تو مجھے تاریک راہوں میں مارا ہی جانا ہے تو پھر کیا یہ زیادہ بہتر نہیں ہے کہ میں اس کی خاطر کچھ کر گزروں جو مجھے بے حد عزیز ہے۔ ویسے بھی وہ ہمیشہ اس دکھ میں مبتلا رہا تھا کہ اس کی زندگی اس کے اپنے پیاروں کے کام نہیں آسکی تھی۔ وہ ایک ایسا بے بس بھائی ثابت ہوا تھا جس سے اپنی بہن کی خوشیوں کا بندوبست نہ ہو سکا تھا اور وہ موت کی آغوش میں پناہ لے بیٹھی تھی۔ وہ ایک ایسا بیٹا تھا جس کی ماں آج بھی ایک ایسے گاؤں میں جہاں پانی جیسی بنیادی سہولت بھی دستیاب نہیں تھی، تنہا کسمپرسی کی

زندگی گزار رہی تھی اور اس سے ناراض، اس سے ملنے سے بھی انکاری تھی۔ اپنے ان دونوں عزیز رشتوں سے جدا ہونے کے بعد وہ کبھی کسی سے محبت نہیں کر سکا تھا۔
اسے لگتا تھا کہ اس کے دل کی سرزمین محبت کی فصل کے لیے بنجر ہو گئی ہے لیکن پھر اس کی زندگی میں ماہ بانو چلی آئی۔ ماہ بانو اس کے لیے ایک ایسی لڑکی ثابت ہوئی تھی جس کے سامنے وہ پہلی نظر میں ہی دل ہار بیٹھا تھا اور اس نے اپنی بنجر ہو جانے والی سرزمینِ دل پر محبت کی کونپل پھوٹتی ہوئی محسوس کی تھی۔ اس کونپل نے اتنی زور آوری کے ساتھ سر ابھارا تھا کہ وہ یہ جاننے کے بعد بھی کہ ماہ بانو کسی اور سے محبت کرتی ہے، مرجھانے نہیں پائی تھی اور آج اسی محبت کو سرخ رو کرنے کا وقت آیا تھا تو وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے گروہ سے بغاوت کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اس نے ماہ بانو کو بتا دیا تھا کہ آج کی رات وہ لوگ وہاں سے نکل پڑیں گے چنانچہ وہ ذہنی طور پر سفر کے لیے تیار رہے۔ وہ آمد و رفت کے لیے استعمال ہونے والے عمومی راستے سے ہٹ کر سفر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا چنانچہ اس سلسلے میں کچھ ضروری تیاریاں بھی کرنا تھیں۔ اس نے پھلواری کی طرف آتے ہوئے چپکے سے ماہ بانو کے کان میں کہہ دیا تھا کہ وہ بھی وہیں آجائے چنانچہ اب اپنے سجائے اس گلستان سے الوداعی ملاقات کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا انتظار بھی کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر گزری تو وہ بھی وہاں آتی نظر آئی۔ پیروں میں پڑی زنجیر کی وجہ سے وہ کافی آہستہ چل رہی تھی۔ اس کے پیروں میں پڑی اس زنجیر نے اسے ہمیشہ بہت تکلیف دی تھی۔ اسے ماہ بانو کا کسی جانور کی طرح اس طرح زنجیر کیا جانا کبھی اچھا نہیں لگا تھا لیکن اس سلسلے میں وہ سردار کو قائل نہیں کر سکا تھا۔ اب آج کی رات وہ اس زنجیر سے بھی نجات پانے والی تھی۔
"تمہارے کام ختم ہو گئے یا ابھی کچھ باقی ہے؟" وہ اس کے نزدیک آئی تو اس نے اس کے ماتھے پر چمکتے موتیوں جیسے پسینے کے قطروں کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
"ختم ہی سمجھو۔ کھانا پک چکا ہے۔ کپڑوں کی دھلائی کو میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا ہے کہ آج طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی، اس کام کو کل پر اٹھا رکھتے ہیں۔" اس نے رپورٹ دی۔

"یہ تم نے اچھا کیا۔ ہمیں جو سفر کرنا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ تم کچھ دیر آرام کر لو۔ سفر طویل بھی ہے اور مشکل بھی۔ ویسے تو میں نے اپنے طور پر ایسے راستے سے جانے کا فیصلہ کیا ہے جس کی طرف کسی کا دھیان جانا مشکل ہی ہے لیکن وقت کا کیا پتا۔ جب یہاں ہمارے غائب ہونے کا علم ہوگا تو سردار ہماری تلاش میں ہر طرف بندے دوڑا دے گا۔ اگر کوئی تلاش میں آنے والا ہماری راہ پر لگ گیا تو اس سے بھی مقابلہ کرنا ہوگا۔ بہرحال، وہ میرا اپنا مسئلہ ہے، تم یہ چیزیں اپنے پاس رکھ لو۔ آدھی رات کے بعد تیار رہنا۔" اس نے کینوس کا ایک تھیلا اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ ماہ بانو نے اس کے ہاتھ سے تھیلا لے کر اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک جوڑی ربر کے نرم جوتے اور مردانہ جوڑا تھا۔ یہ جوڑا گہری نیلی جینز اور دھاری دار سیاہ ہاف آستین کی ٹی شرٹ پر مشتمل تھا۔ اس نے اس سامان کو دیکھ کر اسلم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ جوتے اور کپڑے میں نے آپا حمیداں کے سامان میں سے غائب کیے ہیں۔ جوتے آپا حمیداں کے ہیں۔ تمہیں سائز میں کچھ بڑے ہوں گے، آگے کوئی کپڑا وغیرہ پھنسا کر پہن لینا۔ کپڑوں کا جوڑا اس کے بیٹے کا ہے۔ وہ ایک بار غلطی سے اپنے سامان کے ساتھ رکھ کر لے آئی تھی اور میرے سامنے اس کا ذکر کیا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات رہ گئی اس لیے جب مجھے سفر کے لیے تمہارے کپڑوں کا خیال آیا تو میں یہ کپڑے لے آیا۔ آپا حمیداں کا بیٹا دبلا پتلا بوٹے سے قد کا لڑکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کے کپڑے پورے آجائیں گے۔" اس نے وضاحت کی۔
"لیکن یہ کپڑے؟ میرا مطلب ہے کہ میں نے کبھی اس قسم کا لباس نہیں پہنا ہے۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

"مجھے اندازہ ہے لیکن ہمیں جو سفر درپیش ہے، اس میں اسی قسم کا لباس مناسب رہے گا۔ تمہارا ڈھیلا ڈھالا لباس ادھر اُدھر اٹک کر مشکل پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ لباس لہراتا ہوا دور سے ہی نمایاں ہو جائے گا۔ اس لیے فی الحال تمہیں حالات کے ساتھ کمپرومائز کرنا پڑے گا۔ ایک بار ہم یہاں سے نکل جائیں تو پھر تم آزاد ہو... جو جی چاہے پہننا۔" اسلم نے اسے سمجھایا تو اس نے وقت کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی۔ زندگی میں یوں بھی تو بہت کچھ اس کی مرضی کے خلاف ہی ہو رہا تھا تو پھر ایک لباس کے معاملے میں سمجھوتا کرنے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اگر زندگی اسے چوائس کا حق دیتی تو وہ نیلے پھولوں والی اس سیاہ چادر کو کبھی اپنے وجود سے علیحدہ نہیں ہونے دیتی جو شہریار نے ایک بیرے سے خرید کر اسے دی تھی۔ اِدھر سے اُدھر بھاگتے اور منتقل ہونے میں اس کا سامان جانے کہاں سے کہاں پہنچ

WWW.PAKSOCIETY.COM

گیا تھا۔ اس سامان میں وہ چادر بھی تھی جو اسے بہت عزیز تھی لیکن وہ پھر بھی اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکی تھی اور یہی تو انسان کی بے اختیاری و بے بسی ہے۔ اسے اپنی عزیز از جان چیزوں پر بھی اختیار نہیں ہوتا اور تقدیر کے سامنے سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔ اگر یہ بے بسی و بے اختیاری نہ ہوتی تو بے جان چیزوں کی کیا بات... آدمی اپنے پیاروں کے بچھڑنے پر صبر کیونکر کر پاتا۔

"میرے خیال میں اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔ آرام کے لیے جتنا وقت مل جائے، مناسب ہے ورنہ آگے چل کر شاید ہی آرام کا وقت مل سکے۔ تم اب اپنے جھونپڑے میں جاؤ۔ میں آدھی رات سے کچھ پہلے تمہارے پاس آؤں گا اور کچھ وقت گزاروں گا۔ اس کے بعد ہم مناسب وقت پر نکل پڑیں گے۔ میں پہرے داروں کو یہ تاثر دے کر آؤں گا کہ میں تمہارے ساتھ شب گزاری کا ارادہ رکھتا ہوں، اس طرح وہ مشکوک نہیں ہوں گے۔" اسلم نے اسے اپنے منصوبے کی مزید تفصیلات سے آگاہ کیا جنہیں سن کر اس کا چہرہ شرم سے سرخ پڑ گیا لیکن وہ خاموش رہی۔ اعتراض کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اسلم وہ کر رہا تھا جو بہتر سمجھتا تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے بہرحال اتنا طویل عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ ہر بات سے واقف ہوتی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں تیار ملوں گی۔" اس نے اسلم کو رضامندی کا عندیہ دیا اور واپسی کے لیے پلٹی۔ پلٹتے ہی وہ بری طرح چونکی۔ اس کی طرف متوجہ اسلم بھی چونک پڑا۔ اس کی نظروں نے بھی وہ منظر دیکھ لیا جو ماہ بانو کے چونکنے کا سبب بنا تھا۔ ایک درخت کی آڑ سے بالکل ہی اچانک للّی نکل کر ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے ہونٹوں پر جو معنی خیز مسکراہٹ تھی، وہ صاف ظاہر کر رہی تھی کہ اس نے ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی ہے۔ اسلم اور ماہ بانو کچھ بھی کہے بغیر اس کی طرف دیکھتے رہے۔ للّی جس قسم کی عورت تھی، انہیں ضرورت ہی نہیں تھی کہ وہ اس پچویشن میں اپنی زبانوں کو زحمت دیتے۔ اب تو جو کہنا تھا وہ للّی کو ہی کہنا تھا۔ ان کی یہ توقع پوری ہوئی اور وہ کچھ دیر دونوں کو ہی ان دونوں کو گھورتے رہنے کے بعد ماہ بانو کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹاتی ہوئی اسلم کے عین مقابل آ کھڑی ہوئی۔

"تو تم یہاں سے جا رہے ہو؟" اسلم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر جما کر پوچھا۔ اسلم خاموش رہا۔ تصدیق یا تردید کی گنجائش نہیں تھی۔ للّی یقیناً سب کچھ سن چکی تھی۔ معلوم نہیں وہ پہلے سے اس جگہ موجود تھی

یا ماہ بانو کا پیچھا کرتی ہوئی ٹوہ لینے کے لیے آئی تھی۔

"سچ سچ..." اس نے اسلم کی خاموشی سے شہ پاتے ہوئے استہزائیہ انداز اختیار کیا۔ "تم دونوں کا تو ان دنوں ان ٹین ایجرز جیسا حال لگ رہا ہے جو نئے نئے عشق کے مرض میں مبتلا ہوئے ہوں اور دنیا والوں سے بچ کر اپنی الگ دنیا بسانے کا ارادہ کرتے ہوئے گھر سے بھاگنے کو تیار ہوں لیکن عین وقت پر دھر لیے جائیں۔ ویسے تم دونوں کو دیکھ کر مجھے انڈین فلم قیامت سے قیامت تک یاد آ رہی ہے۔ اس میں بھی تو ہیرو اور ہیروئن بھاگ کر نئی دنیا بسانے نکلے تھے۔ بس فرق اتنا ہے کہ وہ شہر سے بھاگ کر جنگل میں پہنچے تھے، تم جنگل سے بھاگ کر شہر جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔"

"تم اسی انداز میں سوچ سکتی ہو۔ تمہارا فلمی ہیروئن بننے کا خواب تو پورا نہیں ہوا لیکن افسوس کہ تمہارے ذہن پر فلموں کا بھوت اب بھی سوار ہے۔" اسلم نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"فلموں کا بھوت بھی اور تمہارے عشق کا بھوت بھی۔ میں بہت ضدی عورت ہوں اور جو چیز میرے سر پر سوار ہو جائے، اس کو کبھی بھولتی نہیں ہوں۔" اس کے طنز کو خاطر میں لائے بغیر للّی بولی۔

"فضول بکواس بند کرو، وہ کہو جو کہنا چاہتی ہو۔" اسے اندازہ تھا کہ ان کے راز سے واقف ہونے کے بعد للّی بلیک میلنگ ضرور کرے گی اس لیے زیادہ بحث میں پڑنے کے بجائے اس سے پوچھا۔ ماہ بانو دخل اندازی کیے بغیر ان کے درمیان ہونے والی مکالمے بازی سن رہی تھی۔ ان کی گفتگو کے حتمی نتیجے پر اس کے مستقبل کا بھی دارومدار تھا اس لیے اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔

"تمہیں مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا ہوگا۔" للّی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

"کیا کہا تم نے...؟" اسلم اس کا مطالبہ سن کر چراغ پا ہوا۔

"میں نے کوئی اتنی زیادہ مشکل بات نہیں کہی ہے جو تمہیں سمجھ نہیں آئے۔ بہت سیدھا اور صاف مطالبہ ہے میرا۔ جب تم یہاں سے جاؤ گے تو میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" اس نے ایک بار پھر اپنی بات دُہرائی۔

"اور اگر میں نے تمہارا یہ مطالبہ پورا نہ کیا تو...؟" اسلم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"پھر سیدھی سی بات ہے۔ تم دونوں بھی یہاں سے نہیں جا سکو گے۔" اس نے شانے اچکاتے ہوئے دوٹوک

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھیجے میں جواب دیا اور یہ تو اسلم بھی جانتا تھا کہ یہ صرف دھمکی نہیں ہے۔ اس نے مشورہ لینے والے انداز میں ماہ بانو کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی یہی لکھا تھا کہ فی الوقت لڑکی سے بگاڑنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آخر وہ اس مدقوق نظر آنے والی لیکن درحقیقت اندر سے بے حد شاطر عورت کے سامنے اپنی بے بسی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔

"او کے! تم بھی ہمارے ساتھ چلو گی۔ ہمارا سارا پلان تو تم نے سن ہی لیا ہے۔ اپنے لیے تم خود سوچنا اور انتظام کرنا کہ کیا اور کیسے کرنا ہے۔ میں صرف تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کا ذمے دار ہوں۔"

"اتنا ہی کافی ہے۔ باقی راستے نکالنا مجھے خود آتا ہے۔" وہ کمال کی خود اعتماد تھی۔

"اور ہاں... یاد رکھنا کہ ہمارا ساتھ بس یہاں سے نکل کر کسی شہر تک پہنچنے جتنا ہی ہوگا۔ اس کے بعد تم اپنے راستے جانا اور ہم اپنے راستے۔" اس نے مناسب سمجھا کہ حفظ ماتقدم کے تحت اسے پہلے ہی اس کی حدود سے آگاہ کر دے۔

"کون کس راستے جاتا ہے، اس کا فیصلہ بعد میں ہو گا۔ تمہیں اس بارے میں سوچ کر ابھی سے اپنی جان ہلکان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا اور خراماں خراماں چلتی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔ اسلم اس کی پشت کو گھورتے ہوئے فقط بے بسی سے دانت ہی کچکچا سکا۔

☆☆☆

"کھانا کھالیں بی بی۔" ملازمہ نے کھانے کی ٹرے وڈی چودھرائن کے سامنے رکھی تو اس نے نظر اٹھا کر ٹرے میں رکھے کھانے کو دیکھا۔ دو عدد موٹی موٹی روٹیوں اور پتلی پانی جیسی بے رونق دال نے بے ساختہ ہی اس وسیع و عریض دسترخوان کی یاد دلائی جس پر ایک وقت میں اتنی اقسام کے کھانے ہوتے تھے کہ بعض اوقات وہ ہر کھانے کو چکھ بھی نہیں پاتی تھی... اور یہاں اس قید خانے میں اسے وہ کھانا فراہم کیا جا رہا تھا جسے کھانا تو دور کی بات، اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس کے سامنے زندگی میں کبھی کھانے کے نام پر ایسی کوئی چیز بھی رکھی جا سکتی ہے۔ اس سے قبل بھی اس کے لیے کچھ اسی قسم کا کھانا لایا گیا تھا۔ بس اس کھانے میں دال کی جگہ آلو کی بھجیا تھی۔ اس نے نخوت سے اس کھانے کو ٹھکرا دیا تھا اور نتیجے میں بھوکی رہی تھی۔ اب پھر کھانا دیکھ کر اسے سمجھ آ گیا تھا کہ اسے ایک بار پھر بھوکا رہنا ہوگا۔ اس کے لیے اس قید خانے کو منتخب کرنے والا جانتا بے رحم شخص تھا، اس سے اچھے سلوک کی امید کی جا سکتی تھی لیکن وہ بھی تو وڈی چودھرائن تھی۔ حویلی کے ایک بے انتہا آرام دہ کمرے سے اس قید خانے تک منتقل ہونے میں بے شک اس کے غرور کو زبردست دھچکا لگا تھا لیکن اس کا وہی حال تھا کہ رسی جلنے کے بعد بھی بل نہیں گئے تھے۔

"لے جا اپنا یہ کھانا اور لے جا کر کچرے میں ڈال دے۔ تو کھانے کے نام پر جو کچھ میرے لیے لے کر آئی ہے، وہ تو میں اپنے پالتو جناور (جانور) کو بھی نہ کھلاؤں۔" اس نے نخوت سے منہ پھیرتے ہوئے ملازمہ سے کہا۔

"کھالیں بی بی! چودھری صاحب کا حکم ہے کہ اگر آپ نے اب کھانا لوٹایا تو فیر دوبارہ آپ کو کھانا بھجایا ہی نہیں جائے گا۔" ملازمہ نے ڈرتے ڈرتے اسے چودھری کا حکم سنایا۔ اس کے سامنے ایک معزول ملکہ تھی جس کی اوقات اب دو کوڑی کی بھی نہیں رہی تھی لیکن اس بے چاری نے اپنی ساری زندگی وڈی چودھرائن سے ڈرتے ڈرتے گزاری تھی، سو ایک دم سے اس خوف سے کیسے نجات پاتی۔

"تیرا چودھری بھی اپنی اس حرکت کا مزہ چکھ لے گا۔ کوئی لاوارث اور مجبور ملازمہ نہیں ہوں میں چودھری کی کہ وہ مجھے یہاں قید کر کے مار ڈالے گا اور کوئی اس سے کچھ پوچھے گا ہی نہیں۔ میرے پیکے والے حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے، اور میرا پتر مراد شاہ باپ کا گریبان پکڑے گا کہ مجھے میری ماں کا پتا بتاؤ۔" اس کی خوش فہمیاں اپنی جگہ قائم تھیں۔

"ایسا تو جب ہوگا نا بی بی جب کسی کو پتا چل سکے گا کہ آپ کہاں ہو؟ چودھری صاحب نے سب سے کہہ دیا ہے کہ آپ کو گلے کا کینسر ہو گیا ہے اور انہوں نے آپ کو علاج کے لیے ولایت بھجوا دیا ہے۔" ملازمہ نے دبی آواز میں اسے صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ سوچ میں پڑ گئی پھر ملازمہ کی طرف دیکھتے ہوئے رازداری سے بولی۔

"دیکھ نجو! تو ایسا کر کہ میرے بھرا کی حویلی میں یہ گل کسی طرح پہنچا دے کہ چودھری نے مجھے قید کر کے حویلی کے تہ خانے میں ڈال رکھا ہے۔ تجھے بس یہ پیغام پہنچانا ہوگا، آگے وہ لوگ خود ہی سب کچھ دیکھ لیں گے۔ تیرا نام بھی کہیں نہیں آئے گا، اور میں یہاں سے نکلنے کے بعد تجھے وڈا سارا انعام دوں گی۔" اس نے ملازمہ کو ترغیب دی لیکن وہ ڈر کر پیچھے ہو گئی اور سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہ بی بی نہ۔ چودھری صاحب تو میرے ٹوٹے ٹوٹے کر کے کتوں کو کھلا دیں گے۔"

"میں کہہ رہی ہوں نا کہ تیرا نام کہیں نہیں آئے گا، اور تجھے انعام بھی ملے گا۔ تو نے میرے کنگن دیکھے ہیں نا اور وہ چوڑیاں بھی۔ میں اپنے کنگن اور بارہ کی بارہ چوڑیاں تجھے دے دوں گی۔" وڈی چودھرائن کی پیشکش بہت بڑی تھی۔ ملازمہ کی نظریں بے ساختہ ہی اس کی کلائیوں پر گئیں۔ بھاری گول کلائیاں جو ہر دم سونے کے کنگنوں اور چوڑیوں سے بھری رہتی تھیں، بالکل سونی پڑی تھیں۔ وڈی چودھرائن کو اس قید خانے میں ڈالنے سے قبل تن کے لباس کے علاوہ ہر شے سے محروم کر دیا گیا تھا اور ایسا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہاں سے نکل کر اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کر سکے گی۔ ہو سکتا تھا کہ اس کے میکے والے اگر اس کی حالت سے باخبر ہو جاتے تو اس کی کچھ مدد کرتے لیکن یہ صرف ایک امکان تھا جبکہ چودھری کو دھوکا دینے کی صورت میں اسے یقینی اندوہناک انجام سے دوچار ہونا پڑتا۔ اس انجام کا سوچ کر وہ اندر تک کانپ گئی اور بڑی عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"مجھے معاف کر دیں بی بی! میں آپ کی لونڈی ہوں لیکن مجھ میں بڑے سرکار سے بغاوت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔"

"ہمت کر لے نجیے! ہمت کرے گی تو مالا مال ہو جائے گی ورنہ ادھر تجھے کچھ نہیں ملنے والا۔ چودھری کی چاکری کر کے اس کا نمک حلال کرنے میں تیرے ہاتھ فاقوں کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔" ملازمہ کو عقل سکھاتی چودھرائن کو قطعی یاد نہیں تھا کہ اب سے پہلے وہ خود اس قبیل میں شامل تھی جو اپنی تجوریاں بھر کر اپنے زیر دست افراد میں فاقے بانٹ دیتا ہے۔

"مینوں معاف کر دو بی بی! میں بہت بزدل ہوں۔" ملازمہ ہاتھ جوڑے جوڑے پیچھے ہٹ گئی۔ اس پر چودھری کی اتنی شدید دہشت طاری تھی کہ کسی قسم کا لالچ اس دہشت پر غالب نہیں آ سکا تھا۔

وڈی چودھرائن نے ملازمہ کی اس بزدلی پر خوب دانت کچکچائے لیکن اس وقت وہ خود اتنی بے بس تھی کہ ملازمہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ البتہ اسے دوبارہ قائل کرنے کی کوشش کی جا سکتی تھی چنانچہ زبردستی لہجے کو نرم کرتے ہوئے بولی۔ "چل ٹھیک ہے، جیسی تیری مرضی۔ میں کوئی تیرے نال زبردستی تھوڑی کر رہی ہوں۔"

"وڈی مہربانی بی بی۔" ملازمہ پلٹ کر واپسی کے راستے پر چلی گئی۔ چودھرائن کے کہنے کے باوجود وہ کھانے کی ٹرے اپنے ساتھ واپس نہیں لے گئی تھی کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ چودھری کی طرف سے جو دھمکی دی گئی ہے اس پر عمل بھی ضرور ہوگا۔ لرزتی کانپتی وہ جب تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچی تو وہاں منشی اللہ رکھا اس کا منتظر تھا۔

"تو نے اچھا کیا کہ لالچ میں نہیں پڑی۔ ورنہ ادھر سے باہر نکلتے ہی تیری لاش چیل کوؤں کی دعوت کے کام آتی۔" منشی اللہ رکھا کی بات نے اسے سہا کر رکھ دیا۔ منشی کی اس بات کا یہ مطلب تھا کہ اس نے تہ خانے میں چودھرائن سے جو کچھ بھی بات کی تھی، وہ اس نے کسی ذریعے سے سن لی تھی۔ دل ہی دل میں اپنے لالچ میں نہ پڑنے پر شکر ادا کرتی وہ اپنے راستے چل دی۔

دوسری طرف چودھرائن ابھی تک اکڑی ہوئی بیٹھی تھی اور کھانے کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھایا تھا۔ ایسا وہ صرف ضد میں کر رہی تھی ورنہ بھوک کا تو یہ عالم تھا کہ لگتا تھا کوئی اندر بیٹھا آنتوں کو نوچ رہا ہے۔ کبھی ایک وقت کا کھانا بھی نہ چھوڑنے والی کے لیے یہ فاقہ کشی بہت مشکل تھی۔ اس نے تو کبھی رمضان کے روزے بھی نہیں رکھے تھے تو اس فاقے کو کیسے برداشت کر سکتی تھی؟ بس زبردستی خود پر جبر کیے بیٹھی تہ خانے کی دیواروں کو تکتی رہی۔ یہ تہ خانہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ زیادہ عرصہ تو نہیں گزرا تھا جب اس تہ خانے میں کشور کی ملازمہ خاص رانی کو قید کیا گیا تھا۔ وہ رانی پر تشدد کے سارے ظالمانہ حربے آزما کر اس سے کشور کا پتا اگلوانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ تہ خانے کے در و دیوار سے اب بھی رانی کی وہ چیخیں ٹکراتی اور ٹکرا کر گونجتی محسوس ہو رہی تھیں جو اس کے حلق سے بہیمانہ تشدد کے نتیجے میں نکلی تھیں۔ اسی تہ خانے میں رانی نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لی تھیں لیکن اس وقت وڈی چودھرائن کے دل میں ذرا ڈر نہیں جاگا تھا۔ اسے کسی قسم کی ندامت نہیں ہوئی تھی کہ ایک زندگی سے بھرپور لڑکی یوں دیکھتے ہی دیکھتے موت کی آغوش میں جا سوئی ہے۔ آج وقت خود اسے ان دیواروں کے بیچ لے آیا تھا۔ کل اگر وہ صیاد تھی تو آج اس تہ خانے کی قیدی اور زندگی کی ساری بہاریں دیکھ لینے کے باوجود اس قید سے آزاد ہونے کے لیے بری طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ حویلی میں راج کرتے کرتے وہ اچانک اس سیلن زدہ تہ خانے میں فریدہ کو قتل کرنے کی سازش کے نتیجے میں پھینکی گئی تھی۔ چودھری نے اس سے اس کے جرم کی وضاحت نہیں مانگی تھی، بس براہ راست سزا سنا کر یہاں ڈلوا دیا تھا۔ سازش تیار کرتے ہوئے وہ کبھی گمان بھی نہیں کر سکی تھی کہ معاملہ کھل جانے پر اس کے ساتھ یہ سلوک ہوگا۔ وہ زیادہ سے زیادہ بھی خود کو حویلی کے معاملات سے الگ کر کے خواب گاہ تک محدود کیے جانے کا تصور کر سکتی تھی لیکن چودھری

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے تو کچھ زیادہ ہی غضب ناکی کا مظاہرہ کیا تھا۔ شاید وہ اسے باور کروانا چاہتا تھا کہ حویلی میں کسی بھی شخص کو چاہے جتنے بھی اختیارات حاصل ہوں لیکن حاکم بہرحال وہی ہے اور ایک جھٹکے میں سارے اختیارات چھین لینے کی طاقت رکھتا ہے۔

''مینوں یہاں سے نکلنے دے چودھری۔ میں تیری ساری چودھراہٹ تیری اپنی اولاد کے ہاتھوں نکلوا دوں گی۔'' دیواروں کو گھورتے ہوئے وہ غصے سے بڑبڑائی اور اپنی نظروں کا زاویہ اس ٹرے پر مرکوز کرلیا جس میں اس کے لیے آیا ہوا کھانا رکھا تھا۔ کھانے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر موجود نفرت بھرے تاثرات میں مزید اضافہ ہوگیا۔ یہ کھانا چودھری کی کمینگی کا بھرپور اظہار تھا۔ وہ ایک بار پھر دانت کچکچانے لگی اور ٹرے کی طرف سے منہ پھیر لیا لیکن آخر کب تک؟ ہر شخص کی برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اور اس کی برداشت کی حدیں تو ویسے بھی بہت محدود تھیں۔ کھا کھا کر پھیلا ہو جانے والا جسم بھوک کی سختی کو زیادہ دیر برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ وہ اپنے لیے فرش پر بچھائی گئی چٹائی پر نڈھال سی لیٹ گئی۔ اسے بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پیروں سے جان نکلتی جارہی ہے۔ اس کیفیت میں لحہ بہ لحہ شدت آتی جارہی تھی۔ آخرکار اس کی ضد ٹوٹ گئی اور وہ کہنیاں ٹکا کر اپنے بھاری بدن کو اٹھا کر بیٹھی۔ بیٹھنے کے بعد اس نے خود کو کھانے کی ٹرے کی طرف کھسکایا اور پھر ہاتھ بڑھا کر ٹرے اپنی طرف سرکالی۔ ٹرے میں موجود روٹی کو توڑتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ کافی دیر گزر جانے کے باعث روٹی سوکھ گئی ہے لیکن اب وہ بھوک کی شدت سے اتنی بے حال تھی کہ سوکھی روٹی کھانے کے لیے بھی آمادہ ہوگئی اور روٹی کو دال میں بھگو کر پہلا لقمہ منہ میں رکھا۔ دال دیکھنے میں جتنی بے رونق تھی، کھانے میں بھی اتنی ہی بدذائقہ محسوس ہورہی تھی یا پھر یہ بات تھی کہ ہمیشہ مرغ مسلم کھانے والی کی زبان دال کے ذائقے کو قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ اس پہلے لقمے کو نگلتے ہوئے اس نے بہت برا سا منہ بنایا لیکن پھر بھی اس کا ہاتھ دوسرا لقمہ توڑنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ سچ ہے کہ پیٹ میں لگی آگ زبان کو لگے ذائقے کی چاٹ پر حاوی ہونے میں کمال رکھتی ہے۔ دوسروں کو دانے دانے کو ترسانے والی آج خود پیٹ کی آگ سے مجبور ہوکر ایک نہایت ناپسندیدہ کھانا تناول کررہی تھی۔ ایک روٹی سے کچھ اوپر کھا کر یہ آگ ذرا سرد پڑی تو اس نے سکون کا سانس لیا اور ٹرے ذرا پرے سرکا کر دوبارہ چٹائی پر ڈھیر ہوگئی۔ کھانے کے بعد اسے شدت کی پیاس بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ پانی کمرے کے ایک کونے میں رکھے مٹی کے گھڑے میں موجود تھا لیکن ساری عمر ہل کر پانی نہ پینے والی کو اپنی گھڑے تک جا کر پانی پینا سخت دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ آخرکار بھوک کی طرح پیاس کی شدت نے بھی اسے زیر کردیا اور اپنی ہڈحرامی کے باوجود اسے اٹھ کر پانی پینے کے لیے جانا پڑا۔ ایک ساتھ دو گلاس پانی چڑھا کر وہ واپس چٹائی پر آکر لیٹی تو پیٹ کی حالت عجیب ہورہی تھی اور اس میں سے گڑگڑ کی آوازیں آرہی تھیں۔ آہستہ آہستہ ان آوازوں نے شدت اختیار کرلی اور وہ اپنے پیٹ میں درد کی لہریں سی اٹھتی محسوس کرنے لگی۔ ہمیشہ تر نوالہ کھانے والی کو سوکھی روٹی اور دال ہضم نہیں ہوسکی تھی۔ وہ درد سے بے طرح تڑپتی ہوئی چیخیں مارنے لگی۔ تہ خانے کے درودیوار نے بہت کم مدت میں مکافات عمل کی ایک چھوٹی سی مثال دیکھی تھی۔ کچھ عرصہ ہی تو گزرا تھا انہیں مظلوم رانی کی چیخیں سنے اور اب اس پر ظلم ڈھانے والی جابر چودھرائن کی چیخیں سن رہے تھے۔

☆☆☆
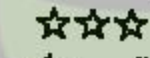
وہ جیپ طوفانی رفتار سے سڑک پر دوڑی جارہی تھی۔ اسی رفتار سے چلتی جب وہ آبادی میں داخل ہوئی تو راہ چلتے لوگ خود کو بچانے کے لیے گھبرا گھبرا کر ایک طرف ہونے لگے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے زیر لب یا بآواز بلند بھی جیپ والوں کو گالیوں سے نوازا لیکن جیپ سواروں کو فی الحال ان کی فکر نہیں تھی۔ وہ بہت دور سے آئے تھے اور کسی راہ گیر سے الجھنے کے بجائے سیدھے اس مقام تک پہنچنا چاہتے تھے جہاں ان کا اصل شکار موجود تھا۔ ان کا رخ ایک اسپتال کی طرف تھا۔ جوں جوں اسپتال کی عمارت نزدیک آتی جارہی تھی، ان کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اسی وقت جیپ میں ایک موبائل فون کی گھنٹی کی آواز گونجی۔ اس گھنٹی کو سن کر ایک شخص نے پھرتی سے اپنی جیب میں سے موبائل نکالا اور کال ریسیو کی۔

''سلام منشی جی۔'' نمبر وہ دیکھ چکا تھا اس لیے کال ریسیو کرتے ہی سلام جھاڑا۔

''کیا رپورٹ ہے شیدے؟'' اس کے سلام کو نظرانداز کرتے ہوئے منشی نے سوال کیا۔ جب سے بالا، جگو کے آدمیوں کے ہاتھوں بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے کے بعد چارپائی سے لگا تھا، شیدا چودھری کی ناک کا بال ہوگیا تھا۔ نئی نئی ہونے والی اس ترقی پر نازاں اسے ذرا احساس نہیں تھا کہ وہ جس مقام کو پاکر اتنا خوش ہے، کبھی اس مقام پر بالا بھی رہا تھا اور آج بالے کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ وہ جب تک چودھری کے کام کے لائق تھا، چودھری اسے نوازتا رہا اور اب ناکارہ ہوکر چارپائی سے لگا تھا تو کوئی اسے پوچھنے والا نہیں تھا۔ اگر شیدا ناکارہ ہوجاتا تو چودھری اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتا اور کسی استعمال شدہ ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیتا لیکن فی الحال شیدا اس بات کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''ہم لوگ بس پہنچ چکے ہیں۔ مجھے سامنے اسپتال کے دروازے پر کھڑا سومرو صاف نظر آرہا ہے۔''

''کام صفائی سے کرنا۔ اب غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' منشی نے اسے ہدایت دی۔

''تسی فکر ہی نہ کرو منشی جی۔ تھوڑی دیر میں، میں فون کرکے آپ کو خوش خبری سناؤں گا۔'' وہ بہت پُراعتماد ہو رہا تھا۔ اس سارے معاملے میں اس نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ چودھری کو کوریئر کے ذریعے آفتاب کا جو خط ملا تھا، اس سے یہ تو فوراً ہی معلوم ہوگیا تھا کہ یہ خط میرپور خاص سے بھیجا گیا ہے۔ ان دنوں شیدا چودھری کے کسی کام سے کراچی میں تھا چنانچہ اسے حکم دیا گیا کہ باقی کی معلومات حاصل کرکے آفتاب کے بارے میں معلوم کیا جائے۔ معلومات کے لیے سب سے اچھا ذریعہ اسپتال ہی تھا کہ قوی امید یہی تھی کہ بچی کی پیدائش جس اسپتال میں ہوئی ہوگی، وہاں آفتاب نے فرضی نام کے بجائے اپنا اصل نام ہی لکھوایا ہوگا کیونکہ کوئی بھی باپ بہرحال یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کی اولاد کے نام کے آگے اس کے نام کے سوا کسی دوسرے کا نام لکھا جائے۔

یہ آئیڈیا بہت ہی عمدہ ثابت ہوا۔ شیدے کے میرپور خاص میں کچھ ذاتی رابطے تھے چنانچہ اس نے کراچی سے روانہ ہونے سے قبل ہی اسپتالوں کو چیک کروالیا تھا۔ ایک چھوٹے شہر میں جہاں اسپتال محدود تعداد میں ہوں، اس قسم کی معلومات حاصل کرنا زیادہ دشوار نہیں ہوتا۔ اسے راستے میں ہی اطلاع مل گئی تھی کہ آفتاب اور کشور کی بیٹی کی پیدائش کس اسپتال میں ہوئی ہے اور بچی کے نرسری میں ہونے کی وجہ سے کشور بھی ابھی تک اسپتال میں ہی مقیم ہے۔ آفتاب کے بارے میں بھی یہی معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت اسپتال میں ہی گزارتا ہے اور صرف کسی ضرورت کے تحت ہی باہر جاتا ہے۔ اس نے یہ ساری معلومات فوری طور پر منشی اللہ رکھا کو پہنچادی تھیں۔ جواباً اس نے کچھ ہدایات دی تھیں اور اب پھر اس سے تازہ ترین حالات جاننے کا خواہش مند تھا۔

''دیکھ بھال کر کام کرنا شیدے! سرکار آج کل ویسے خراب موڈ میں ہیں۔ اب کی واری اگر ناکامی ہوئی تو جانے ان کا غصہ کیا دکھلائے۔'' شیدے کے اعتماد کے باوجود منشی نے اسے تنبیہ کرنا ضروری سمجھا۔

''میں خیال رکھوں گا۔'' اس نے زیادہ بحث میں پڑنے کے بجائے تسلی دی اور سلسلہ منقطع کردیا۔ اس دوران میں ان کی جیپ اسپتال کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک چکی تھی۔ جیپ کو رکتے دیکھ کر سامنے کھڑا سومرو فوراً لپک کر نزدیک آیا۔

''کیا خبر ہے سومرو! وہ لوگ یہیں موجود ہیں نا؟'' شیدے نے اس سے پوچھا اور جیپ سے اتر گیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کی تقلید کی۔

''بالکل بابا، وہ لوگ سو فیصد اندر ہے۔ ہم نے پوری خبر رکھی ہے ان کی۔'' سومرو نے جواب دیا تو شیدا سر ہلاتا ہوا اس کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ گیا۔ باقی چاروں بھی ظاہر ہے اس کے پیچھے ہی تھے۔ ان کا انداز واضح طور پر جارحانہ تھا اس لیے وہ جیسے ہی اسپتال کے دروازے سے اندر داخل ہونے لگے، وہاں موجود چوکیدار نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔

''کون ہو بابا تم لوگ اور کدھر منہ اٹھا کر جارہے ہو؟'' وہ لپک کر ان کے راستے میں آیا۔ اس کے اس سوال کا جواب زبان سے دینے کے بجائے رائفل کے بٹ سے دیا گیا۔ سر پر لگنے والی زوردار ضرب نے بے چارے چوکیدار کو مزید کچھ پوچھنے کی مہلت ہی نہیں دی اور وہ بغیر آواز نکالے بے ہوشی کی وادی میں چلا گیا۔ چوکیدار سے فارغ ہو کر وہ لوگ ایک بار پھر دندناتے ہوئے چل پڑے۔ اب انہوں نے چادر کی بکل میں چھپائے اپنے اسلحے باہر نکال لیے تھے چنانچہ جیسے ہی وہ مرکزی عمارت میں داخل ہوئے، ریسپشن پر بیٹھی لڑکی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ شیدے نے فوراً ہی ایک ہوائی فائر کیا۔

''خاموش... نہ کوئی حرکت کرے اور نہ ہی آواز نکالے۔ اگر تم لوگوں نے ہماری گل مانی تو کسی کو کچھ نہیں ہوگا ورنہ دوسری صورت میں اپنی جان سے جاؤ گے۔'' نہایت بھیانک لہجے میں یہ اعلان کرکے اس نے اپنی نظریں ادھر اُدھر گھمائیں۔ وہاں موجود لوگ یوں ساکت ہوگئے تھے جیسے کسی نے جادوئی چھڑی گھما کر انہیں پتھر کے مجسموں میں تبدیل کردیا ہو۔ گولی اور گالی شریف لوگوں کے لیے ایسی ہی زوداثر ہوتی ہیں۔ بے چارے ان دونوں چیزوں کا مقابلہ نہیں کرپاتے اور چپ سادھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

''تم یہیں ٹھہر کر ان پر نظر رکھو۔'' جائزے سے فارغ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہو کر اس نے اپنے ایک ساتھی کو حکم دیا اور پھر خود باقی ماندہ ساتھیوں کے ساتھ سومرو کی راہنمائی میں اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں کشور اور آفتاب موجود تھے۔

دروازے پر پہنچ کر انہوں نے اسے زور سے دھکا دیا لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ اصل میں دروازہ کچھ اس قسم کا تھا جو اندر سے تو صرف لٹو گھمانے پر کھل جاتا تھا لیکن باہر سے کھولنے والے کے لیے چابی کا استعمال لازمی تھا چنانچہ انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس ناکامی پر مشتعل ہو کر شیدے نے دروازے پر زوردار دستک دی۔ وہ گاؤں میں اپنے غنڈا راج کی وجہ سے اسی انداز سے کام کرنے کا عادی تھا۔ حکمت عملی اور منصوبہ بندی اس کے مزاج میں شامل نہیں تھی۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ چودھری کا پٹھو ہے۔ چودھری کی دہشت سے کانپنے والے گاؤں کے بے چارے مکین تو ایک اشارے پر ہی چودھری کے آدمیوں کے سامنے ہاتھ باندھ کر حاضر ہو جاتے تھے لیکن اندر موجود افراد ظاہر ہے چودھری کی بے بس رعایا میں شمار نہیں ہوتے تھے۔

دروازے کو لگنے والے پہلے دھکے پر ہی آفتاب بُری طرح چونک گیا تھا اور اس نے خودکار انداز میں حرکت کرتے ہوئے سب سے پہلے دروازے کی چٹخنی لگائی اور پھر ذور آئی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ اسے دروازے کے باہر کھڑے مسلح افراد فوراً ہی نظر آ گئے۔ وہ پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ دروازہ نہ کھلنے کی صورت میں اس کے لاک پر فائر کیا جائے گا تاکہ لاک توڑا جا سکے۔ اس کوشش میں کوئی گولی دروازہ پار کر کے سامنے موجود شخص کو بھی نشانہ بنا سکتی تھی۔

''دستک... کون ہے؟'' کشور کو انجکشن لگانے کی تیاری کرتی نرس اس صورت حال پر سخت متوحش ہو گئی اور دہشت زدہ سی سوال کر رہی تھی۔

''ہمارے کچھ دشمن یہاں گھس آئے ہیں، کیا اس کمرے سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ ہے؟'' آفتاب نے جواب دیتے ہوئے نرس سے سوال کیا۔ یہ وہی نرس تھی جس نے اسے بیٹی کی پیدائش کی خوش خبری سنا کر مٹھائی کی فرمائش کی تھی۔ دہشت زدہ نرس کیا جواب دیتی، خود آفتاب کے دماغ نے ہی کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کمرے اور اس کے پیچھے والے کمرے کے درمیان میں ایک مشترکہ باتھ روم تھا۔ باتھ روم کے دو دروازے تھے، ایک اس کمرے میں اور دوسرا پچھلے کمرے میں۔ جس کمرے کے مکین باتھ روم استعمال کرتے وہ دوسری طرف کا دروازہ بند کر دیتے۔ موجودہ صورت حال میں یہ مشترکہ باتھ روم انہیں فرار کے لیے بہترین راہ فراہم کر سکتا تھا۔ اس نے فوراً حرکت میں آتے ہوئے کشور کے بیڈ کا رخ کیا۔ وہ صورت حال کو سمجھ چکی تھی اور کسی نہ کسی طرح کوشش کر کے بستر پر اٹھ کر بیٹھ بھی چکی تھی۔ آفتاب نے اسے بانہوں میں اٹھایا اور باتھ روم کی طرف بڑھا۔ نرس بھی اس کے پیچھے لپکی۔ غنیمت یہ تھا کہ باہر موجود افراد نے پہلے دستک دینے اور پھر دھکے مار کر دروازہ کھولنے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع کر دیا اور ان لوگوں کو تھوڑی سی مہلت مل گئی۔ پہلی گولی اس وقت چلائی گئی جب آفتاب باتھ روم میں گھس کر دروازے کی چٹخنی لگا چکا تھا۔ دروازے کا لاک ٹوٹنے کے بعد چٹخنی ٹوٹنے میں کتنی دیر لگتی چنانچہ اس نے مزید تیزی سے کام لیا اور دوسرے کمرے میں کھلنے والا باتھ روم کا دروازہ کھول کر اس کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرا خالی پڑا تھا۔ اس میں موجود مریض کو شاید آج ہی ڈسچارج کیا گیا تھا ورنہ تو ان کو کمرے اور باتھ روم کا درمیانی دروازہ کھلا ملنا مشکل تھا۔ مشترکہ باتھ روم ہونے کی وجہ سے عام طور پر لوگ باتھ روم کا دروازہ اپنی طرف سے بند کر لینا پسند کرتے تھے۔ ان بدترین حالات میں یہ چھوٹی سی خوش قسمتی بھی اس وقت غنیمت تھی۔ آفتاب نے کمرے سے نکلنے سے قبل کمرے اور باتھ روم کا درمیانی دروازہ بند کر دیا۔ وہ لوگ کمرے سے باہر نکلے تو بالکل الگ کوریڈور میں موجود تھے لیکن محفوظ بہرحال نہیں تھے کہ جس راستے سے وہ اس کوریڈور میں پہنچے تھے، اسی راستے سے ان کے دشمن بھی پہنچ سکتے تھے۔ انہیں بس چند منٹوں کی سبقت حاصل تھی۔

''سسٹر! آپ ہمیں یہاں سے کسی محفوظ راستے سے باہر نکال سکتی ہیں؟'' اس نے کوریڈور میں رک کر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتے ہوئے لرزتی کانپتی نرس سے پوچھا۔

جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔

''اِدھر ڈاکٹر کرمانی کے روم سے ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا ہے۔''

''او کے... تو پھر وہیں سے نکلتے ہیں۔'' آفتاب نے ایک بار پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ پیچھے سے مسلسل آتی آوازیں اسے بتا رہی تھیں کہ درمیانی دروازوں کو توڑنے کا سلسلہ جاری ہے اور ان کے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے۔ ڈاکٹر کرمانی اپنے کمرے میں موجود تھا اور کمپیوٹر کی اسکرین کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ اچانک کھلنے پر چونک کر دیکھا اور ایک اسٹاف نرس اور ایسے آدمی کو دیکھ کر جس کی بانہوں میں ایک عورت تھی، مزید حیران رہ گیا۔

''کیا بات ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے سخت لہجے میں نرس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''سر... وہ...'' نرس نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اسے کچھ بتانے کی کوشش کی مگر خود اس بے چاری پر بھی صورت حال واضح نہیں تھی اس لیے وہ اسے کیا بتا پاتی۔ اسی وقت ایک فائر کی آواز سنائی دی۔

''سسٹر پلیز! ہیلپ می۔'' ڈاکٹر کرمانی کے کمرے کے دروازے کی بھی چٹخنی چڑھا کر آفتاب نے التجائیہ لہجے میں نرس سے کہا تو وہ اسے نظرانداز نہیں کر سکی اور خود آگے بڑھ کر دوسرا دروازہ کھول دیا جو ایک کھلے احاطے میں کھلتا تھا۔

''سوری ڈاکٹر۔'' آفتاب حیران پریشان ڈاکٹر سے کہتا ہوا تیزی سے نرس کے پیچھے باہر نکل گیا۔ ان کے پاس اس دروازے کو باہر سے بند کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی ورنہ وہ اسے بھی بند کرتے ہوئے جاتے۔

''اِدھر اسٹاف کے کوارٹرز ہیں۔ میں بھی وہیں رہتی ہوں۔'' نرس نے اشارے سے بتایا تو وہ اسی طرف دوڑ پڑا۔ ہمدرد نرس اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ وہ قطار سے بنے کوارٹرز کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک ایسے کوارٹر کے سامنے پہنچے جس کے دروازے کے آگے سفید رنگ کی سوزوکی مہران کھڑی تھی۔ نرس نے انہیں وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود دروازے پر دستک دی۔ دستک کافی بلند تھی۔

''کون؟'' جواب میں اندر سے ایک نسوانی آواز نے پوچھا۔

''دروازہ کھولو نازیہ... میں ہوں شبانہ۔'' نرس نے جواب دیا۔

''تم تو ایسے دروازہ بجا رہی ہو جیسے تمہارے پیچھے کُتے لگے ہیں۔'' نازیہ نے بولتے ہوئے دروازہ کھول دیا اور پھر اس کے پیچھے اس حالت میں کھڑے ہوئے آفتاب کو دیکھ کر کہ اس نے کشور کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا ہوا تھا، گنگ رہ گئی۔

''اندر آ جائیں۔'' نازیہ نامی اس لڑکی کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے نرس شبانہ نے آفتاب سے کہا اور پھر اس کے اندر آتے ہی فوراً دروازہ بند کر لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا جو بیڈ روم اور نسبتاً بڑے لاؤنج پر مشتمل تھا۔ باتھ روم اور کچن کے دروازے اسی لاؤنج میں کھل رہے تھے۔ یہاں ایک سترہ انچ کا کلر ٹی وی بھی رکھا ہوا تھا جس کے عین مقابل ایک آرام دہ کاؤچ پڑا تھا۔ ٹی وی آن تھا اور اس پر کوئی نیوز چینل لگا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی آمد سے قبل یقیناً نازیہ کاؤچ پر بیٹھی خبریں دیکھ رہی تھی۔ آفتاب نے کشور کو اسی کاؤچ پر لٹا دیا۔ ایک تو ذہنی پریشانی، دوسرے وزن اٹھا کر بھاگنا... وہ بے چارہ پسینا پسینا ہو گیا تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ کشور آپریشن سے بچی کی پیدائش ہونے کی وجہ سے اس وقت بھاگ دوڑ کرنے کے لائق نہیں تھی چنانچہ اسے یہ طریقہ کار استعمال کرنا پڑا۔ کشور کو کاؤچ پر لٹانے کے بعد وہ خود بھی نیچے فرش پر پڑے کارپٹ پر بیٹھ گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ صورت حال کو پوری طرح نہ سمجھنے کے باوجود نازیہ نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور ایک طرف رکھے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر لے آئی۔

''تھینک یو۔'' آفتاب نے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیتے ہوئے ممنونیت سے کہا اور پھر بہت زیادہ حلق خشک ہونے کے باوجود ٹھہر ٹھہر کر گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگا۔ نازیہ نے کشور اور نرس شبانہ کو بھی پانی سے بھرے گلاس تھما دیے تھے۔

''یہ میری کزن نازیہ ہے۔ جامشورو یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہے۔ مجھ سے ملنے یہاں آئی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔ اگر موجودہ پچویشن نہیں ہوتی، تب بھی میں آپ کی مسز کو انجکشن لگانے کے بعد اسے رخصت کرنے یہاں آتی۔'' پانی پینے کے بعد نرس شبانہ نے اپنے کوارٹر میں موجود لڑکی کا تعارف کروایا۔

''باہر جو گاڑی کھڑی ہے انہی کی ہے؟'' آفتاب نے سوال کیا۔

''ہاں، یہ پبلک ٹرانسپورٹ کے بجائے اپنی ذاتی سواری پر ہی آنا جانا پسند کرتی ہے۔'' شبانہ نے جواب دیا اور پھر چونک کر بولی۔ ''آپ لوگ ایسا کریں کہ نازیہ کے ساتھ یہاں سے نکل جائیں۔ یہ حیدرآباد جاتے ہوئے آپ کو جہاں آپ کہیں گے ڈراپ کر دے گی۔''

''مشورہ تو اچھا ہے۔'' آفتاب نے اس سے اتفاق کیا۔ دشمن کی یہاں تک رسائی کے بعد اس کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اب اس چھوٹے سے شہر میں ان کا چھپنا ممکن نہیں ہے اور انہیں رختِ سفر باندھنا پڑے گا۔

''میری بچی آفتاب... میری امید۔'' ترتیب پاتے اس پروگرام کو سن کر کشور نے اپنی نومولود بیٹی کی یاد دلائی۔

''آپ کی بچی نرسری میں حفاظت سے ہو گی۔ فی الحال آپ لوگ یہاں سے نکل جائیں اور میرا فون نمبر ساتھ لے جائیں۔ کسی محفوظ جگہ پہنچ کر آپ مجھ سے رابطہ کیجیے گا۔ میں آپ کی بچی کو آپ تک پہنچا دوں گی۔''

شبانہ نے تجویز پیش کی جو موجودہ حالات میں مناسب معلوم ہو رہی تھی لیکن کشور ایک ماں تھی۔ اس کے لیے اپنی بچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کو یوں چھوڑ کر جانا آسان نہیں تھا۔ وہ بُری طرح رونے لگی۔

"آپ روئیں نہیں۔ میں امید کو لانے کی کوشش کرتا ہوں۔" اس کے آنسوؤں نے حسبِ معمول آفتاب کو بے قرار کر دیا اور وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"نن... نہیں۔ باہر آپ کے لیے خطرہ ہوگا۔" کشور نے جھٹ اس کا ہاتھ تھام کر اسے باہر جانے سے روک لیا۔ اگر بیٹی عزیز تھی تو شوہر بھی کم محبوب نہیں تھا۔ بیٹی کی خاطر وہ اس کی جان خطرے میں کیسے ڈالتی؟

"خطرہ آپ کے لیے یہاں بھی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ آپ کے پیچھے کون لوگ لگے ہوئے ہیں لیکن یہ تو صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ لوگ آپ کی جان کے دشمن ہیں۔ شکر ہے کہ وہ یہ نہیں جانتے کہ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہوں۔ واحد ڈاکٹر کرمانی ہیں جنہوں نے مجھے آپ کے ساتھ دیکھا ہے۔ وہ بہت غصے والے آدمی ہیں لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ انہوں نے آپ کے دشمنوں کو ہرگز بھی یہ بات نہیں بتائی ہوگی مگر آپ پھر بھی بہت دیر تک یہاں نہیں چھپ سکتے۔ اگر ان لوگوں کو شک ہو گیا تو وہ زبردستی یہاں کے ہر کوارٹر کی تلاشی لے سکتے ہیں۔" شبانہ نے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان دونوں کو سمجھایا تو وہ دونوں ہی سوچ میں پڑ گئے۔

"بچی کے بارے میں، میں آپ کو ایک بار پھر یقین دلاتی ہوں کہ آپ کی بچی آپ تک پہنچا دوں گی۔ میری طرف سے یہ صرف ایک تجویز ہے۔ زبردستی میں آپ کے ساتھ کر بھی نہیں سکتی۔ اتنا ساتھ بھی اس لیے دے رہی ہوں کہ آپ لوگ مجھے اچھے لگے ہیں ورنہ موجودہ حالات میں تو مجھے خود پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسپتال کی مینجمنٹ مجھ سے وضاحت مانگے گی کہ میں نے خود کو اس سچویشن میں کیوں انوالو کیا؟" شبانہ کی بات میں سچائی تھی۔ آفتاب فوراً نتیجے پر پہنچ گیا۔

"ٹھیک ہے، ہم نازیہ صاحبہ کے ساتھ یہاں سے نکل رہے ہیں۔ آپ میرا فون نمبر رکھ لیں اور اپنا دے دیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے موبائل نکالنے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ خالی واپس آیا۔ اس کا موبائل بھاگ دوڑ میں کہیں گر چکا تھا۔

"آپ میرا نمبر رکھ لیں۔ اگر کسی وجہ سے فون پر رابطہ نہیں ہو سکا، تب بھی آپ کے لیے مجھ تک پہنچنا مشکل نہیں ہوگا۔ میں تو مستقل یہیں ہوتی ہوں۔" شبانہ ذہین لڑکی تھی اس لیے فوراً سمجھ گئی کہ آفتاب کا موبائل اس کے پاس نہیں رہا ہے چنانچہ جھٹ نیا مشورہ دے دیا۔ آفتاب نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ ایک کاغذ پر فون نمبر لکھ کر اسے دینے کے بعد شبانہ کو ہدایت کی کھڑکی تک گئی۔ یہ کھڑکی کوارٹر کی پشت پر تھی اور یہاں سے ڈاکٹر کرمانی کے کمرے کا دروازہ صاف نظر آ رہا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ حملہ آور باہر نکل آئے ہیں لیکن خوش نصیبی سے ابھی انہوں نے اس طرف کا رخ نہیں کیا تھا پھر اس کے کوارٹر کا دروازہ بھی اس طرف سے سامنے نہیں پڑتا تھا کہ اگر آفتاب اور کشور دروازے سے باہر نکلتے تو فوراً نظروں میں آ جاتے۔

"آپ لوگوں کو یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔ اگر کچھ دیر اور گزر گئی تو میرے لیے آپ کی کوئی بھی مدد کرنا ممکن نہیں ہوگا۔" باہر کی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد اس نے کھڑکی بند کر کے پردہ برابر کیا اور اپنا رخ ان لوگوں کی طرف کرتے ہوئے بولی۔

"اوکے، ہم یہاں سے نکلتے ہیں۔" آفتاب نے فوراً اعلان کیا۔

"تمہیں تو کوئی پریشانی نہیں ہوگی شبانہ؟" نازیہ کا اس صورتِ حال میں بڑا اہم کردار تھا۔ انہیں اس کی گاڑی میں ہی یہاں سے روانہ ہونا تھا لیکن شاید اس کے اور شبانہ کے تعلقات کی نوعیت ایسی تھی کہ اس نے اپنی کزن سے کہیں اختلاف نہیں کیا تھا اور خاموش رضامندی سے اپنی دوستی کا مان رکھا تھا لیکن اس کی طرف سے تشویش کا شکار تھی۔

"میری طرف سے بے فکر رہو۔ یہ اسپتال میرا گھر ہے اور یہاں میرا خیال رکھنے والے بہت لوگ ہیں۔" شبانہ نے اسے اپنی طرف سے اطمینان دلایا پھر وہ لوگ دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

"تھینک یو سو مچ مس شبانہ! آپ کا یہ احسان میں ساری زندگی یاد رکھوں گا۔" اس بار آفتاب نے کشور کو بانہوں میں اٹھانے کے بجائے صرف سہارا دیا ہوا تھا اور نہایت ممنونیت سے شبانہ سے کہہ رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں سر... انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور فوراً ہی اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر کشور کی طرف رخ موڑ گئی۔

"ہمت سے کام لیجیے گا اور اپنا خیال رکھیے گا۔ اتنا چاہنے والا زندگی کا ساتھی سب کو نہیں ملتا چنانچہ جسے ملے اسے قدر کرنی چاہیے اور زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا چاہیے کیونکہ آپ کے پاس زندہ رہنے کی ایک بہت ہی خوب صورت وجہ موجود ہے۔" اس کی یہ نصیحت سن کر کشور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دھیرے سے مسکرا دی اور اس سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ نازیہ بھی باہر نکلنے سے قبل اس سے گلے ملی اور پھر وہ سب باہر نکل گئے۔

کشور کو انہوں نے گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹا دیا۔ اس طرح وہ آرام سے بھی رہتی اور باہر سے دیکھنے والوں کو نظر بھی نہ آتی۔ آفتاب نازیہ کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس نے اپنے جسم کو دُہرا کر کے بالکل جھکا لیا تھا۔ اب نازیہ گاڑی لے کر نکلتی تو دور سے دیکھنے والوں کو یہی تاثر ملتا کہ وہ اکیلی گاڑی میں جا رہی ہے۔ گاڑی حرکت میں آئی تو شبانہ نے الوداعی انداز میں ہاتھ اٹھا کر ہلایا اور اس وقت تک ہلاتی رہی جب تک گاڑی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ گاڑی کے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد وہ اپنے کوارٹر میں آئی اور دروازہ بند کر کے اس سے پشت لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس پل اس کی دائیں آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ ٹپکا۔ یہ قطرہ اس خاموش محبت کا گواہ تھا جو ایک اجنبی کے لیے اس کے دل میں جاگی تھی اور اظہار کی جرأت نہ پا سکی تھی کہ وہ شخص تو پہلے ہی پور پور کسی اور کا تھا ورنہ اس پل جب آفتاب نے کہا تھا کہ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا، اس کا دل چاہا تھا اس سے کہے کہ اور میں آپ کو زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی... لیکن محبت کے معاملات ہوتے ہی دنیا کے ہر معاملے سے انوکھے ہیں۔ بڑی بڑی سمندر جیسی گہری محبتیں اظہار کے چند لفظوں سے محروم رہ جاتی ہیں اور شاید محبت کو اس کی حاجت ہوتی بھی نہیں ہے۔

☆☆☆

شیدا شدید غصے اور پریشانی کا شکار تھا۔ جس کام کو وہ بہت آسان سمجھ رہا تھا، اسے سرانجام دینے میں بُری طرح ناکام رہا تھا۔ کشور اور آفتاب کا پتا چل جانے پر اس نے تو یہی سوچا تھا کہ بس سیدھا وہاں پہنچے گا اور بندوق کے بل پر دونوں کو قابو کر کے اپنے ساتھ لے آئے گا لیکن اسے تو ان دونوں کی شکل بھی دیکھنے کو نہیں ملی۔ وہ کمرے کے بند دروازے کے پیچھے سے ایسے غائب ہوئے تھے کہ وہ بس ان کی آہٹوں کے پیچھے ہی بھاگتا رہ گیا۔ کشور کے کمرے اور دونوں کمروں کے مشترکہ باتھ روم کے دروازے کھولنے میں انہیں کچھ وقت لگا تھا۔ اس کے بعد وہ جب پچھلے کمرے سے گزر کر کوریڈور میں پہنچے تو فوری طور پر اندازہ نہیں لگا سکے کہ ان کا شکار کس طرف گیا ہے۔ کوریڈور میں بہت سے کمروں کے دروازے کھل رہے تھے۔ وہ لوگ ایک ایک کر کے ہر کمرے کو دیکھتے آگے بڑھتے رہے۔ سب سے آخر میں ڈاکٹر کرمانی کے کمرے کا دروازہ تھا۔ انہوں نے اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کی تو وہ اندر سے بند ملا۔ وہ لوگ سمجھ گئے کہ ان کا شکار اسی کمرے میں ہے۔ دروازے کے لاک کو گولی سے اڑانے کے بعد وہ اندر کی چٹخنی گرانے کے لیے اس پر زور آزمائی کرنے لگے۔ ان کی کامیابی سے پہلے دروازہ خود ہی کھل گیا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی کا غصے بھرا چہرہ نظر آیا۔

"کون ہو تم لوگ اور یہ کیا بدتمیزی ہے؟" ان کے ہاتھوں میں موجود اسلحے کو خاطر میں لائے بغیر اس نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔ شیدا اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اسے دھکیلتا ہوا کمرے میں گھس گیا۔ پیچھے اس کے چیلے بھی تھے لیکن خلافِ توقع کمرا خالی تھا۔

"کہاں ہیں وہ دونوں؟" وہ ڈاکٹر کرمانی کی طرف منہ کر کے غرایا۔

"چلے گئے۔" ڈاکٹر نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔

"کہاں چلے گئے؟" اس نے پوچھا۔

"آئی ڈونٹ نو۔ انہوں نے مجھے بتایا نہیں تھا۔" ڈاکٹر کرمانی جو کچھ سنکی سا آدمی تھا، اسی اطمینان سے بولا۔ دروازہ کھولتے وقت اس کے چہرے پر جو غصہ تھا، اب اس کا نام و نشان بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ وہ اس صورتِ حال کو انجوائے کر رہا ہے۔

"استاد! اس طرف ایک دروازہ اور ہے۔ لگتا ہے وہ لوگ اس دروازے سے باہر نکل گئے ہیں۔" شیدے کا ایک ساتھی وہ دروازہ دریافت کر کے چلّایا جو کھڑکیوں اور دروازوں پر پڑے بڑے سے مشترکہ پردے کی وجہ سے فوراً نظر میں نہیں آیا تھا۔ دروازہ کھولا گیا تو سامنے کھلا ایریا نظر آیا اور ساتھ ہی یہ بات تحقیق ہو گئی کہ فرار ہونے والے اسی راستے سے گئے ہیں۔

"مین گیٹ کی طرف دیکھو۔" شیدے نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ایک تو وہ اتنا ذہین نہیں تھا، دوسرے اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ جن لوگوں کے پیچھے ہے انہیں کسی نرس کا تعاون بھی حاصل ہے۔ اس لیے وہ یہی سوچ سکا تھا کہ وہ لوگ مین گیٹ سے گزر کر اسپتال سے فرار ہونے کی کوشش کریں گے۔ وہ لوگ مین گیٹ تک پہنچے ہی تھے کہ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے۔ پولیس کی آمد اتنی بعید از امکان نہیں تھی، وہ لوگ اسپتال میں موجود ہر شخص کو اپنے کنٹرول میں نہیں لے سکتے تھے۔ کوئی بھی شخص پولیس کو کال کر سکتا تھا۔ اس بات کی انہوں نے اتنی زیادہ فکر اس لیے نہیں کی تھی کہ ان کے نزدیک ان کا کام صرف چند منٹوں کا

تھا اور چند منٹوں میں وہ پولیس کی آمد کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن یہاں تو چال ہی الٹی پڑ گئی۔ وہ کشور اور آفتاب کی گرد کو بھی نہیں پا سکے، الٹا خود مشکل میں پڑنے والے تھے۔ شیدے نے موبائل پر کال کر کے اسپتال کے۔۔۔۔ اندر موجود ساتھیوں کو باہر نکلنے کا حکم دیا اور پھر وہ لوگ اپنی جیپ میں جا بیٹھے۔ سومرو اپنی الگ گاڑی میں آیا تھا اور اب انہیں اس کے ساتھ ہی جانا تھا۔ جونہی انہیں پولیس کی گاڑی کی جھلک دکھائی دی، اندر موجود دونوں بندے بھی ان سے آن ملے۔ ان دونوں کے جیپ میں سوار ہوتے ہی وہ برق رفتاری سے وہاں سے بھاگ نکلے۔ ان حالات میں ان کا دھیان اس سفید سوزوکی مہران کی طرف جانا ممکن ہی نہیں تھا جسے ایک لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی۔

"بہت بُرا ہوا سومرو۔۔۔ بہت ہی بُرا ہوا۔ اس ناکامی پر تو چودھری صاحب میرے ٹوٹے ٹوٹے کر ڈالیں گے۔" شیدا، سومرو کے ساتھ اس کی گاڑی میں ہی بیٹھا تھا۔ وہ لوگ پولیس سے ذرا محفوظ فاصلے پر پہنچے تو اس نے ہاتھ ملتے ہوئے سومرو سے کہا۔

"بُرا تو خیر ہوا بابا! مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ اتنے تیز ہیں ورنہ میں تمہیں ایسے ڈائریکٹ حملہ کرنے کے بجائے ذرا سوچ سمجھ کر انہیں گھیرنے کا مشورہ دیتا۔" سومرو نے جواب دیا۔

"کوئی صورت نکالو سومرو! سوچو کہ وہ اسپتال سے نکل کر کدھر جا سکتے ہیں۔ اس شہر میں ان کا کوئی ٹھکانا تو ہوگا؟" شیدے کو اپنی جان کے لالے پڑے تھے چنانچہ وہ اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔

"اسپتال کے ریکارڈ سے میں نے اس گھر کا پتا نکلوا لیا تھا جدھر آج کل وہ لوگ رہ رہے تھے۔ ادھر چیک کر لیتے ہیں لیکن اگر وہ اتنے ہُشیار (ہوشیار) ہیں تو مشکل ہے کہ واپس گھر کا رخ کریں۔ وہ سب سے پہلے شہر سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔" سومرو نے اسے بتاتے ہوئے خیال آرائی کی۔

"وہ ایسا نہیں کر سکتے سومرو۔ تم نے بتایا تھا نا کہ ان کی بچی اسپتال کی نرسری میں ہے۔ وہ ابھی جان بچا کر بھاگے ہیں لیکن بچی کو لینے کے لیے تو واپس آئیں گے۔ اگر کسی طرح وہ بچی ہمیں مل جائے تو اس کے ذریعے ہم انہیں قابو کر سکتے ہیں۔" شیدے کے دماغ نے بھی اب کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

"بچی کا مسئلہ نہیں ہے۔ میں اسے اسپتال سے نکلوا سکتا ہوں لیکن اس کے لیے رقم خرچ کرنی پڑے گی۔" سومرو نے جواب دیا۔

"رقم کی فکر نہ کرو۔ اس کا بندوبست ہو جائے گا۔ تم بس یہ کام کرواؤ۔" اس نے سومرو سے کہا تو وہ ذرا جھجک کے دوران ہی فون پر مصروف ہو گیا۔ دوسری طرف شیدے نے بھی منشی اللہ رکھا کو فون کر کے اب تک کی رپورٹ دی اور اگلے مرحلے کے لیے ڈرتے ڈرتے رقم کی فراہمی کا مطالبہ کر ڈالا۔ منشی نے رپورٹ سن کر خوب بُرا بھلا کہا لیکن رقم کی فراہمی کے لیے رضامندی دے دی۔

"کیا ہوا، بچی کب تک ملے گی؟" جس دوران وہ منشی سے بات کر رہا تھا سومرو فارغ ہو چکا تھا چنانچہ اس نے بے تابی سے سومرو سے پوچھا۔

"ایک گھنٹے میں کام ہو جائے گا۔ اگر تم چاہو تو اتنی دیر میں ہم ماسٹر کے گھر کو دیکھ لیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ادھر ہی چلتے ہیں۔" اس نے ہامی بھرلی اور گاڑیوں کا رخ آفتاب کے گھر کی طرف ہو گیا۔ حسب توقع وہاں کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے گھر میں موجود مختصر سامان کو بُری طرح توڑا پھوڑا اور ایک نسبتاً پڑھے لکھے آدمی سے یہ تحریر لکھوا کر کاغذ دیوار پر چسپاں کر دیا۔ "اگر اپنی بچی زندہ سلامت چاہتے ہو تو اس شخص کے پاس چلے آؤ جس سے بھاگتے پھر رہے ہو۔" اس کام سے فارغ ہو کر وہ لوگ سومرو کے گھر واپس لوٹ گئے۔ آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد بچی بھی ان تک پہنچ گئی۔ گلابی کپڑوں اور گلابی ہی چادر میں لپٹی وہ نازک سی بچی اتنی پیاری تھی کہ دیکھنے والوں کے دل موہ لے لیکن اسے دیکھنے والوں کے پاس دل تھے ہی کہاں؟ وہ تو بس پیسوں کے پجاری اور غلام ابن غلام تھے جن کی ساری حسیات مر چکی تھیں۔

بچی ہاتھ آئی تو شیدے نے منشی کے حکم کے مطابق فوراً روانگی کا اعلان کر دیا۔ ان کے ساتھ کوئی عورت تو تھی نہیں۔ بچی کی ضرورت کی چند اہم چیزیں اپنے ساتھ لے کر وہ لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ انہیں یہاں سے کراچی تک کا سفر بائی روڈ طے کرنا تھا پھر وہاں سے صرف شیدا بچی کو لے کر بائی ائر لاہور پہنچتا۔ منشی کی ہدایت تھی کہ اگلا کوئی حکم آنے تک بچی کو لاہور والی کوٹھی میں رکھا جائے۔ وہاں کے ملازمین میں ایک عورت بھی شامل تھی چنانچہ بچی کی دیکھ بھال کا مسئلہ حل ہو جاتا لیکن فی الحال وہ سارے اس ذرا سی بچی کی وجہ سے ہلکان تھے۔ ان میں سے ایک اسے اپنی گود میں لے کر پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔ ہتھیاروں کو اٹھانے والے ہاتھوں کو کیا معلوم تھا کہ ایک معصوم بچی کو کس طرح سنبھالا جاتا ہے۔ لینے والے کے اناڑی ہاتھوں کی گرفت نے بچی کو بے چین کر دیا اور وہ گلا پھاڑ کر رونے لگی۔

"اوئے یار اچپ کرواؤ اس کو۔ متھا پہلے ہی گھوما ہوا ہے، اس پر سے اس کی ریں ریں سن کر ہور بھی سر میں درد ہو رہا ہے۔" کچھ دیر برداشت کرنے کے بعد شیدا اپنے ساتھی پر بگڑا۔

"چپ کروانے کی کوشش تو کر رہا ہوں لیکن اس کا بھونپو کسی طرح بند ہی نہیں ہو رہا۔" بچی کو ہاتھوں پر جھلا جھلا کر اسے خاموش کروانے کی کوشش میں ہلکان ہوتے شخص نے جواب دیا۔

"اس کے منہ میں دودھ کی بوتل ٹھونس دو۔" شیدے نے غصے سے مشورہ دیا جس پر عمل کرنے کی کوشش کی جانے لگی لیکن بچی بھوک کے بجائے کسی اور مسئلے سے دوچار تھی اس لیے بوتل منہ میں لینے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔

"اگر چودھری صاحب نے اسے زندہ سلامت نہ مانگا ہوتا تو یہیں اس کا گلا گھونٹ کر ہمیشہ کے لیے چپ کروا دیتا۔" ناکام و نامراد شیدا سارا غصہ معصوم بچی پر نکال رہا تھا۔ وہ بچی چودھری افتخار عالم شاہ کی نواسی تھی لیکن چونکہ اس کی مرضی کے خلاف اس دنیا میں آئی تھی اس لیے اس کے معمولی ملازم بھی اس معصوم پر غرار ہے تھے۔ ابھی جو اگر وہ اپنے نانا کی آنکھ کا تارا ہوتی تو کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ اسے اُف بھی کہہ پاتا۔ سارے کے سارے چودھری کی خوشنودی کے لیے اس پر اپنی جان نثار کر رہے ہوتے۔ رویّوں کے فرق سے ناواقف وہ نومولود بچی گلا پھاڑ کر روتی اپنی اور دوسروں کی جان ہلکان کر رہی تھی۔ اس کے رونے نے ان سب کی توجہ بانٹ دی تھی چنانچہ وہ نوٹ ہی نہیں کر سکے کہ ایک گاڑی بہت دیر سے ان کے تعاقب میں ہے۔ وہ تو جب اس گاڑی کی کھڑکیوں سے جھانکنے والی کلاشنکوفوں نے شعلے اگلے اور جیپ کے سواروں میں سے تین کو شکار کر لیا تو انہیں ہوش آیا لیکن سنبھلنے کا موقع ہی نہیں تھا۔ گولیوں کا شکار ہونے والے تینوں افراد میں سے ایک بھی اس لائق نہیں تھا کہ جوابی فائر کر سکے۔ صرف ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شیدا اور بچی کو گود میں لے کر بیٹھنے والا شخص گولیوں کی زد میں آنے سے محفوظ رہے تھے یا پھر شاید انہیں نشانہ بنانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی تھی۔ شیدے نے جب دیکھا کہ وہ لوگ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو جیپ کی رفتار مزید بڑھا کر وہاں سے نکل جانے کی کوشش کی لیکن اب حملہ کرنے والی گاڑی ان کی جیپ کے بالکل ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ شیدے نے ایک نظر اس گاڑی کی طرف ڈالی تو ایک ہتھیار بردار شخص نے اسے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ ہتھیار سے لیس شخص جب کسی کو نشانے پر لے کر اشارہ کرے تو وہ اشارہ صرف اشارہ نہیں رہتا، حکم بن جاتا ہے۔ شیدے کے پاس بھی بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسے گاڑی روک کر سائڈ پر لگانی پڑی۔

"ہمارے پاس کوئی مال دولت نہیں ہے۔ تم جو کوئی بھی ہو تمہیں ہم سے کچھ نہیں ملے گا۔" موٹی عقل کا شیدا یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ جنہیں مال چاہیے ہو، وہ پہلے ہی سے اتنی بے دردی سے قتل و غارت نہیں کرتے۔

"بکواس بند کر اوئے۔ ہمیں تیری اوقات اچھی طرح پتا ہے۔ ہمیں مال نہیں یہ بچی چاہیے۔" شیدے کے منہ پر بٹ مار کر اس کا تھوبڑا ٹیڑھا کرتے ہوئے اسے جواب دیا گیا۔

"نہیں، میں یہ بچی تمہیں نہیں دے سکتا۔ اگر تم اسے لے گئے تو چودھری صاحب میری کھال کھنچوا دیں گے۔" خود کو لگنے والی چوٹ کی پروا نہ کرتے ہوئے شیدے نے مزاحم ہونے کی کوشش کی۔ وہ جانتا تھا کہ پہلی ناکامی پر ہی اسے

نمک پارے

☆ بچوں کو نانی مت دو، ہمارے نمک پارے دو۔
☆ میرا روپ و حسن سے بنا تھا، نہ نازو نزاکت سے بلکہ حوصلوں ہمتوں اور مقابلوں سے۔
☆ مشکل اچھی چیز ہے بشرطیکہ تم اسے صحیح استعمال کر سکو۔
☆ اٹھ جاگ رے راہی بھور بھئی اب رین کہاں جو سووت ہے جو جاگت ہے سو پاوت ہے، جو سووت ہے سو کھووت ہے۔
☆ یہ ایک دل فگار مسئلہ ہے جس کا حل دو نئے مسئلوں کو جنم دیتا ہے۔
☆ میں اپنے درد کے لیے گرم بوتل کی جگہ کمرے بلی لگا کر سوتا ہوں، وہ ٹھنڈی نہیں ہوتی۔
☆ ہائے کتنے پُرسکون دن تھے اور پُرسکون راتیں جب ٹیلی فون ایجاد نہیں ہوا تھا۔
☆ جب سقراط جیسا عقل مند زہر پی گیا تو ظاہر ہوا، احمق سے احمق عورت عقل مند سے عقل مند مرد کو احمق بنا سکتی ہے۔

از ہان نعیم سرو ہڑی

WWW.PAKSOCIETY.COM

چودھری کے اچھے خاصے عتاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بچی ہاتھ سے نکل جاتی تو اس کا وہ حشر کیا جاتا کہ دیکھنے والے لرز اٹھتے۔ خود کو اس انجام سے بچانے کے لیے ہی اس نے مزاحمت کی کوشش کی جو سراسر ناکام رہی۔

"اگر تو نے ہماری راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی تو ہم تیری کھال کھنچوانے کے ساتھ اس میں بھس بھی بھر دیں گے۔" اس کے شانے پر ایک زوردار ضرب لگا کر راستے سے ہٹاتے ہوئے جواباً کہا گیا اور بچی کو جھپٹ لیا گیا۔ تمام تر کوششوں سے چپ نہ ہونے والی بچی فائرنگ کی آواز پر رونا بند کر چکی تھی۔ شاید وہ ننھی سی جان حیران تھی کہ یہ مجھے کس دنیا میں سانس لینے کو بھیج دیا گیا ہے؟

"تمہیں اس بچی کو ساتھ لے جانے کے لیے میری لاش پر سے گزرنا پڑے گا۔" ٹھیک ٹھاک چوٹ کھا لینے کے باوجود شیدے کا دم خم باقی تھا۔ دوسرے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جان اس کی ہر حال میں خطرے میں ہے۔ اگر وہ بچی سے ہاتھ دھو کر چودھری کے پاس پہنچا تو بڑی دردناک موت سے دوچار ہوتا چنانچہ بہتر تھا کہ کہیں تھوڑی سی جدوجہد کر لی جائے۔ اگر کامیاب ہو گیا تو چودھری کی طرف سے تھوڑی رعایت مل جائے گی ورنہ کم از کم وہ ان حملہ آوروں کے ہاتھوں ہی نسبتاً آسان موت مارا جائے گا۔

"اسے جان پیاری نہیں ہے یارا۔ یہ اتنی ضد کر رہا ہے تو اس کا کام تمام ہی کر دو۔" بچی کو گود میں لے لینے والے نے اپنے کسی ساتھی کو حکم دیا اور واپس گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنی پشت پر فائر کی آواز سنی لیکن پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ جو کچھ ہوا تھا، اسے وہ بغیر دیکھے بھی جان سکتا تھا۔ شیدے کا واحد سالم ساتھی جس کی گود میں تھوڑی دیر قبل بچی تھی، حیرت سے یوں گنگ ہوا تھا کہ مجسمہ ہی بن گیا تھا۔ موت کے ہرکاروں کو موت سے دوچار کرنے والے اپنی گاڑی میں واپس بیٹھے اور گاڑی ایک بار پھر چل پڑی۔ آفتاب اور کشور کی ننھی امید ان کے ساتھ تھی اور نہیں جانتی تھی کہ جن کے ساتھ سفر کر رہی ہے، وہ اس کے دوست ہیں یا دشمن۔ ابھی تو اسے ان دونوں جذبوں کے درمیان فرق کرنا بھی نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

جنگل پر رات اتر آئی تھی اور رات کے اندھیرے نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تاریکی نے جنگل کی ہیبت ناکی اور دہشت کو کچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔ جنگل کا یہ حصہ جسے ڈاکوؤں نے اپنی رہائش کے لیے کاٹ چھانٹ کر ذرا کم گنجان کر لیا تھا، دن کی روشنی میں کچھ کچھ خوب صورت بھی محسوس ہوتا تھا۔ کچھ کچھ اس لیے کہ یہاں موجود ڈاکوؤں کے جھونپڑوں نے اس کی خوب صورتی کو داغ دار کر دیا تھا اور انسانی ہاتھوں کی غیر جمالیاتی چھیڑ چھاڑ نے جنگل کے اس حصے کی خوب صورتی میں سے کافی کچھ چھین لیا تھا۔ جنگل کا یہ حصہ ظالم و مظلوم سب کے لیے ایک سی پناہ گاہ ثابت ہوا تھا۔ یہاں ظلم کا بازار گرم رکھنے والا جبرو بھی تھا اور اپنے خواب اور مقصدِ حیات کھو دینے والا اسلم بھی۔ باہر سے دیکھنے والا ان دونوں میں فرق محسوس نہیں کر سکتا تھا لیکن دونوں میں فرق تو تھا جب ہی آج اسلم اس جگہ کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

طے کردہ پروگرام کے تحت وہ آدھی رات کے قریب اپنے جھونپڑے سے نکلا۔ باہر نکل کر اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ آسمان پر چمکتے چاند نے بھی ابھی اپنی عمر کی کچھ منزلیں ہی طے کی تھیں اس لیے آدھا ادھورا تھا اور شاعری کے کسی بھی استعارے و تمثیل میں استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چاند کی اس بے حد مدھم روشنی میں چلتا ہوا وہ ماہ بانو کے جھونپڑے کی طرف بڑھا تو اپنے ایک ساتھی سے ٹکراؤ ہو گیا۔

"کی گل ہے سوہنیو۔ آج یہ ہمارا شہزادہ اس وقت کدھر چہل قدمی کرتا نظر آ رہا ہے؟" اس نے ذرا مسکراتے ہوئے اسلم سے سوال کیا۔ چاند کی مدھم روشنی میں مسکرانے پر نظر آنے والے اس کے چوڑے چوڑے پیلے دانت اور بھی بدنما محسوس ہو رہے تھے۔

"شہزادہ بھی کہتے ہو اور پھر ایسے سوال بھی کرتے ہو۔ جانتے نہیں ہو کہ شہزادوں کے مزاج کا کچھ پتا نہیں ہوتا اور وہ کبھی بھی کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

اسلم نے اس کی بات کو مذاق میں ٹالا جسے سن کر وہ زوردار قہقہہ لگا کر ہنسا پھر ایک آنکھ کا کونا دباتے ہوئے رازداری سے بولا۔ "سچ کہو، ادھر جا رہے ہو نا جدھر جانے پر باقی سب کے لیے پابندی ہے؟" اس کے سوال کا مطلب سمجھتے ہوئے اسلم نے سر کو اثبات میں ہلا دیا۔ اس کے ساتھیوں کے لیے یہی تاثر سب سے مناسب تھا کہ وہ سمجھیں کہ وہ ماہ بانو کے ساتھ شب بسری کے لیے جا رہا ہے۔

"جا فیر عیش کر۔" اس نے ایک اور قہقہہ لگایا اور اس کے شانے پر دھپ مارتے ہوئے بولا۔ اسلم نے بھی وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور فوراً چل پڑا۔ آگے بڑھتے ہوئے اسے للی نظر آئی۔ وہ جنگل کے مشرقی حصے کی طرف جا رہی تھی۔ اس سے اسلم نے جو معاملات طے کیے تھے، اس کے مطابق للی نے مشرقی حصے میں پہرا دینے والے کو خود

سنبھال لینے کا دعویٰ کیا تھا اور اسلم جانتا تھا کہ وہ ایسی چھلتا پرزہ عورت ہے کہ یہ کام آسانی سے کر گزرے گی۔ للی کے اس معاملے میں شامل ہونے پر وہ شروع میں تو تھوڑا الجھا تھا لیکن بعد میں اسے احساس ہوا تھا کہ للی کی شمولیت سے اس کا کام تھوڑا آسان ہو جائے گا۔ اب بھی اسے مخصوص سمت میں جاتے دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان اترا۔ خود اس نے ماہ بانو کے جھونپڑے کے باہر پہنچ کر دھیرے سے دستک دی۔

"آ جاؤ۔" اندر سے اس نے جواب دیا، وہ فوراً ہی اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ہی وہ لالٹین کی مدھم روشنی میں کھڑی نظر آ رہی تھی اور روشنی کی کمی نے بھی اس کی سندرتا پر کوئی فرق نہیں ڈالا تھا۔ ہمیشہ ڈھیلے ڈھالے لباس میں چھپا رہنے والا اس کا جسم پہلی بار تنگ جینز اور ٹی شرٹ سے آشنا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا کہ یہ ساری جس خزانے کو چھپائے پھرتی ہے، لو آج تم نے اس کے دیدار کی ایک صورت نکال ہی لی۔ اگرچہ یہ دیدار اب بھی ادھورا ہے لیکن صاف پتا چلتا ہے کہ جس خزانے کو چھپا چھپا کر رکھا جاتا ہے، وہ واقعی بڑا قیمتی اور نایاب ہے۔ وقت کے ان لمحوں میں اسلم ذرا دیر کے لیے تو بھول ہی گیا تھا کہ وہ یہاں کس لیے آیا ہے۔ وہ بس مبہوت سا کھڑا اسے دیکھے جا رہا تھا اور اس کے اس انہماک پر وہ اپنی اس اوڑھنی کو جو اس نے اس خالصتاً مغربی لباس پر بھی اوڑھ رکھی تھی، مزید پھیلانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن چھپ پھر بھی نہیں پا رہی تھی۔

"کب تک نکلنا ہے؟"

آخر اس نے اسلم کا انہماک توڑنے کے لیے اس سے پوچھا تو وہ ہوش میں آیا اور بولا۔ "بس ابھی چلتے ہیں۔ میں ذرا حالات کا جائزہ لے لوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکلا اور جھونپڑے کے ساتھ بالکل چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے پیچھے اس نے دروازہ بند کر دیا تھا کہ اندر جلتی لالٹین کی روشنی باہر آ کر اسے عیاں نہ کر سکے۔ اس طرح تاریکی کا حصہ بن کر چپ چاپ کھڑے ہونے کی دو وجوہات تھیں، وہ انتظار کر رہا تھا۔ یہاں سے روانگی سے قبل دو واقعات ظہور پذیر ہونے لازمی تھے۔ اس کا یہ انتظار رائگاں نہیں گیا۔ حسب توقع وہ شخص جو اسے راستے میں ملا تھا اور رات کو پہرا دینے والوں میں سے ایک تھا، اس طرف آتا نظر آیا۔ جھونپڑی کے قریب پہنچ کر اس نے اپنے قدموں کی آواز کو بالکل ہی دبا لیا اور دروازے کے سامنے کھڑا ہو کر اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ بھی یہاں موجود ہوس پرستوں میں سے ایک تھا جو مال ہاتھ نہ آنے پر صرف آنکھوں کی سینکائی کے ذریعے ہی اپنے نفس کی کچھ نہ کچھ تسکین کر لینا چاہتا تھا۔ اپنی اس جدوجہد میں مگن اسے علم ہی نہ ہو سکا کہ کب تاریکی کا حصہ بنا اسلم سانپ کی سی پھرتی سے اس پر آن پڑا اور اس کا منہ اور ناک اپنے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں لے کر اس طرح دبایا کہ وہ سوائے پھڑپھڑانے کے کچھ نہیں کر سکا اور کچھ دیر میں ہی بے دم ہو کر اس کے بازوؤں میں جھول گیا۔ وہ صرف ہوش سے بیگانہ ہوا تھا یا زندگی کی بازی ہی ہار گیا تھا، یہ دیکھنے کی اسلم کے پاس فرصت نہیں تھی۔ اس نے بازوؤں میں جھولتے آدمی کو ایک طرف ڈالا اور مشرق کی طرف آسمان پر نظر جمالی۔ اس کی منتظر نظروں کو زیادہ دیر زحمت نہیں کرنی پڑی اور روشنی کی ایک لکیر سی تین بار اندھیرے میں جھلملا کر غائب ہو گئی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ للی نے اپنے حصے کا کام کر لیا ہے اور اس طرف موجود شخص بھی اٹھا شغل ہو چکا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس شخص کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ پہلے للی نے اس کی ہوس کو جگایا ہوگا اور جب وہ ہوس میں جلتا ہو کر اپنے اردگرد سے بے خبر ہوا ہوگا تو اس کا کام تمام کر دیا ہوگا۔ یہ اشارہ پا کر وہ تیزی سے اندر گیا۔ ماہ بانو اس کی ہی راہ تک رہی تھی۔ آج اس کے پیر اس زنجیر سے آزاد تھے جو یہاں آنے کے بعد سے مستقل اس کے جسم کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ زنجیر کا تالا کھولنے والی چابی اسے اسلم نے ہی فراہم کی تھی اور اسے آزاد دیکھ کر خوشی سی محسوس کر رہا تھا لیکن یہ آزادی ابھی نامکمل تھی۔ آزاد تو وہ جب ہوتی جب اس جنگل کی فضا سے دور کسی مہذب دنیا میں پہنچ جاتی۔

"کیا ہوا... چلیں؟" اسلم کو دیکھتے ہی اس نے استفسار کیا۔

"ہاں۔" اس نے صرف ایک لفظی جواب دیا اور وہ دونوں ساتھ ساتھ باہر نکل آئے۔ باہر نکلتے ہوئے ماہ بانو نے اپنی اوڑھنی کو حتی الامکان مزید پھیلا لیا تھا۔ اسلم چاہتا تھا کہ اسے یہ اوڑھنی اتارنے کا کہہ دے تاکہ بھاگ دوڑ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو سکے لیکن اس کی جھجک اور شرم و حیا دیکھ کر نہ کہہ سکا۔ باہر نکل کر وہ دبے قدموں چلنے لگے۔ اسلم پوری طرح چوکنا تھا۔ انہوں نے صرف دو پہرے داروں کو خاموش کروایا تھا اور کسی تیسرے سے سامنا ہونا بھی بعید از امکان نہیں تھا۔ خیر گزری کہ وہ جب تک جھونپڑوں کے درمیان سے نکل کر اس مقام تک نہیں پہنچے جہاں للی ان کی منتظر تھی، تب تک ان کا کسی اور سے سامنا نہیں ہوا۔ سامنا ہوا تو اتنی اچانک کہ پوری طرح ہوشیار ہونے کے باوجود اسلم کو معلوم نہیں ہو سکا اور ایک رائفل کی نال اس کے سر سے آ لگی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کون ہے؟" رائفل بردار ایک تو اس کی پشت پر سے آیا تھا اور دوسرے روشنی بھی نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے وہ اسلم کو فوری طور پر پہچان نہیں سکا۔

"میں ہوں اسلم۔" اس نے بغیر گھبرائے جواب دیا۔

"اسلم... تُو ادھر کیا کر رہا ہے اور تیرے ساتھ یہ دوسرا کون ہے؟" رائفل کی نال اس کے سر سے ہٹ گئی اور تعجب سے پوچھا گیا۔

"بس ایسے ہی ہوا خوری کے لیے نکلا تھا۔" وہ جواب دیتا ہوا پلٹا اور یکدم ہی پوچھنے والے پر حملہ کر دیا لیکن وہ اپنے اور اس کے مابین فاصلے کا درست اندازہ نہیں لگا سکا تھا اس لیے وار چھچھلتا ہوا پڑا۔

"پاگل ہو گیا ہے کیا تُو؟" اس شخص نے خود کو گرنے سے سنبھالا اور غصے سے پوچھنے لگا لیکن اسلم کے پاس زبان سے جواب دینے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے ہاتھ سے جواب دینے کی کوشش کی اور اس شخص پر جا پڑا۔ اس بار اس شخص نے بھی رعایت نہیں کی اور نیچے گر جانے والی رائفل اٹھا کر اس کو دے ماری۔ رائفل کا بٹ اسلم کے شانے پر پوری قوت سے لگا۔ اگر وہ زمانۂ طالب علمی والا اسلم ہوتا تو اس وار کو کھا کر لمبا لمبا لیٹا ہوا نظر آ رہا ہوتا لیکن اس جنگل میں گزارے ماہ و سال نے اسے بہت سخت جان بنا دیا تھا۔ چوٹ کھا کر وہ بس ذرا سا ڈگمگایا اور پھر سنبھل گیا۔ اس بار اس نے اپنی لات گھما کر رکاوٹ بننے والے شخص کے بوتھے پر رسید کی اور حتمی طور پر اس کا جبڑا ٹوٹ گیا۔ ٹوٹے ہوئے جبڑے کو تھام کر وہ یکدم ہی گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ گیا۔ اسلم نے اسے سنبھلنے کی ذرا بھی مہلت دیے بغیر ایک بار پھر اس کے ہاتھ سے نکل جانے والی رائفل جھپٹ کر اٹھائی اور نال سے پکڑ کر پوری قوت سے اس کے سر پر مار دی۔ کھوپڑی چٹخنے کی آواز سنائی دی اور وہ شخص کوئی بھی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

"شاباش میرے شیر! تم نے تو دل خوش کر دیا۔ یہ دل ایسے ہی تو سب کو چھوڑ کر تم پر نہیں مرتا ہے۔ تمہارے سامنے ان سالے ساروں کی مردانگی پانی بھرتی ہے۔" وہ جس جگہ موجود تھے، وہاں لَلّی کی موجودگی متوقع تھی لیکن وہ انہیں نظر نہیں آئی تھی۔ راہ روکنے والے آدمی کے زمین پر گرتے ہی وہ جانے کہاں سے نکل کر آئی اور اسلم سے چمٹ کر اسے بوسا دیتے ہوئے بولی۔

"دور مر۔" اسلم نے فوراً ہی اسے دھکیل دیا۔

"کتنا ہی دور ہٹاؤ، رہوں گی تو میں تمہارے ساتھ ساتھ ہی۔" اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"مار کر بھی یہیں دفن کر دوں گا۔" وہ غرّایا۔

"کوشش کر دیکھو۔ مرنے سے پہلے اتنا شور مچاؤں گی کہ ڈیرے کے سارے لوگ ادھر جمع ہو جائیں گے... پھر نکل کر دکھانا اپنی محبوبہ دلنواز کے ساتھ یہاں سے۔" اس نے طنز کیا۔

"یہ جھگڑا چھوڑو۔ جب طے ہے کہ لَلّی ہمارے ساتھ جائے گی تو پھر بیکار کی بحث کس لیے؟" اس مرحلے پر ماہ بانو نے ثالث کا کردار ادا کیا تو اسلم نے بھی مزید کچھ کہنے سے گریز کیا اور وہ تینوں بے آواز لیکن تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔ انہیں جلد از جلد اس جگہ سے نکل کر پہاڑی سلسلے میں داخل ہونے کی فکر تھی۔ ایک بار وہ اس سلسلے میں داخل ہو جاتے تو انہیں ڈھونڈنا آسان نہیں رہتا لیکن اصل مرحلہ تو اس سلسلے تک پہنچنے کا ہی تھا۔ وہ ابھی کافی فاصلے پر ہی تھے کہ انہیں اپنی پشت پر فائرنگ کی زوردار آوازیں سنائی دیں۔ شاید پہرے داروں کی لاشیں دریافت کر لی گئی تھیں اور اب پہرے داروں کو جنہوں نے لاشوں میں تبدیل کیا تھا، انہیں تلاش کیا جا رہا تھا۔

"بھاگو!" اسلم نے ان دونوں سے کہا اور خود ماہ بانو کا ہاتھ تھام کر بھاگ پڑا۔ اس کے پاس ایک پسٹل، چاقو اور پہرے دار کی رائفل کے علاوہ مزید کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ لَلّی کے پاس بھی شاید ایک ریوالور موجود تھا لیکن وہ تین افراد اتنے محدود اسلحے کے ساتھ ڈھیر سارے لوگوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ کم از کم اس کھلے حصے میں تو بالکل بھی نہیں اس لیے ان کے لیے بہتر تھا کہ جتنی تیزی سے ممکن ہو بھاگیں اور پہاڑی سلسلے میں پناہ لے لیں۔ پہاڑوں کی آڑ مل جاتی تو محدود اسلحے کے ساتھ بھی مقابلے کا امکان تھا اس لیے وہ دیوانہ وار دوڑتے چلے جا رہے تھے اور ان کی پشت پر ابھرتی فائرنگ کی آوازیں بھی اسی تناسب سے زور پکڑتی جا رہی تھیں۔ معلوم نہیں یہ جنگل انہیں اپنی قید سے آزاد ہونے بھی دیتا یا نہیں؟ ان کے پاس ذہنوں میں ابھرتے اس سوال کا جواب موجود نہیں تھا لیکن وہ اپنی پوری کوشش کر لینا چاہتے تھے۔ اس پرندے کی طرح جس کے پنجرے کا دروازہ غلطی سے کھلا رہ گیا ہو اور وہ اپنے پوری طرح پرواز نہ پکڑنے والے پروں کے باوجود ایک اونچی اڑان اڑنا چاہتا ہو تاکہ آزادی کا ذائقہ چکھ سکے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

فائرنگ کی آوازیں لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جارہی تھیں اور جواب سے ان کے دوڑتے قدموں کی رفتار بھی بڑھتی جارہی تھی۔

"رک جاؤ۔" اچانک ہی اسلم نے بلند آواز میں کہا تو اس کے ساتھ ساتھ دوڑتی للی اور ماہ بانو کے قدموں کو بریک لگ گئے۔ اسلم خود بھی رک گیا اور سماعت پر زور دے کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ آخر وہ اپنے اس خیال میں پُریقین ہو گیا جس نے اسے رکنے پر مجبور کیا تھا۔

"کیا ہوا... تم رک کیوں گئے؟" اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے للی نے دریافت کیا۔

"فائرنگ کی آوازیں سن رہی ہو؟"

"ظاہر ہے۔ فائرنگ ہو رہی ہے تو سن بھی رہی ہوں... لیکن تم رک کیوں گئے ہو؟ کیا ان لوگوں کو موقع دینا چاہتے ہو کہ وہ ہمارے سروں پر پہنچ جائیں؟" اس کے سوال کے جواب میں للی نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

"ہمارے سروں پر تو وہ تب پہنچیں گے جب ہمارے پیچھے آئیں گے۔ ذرا فائرنگ کی آوازوں کو غور سے سنو۔ یہ آوازیں بلند تو ہو رہی ہیں لیکن ہمارے قریب نہیں آ رہیں۔ اس بات کا مطلب ہے کہ فائر کرنے والے ہمارے پیچھے نہیں آ رہے۔ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ جتنی شدت سے فائرنگ کی جارہی ہے اس سے یوں لگتا ہے کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اگر یہ تماشا ہماری وجہ سے ہو رہا ہوتا تو فائر کرنے والے ہمیں للکارتے اور رکنے کا کہتے لیکن ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھے تو آوازوں سے یوں لگ رہا ہے جیسے دو مسلح گروپوں کے درمیان مقابلہ ہو رہا ہے۔"

"تم صحیح کہہ رہے ہو۔ یہ تو واقعی کوئی زوردار مقابلہ ہو رہا ہے۔" اس کے کہنے پر للی نے بھی کان لگا کر غور کیا اور بالآخر اس سے متفق ہو گئی۔

"لیکن یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ ایک گروپ تو لازمی ڈیرے والوں کا ہے مگر یہ دوسرا گروپ کس کا ہے جو ان سے مقابلہ کر رہا ہے؟" اس بات کا یقین ہو جانے کے بعد کہ واقعی سنائی دینے والی فائرنگ کی آوازیں دو مسلح گروپوں کے درمیان لڑائی کا نتیجہ ہیں، اس نے حیرت سے سوال کیا۔ وہ اچھے خاصے طویل عرصے سے ڈاکوؤں کے اس ٹھکانے پر مقیم تھی۔ اتنے عرصے میں اس نے کبھی کسی کو ان لوگوں سے الجھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ان کا گروہ اس علاقے کا واحد ڈکیت گروہ تھا اس لیے اپنے "ہم پیشہ" افراد سے تو تصادم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دوسرا خیال پولیس کی طرف جاتا تھا لیکن یہ بھی ذرا حیرت کی بات تھی۔ پولیس نے کبھی جنگل میں گھس کر ان لوگوں سے مقابلے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ وہ تو کسی واردات کے موقع پر بھی ان کی راہ میں رکاوٹ بننے سے گریز کرتے تھے۔ پھر ان کے سرپرستوں کا تعاون بھی ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا تھا۔ پولیس فورس اگر کبھی کسی وجہ سے جنگل میں داخل بھی ہوتی تھی تو انہیں پہلے ہی اطلاع کر دی جاتی تھی تاکہ وہ لوگ ہوشیار رہیں اور ان کی پولیس سے مڈبھیڑ کی نوبت ہی نہ آئے۔

"میرا خیال ہے پولیس نے ڈیرے پر ریڈ کیا ہے۔ اگر تم لوگ غور سے سنو تو فائرنگ کی آوازوں کے درمیان بھی کبھی کسی کی لاؤڈ اسپیکر پر بولنے کی آوازیں بھی آ رہی ہیں۔ جہاں تک مجھے سمجھ آ رہا ہے، پولیس والے ڈیرے والوں کو ہتھیار ڈالنے کا کہہ رہے ہیں۔" اب تک خاموش رہنے والی ماہ بانو اچانک ہی بولی اور بڑے وثوق سے اپنا خیال ظاہر کیا۔ پہلے لمحے میں وہ فائرنگ کی آوازیں سن کر گھبرا گئی تھی اور اسے بھی یہی ڈر محسوس ہوا تھا کہ ڈیرے والوں کو ان کے فرار کی خبر ہو گئی ہے اور وہ انہیں پکڑنے کے لیے ان کے تعاقب میں آ رہے ہیں لیکن اسلم کی خیال آرائی کے بعد اس نے خاموش رہ کر بہت توجہ سے سنائی دینے والی آوازوں پر غور کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ پولیس وہاں پہنچ چکی ہے۔

"پھر تو تم صحیح رہی ہو۔ پھر بتاؤ کہ کیا خیال ہے؟ کیا ہم یہیں رک کر اس ہنگامے کے تھمنے کا انتظار کریں اور پھر فائرنگ رکنے کے بعد واپس جا کر میں پولیس کو گرفتاری دے دوں؟ تم دونوں تو ظاہر ہے خود مظلوم ہو۔ تم دونوں کو ہی زبردستی اغوا کر کے یہاں لایا گیا تھا۔ تم دونوں پولیس کی حفاظت میں آرام سے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جاؤ گی۔ دوسری صورت میں تو راستہ بہت دشوار اور پُرپیچ ہے اور تم دونوں کو بلاوجہ اتنی تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ میں ہرگز بھی تمہارا پولیس کے ہاتھ آنا پسند نہیں کروں گی۔ تم پر اتنے الزامات ہیں۔ تمہاری تو ساری زندگی مقدمات بھگتنے اور سزا کاٹنے میں گزر جائے گی۔" اسلم نے ماہ بانو کی طرف رخ کر کے سوال کیا تھا لیکن جواب فوری طور پر للی کی طرف سے آیا۔ وہ واقعی اس پر مرتی تھی اور اسے کسی طور نقصان پہنچتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن اسلم کی سوالیہ نظریں تو ماہ بانو پر جمی تھیں۔ اندھیرے کے باعث وہ تینوں ہی ایک دوسرے کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتے تھے، پر اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ماہ بانو کو اندازہ تھا کہ اسلم کو اس کے جواب کا انتظار ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"للّی ٹھیک کہہ رہی ہے اسلم! اگر تم پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو زندگی کا بڑا حصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنا پڑے گا اور میں دل سے یہ چاہتی ہوں کہ قدرت تمہیں ایک اچھی زندگی گزارنے کا جو موقع فراہم کر رہی ہے، اسے ہاتھ سے جانے نہ دو۔" اس کے جواب نے اسلم کی سماعتوں میں رس گھول دیا اور وہ جو کہیں دل میں اندیشہ تھا کہ ماہ بانو صرف یہاں سے نکلنے کے لیے اسے شادی کا جھانسا دے رہی ہے، وہ مکمل طور پر دل سے نکل گیا۔

"اگر آپ دونوں خواتین کا یہی اصرار ہے تو پھر چلو یہاں سے چلتے ہیں۔ یہاں زیادہ دیر رکنا بیکار بھی ہے اور خطرناک بھی۔ اگر پولیس نے ڈیرے والوں پر قابو پالیا تو اس کے بعد سرچ آپریشن بھی کرے گی اس لیے مناسب یہی ہے کہ ہم جلد از جلد یہاں سے دور نکل جائیں۔" وہ سرخوشی کے ساتھ بولا اور پھر ان تینوں کے قدم ایک بار پھر آگے کی جانب بڑھنے لگے۔ یہ قدم انہیں کہاں تک لے جاتے، یہ تو کسی کو معلوم نہیں تھا لیکن اپنی اپنی جگہ وہ تینوں ہی مطمئن تھے کہ جینے کی ایک کوشش کرنے کا موقع تو بہرحال مل ہی گیا ہے۔

☆☆☆

"اور کتنا راستہ باقی ہے؟" اس نے اپنے دائیں پہلو میں چلتے گھوڑے پر سوار سادھو سے پوچھا۔ یہ ہندو سادھو جو ایس پی کے مطابق ہر وقت اِدھر اُدھر آوارہ گردی کرتے رہنے کے باعث ویرانوں اور آبادیوں کے بہت سے رازوں سے واقف تھا اور پولیس کو ڈاکوؤں کے ڈیرے کی صحیح نشان دہی کرنے والا مخبر ثابت ہوا تھا، یوں اس کا ہم سفر بنا تھا کہ اس نے ایس پی سے درخواست کر کے اسے اپنے پاس بلا لیا تھا اور بظاہر تارک دنیا سادھو کو موٹی رقم کی ترغیب دے کر اس کام کے لیے راضی کر لیا تھا کہ وہ ڈیرے تک پہنچنے والے راستے کی اس کے ساتھ رہ کر راہنمائی کرے گا۔ سو اب وہ چاند کی بے حد مدھم روشنی میں گھوڑوں پر سوار جنگل میں سفر کر رہے تھے۔ اس سفر میں نڈر، بے باک اور قابلِ بھروسا مشابرم خان بھی اس کے ساتھ تھا۔ پولیس فورس ان سے بہت پہلے روانہ ہو چکی تھی۔ پولیس فورس میں کئی ایسے مقامی افراد بھی شامل تھے جو کافی حد تک جنگل سے واقف تھے اس لیے انہوں نے سادھو کو اپنے ساتھ رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ویسے بھی اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جب اپنی بولتی بند کر لیتا ہے تو پھر کسی طرح زبان کھولنے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔ ایسے من موجی آدمی کو ساتھ رکھ کر فائدہ اٹھانا ذرا مشکل ہوتا ہے اس لیے اسے ساتھ لے جانے کے بجائے آپریشن کی تکمیل تک

پولیس کسٹڈی میں رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا جہاں سے وہ شہریار کی خواہش پر اس تک پہنچا دیا گیا تھا۔ اس نے سادھو سے بات کرنے میں طویل مذاکرات کیے تھے۔ ابتدا میں تو وہ یہی ظاہر کرتا رہا کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جسے دنیاداری کے جھمیلوں سے کوئی غرض نہیں ہے لیکن جوں جوں شہریار کی طرف سے کی جانے والی رقم کی پیشکش میں ہندسوں کا اضافہ ہوتا رہا، اس کی بے نیازی کا خول چٹختا چلا گیا اور بالآخر وہ پوری طرح اپنے خول سے باہر آ کر شہریار کا ساتھ دینے کے لیے راضی ہو گیا۔ رقم کے لالچ نے اس کی وہ ساری بے نیازی اور بے خوفی اڑن چھو کر دی جس کا ڈھونگ رچا کر وہ لوگوں میں باعزت بنا پھرتا تھا۔ شہریار کو اس سے پہلے ہی یہ امید تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ عام طور پر اس طرح کے لوگ بہروپیے ہوتے ہیں اور کمانے کے مروجہ طریقے اپنانے کے بجائے ایسی راہ ڈھونڈتے ہیں جس سے لوگوں کو لوٹا جا سکے۔ اس سادھو کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ مخبری کے فرائض انجام دینے کے علاوہ لوگوں کی اندھی عقیدت سے فائدہ اٹھا کر بھی مال سمیٹتا ہوگا۔ بہرحال اسے فی الحال اس سادھو کے کردار سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ ابھی تو وہ اسے ایک ایسے شخص کی حیثیت سے پہچانتا تھا جو اسے ڈاکوؤں کے ڈیرے تک پہنچا سکتا تھا چنانچہ کسی بھی قسم کی بحث میں الجھے بغیر اس سے سودے بازی کر لی تھی اور نتیجتاً اب وہ لوگ جنگل کے پُرپیچ راستوں پر سفر کر رہے تھے۔ سادھو ان کا راہنما تھا اسی لیے اس نے اس سے راستے کے بارے میں استفسار کیا تھا۔

"ابھی تو وڈا لمبا رستہ ہے سوہنیو! کیا تھک گئے ہو جو ابھی سے پوچھ تاچھ کر رہے ہو؟" سادھو کی شخصیت کی قلعی اتر چکی تھی لیکن ظاہر ہے وہ ایک مخصوص انداز میں بات کرنے کا عادی تھا اور یہ عادت چند گھنٹوں میں ختم نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ اس سے ابھی بھی اسی ٹون میں بات کر رہا تھا جیسے وہ بڑا گیانی ہو۔

"یہ جو جنگل ہے نا، یہ وڈا انوکھا جادو ہے۔ یہ اتنی آسانی سے کسی کو اپنے اندر رستہ نہیں دیتا۔ مسافر کو اپنی بھول بھلیوں میں بھٹکا کر رکھ دیتا ہے۔ تم تو خوش نصیب ہو جو میرا ساتھ مل گیا ورنہ کہیں بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔" اس کی لن ترانیاں جاری تھیں اور وہ قطعی بھول چکا تھا کہ جس بات کا احسان جتا رہا ہے اس کے لیے اس نے پوری پوری قیمت وصول کی ہے اور وہ بھی ایڈوانس۔ رقم لینے کے بعد وہ شہریار سے چند گھنٹوں کی مہلت لے کر گیا تھا کہ رقم اپنے گھر والوں تک پہنچا کر واپس آ جاؤں گا اور حسبِ وعدہ واپس بھی آ گیا تھا۔ رقم لے کر بھاگنے کا یقیناً

اس نے اس لیے نہیں سوچا تھا کہ اسے ہی ضلع سے بھاگ کر کہاں جائے گا۔

"میں نے تمہیں اتنی رقم باتیں بنانے کے لیے نہیں دی ہے۔ رقم میں نے اس لیے خرچ کی ہے کہ پولیس فورس سے پہلے یا کم از کم ان کے ساتھ ساتھ ڈیرے پر پہنچ سکوں لیکن جس انداز میں تم مجھے لے جا رہے ہو، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ پولیس ہم سے سبقت لے جائے گی۔" سادھو کی فضول گوئی کو وہ ایک حد تک ہی برداشت کر سکتا تھا چنانچہ فوراً ہی اسے اس کی اوقات یاد دلا دی۔

"میں کوشش کر رہا ہوں، پر فرق تو پڑے گا۔ پولیس والے ہم سے پہلے کے نکلے ہوئے ہیں اور گئے بھی میرے بتائے ہوئے راستے سے ہوں گے۔ اب آپ کی شرط کے مطابق ان سے ٹاکرا ہوئے بغیر ڈیرے پر پہنچنے کے لیے مجھے تھوڑا سا راستہ بدلنا پڑا ہے تو ٹیم (ٹائم) تو لگے گا نا۔ ویسے آپ بتاؤ آپ اُدھر کیا کرنے جا رہے ہو؟ وہ بھی ایسے چھپ کے؟ جانا ہی تھا تو آپ پولیس والوں کے ساتھ بھی جا سکتے تھے۔ آپ تو خود سرکاری آدمی ہو۔" سادھو نے بڑے پتے کا سوال پوچھا تھا لیکن وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ وہاں کیوں جا رہا ہے۔

وہ تو بس ایک دیوانگی تھی، ایک آشفتہ سری تھی، تن من میں لگی آگ تھی جو اسے کچھ بھی سوچے سمجھے اور اپنے عہدے کا لحاظ کیے بغیر جنگل میں لیے چلی جا رہی تھی چنانچہ کوئی وضاحت دینے کے بجائے سرد لہجے میں بولا۔ "فضول سوالات کرنے کے بجائے اپنے کام سے کام رکھو۔ وہاں جا کر میں کیا کروں گا اور کیا نہیں، یہ میرا مسئلہ ہے۔"

"جیسی تہاڈی مرضی سرکار! بندہ تو بے دام غلام ہے۔" جواباً سادھو نے دانت نکالتے ہوئے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔ اپنی مرضی کے دام وصول کرنے کے بعد خود کو بے دام غلام کہنا ڈھٹائی نہیں تو اور کیا تھا لیکن شہریار نے اسے کچھ جتانا ضروری نہیں سمجھا اور ان کا سفر جاری رہا۔ جنگل کی ہولناکی میں جاری یہ سفر کب ختم ہوتا یہ تو انہیں لے جانے والا سادھو ہی جانتا تھا، وہ تو بس چلے جا رہے تھے کہ کبھی تو منزل پر پہنچیں گے۔ وہ اور مشابرم خان دونوں ہی جنگل سے واقف نہیں تھے اور کلی طور پر سادھو کے رحم و کرم پر تھے۔ چلتے چلتے اچانک ہی مشابرم خان کے گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور وہ زمین پر آ رہا۔ شہریار نے فوراً ہی اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ان لمحات میں وہ سادھو کی طرف سے بالکل بے خبر ہو گیا اور وہ مکار سادھو تو یقیناً تھا ہی موقع کی تلاش میں۔ فوراً ہی اپنے

گھوڑے سے اچھل کر اس کے پیچھے اس کے گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا اور اپنے چولے نما لباس میں سے کہیں سے ریوالور نکال کر اس کی کنپٹی سے نال لگا دی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" اس صورتِ حال پر ششدر رہ جانے کے باوجود شہریار نے اس سے سخت لہجے میں پوچھا۔

"بدتمیزی نہیں مجبوری ہے۔ مجھے حکم ہے کہ آپ کو ہلاک کر دوں۔" سادھو نے جواب دیا۔

"یہ حکم دینے والا کون ہے؟" اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سوال کیا۔ سوالات کے ذریعے وہ سادھو کو اپنے ساتھ الجھائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اس دوران بچاؤ کی کوئی صورت نکل سکے۔ غنیمت تھا کہ اس منحوس صورت سادھو نے فوری طور پر اسے قتل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اسے تھوڑی سی مہلت مل گئی تھی۔

"میں اس شخص کا نام نہیں بتا سکتا۔" سادھو نے اس کے سوال کے جواب میں اپنی معذوری ظاہر کی۔

"بہت خوب، تم تو بڑے کمال کے آدمی ہو۔ مجھ سے اتنی موٹی رقم لے کر مجھے ہی قتل کرنے پر تلے ہو۔ کیا جس نے تمہیں میرے قتل کا حکم دیا ہے، وہ تمہیں اور بھی زیادہ رقم دے رہا ہے؟ اگر ایسا ہے تو مجھے کھل کر بتاؤ۔ میں اپنی جان بچانے کے لیے تمہیں اس سے ڈبل رقم دوں گا۔" وہ دیکھ رہا تھا کہ گھوڑے کے ٹھوکر کھانے کے نتیجے میں نیچے گر جانے والا مشابرم خان خود کو سنبھال چکا ہے اور بڑی احتیاط سے حرکت میں بھی آ گیا ہے اس لیے خلافِ مزاج لایعنی گفتگو کو طول دینے لگا۔

"کتنی رقم...؟" سادھو کا لہجہ حرص و طمع سے لتھڑا ہوا تھا۔

"بتایا تو ہے کہ جس کے کہنے پر تم مجھے قتل کرنے آئے ہو، اس سے ڈبل رقم دوں گا۔" اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی نرمی سے جواب دیا۔ ریوالور کی نال کنپٹی سے لگی ہونے کے باعث وہ صرف ایک ہی سمت میں دیکھتے رہنے پر مجبور تھا اور نہیں دیکھ سکتا تھا کہ مشابرم خان کا متحرک جسم اب کہاں ہے۔ شاید وہ ان لوگوں کی پشت پر چلا گیا تھا اس لیے نظر نہیں آ رہا تھا۔

"میں جس کے کہنے پر تمہیں قتل کرنے والا ہوں، وہ بس کام لینا جانتا ہے۔ تمہاری طرح میں اس سے منہ مانگی رقم نہیں لے سکتا۔ اس کی مرضی ہوتی ہے کہ جو چاہے دے دے، ہور اگر نہ بھی دے تو کسی کو شکایت کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔" سادھو اس کی خواہش کے مطابق باتوں میں الجھ گیا تھا۔ شاید وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس سطح کا آدمی تھا ہی نہیں۔ جس سطح کا کام اسے سونپ دیا گیا تھا۔

"تم جس کے کہنے پر مجھے قتل کرنا چاہتے ہو، اس کا نام بتا بھی دو گے تو کیا حرج ہوگا؟ مرنے کے بعد میں اس کا کچھ بگاڑ تو نہیں سکوں گا۔" اس نے ایک بار پھر سادھو کو کریدنے کی کوشش کی۔

"ہوسکتا ہے تمہارا ساتھی..." جواب میں سادھو جانے کیا کہنے جارہا تھا، یکدم ہی اسے احساس ہوگیا کہ مشابرم خان جس جگہ گرا تھا اس جگہ موجود نہیں ہے۔ اس نے بھڑک کر ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی لیکن مشابرم خان اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ پھرتیلا تھا۔ اپنے اس پھرتیلے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے سادھو کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس کا ریوالور والا ہاتھ اپنے قابو میں کر کے اس کو گھوڑے سے نیچے کھینچ لیا۔ سادھو نے نیچے گرتے ہوئے ایک خوف زدہ سی چیخ ماری۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر کہیں دور جا گرا تھا اور اب وہ بالکل نہتا مشابرم خان کے رحم و کرم پر تھا۔ مشابرم خان نے بھی بنا کسی رو رعایت کے اس کا چہرہ گھونسوں کی زد پر رکھ لیا اور تابڑتوڑ اتنے گھونسے اسے رسید کیے کہ وہ خون اگلنے لگا۔ اس خون کے ساتھ اس کے بدنما اور پیلے دانت بھی باہر نکل کر گرے۔ مشابرم خان کے گھونسوں نے اس کی بتیسی کے کئی دانت جڑ سے اکھاڑ دیے تھے۔ اگر شہریار اسے اشارے سے نہ روکتا تو شاید وہ منہ توڑ کر ہاتھ میں دے دینے والا محاورہ سچ کر دکھاتا۔

"تم اگر اس شخص کا نام بتا دو جس نے تمہیں مجھے قتل کرنے کا حکم دیا تھا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں ہم سے مزید کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور تم زندہ سلامت یہاں سے لوٹ سکو گے۔" مشابرم خان کو روکنے کے بعد وہ خود گھٹنوں کے بل بیٹھے خون تھوکتے ہوئے سادھو سے مخاطب ہوا۔

"اگر میں نے آپ کو اس شخص کا نام بتا دیا تو وہ مجھے اور میرے گھر والوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ بہت ظالم ہے اور اس کے حکم پر اس کے کارندے بندے کو چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دیتے ہیں۔" سادھو نے خوف زدہ اور کمزور آواز میں جواب دیا۔ اس وقت وہ بُری طرح پھنس چکا تھا۔ شہریار پر ناکام قاتلانہ حملہ کرنے کے بعد وہ یہ امید نہیں کرسکتا تھا کہ وہ لوگ اس سے کوئی اچھا سلوک کریں گے۔ دوسری طرف اس کو اس کام پر مامور کرنے والا بھی یقیناً کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا نہیں ہوسکتا تھا۔ لالچی سادھو کو قتل جیسے جرم پر آمادہ کرنے کے لیے اس نے موٹی رقم اور اثر رسوخ دونوں ہی کا استعمال کیا ہوگا جب ہی تو وہ اپنی حیثیت بھلا کر ایک اسسٹنٹ کمشنر کو قتل کرنے چلا تھا۔

"اس طرف سے تم اطمینان رکھو۔ تم اگر مجھے اس شخص کا نام بتا بھی دو گے تو میں اس معاملے میں تمہارا نام کہیں نہیں آنے دوں گا۔ نہ ہی ایسی کوئی حرکت کروں گا جس سے وہ یہ سمجھے کہ تم نے مجھے کچھ بتایا ہے۔" اس نے سادھو کی بزدلی اور خوف کا علاج نرم لہجے میں کیے جانے والے ایک وعدے سے کرنے کی کوشش کی جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور اپنے منہ سے نکلنے والا خون روک لینے کی کوشش میں مصروف سادھو اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو؟ یہ نہ ہو کہ تم اپنے وعدے سے پھر جاؤ۔" وہ میلا کچیلا سادھو "آپ" اور تم کے درمیان بڑی تیزی سے قلابازیاں کھا رہا تھا۔ عادت اسے "تم" کا صیغہ استعمال کرنے پر مجبور کررہی تھی جبکہ اے سی کے عہدے کا تقاضا تھا کہ وہ شہریار سے "آپ" کہہ کر مخاطب ہو۔

"مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی میں جھوٹے وعدے کرنے والا آدمی ہوں۔" اس کے بے حد روکھے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ خوف میں لپٹے سادھو کو اس کا یقین کرنا پڑا اور وہ دانتوں سے محروم ہو جانے والے اپنے زخمی مسوڑھوں پر زبان پھیرتا ہوا سچ اگلنے پر تیار ہوگیا۔

"مجھے اس کام کے لیے چودھری افتخار عالم نے کہا تھا۔ چودھری صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ آپ مجھے ڈاکوؤں کے ڈیرے کا راستہ دکھانے کے لیے اپنے ساتھ لے جارہے ہیں تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کو اصل راستے پر لے جانے کے بجائے جنگل میں اِدھر اُدھر بھٹکاتا رہوں اور جیسے ہی موقع ملے آپ کو قتل کر ڈالوں۔"

"چودھری کو کیسے معلوم ہوا کہ تم میرے ساتھ جانے والے ہو؟" اس نے بصارت کو محدود کردینے والی تاریکی کی چادر کے پار سادھو کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں سوال کیا۔ سوال و جواب کے اس سیشن کے دوران میں مشابرم خان نے تینوں گھوڑوں کو ایک درخت کے تنے کے ساتھ باندھ دیا تھا اور اب خود خاموش لیکن ہوشیار کھڑا ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس کے تیوروں سے ظاہر تھا کہ اب وہ سادھو کو ایسا کوئی موقع نہیں دے گا کہ وہ دوبارہ شہریار پر حملہ کرسکے۔ پہلے بھی وہ اس کی طرف سے ہوشیار ہی رہا تھا لیکن اتفاق سے اس کے گھوڑے کو لگنے والی ٹھوکر نے سادھو کو موقع فراہم کردیا تھا۔ دیکھا جائے تو ایک طرح سے یہ بات ان کے حق میں بہتر ہی

ثابت ہوئی تھی۔ لمحاتی برتری حاصل کرنے کے بعد اب سادھو ان کے سامنے پڑا خاک چاٹ رہا تھا اور اس امر پر مجبور ہوگیا تھا کہ اپنی زبان کھول دے۔ دوسری صورت میں یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اسے کوئی بہتر موقع مل جاتا اور وہ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہوجاتا۔

"نہیں میں نے ہی بتایا تھا۔ میں جب آپ سے گھر والوں کو رقم دینے کا بہانہ کر کے گیا تھا تو چودھری صاحب کے پاس بھی گیا تھا۔" اس نے جھجکتے ہوئے اعتراف کیا۔ اس کے اس اعتراف نے شہریار کو بُری طرح چونکا دیا۔ اس اعتراف سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ چودھری اور سادھو کے درمیان کوئی خاص گٹھ جوڑ ہے۔

"کیوں؟ تم چودھری کو یہ بتانے کیوں گئے تھے؟" اس نے اضطرابی انداز میں سوال کیا۔

"میں انہیں بتائے بغیر یہ کام کیسے کرسکتا تھا؟ ان کی مرضی کے بغیر اگر میں آپ کو راستہ دکھانے چل پڑتا تو وہ بعد میں میری چمڑی بھی اُدھیڑ سکتے تھے۔" اس کے لہجے سے خوف جھلک رہا تھا۔

"تو کیا پولیس کو بھی تم نے چودھری کی اجازت سے راستہ بتایا ہے؟" اس نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے اندیشے کے تحت پوچھا۔

"اجازت کیا جی، ان کے حکم پر ہی بتایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مخبر بن کر پولیس والوں کو بتادو کہ جنگل میں ڈاکو کس جگہ رہ رہے ہیں تو میں نے بتادیا۔ ان کا حکم نہ ہوتا تو میں بھلا زبان کھول سکتا تھا؟ مجھے تو برسوں سے معلوم ہے کہ ڈاکو کدھر رہ رہے ہیں۔" اس کے لہجے میں تھوڑا سا تفاخر در آیا تھا۔

"چودھری کو ڈاکوؤں کی مخبری کروانے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟" وہ ذرا حیرت سے بہ آواز بلند بڑبڑایا۔

اس کی اس بڑبڑاہٹ کو سادھو نے اپنے لیے نیا سوال تصور کیا اور بے نیازی سے بولا۔ "یہ تو مجھے نہیں معلوم جی۔ میں تو بس حکم کا غلام ہوں۔ وہ جو حکم دیتے ہیں، میں بجا لاتا ہوں۔" اس کے بے نیازانہ جواب نے واضح کردیا کہ وہ سادھو چودھری کا کوئی باقاعدہ ملازم یا کارندہ ہے جو کسی مصلحت کے تحت اپنی اصلیت چھپاتا ہے۔

"کیا تم چودھری اور ڈاکوؤں کے درمیان پیغام رسانی کا کام کرتے ہو؟" اس نے اپنے ذہن میں سرسرانے والے خیال کو سوال کا روپ دیا۔ اس سوال نے اب تک روانی سے بولتے سادھو کو خاموش کردیا۔ شاید اسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ ضرورت سے کچھ زیادہ بول چکا ہے اور یہ بڑبولا پن اسے نقصان دے سکتا ہے۔

"سنائی نہیں دیا کہ صاحب نے کیا پوچھا ہے؟" اس کی طرف سے جواب نہ ملنے پر خاموش کھڑے مشابرم خان نے رائفل کی نال سے اسے ٹھوکا دیا۔

سادھو کچھ دیر قبل ہی اس کے طوفانی مکوں کو سہہ کر اپنی بتیسی کے کئی دانتوں سے محروم ہوچکا تھا اور دانتوں سے محروم عجیب سی آواز میں بول رہا تھا۔ اس نے رائفل کی نال سے ٹھوکا دیا تو وہ سر پر کھڑی اس بلا سے جان چھڑانے کے لیے ایک بار پھر رواں ہونے کے لیے تیار ہوگیا لیکن کوئی بھی نیا انکشاف کرنے سے پہلے اس نے اپنے تحفظات کی ضمانت چاہی اور گھگیائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں تم لوگوں کو سب کچھ سچ سچ بتادوں گا، پر آپ کو بھی اپنا وعدہ یاد رکھنا ہوگا کہ چودھری صاحب کے سامنے کہیں میرا نام نہ آنے پائے۔" اس کی آپ اور تم کے درمیان قلابازیاں مسلسل جاری تھیں۔

"ایک بار کے کہے کو کافی سمجھو۔ تمہارے سامنے تمہارا حرام خور اور بددیانت چودھری نہیں کھڑا ہے جو تمہیں وعدہ خلافی کا ڈر ہو۔ یہ اے سی شہریار عادل ہیں۔ ان کی سچائی اور دیانت داری کی گواہی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ تمہارے بدذات آقا کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتے رہتے ہیں اور وہ تم جیسوں کے ذریعے انہیں ختم کرنے کے ناپاک منصوبے بناتا رہتا ہے۔ اپنے ان منصوبوں پر اس نے ہمیشہ منہ کی کھائی ہے لیکن باز نہیں آتا۔" شہریار کے بجائے مشابرم خان نے اسے جواب دیا اور ایک چھوٹی سی جذباتی تقریر کر ڈالی جس کا سادھو پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ بولنے پر آمادہ ہوگیا۔

"گل یہ ہے جی کہ میرا تعلق خانہ بدوشوں کے خاندان سے ہے۔ ہم لوگ اِدھر اُدھر گھوم کر اور مانگ تانگ کر کھانے کے عادی ہیں۔ محنت مزدوری سے جان چھڑاتے ہیں لیکن ہر وقت گھومتے پھرتے رہنے کی وجہ سے جنگلوں اور ویرانوں سے نہیں ڈرتے۔ میں بھی جب دل میں آتا تھا، جنگل میں نکل جاتا تھا۔ چودھری صاحب کو کسی طرح میرے بارے میں خبر ہوگئی۔ انہوں نے کہا کہ میری ملازمت میں آجا۔ کام یہی ہوگا جو تو ابھی کرتا ہے۔ ہر طرف گھومتا پھرتا، پر اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھتا۔ جدھر میرے خلاف کوئی گل ہو، مجھے بتا دینا۔ میں راضی ہوگیا تو پھر انہوں نے مجھے دوجا کام بتایا۔ یہ کام جنگل میں ڈاکوؤں کے ڈیرے پر پیغام لانے لے جانے کا تھا۔ میرے لیے اس میں بھی کوئی مشکل نہیں تھی اس لیے یہ بھی آرام نال کرنے لگا۔ چودھری صاحب جو کچھ دیتے تھے، وہ اپنی جگہ تھا... اور لوگ عقیدت سے جو تھما دیتے تھے، وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنی جگہ۔ میں نے اپنے گھر والوں کو برادری سے توڑ کر ادھر شہر آباد میں ہی بسا لیا۔ آپ نے مجھے جو رقم دی تھی، وہ میں نے اپنے گھر والوں کو پہنچا کر چودھری صاحب تک آپ کے پروگرام کی خبر پہنچا دی تھی۔ جواب میں انہوں نے مجھے آپ کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ اس حکم پر میں ڈر گیا، پر انکار کی بھی ہمت نہیں تھی۔ اگر میں انکار کرتا تو چودھری صاحب آپ سے پہلے میرا جنازہ اٹھنے کا بندوبست کر دیتے اسی لیے میں مان گیا، پر اپنی تو قسمت ہی خراب ہے۔ ایک طرف سے جان بچا کر نکلا تو دوسری طرف سے پکڑا گیا۔ آپ کی مرضی ہے کہ معافی دے دو یا سزا دے ڈالو۔''

وہ ایک بار پھر رونے والا ہو گیا لیکن وہ سادھو کی حالت سے زیادہ موجودہ حالات کے تجزیے میں الجھا ہوا تھا۔ یہ بات قطعی ناقابلِ فہم تھی کہ چودھری نے ڈاکوؤں کی مخبری کیوں کروائی۔ وہ تو اس کے پالتو پٹھو تھے جن سے ابھی کچھ عرصہ قبل اس نے شہریار کے بنگلے پر ڈاکے کا کام بھی لیا تھا۔ شاید ان ڈاکوؤں نے اس کی کوئی حکم عدولی کی تھی جس کی وجہ سے وہ بھڑک گیا اور کوشش کی تھی کہ ڈاکو پولیس کے ہاتھوں آپریشن میں مارے جائیں۔ یہ باغی ٹولہ ختم ہوتا تو وہ نئی بھرتیاں آرام سے کر سکتا تھا۔ نئے آنے والے ڈاکو بھی اس کے فرماں بردار ہوتے لیکن یہ سب تو بعد کی باتیں تھیں۔ شہریار کو تو فی الحال موجودہ صورتِ حال سے نمٹنا تھا۔

''ہم ڈیرے سے کتنی دور ہیں؟'' ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے سادھو سے دریافت کیا۔

''بہت دور ہیں۔ آپ کو اصل راستے سے بھٹکانے کے لیے میں جنگل میں ادھر اُدھر لے کر پھر رہا تھا، اس چکر میں ہم ڈیرے تک جانے والے راستے سے کافی دور نکل آئے ہیں۔'' اس نے شرمندہ سی آواز میں بتایا۔

''اوکے... جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب تم ہمیں کسی ایسے راستے سے لے کر جاؤ گے کہ ہم کم سے کم وقت میں ڈیرے تک پہنچ سکیں۔'' اس نے دوٹوک انداز میں سادھو کو حکم سنایا جسے ظاہر ہے اسے قبول ہی کرنا تھا۔ ڈیرے پر جانے کا فیصلہ ہو گیا تو وہ لوگ ایک بار پھر سفر کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اس بار وہ اور مشابرم خان دونوں ہی پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ محتاط تھے۔ ایک بار سادھو کے وار سے بچنے کے بعد وہ اسے دوبارہ کوئی موقع فراہم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ چودھری کے لیے کام کرنے والا یہ ڈھونگی سادھو کب دوبارہ اپنے ادھورے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر تل جاتا۔ دوبارہ شروع ہونے والا یہ سفر واقعی طویل ثابت ہوا لیکن انہیں یقین تھا کہ سازش کھل جانے کے بعد سادھو دوبارہ انہیں بھٹکانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ ان کا یہ یقین غلط نہیں تھا۔ گھنٹا بھر بعد ہی سنائی دینے والی فائرنگ کی آوازوں نے تصدیق کر دی کہ سادھو انہیں درست سمت میں لے کر جا رہا ہے۔ ان سے بہت پہلے نکلنے والی پولیس فورس یقینی طور پر ڈیرے تک پہنچ کر اس کا محاصرہ کر چکی تھی اور اب پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان کانٹے کا مقابلہ جاری تھا۔ سادھو کے علاوہ اب یہ آوازیں بھی ان کی راہ نما بن چکی تھیں۔ وہ ایک جوش کے عالم میں سفر کر رہے تھے۔ جوش کی اس کیفیت میں بھی وہ سادھو کی طرف سے بے خبر نہیں ہوئے تھے۔ خیر گزری اور اس نے مزید کوئی گڑبڑ نہیں کی۔

''بس اب یہاں سے ڈیرا تھوڑی ہی دور ہے۔ ہمیں اب اور آگے نہیں جانا چاہیے ورنہ ہم میں سے کسی کو گولی بھی لگ سکتی ہے۔'' کافی طویل سفر طے کرنے کے بعد سادھو نے ایک مقام پر اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ اس کا کہنا درست ہی لگ رہا تھا۔ اس مقام پر فائرنگ کی آواز اتنی بلند تھی کہ لگتا تھا ابھی چند گولیاں اس طرف آئیں گی اور انہیں چاٹ لیں گی۔ فائرنگ کی آواز سے صاف ظاہر تھا کہ دو گروہوں کے درمیان مقابلہ ہو رہا ہے۔ یقینی طور پر ڈاکو پولیس کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بجائے مقابلے پر اتر آئے تھے اور یہ مقابلہ کسی ایک فریق کے پسپائی اختیار کرنے تک جاری رہنا تھا۔ شہریار کے نزدیک پولیس فورس کی کامیابی کے امکانات زیادہ روشن تھے کیونکہ انہوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ ڈیرے پر چڑھائی کی تھی اور جدید اسلحے سے لیس تھے۔ اسلحے کی تو خیر ڈاکوؤں کے پاس بھی کوئی کمی نہیں ہوگی لیکن ان کی بے خبری میں ہونے والا یہ آپریشن پولیس فورس کو ان پر برتری دلانے میں اہم کردار ادا کر سکتا تھا۔ دوسری طرف سے وہ چودھری کی سازش کا بھی شکار ہوئے تھے۔ وجہ جو بھی رہی ہو لیکن حقیقت میں چودھری نے ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا اور برسوں کی دوستی کے بدلے میں آج خود انگلی پکڑ کر پولیس کو ان کی کمین گاہ تک لے آیا تھا۔ اگر چودھری کا یہ تعاون جو کہ اس نے سادھو کی صورت میں کیا تھا، شامل نہ ہوتا تو پولیس کو اس ٹھکانے تک پہنچنے میں ہی اچھا خاصا وقت لگ جاتا۔ اب وہ بالکل ناک کی سیدھ میں چلتی ہوئی وہاں پہنچی تھی اور آرام سے اپنی کارروائی شروع کر دی تھی۔ وہ لوگ جس جگہ کھڑے تھے، وہاں سے فائرنگ کی آوازوں کے ساتھ ساتھ پولیس والوں کی نقل و حمل بھی صاف محسوس ہو رہی تھی اور اس جگہ سے آگے جانا یقیناً رسکی ہو سکتا تھا لیکن وہ اتنا سفر طے کر کے صرف دور سے

تماشا دیکھنے تو نہیں آیا تھا۔ اسے اپنے طور پر بھی کچھ کرنا تھا چنانچہ سادھو کے مشورے پر کان دھرے بغیر اٹل لہجے میں بولا۔

''ہم یہاں نہیں رک سکتے۔ ہمیں آگے جانا ہے۔''

''ہم... مگر آگے خطرہ ہے۔'' سادھو خوف زدہ لہجے میں بولا۔

''یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے۔ ہم جس جگہ آئے ہیں اس کے بارے میں پہلے ہی سے جانتے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ڈاکوؤں کے ڈیرے پر جہاں پولیس آپریشن جاری ہے، خطرہ نہ ہو؟ ہمیں اسی خطرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آگے بڑھنا ہوگا اور یہ کام ہم تمہاری مدد سے کریں گے۔ تمہیں ہمیں کسی محفوظ راستے سے ڈیرے کے اندر تک پہنچانا ہوگا۔''

''ہم بیکار میں مارے جائیں گے صاحب! گولی کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ یہ کدھر کا بھی رخ کر لیتی ہے اور کسی کو بھی لمبا لٹا دیتی ہے۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔'' سادھو گھگھیایا۔

''اگر انکار کرو گے، تب بھی مارے جاؤ گے۔ ادھر سے چلنے والی گولیوں سے بچنے کا پھر بھی چانس ہے لیکن یہ گولی تو سیدھی تیرے بھیجے کو ہی اڑائے گی۔'' سادھو کی حجت بازی کا علاج کرنے کے لیے مشابرم خان نے رائفل کی نال اس کی پیشانی کے عین وسط میں ٹکا دی۔ موت سے ڈرنے والا وہ سادھو خوفناک رائفل کی نال اپنے ماتھے پر پا کر بادل ناخواستہ راضی ہو گیا۔ اس کی راہنمائی میں وہ ایک ایسی پگڈنڈی پر پہنچ گئے جو بہت واضح نہیں تھی اور کہیں کہیں سے راستہ بالکل ہی معدوم معلوم ہوتا تھا لیکن سادھو جس اعتماد سے اس راستے پر چل رہا تھا، اس سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس راستے کو بارہا استعمال کر چکا ہے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنتے وہ تینوں محتاط قدموں سے آگے بڑھتے رہے۔ اندھیرے میں انہیں کبھی کبھار پولیس والوں میں سے کسی کی جھلک نظر آ جاتی تھی لیکن ابھی تک کسی سے براہِ راست سامنا نہیں ہوا تھا۔ بعض گولیاں بھی ان کے بالکل قریب سے سنسناتی ہوئی گزریں اور ہر بار سادھو کا دم حلق میں آ گیا لیکن مشابرم خان نے اسے رکنے نہیں دیا۔ وہ بے جگر آدمی تھا اور شہریار کا ساتھ نبھاتے ہوئے اسے اس بات کی قطعی فکر نہیں تھی کہ خود اس کی اپنی جان بھی خطرے میں تھی۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور سنسناہٹ کے کسی قدر عادی ہوتے وہ آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک کان پھاڑ دھماکے نے ان کے قدموں کو لرزا دیا۔ پہلے ہی سے خوف زدہ سادھو اس دھماکے کے اثر سے زمین پر گر گیا۔

''شاید ڈاکو محاصرہ توڑنے کے لیے ہینڈ گرینیڈ استعمال کر رہے ہیں۔'' اس نے خود کو سنبھال کر دھماکے کی آواز سے فاصلے کا تعین کرتے ہوئے تبصرہ کیا جس کے جواب میں مشابرم خان نے اپنے سر کو تائیدی جنبش دی۔

''میں اب اور آگے نہیں جاؤں گا صاحب۔'' زمین پر گرے خوف زدہ سادھو نے روہانسی آواز میں دہائی دی۔ وہ اس کی آواز پر کان دھرتے اس سے قبل فضا پے در پے دھماکوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ ان دھماکوں کے ساتھ ہی کسی مقام پر آگ بھڑک اٹھی اور ماحول قدرے روشن ہو گیا۔

''یہ احمق کیا کر رہے ہیں۔ اس طرح تو بہت زیادہ لوگ مارے جائیں گے اور جنگل الگ تباہ ہوگا۔'' یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ دھماکے پولیس کی کارروائی کا نتیجہ ہیں، وہ زور سے بولا اور اس سمت میں بھاگ کھڑا ہوا جہاں اسے پولیس والوں کی موجودگی واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ مشابرم خان بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی دوڑا تھا۔ سادھو کو انہوں نے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ نہتا ہونے کی وجہ سے وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا بلکہ اس کی پہلی کوشش یہی ہوگی کہ کسی طرح اپنی جان بچا کر یہاں سے فرار ہو جائے۔

''ہینڈز اَپ۔'' وہ دونوں جیسے ہی پولیس والوں کے قریب پہنچے، کئی رائفلیں ان کی طرف اٹھ گئیں۔

''فرینڈز۔'' شہریار نے بلند آواز میں بتایا۔

''کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟'' اس سے سخت لہجے میں پوچھا گیا۔

''یہ میں ڈی ایس پی منظور کو بتاؤں گا۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔'' اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''ارے یہ تو اپنے اے سی صاحب ہیں۔'' اس اثنا میں کسی نے اسے شناخت کر لیا اور حیرت بھرے لہجے میں انکشاف کیا۔ شناخت کر لیے جانے کے بعد سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ اس کی فرمائش پوری نہ کی جاتی۔ اسے اور مشابرم خان کو ڈی ایس پی منظور کے پاس پہنچایا گیا۔ اس آپریشن کو وہی لیڈ کر رہا تھا اور اس کے چہرے پر موجود چمک بتا رہی تھی کہ وہ کامیابی کے قریب ہے۔ دوسری طرف سے ہونے والی فائرنگ میں واضح کمی بھی اس کی کامیابی کا اعلان کر رہی تھی۔ چند لمحوں قبل جو زوردار دھماکے سنائی دیے تھے، انہوں نے پولیس کی اس برتری میں یقیناً بڑا کردار ادا کیا تھا۔

''آپ یہاں سر؟'' ڈی ایس پی منظور اسے اپنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

سامنے پاکر سخت حیران ہوا۔

''ہاں، مجھے یقین تھا کہ تم کوئی نہ کوئی حماقت ضرور کرو گے اس لیے میں خود اس آپریشن کی نگرانی کے لیے یہاں آیا ہوں۔ اس آپریشن کے لیے تمہارا انتخاب میری سفارش پر ہوا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری وجہ سے مجھے کوئی شرمندگی اٹھانی پڑے۔'' اس نے سختی سے جواب دیا۔

''آپ کو خود کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے تھا سر! ہم کامیابی کے بالکل قریب ہیں۔ ایک دو راکٹ لانچر مزید فائر کریں گے تو ان سب کا قیمہ بن جائے گا۔'' اس نے جوش سے بتایا اور ساتھ ہی مزید راکٹ لانچر فائر کرنے کا حکم دینے لگا۔

''رک جاؤ احمق! وہاں صرف ڈاکو نہیں ہیں۔ وہاں کچھ مغویوں کی موجودگی کی بھی اطلاع ہے۔ کیا تمہیں اس سلسلے میں بریفنگ نہیں دی گئی تھی؟'' وہ غصے سے بولا تو ڈی ایس پی منظور کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نظر آئے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ اہم بات فراموش کر چکا تھا۔

''مجبوری تھی سر! اگر ہم انہیں جواب نہیں دیتے تو وہ ہینڈ گرنیڈز کی بارش کرتے ہوئے یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے۔ اس وقت ہماری حکمتِ عملی نے ان کے قدم اکھاڑ دیے ہیں اور وہ پسپا ہونے والے ہیں۔'' اس کے پاس اپنے عمل کا جواز موجود تھا۔

''اور اگر ڈاکوؤں کے پسپا ہونے تک یہ جنگل ہی تباہ ہو گیا تو پھر... کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ یہاں بھڑکنے والی آگ کتنے بڑے نقصان کا سبب بنے گی؟'' اس کا غصہ مزید بڑھا۔ ملکی املاک اور افراد کی سلامتی کے لیے وہ ویسے ہی بڑا حساس تھا اور یہاں تو معاملہ ہی الگ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ڈاکوؤں کے اس ڈیرے پر ماہ بانو بھی موجود ہے بلکہ ماہ بانو کی وہاں موجودگی ہی تو اسے یہاں کھینچ کر لائی تھی ورنہ اس قسم کے کسی آپریشن میں دخل دینا اس کے فرائضِ منصبی میں شامل نہیں تھا۔ اس نے اگر اپنی حدود سے تجاوز کیا تھا تو صرف ماہ بانو کی وجہ سے اور یہاں جس انداز میں کارروائی کی جا رہی تھی، اس سے ماہ بانو کی سلامتی کو شدید خطرہ تھا۔ آگ اور بارود کے کھیل میں کچھ پتا نہیں چلتا کہ کون زد میں آ جائے۔ یہ کھیل ظالم و مظلوم دونوں کے لیے یکساں خطرناک ہوتا ہے۔ اگر ماہ بانو کو کچھ ہو جاتا تو وہ زندگی بھر خود کو معاف نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ آپریشن شروع ہی اس کے ایما پر ہوا تھا۔

''اس آپریشن کو شروع کرنے سے پہلے... یہ خدشہ تو ذہنوں میں تھا ہی سر! اس لیے ہم اس سلسلے میں انتظامات کر کے چلے تھے۔ اللہ نے چاہا تو ہماری کارروائی کے نتیجے میں کوئی بڑا نقصان نہیں ہوگا۔ ویسے آپ اطمینان رکھیے کہ اب ہم مزید راکٹ لانچر یا ہینڈ گرنیڈز استعمال نہیں کریں گے۔ آپ فائرنگ کی آواز پر غور کریں تو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ دوسری طرف سے فائرنگ میں واضح کمی ہوئی ہے۔ یقیناً اب وہاں ہمارا مقابلہ کرنے کے لیے بہت کم لوگ رہ گئے ہیں۔ میں میگافون پر اعلان کرواتا ہوں کہ باقی بچ جانے والے افراد اگر ہتھیار ڈال دیں تو انہیں مکمل قانونی تحفظ فراہم کیا جائے گا۔'' اس کے اعتراضات کے جواب میں اس کی تشفی کروا کر ڈی ایس پی منظور اپنے کسی ماتحت کی طرف رخ موڑ گیا اور اسے ہدایات دینے لگا۔

شہریار کے ساتھ اس کی مکالمے بازی کے دوران بھی کسی ماتحت اس کی ذمے داری سنبھالے ہوئے تھا۔ ذرا دیر میں میگافون پر اعلان کیا جانے لگا۔ اعلان کئی بار دہرایا گیا اور ڈاکوؤں کی یقین دہانی کے لیے پولیس کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ موقوف کر دیا گیا۔ اس حکمتِ عملی کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور ڈاکوؤں کی طرف سے کی جانے والی جوابی فائرنگ کی آوازیں بھی آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی گئیں۔ اس خاموشی کا مطلب تھا کہ وہ لوگ گرفتاری دینے پر آمادہ ہیں۔ عرصہ دراز سے ترقی کے خواہاں ڈی ایس پی منظور کا چہرہ اس بدلتی ہوئی صورتِ حال پر خوشی سے چمکنے لگا۔ اتنی بڑی کامیابی اس کے کریڈٹ پر آ جانے کے بعد کوئی اس کی ترقی کو نہیں روک سکتا تھا۔ ترقی اور انعام ملنے کے ساتھ میڈیا پر اس کی جو ''واہ واہ'' ہوتی، وہ اپنی جگہ تھی۔ یقینی طور پر اس وقت وہ خود کو ایک ہیرو تصور کر رہا تھا۔ یہ اور بات کہ اسے یہ ہیروشپ دلانے میں ان تیاریوں کا بڑا ہاتھ تھا جو اس آپریشن کے آغاز سے قبل کی گئی تھیں۔ آئی جی مختار مراد نے اس آپریشن کے لیے اسلحے سے لے کر افرادی قوت تک سب کچھ بڑے پیمانے پر فراہم کیا تھا۔ یہ ڈی ایس پی منظور کی خوش قسمتی تھی کہ اس مہم کے لیے اس کا چناؤ کیا گیا تھا۔

آخرکار ہاتھ سر سے اوپر بلند کیے پہلا ڈاکو نمودار ہوا۔ وہ قطعی غیر مسلح تھا۔ اس کے سامنے آتے ہی اسے فوراً ہی گرفتار کر کے ہتھکڑی لگا دی گئی۔ پھر تو جیسے سلسلہ ہی بن گیا۔ وہ کل آٹھ ڈاکو تھے جنہوں نے پولیس کو گرفتاری پیش کی تھی۔ گرفتاری کا یہ عمل مکمل ہونے تک سورج کی پہلی کرن نمودار ہو گئی۔ اس کرن کے نمودار ہونے کے ساتھ گرفتار شدہ ڈاکوؤں کو پولیس کی ایک ٹیم کے ساتھ روانہ کر دیا گیا جبکہ دوسری ٹیم تمام تر حفاظتی تدابیر کے ساتھ ڈیرے کی تلاشی لینے کے لیے میدان میں اتر پڑی۔ اس ٹیم کے افراد کا پوری طرح چوکس

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہنا اس لیے ضروری تھا کہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ کہیں کوئی ڈاکو چھپا بیٹھا ہو اور اچانک ہی حملہ کردے۔ تیسری ٹیم کو ڈیرے کے اردگرد کے علاقے میں سرچ آپریشن کرنا تھا تاکہ اگر کوئی ڈاکو ڈیرے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہو تو اسے بھی گرفتار کیا جاسکے۔

شہریار اور مشاہرم خان دوسری ٹیم کے افراد کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس موقع پر اسے ڈی ایس پی منظور نے روکنے کی کوشش کی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ شہریار کو کوئی نقصان نہ اٹھانا پڑے لیکن وہ کسی طور رکنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ گرفتاری دینے والے ڈاکوؤں کے ساتھ ماہ بانو ڈیرے سے باہر نہیں آئی تھی اور ڈاکوؤں نے اس کے بارے میں کوئی خبر بھی نہیں دی تھی چنانچہ وہ خود اسے تلاش کرنا چاہتا تھا۔ ڈی ایس پی منظور بھی اسی ٹیم کے ساتھ تھا۔ اس کی قیادت میں ڈیرے کی تلاشی کا عمل شروع ہوا تو کئی لاشیں اور زخمی سامنے آئے۔ زخمی ہونے والوں میں ایک موٹی عورت بھی شامل تھی اور وہ اس ڈیرے پر واحد نسوانی وجود ثابت ہوئی تھی۔ اس عورت کے پیٹ میں گولی لگی تھی اور اس کی حالت کافی نازک تھی۔ اس سے ڈیرے پر مزید عورتوں کی موجودگی کے بارے میں استفسار کیا گیا تو اس نے اعتراف کیا کہ ڈیرے پر .... للی نام کی ایک لڑکی کے علاوہ حال میں ہی اغوا کرکے لائی جانے والی ماہ بانو بھی موجود تھی لیکن آپریشن شروع ہونے کے بعد جب ڈیرے پر بھگدڑ مچی اور اس نے ان دونوں خواتین کے ساتھ مل بیٹھنے کی کوشش کی تو اسے ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں مل سکی۔ ان کے نہ ملنے پر اس نے یہی گمان کیا کہ بھگدڑ میں وہ دونوں ادھر ادھر ہو گئی ہیں لیکن پولیس کو پورا ڈیرا چھان مار لینے کے باوجود وہ دونوں کہیں نہیں ملی تھیں جس پر یہی تصور کیا گیا کہ وہ دونوں کسی طرح وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔ اب ان کے ملنے کا واحد امکان یہی تھا کہ وہ ڈیرے کے اردگرد سرچ آپریشن کرنے والوں میں سے کسی کو مل جاتیں۔ فی الحال تو شہریار کو شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ جس کے لیے یوں کسی بھی شے کی پروا کیے بغیر یہاں تک دوڑا آیا تھا، وہی غائب تھی۔ دن چڑھے جب وہ تھکا ماندہ جنگل سے واپس لوٹ رہا تھا تو بے حد خاموش تھا۔ قسمت ایک بار پھر اسے دھوکا دے گئی تھی اور وہ تمام تر کوشش کے باوجود ماہ بانو کو نہیں پاسکا تھا۔ شاید کہ اس گل بدن کو پانا اس کے نصیب میں ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

"آفتاب! میری امید...؟" وہ دونوں نرس شبانہ کی کزن نازیہ کے ساتھ حیدرآباد چلے آئے تھے۔ حالات ایسی نہج پر آگئے تھے کہ ان کا مزید میرپور خاص میں رکنا ممکن نہیں تھا۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ چودھری کے جن گرگوں نے اسپتال پر حملہ کیا تھا، وہ ان کی تلاش میں اس گھر تک بھی ضرور پہنچے ہوں گے جہاں ان کی رہائش تھی۔ چودھری کے گرگوں کے تیور دیکھنے کے بعد ان کا میرپور خاص میں ہی رکے رہنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ وہ اگر کسی دوسری جگہ چھپتے بھی تو چھوٹا شہر ہونے کی وجہ سے جلد دھر لیے جاتے۔ چودھری کے گرگے کھوجی کتوں کی طرح ہر جگہ ان کی بو سونگھتے پھرتے۔ میرپور میں ہی رکے رہنا خود کو چوہے دان میں پھنسانے کے مترادف تھا۔ وہاں ان کے پاس کوئی ایسا قابل ذکر ٹھکانا بھی نہیں تھا کہ جہاں وہ طویل عرصے تک رکے رہتے۔ اس لیے سب سے زیادہ مناسب یہی تھا کہ اس سے قبل کہ شہر سے نکاسی کے راستے پر چودھری کے گرگے ڈیرا ڈالتے؛ وہ وہاں سے نکل جاتے۔ اچھی بات یہ تھی کہ میرپور والے گھر میں ان کا کوئی ایسا سامان نہیں تھا جس کے ہاتھ سے نکل جانے سے کسی بڑے نقصان کا احساس ہوتا۔ وہ پہلے ہی بہت کم ساز و سامان کے ساتھ وہاں رہ رہے تھے۔ ضروری کاغذات، شناختی کارڈ، اے ٹی ایم و کریڈٹ کارڈز اور رقم جیسی ضروری چیزوں کو حالات کے پیش نظر آفتاب نے ہمہ وقت اپنے ساتھ رکھنے کی عادت بنالی تھی اور اس وقت بھی یہ ساری ضروری چیزیں اس کی قمیص کے نیچے پوشیدہ بیگ میں محفوظ اس کے سینے سے لگی ہوئی تھیں۔ زیر تصنیف ناول کا مسودہ وہ پہلے ہی پبلشر کو بھجوا چکا تھا۔ اپنی خواہش کے مطابق وہ بیٹی کی پیدائش سے قبل ناول چھپوانے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا لیکن مسودہ تقریباً تیار تھا جسے وصول کرکے پبلشر نے اس کی ساکھ کی بنیاد پر پیشگی چیک بھی دے دیا تھا۔ گھر پر اس کی اگر کوئی خاص شے رہ گئی تھی تو وہ ایک آدھ ادھورا کام تھا۔ اس کے علاوہ باقی استعمال کے سامان کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔ وہ چیزیں ضرورت کے مطابق مزید خریدی جاسکتی تھیں، بس اصل مسئلہ ان کی نوزائیدہ بیٹی امید کا تھا۔ وہ افراتفری میں اسے اسپتال کی نرسری میں ہی چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے تھے لیکن اس سلسلے میں بھی ان کے پاس ایک مضبوط دلاسا موجود تھا۔ نرس شبانہ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ بچی کو اپنی تحویل میں لے کر کسی نہ کسی طرح ان تک پہنچا دے گی اور اب وہی ان کی امیدوں کا مرکز تھی۔ حیدرآباد پہنچ کر انہوں نے نازیہ کو کسی مشکل میں ڈالنا پسند نہیں کیا تھا اور شکریے کے ساتھ اس سے الگ ہو کر درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں آٹھہرے تھے۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر

اس نے کشور کو بستر پر لٹایا تو اس کے ہونٹوں سے پہلا سوال اپنی بیٹی کی بابت نکلا۔ راستے میں بھی یقیناً وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی لیکن زبان سے کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔ اس کے اس ضبط کا بندھن اگر ٹوٹا بھی تھا تو بس اسی حد تک کہ وقفے وقفے سے اس کی آنکھیں بار بار چھلک پڑتی تھیں مگر اب جبکہ وہ ایک محفوظ ٹھکانے پر موجود تھے تو اس میں مزید برداشت کا یارا نہیں رہا تھا چنانچہ سوال اس کے لبوں پر آگیا تھا۔

"آپ فکر نہیں کریں۔ میرے پاس شبانہ کا نمبر ہے۔ میں ابھی اسے فون کرکے امید کے بارے میں پوچھتا ہوں۔ آپ اس دوران ریلیکس کریں۔ انشاء اللہ جلد ہماری بچی ہمارے پاس ہوگی۔" آفتاب نے اسے دلاسا دیا اور خود فون کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا۔ خود اس کا موبائل تو بھاگ دوڑ میں کہیں گر گیا تھا اور وہ ایک بار پھر رابطوں سے محروم خالی ہاتھ تھا۔ اگر اس کے پاس موبائل ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ شبانہ از خود فون کرکے اسے امید کے بارے میں خبر دے دیتی لیکن اب تو ہر صورت میں اسے ہی رابطہ کرنا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر سیڑھیاں طے کرکے ہوٹل کی نچلی منزل پر پہنچا۔ یہاں ریسپشن پر فون کرنے کی سہولت تھی لیکن اس نے ہوٹل کے فون کو استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ پہلے ایک بار سنگین غلطی کر چکا تھا اور نتیجے میں اپنے محفوظ ٹھکانے سے محروم ہو گیا تھا چنانچہ اب کسی بداحتیاطی کی قطعی گنجائش نہیں تھی۔ میرپور خاص سے حیدرآباد تک کا راستہ طے کرنے میں وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ چودھری کے گرگے اس کی کس غلطی کی وجہ سے اسپتال تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یقینی طور پر چودھری کو کوریئر کے ذریعے بھیجا جانے والا خط اسے ان کا سراغ دے گیا تھا اور اس نے فوراً اپنے گرگوں کو اسپتال پر چڑھا دیا تھا۔ لفظوں کی دنیا سے تعلق رکھنے والے آفتاب کی ہر خوش امیدی چودھری کے اس ردعمل کے بعد دم توڑ گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ نواسی کی اطلاع پاکر چودھری کا دل نرم ہو جائے گا اور وہ بے شک کشور کو دوبارہ اپنانے پر راضی نہیں ہو سکے گا لیکن اس حد تک تو ضرور نرم پڑے گا کہ اس کا پیچھا کرنا چھوڑ کر انہیں ان کی دنیا میں سکون سے رہنے دے گا... مگر اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ چودھری کی فطرت سانپ کی سی ہے جو اپنے ہی انڈوں اور بچوں کو ہڑپ کر ڈالتا ہے۔ اب وہ آئندہ اس سے بے انتہا محتاط رہنا چاہتا تھا چنانچہ ہوٹل سے نکل کر کافی دور تک پیدل چلتا چلا گیا اور پھر ایک پبلک کال آفس نظر آنے پر اس کا رخ کرلیا۔ اس کی خواہش پر وہاں موجود لڑکا اٹھ کر باہر چلا گیا اور اسے نمبر ملانے اور بات کرنے کی مکمل آزادی دے دی۔ کال چارجز کی اسے اس لیے فکر نہیں ہوگی کہ بعد میں یونٹ چیک کرکے وہ آرام سے اس سے چارجز وصول کرسکتا تھا۔ لڑکے کے باہر نکلنے کے بعد اس نے شبانہ کا دیا ہوا فون نمبر جیب سے نکالا اور اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین گھنٹیوں کے بعد شبانہ نے اس کی کال وصول کرلی۔

"ہیلو، کون بات کر رہا ہے؟" آواز سے وہ کچھ خوف زدہ اور بجھی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"مس شبانہ! میں آفتاب احمد بات کر رہا ہوں۔ مجھے آپ سے اپنی بچی کے بارے میں پوچھنا تھا۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ بچی کو اسپتال کی نرسری سے نکال کر مجھ تک پہنچانے میں مدد کریں گی۔ میں آپ سے یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں کوئی پیش رفت ہو سکی یا نہیں؟" وہ اپنی بچی کی طرف سے اتنا زیادہ متفکر تھا کہ شبانہ کی خیریت دریافت کرنے یا کسی دوسری رسمی گفتگو میں الجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور براہ راست اپنے مطلب پر آگیا۔

"سوری آفتاب صاحب! میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتی۔" اس کو دوسری طرف سے شبانہ کا جو جواب سننے کو ملا، اسے سن کر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ تو وہی معاملہ تھا کہ جن پر تکیہ تھا، وہی پتے ہوا دینے لگے۔ تعاون کا بھرپور یقین دلانے والی شبانہ یوں صاف انکار کر ڈالے گی، اس کی تو اسے ذرا امید نہیں تھی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مس شبانہ؟ ہم نے تو آپ کے بھروسے پر آپ کا مشورہ قبول کرتے ہوئے شہر چھوڑا تھا۔" وہ کوشش کے باوجود اپنے لہجے میں غصے کی جھلک نمودار ہونے سے نہیں روک سکا۔

"میں مجبور ہوں آفتاب صاحب ورنہ یقین جانیے کہ مجھے خود آپ کی مدد کرکے دلی خوشی ہوتی۔" شبانہ کی آواز رندھ گئی۔

"میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ مسئلہ کیا ہے؟ وہاں سب خیریت تو ہے نا؟" اس کا غصہ فوری طور پر گہری تشویش میں ڈھل گیا۔

"نہیں، یہاں بالکل بھی خیریت نہیں ہے۔ میں بہت شرمندہ ہوں آفتاب صاحب کہ میں آپ کو ایک بری خبر سنانے جارہی ہوں۔" شبانہ کے الفاظ پر اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ یقیناً صورت حال اتنی گمبھیر تھی کہ شبانہ کو تمہید باندھنی پڑ رہی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"میں سن رہا ہوں مس شبانہ! جو بھی بات ہے، آپ مجھے کھل کر بتا دیں۔" آخر اس نے اپنا تمام تر حوصلہ مجتمع کرتے ہوئے شبانہ سے پوچھا۔

"آپ لوگوں کے نکلنے کے بعد آپ کے پیچھے آنے والے غنڈے بھی اسپتال سے فرار ہو گئے تھے۔ کسی نے پولیس کو اطلاع کر دی تھی اس لیے انہیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ میں منتظر تھی کہ پولیس والے آئیں تو میں موقع دیکھ کر بچی کو نرسری سے نکال لوں لیکن میرے کچھ کرنے سے پہلے ہی ڈاکٹر کرمانی نے مجھے کال کر لیا۔ انہوں نے مجھ سے ساری صورتِ حال معلوم کی۔ مجھے جس حد تک معلوم تھا، میں نے انہیں بتا دیا۔ ساری بات سن کر بھی انہیں یہ بات پسند نہیں آئی کہ میں نے اسپتال کے عملے میں شامل ہوتے ہوئے اس قسم کی کسی سرگرمی میں حصہ لیا۔ انہوں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں فوری طور پر اپنا استعفا لکھ کر ان کے حوالے کر دوں ورنہ دوسری صورت میں وہ اس ساری سچویشن میں میرے کردار سے پولیس کو آگاہ کر دیں گے۔ پولیس والوں کو تو آپ جانتے ہیں۔ مجھ جیسی تنہا لڑکی ان کی تفتیش کا سامنا کرنے کی قطعی ہمت نہیں کر سکتی تھی چنانچہ میں نے اپنا استعفا لکھ کر ڈاکٹر کرمانی کے حوالے کر دیا۔ استعفا دیتے وقت میں نے سوچا تھا کہ میں اسٹاف میں موجود اپنی کسی دوست کے ذریعے آپ کی بچی کو نرسری سے نکلوا لوں گی لیکن میرے کچھ کرنے سے پہلے ہی وہ ناخوش گوار واقعہ پیش آ گیا۔" بہت روانی سے سب کچھ بتاتی شبانہ اس مرحلے پر آ کر ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔

"کیسا واقعہ؟ میری بیٹی تو خیریت سے ہے نا مس شبانہ؟" اس کے رکنے پر آفتاب نے بے تابی سے پوچھا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی لیکن میری دعا ہے کہ وہ جہاں ہو خیریت سے ہو۔"

"کیا مطلب؟ کیا امید اسپتال کی نرسری میں نہیں ہے؟" شبانہ کے جواب نے اسے بری طرح چونکا دیا اور اس نے تقریباً چیخنے والے انداز میں اس سے پوچھا۔

"آئی ایم سو سوری سر! میں آپ سے وعدہ کرنے کے باوجود آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکی۔ آپ کی بچی میرے کچھ کرنے سے قبل ہی نرسری سے پُراسرار طور پر غائب ہو گئی ہے۔ یہاں اسپتال میں بچی کے غائب ہونے کی وجہ سے ایک ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ اسٹاف سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ مجھے خود پولیس والوں کی تفتیش کا سامنا کرنا پڑا ہے۔" شبانہ نے اس کے کانوں میں کوئی صور پھونکا تھا۔ وہ بچی کے اس پُراسرار غیاب کے پیچھے موجود ہاتھوں سے واقف تھا۔ جو لوگ کھلے عام اسپتال پر چڑھائی کر کے ان تک پہنچنے کی کوشش کر سکتے تھے، ان کے لیے ایک بچی کو غائب کر لینا کیا مسئلہ تھا لیکن خود اس کی حالت تو یہ خبر سن کر تباہ ہونے لگی تھی۔ اپنی بیٹی کے ایک خون آشام بھیڑیے کی گرفت میں چلے جانے کا سوچ کر اس کا کلیجا منہ کو آنے لگا تھا۔

"یقین کریں آفتاب صاحب! مجھے اس بات کا دلی افسوس ہے اور اگر میں اب بھی آپ کے لیے کچھ کر سکی تو ضرور کروں گی۔" دوسری طرف سے شبانہ پورے خلوص سے کہہ رہی تھی۔

"شکریہ مس شبانہ! مجھے آپ کے خلوص پر کوئی شک نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ آپ یقیناً بے بس ہو گئی ہوں گی۔ ہمارا دشمن ہے ہی اتنا خطرناک کہ میں اچھے خاصے تعلقات رکھنے کے باوجود اس کے مقابلے میں خود کو کمزور پا رہا ہوں بلکہ مجھے سخت افسوس ہے کہ ہماری خاطر آپ اپنی اچھی بھلی ملازمت سے محروم ہو گئیں۔ میں اپنی خاطر آپ کو مزید کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا اور نہ ہی کسی ایسے کام کا کہنا چاہتا ہوں جو آپ کے لیے کسی تکلیف کا باعث بنے۔ ہاں اگر ہو سکے تو آپ تک اس سلسلے میں کوئی خبر پہنچے تو وہ مجھے بھی پہنچا دیں۔ میں آپ کو اس ہوٹل کا فون نمبر دے دیتا ہوں جہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جب تک ہم یہاں ہیں، آپ اس نمبر پر مجھے اطلاع دے سکتی ہیں۔ بعد میں، میں آپ کو اپنا کوئی مستقل رابطہ نمبر دے دوں گا۔"

اس نے خود کو مجتمع کرتے ہوئے شبانہ سے یہ سب کچھ کہا۔ شبانہ کے خلوص اور تعاون کا معترف ہونے کے باوجود وہ اس حقیقت سے آشنا نہیں تھا کہ اس یکہ و تنہا لڑکی کے دل میں چپکے سے اس کی محبت کا پھول کھل اٹھا ہے... اور جو محبت کرتے ہیں، انہیں کب اپنے محبوب کا کوئی کام زحمت یا مشقت لگتا ہے۔ محبت کرنے والوں کے لیے تو اپنے محبوب کے لیے اٹھائی جانے والی ہر مشکل اور پریشانی رحمت اور کیف آگیں ہوتی ہے۔ شبانہ بھی اگر اس کے لیے کچھ کر پاتی تو دلی خوشی محسوس کرتی چنانچہ اس کی پُرتکلف باتیں اور معذرتی انداز سن کر تڑپ اٹھی اور نہایت رقت سے بولی۔

"آپ بلاوجہ تکلف سے کام لے رہے ہیں آفتاب صاحب! یقین جانیے کہ اگر میں آپ کے کسی کام آ سکی تو مجھے خود دلی خوشی محسوس ہو گی۔ رہی ملازمت جانے کی بات تو مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں ہے میرے پاس نرسنگ کی تعلیم اور تجربہ ہے۔ کسی اور جگہ کوشش کروں گی تو آرام سے ملازمت مل جائے گی۔ ڈاکٹر کرمانی نے مجھ سے جبری استعفا ضرور لکھوایا ہے لیکن ساتھ ہی یہ مہربانی بھی کی ہے کہ میرا نام بدنام نہیں ہونے دیا۔ میرا سروس ریکارڈ بے داغ ہے اس لیے مجھے چند دن ملازمت کی تلاش میں گزارنے کے سوا کوئی دوسری پریشانی نہیں اٹھانی پڑے گی... اور ملازمت کی مجھے اتنی جلدی نہیں ہے۔ برسوں سے کام کر رہی ہوں۔ اچھا ہے اس بہانے کچھ دن کا ریسٹ مل جائے گا۔"

"شکریہ مس شبانہ! آپ نے میرے دل کا بوجھ کافی حد تک کم کر دیا۔ اچھا، اب مجھے اجازت دیجیے اور پلیز جیسے ہی کوئی اطلاع ملے مجھے کال کر دیجیے گا۔" اس نے شبانہ کو ہوٹل کا ٹیلی فون نمبر، اپنا کمرا نمبر اور وہ نام لکھوایا جو اس نے کمرے کے حصول کے لیے ہوٹل کے رجسٹر میں درج کروایا تھا۔ فون بند کر کے وہ اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔ امید کا نرسری سے غائب ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ باپ ہونے کے ناتے وہ اس خبر کو سن کر بری طرح تڑپ اٹھا تھا۔ دوسری طرف اسے کشور کی بھی فکر تھی۔ اس کے لیے تو یہ خبر بہت ہی ہولناک ثابت ہوتی۔ وہ پہلے ہی بچی کے لیے تڑپ رہی تھی، اگر جو یہ پتا چلتا کہ بچی لاپتا ہو گئی ہے تو جانے اس کا کیا حال ہوتا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو سکا، کشور سے یہ اندوہناک خبر چھپا کر رکھے گا اور اپنے طور پر امید کی بازیابی کے لیے کوشش کرتا رہے گا۔ ابھی تو اسے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس مسئلے کو کیسے سلجھائے؟ اس کے پاس ایک تدبیر تو یہ تھی کہ اپنی صحافی برادری سے مدد کی درخواست کرے لیکن وہ لوگ تحریر اور تقریر کی مدد سے شور مچانے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ چودھری نے بچی کو اغوا کروا کر جانے کہاں رکھا ہو گا۔ پولیس میں تو اتنا دم بھی نہیں تھا کہ اس کی حویلی کا محاصرہ کر کے خانہ تلاشی ہی کر سکے۔ اگر کسی طرح یہ کام ہو بھی جاتا تو اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ بچی کو حویلی میں ہی رکھا گیا ہو گا۔ چودھری کے پاس دسیوں ٹھکانے تھے، وہ بچی کو کہیں بھی رکھ سکتا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ کشور سے محبت کا تعلق جڑنے کے بعد وہ بارہا مشکل کا شکار ہوا تھا۔ بعض اوقات جان پر بھی بن گئی تھی لیکن اب جو ہوا تھا، وہ سب سے سوا تھا کیونکہ معاملہ اپنی اولاد کا تھا اور اولاد سے آدمی اپنی جان سے بڑھ کر پیار کرتا ہے۔ جان سے پیاری چیز ہاتھ سے نکل جانے پر کسی شخص کی جو حالت ہو سکتی تھی، وہ اس وقت اس کی بھی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ہر سمت گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔

"کیا بات ہے جناب! کیا آپ کا نمبر نہیں ملا؟" پی سی او والا لڑکا جو باہر کھڑا شیشے کے دروازے سے اندر دیکھ رہا تھا، اسے کافی دیر سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے دیکھ کر اندر آیا اور اس سے دریافت کیا۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ اس دوران کوئی اور شخص فون کرنے وہاں نہیں آیا تھا ورنہ وہ پہلے ہی اندر آ کر اسے ٹوک دیتا۔

"نمبر مل گیا تھا لیکن مجھے ابھی ایک کال اور کرنی ہے۔ تم تھوڑی دیر انتظار کر لو پھر میں ایک ساتھ تمہیں دونوں کالز کے چارجز ادا کر دوں گا۔" اس کی مداخلت پر آفتاب چونکا اور پھر ذہن میں یکدم ہی ابھرنے والے ایک خیال کے تحت بولا۔

"پیسوں کی بات نہیں ہے بھائی صاحب! میں اس لیے فکرمند ہو گیا تھا کہ آپ مجھے کچھ پریشان لگ رہے تھے۔" لڑکے نے خلوص سے کہا اور پھر یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ "آپ آرام سے بات کرو، میں باہر کھڑا ہوں۔" اس کے باہر نکل جانے کے بعد آفتاب شہریار کے دفتر کا نمبر ملانے لگا۔ موبائل ہاتھ سے نکل جانے کے باعث کئی ضروری فون نمبرز بھی اس سے مس ہو گئے تھے لیکن شہریار کے دفتر کا نمبر اسے زبانی یاد تھا اس لیے آرام سے ڈائل کر لیا۔

"اے ڈی صاحب تو آج ابھی تک دفتر نہیں آئے ہیں۔ آپ اپنا میسج نوٹ کروا دیں، وہ آئیں گے تو میں انہیں کنوے کر دوں گا۔" شہریار سے بات کروانے کی فرمائش پر دوسری طرف سے اسے یہ جواب سننے کو ملا تو اس کو مایوسی کا احساس ہوا۔ شہریار اس کے لیے ہمیشہ ہی بہت مہربان ثابت ہوا تھا اس لیے موجودہ حالات میں اس کا ذہن اسی کی طرف گیا تھا کہ شاید وہ امید کی تلاش کے سلسلے میں اس کی کچھ مدد کر سکے۔ یہ خیال اس لیے بھی آیا تھا کہ شہریار تو پہلے ہی چودھری کے خلاف سرگرم رہتا تھا۔ وہ اپنے مسئلے کے لیے اس سے مدد مانگتا تو وہ ہر حال میں اس کی مدد کی کوشش کرتا۔

"آپ انہیں بس اتنا بتا دیجیے گا کہ اے اے مشا کا فون آیا تھا۔ بعد میں، میں خود ان سے رابطہ کر لوں گا۔" اس نے اپنے قلمی نام کے حوالے سے پیغام نوٹ کروایا اور سلسلہ منقطع کر کے شیشے کے دروازے کے پار نظر آنے والے لڑکے کو اشارہ کر کے اندر بلایا۔ لڑکے کو کال چارجز ادا کر کے وہ پی سی او سے باہر نکلا تو یوں محسوس کر رہا تھا جیسے ایک ایک قدم من من بھر کا ہو گیا ہو۔ ہوٹل کا رخ کرنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کشور کا سامنا کرنے سے ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن زندگی کے اور بہت سارے امتحانوں کی طرح اس امتحان کا سامنا بھی کرنا ہی تھا، چنانچہ اپنے شکستہ وجود کو سنبھالتے ہوئے وہ اس امتحان سے گزرنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

بوجھل قدموں سے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

''ڈی ایس پی منظور کی کال ہے سر!'' وہ اپنے دفتر میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ آپریٹر نے اسے اطلاع دی۔

''بات کرواؤ۔'' اس نے ہموار لہجے میں جواب دیا لیکن اندر سے بُری طرح مضطرب ہو گیا کہ جانے منظور اسے کیا خبر سناتا ہے۔ وہ خود تو ڈیرے پر ہونے والے آپریشن کے بعد فوراً ہی واپس آ گیا تھا لیکن پولیس پارٹی کا سرچ آپریشن جاری تھا۔ پولیس جنگل میں ان ڈاکوؤں کو تلاش کر رہی تھی جو آپریشن کے دوران ڈیرے سے فرار ہو گئے تھے۔ ماہ بانو کے بارے میں بھی یہی خیال کیا گیا تھا کہ کوئی مفرور ڈاکو اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ آپریشن کے دوران زخمی حالت میں ملنے والی حمیداں نامی عورت نے بھی ماہ بانو سے متعلق استفسار کے جواب میں یہی خیال ظاہر کیا تھا کہ اسلم نامی ڈاکو اسے اپنے ساتھ لے گیا ہوگا۔ حمیداں کو مُردہ و زندہ ڈاکوؤں کی جو شناختی پریڈ کروائی گئی تھی، اس کے بعد اس نے صاف بتا دیا تھا کہ زندہ و مُردہ دونوں طرح کے ڈاکوؤں میں اسلم موجود نہیں ہے۔ حمیداں کی مدد سے مُردہ، گرفتار اور مفرور تینوں طرح کے ڈاکوؤں کے ناموں کی فہرست بنائی گئی تھی۔ اس فہرست سے ظاہر تھا کہ ماہ بانو، لکی اور سات عدد ڈاکو ڈیرے پر نہیں مل سکے ہیں جن کو تلاش کرنا اشد ضروری ہے۔ پولیس یہ کام کر رہی تھی جبکہ شہر یار مشا برم خان کے ساتھ واپس لوٹ کر آ گیا تھا اور اب اس کی امیدوں کا مرکز و محور ڈی ایس پی منظور کی طرف سے ملنے والی رپورٹ تھی، اسی لیے اس کا فون آنے کی خبر سن کر وہ بے چین ہو اٹھا تھا۔

''ہاں منظور! کیا خبر ہے؟'' ڈی ایس پی کے لائن پر آتے ہی اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''کافی حوصلہ افزا خبریں ہیں سر! جنگل کے مختلف حصوں سے ہم نے پانچ ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا ہے، البتہ دو ڈاکوؤں اور قیدی خواتین کے بارے میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ ان کی تلاش کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔'' اس نے جو رپورٹ دی، وہ واقعی صورتِ حال کے مطابق کافی اچھی تھی لیکن خود شہر یار کو تو ماہ بانو سے غرض تھی۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اتنے بڑے جنگل میں اسے کہاں اور کیسے تلاش کرے۔ بس پولیس کے سرچ آپریشن سے ہی ساری امیدیں باندھ رکھی تھیں۔

''تلاش کا سلسلہ ابھی جاری رکھو۔ دونوں خواتین اور ڈاکوؤں کی بازیابی ضروری ہے۔ اس کام کے علاوہ تم اپنا ریکارڈ بھی مین ٹین رکھو۔ جنگل سے ملنے والے پانچوں ڈاکوؤں کے نام نوٹ کر لیے ہیں یا نہیں؟'' اس نے ڈی ایس پی کو ہدایات دیتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

''یس سر! یہ کام ہو گیا ہے اور اب ہماری ساری توجہ باقی دو ڈاکوؤں اور خواتین کی طرف مبذول ہے۔ اس سلسلے میں جیسے ہی کوئی پیش رفت ہوئی، میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔'' ڈی ایس پی منظور نے فوراً جواب دیا۔ آج کل وہ بہت زیادہ ایفی شینسی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ کامیاب آپریشن نے اس کا سینہ پھلا دیا تھا۔ میڈیا کی طرف سے بھرپور کوریج ملنے کے علاوہ اسے اس کامیابی پر نقد انعام اور ترقی کی بھی امید تھی، چنانچہ وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ کہیں کوئی کمی نہ رہنے پائے۔ شہر یار کے سامنے اس ایفی شینسی کا مظاہرہ اس لیے ضروری تھا کہ وہ اس کے آئی جی پنجاب مختار مراد سے قریبی تعلقات سے واقف تھا۔

''جو دو ڈاکو غائب ہیں ان کے کیا نام ہیں؟'' اس نے یونہی اس کی کارکردگی کو جانچنے کے لیے دریافت کیا ورنہ ڈاکوؤں کے نام جان کر اسے کیا حاصل ہونے والا تھا۔ اگر ان دو ڈاکوؤں کی اپنے دیگر ساتھیوں کے مقابلے میں کچھ اہمیت تھی تو صرف اتنی کہ امکان تھا کہ ماہ بانو اور ڈیرے پر موجود دوسری عورت شاید ان دونوں کے ہی ساتھ تھیں۔

''ان دونوں کے نام اسلم اور جمرو ہیں سر۔'' ڈی ایس پی منظور نے فوراً ہی جواب دیا پھر اسے مزید متاثر کرنے کے لیے بات کو اور بھی آگے بڑھایا اور بتانے لگا۔

''حمیداں نے اسلم نامی ڈاکو کے بارے میں بڑے عجیب و غریب انکشافات کیے ہیں سر۔ اس کا کہنا ہے کہ اسلم بڑا پڑھا لکھا اور شریف لڑکا ہے جسے حالات نے ڈاکو بنا دیا ہے لیکن ڈاکو بننے کے باوجود اس کی شرافت ابھی تک قائم ہے اور وہ عورت ذات کا احترام کرتا ہے۔ اس نے ڈیرے پر موجود کسی عورت کو کبھی غلط نظر سے نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی کسی بازاری عورت کے ساتھ ٹائم پاس کرنا پسند کیا ہے۔ البتہ جب سے ماہ بانو ڈیرے پر آئی تھی، وہ اس کے آگے پیچھے پھرتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی ساری دولت دے کر سردار کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ جب تک اس کی مرضی شامل نہیں ہوگی، ڈیرے کا کوئی شخص ماہ بانو کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔'' ڈی ایس پی منظور کی فراہم کردہ یہ معلومات اس کے لیے بڑی اہم تھیں۔ اسلم کے بارے میں معلوم ہونے والی باتوں نے اسے بھی چونکا دیا تھا اور اسے بے ساختہ ہی وہ ڈاکو یاد آیا تھا جو اس کے گھر پر ڈاکا ڈالنے والے ڈاکوؤں کی کمان سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ شخص اپنے لب و لہجے سے ہی تعلیم یافتہ لگتا تھا۔ دوسرے اس نے اپنے ساتھیوں سے جھگڑا مول لے کر ماریا کی عزت لٹنے سے بچائی تھی۔ یہ دو خصوصیات بتا رہی تھیں کہ مفرور ڈاکو اسلم ہی اصل میں وہ شخص ہے جس نے ایک بار اسے اغوا کر کے جنگل میں رکھا تھا اور دوسری بار اس کے گھر پر ڈاکا ڈالنے آیا تھا۔

''اپنے آدمیوں سے کہو کہ اسلم اور جمرو کو ہر حال میں تلاش کریں۔ دونوں خواتین ان دونوں ہی کے ساتھ ہو سکتی ہیں اور ان کا ملنا کتنا ضروری ہے، اس کے لیے میرا تمہیں اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ اگر ہمیں ڈیرے پر خواتین کی موجودگی کا علم نہ ہوتا تو یہ آپریشن ابھی کچھ عرصہ اور التوا میں پڑا رہتا۔'' اس نے سخت لہجے میں ڈی ایس پی کو جتایا۔

''میں اپنی پوری کوشش کروں گا سر۔'' وہ گھبرا کر جلدی سے بولا۔

''ایسا کر کے تم اپنے حق میں ہی اچھا کرو گے۔ ترقی کی منازل اتنی آسانی سے طے نہیں ہوتیں، یہ تو تم خود بھی جانتے ہو گے۔'' اس کو مزید دباؤ میں لے کر اس نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا اور اپنی ٹیبل پر رکھے اس نوٹ پیڈ کا جائزہ لینے لگا جس پر نام کے ساتھ اس کی غیر موجودگی میں آنے والی فون کالز کے پیغامات درج تھے۔ عبدالستان کو آج کسی ذاتی کام کے سلسلے میں جانا تھا اس لیے وہ اس کی اجازت سے دفتر سے جلدی نکل گیا تھا اور تمام اہم پیغامات نوٹ کر کے اس کی میز پر چھوڑ گیا تھا۔ فون کرنے والوں کے نام اور پیغامات دیکھتے ہوئے جیسے ہی اس کی نظر اے اے منشا کے نام پر پڑی، وہ چونک گیا۔ اے اے منشا کا مطلب تھا، آفتاب احمد منشا اور آفتاب کا فون دفتر کے نمبر پر آنے کا مطلب تھا اسے کوئی ضروری کام ہے ورنہ وہ یہ احتیاطی ہرگز بھی نہ کرتا اور اس کا موبائل آن ہونے کا انتظار کرتا۔ اس نے اضطراری طور پر موبائل نکال کر سب سے پہلے آفتاب کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی کال ریسیو کی گئی اور ایک نشے میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ہالو... کون سالا بول رہا ہے؟ صبح صبح میری نیند کیوں خراب کی ہے؟'' زبان کی لڑکھڑاہٹ کے علاوہ اس کے جملے سے بھی ظاہر تھا کہ وہ نشے میں ہے ورنہ پورا دن گزر جانے کے بعد صبح صبح اٹھائے جانے کا شکوہ نہ کرتا۔

''مجھے مسٹر منشا سے بات کرنی ہے۔'' امید نہ ہونے کے باوجود اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''ادھر کوئی انشا اور منشا نہیں ہوتا۔ یہ اپنا کا نمبر ہے۔ اِن یعنی اے ایس آئی خالد۔'' دوسری طرف سے جواب ضرور دیا گیا لیکن جواب دینے والے کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ ڈھنگ سے بات کرنے اور سوالوں کے جواب دینے کے لائق نہیں ہے۔ شہر یار نے بیزار ہو کر سلسلہ منقطع کر دیا لیکن خود تشویش میں مبتلا ہو گیا کہ جانے آفتاب کے ساتھ کیا گزری ہے جو اس کا موبائل کسی اے ایس آئی کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ آفتاب کے موبائل کی کسی پولیس والے کے پاس موجودگی کی کوئی بھی چھوٹی یا بڑی وجہ ہو سکتی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ اس کا موبائل جیب سے گر گیا ہو یا کسی اُچکے نے چھین لیا ہو۔ اگر بات اتنی ہی تھی تو خیر تھی لیکن اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہو۔ چودھری افتخار جیسا شخص اگر کسی کا دشمن ہو تو اس کے بارے میں کسی بھی غیر معمولی واقعے کا خدشہ ہی رہتا ہے۔ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ چودھری کے کتے آفتاب اور کشور کی بُو سونگھتے ہوئے ان کی پناہ گاہ تک پہنچ گئے ہوں اور انہوں نے آفتاب کے ساتھ وہ سلوک کیا ہو کہ وہ کسی اسپتال کے مُردہ خانے میں یا کم از کم شدید نگہداشت کے کمرے میں پڑا ہو اور اس کے پرس سے لے کر موبائل تک ہر شے پولیس کے قبضے میں ہو... اور یہ تو پولیس کا وطیرہ ہے کہ وہ کسی مقتول، زخمی یا مظلوم فریادی کے مال پر اپنا پورا پورا حق سمجھتی ہے۔ اس سے مخمور لہجے میں بات کرنے والا اے ایس آئی خالد بھی یقیناً پولیس کی صفوں میں موجود راشی اور بدعنوان اہل کاروں میں سے ایک تھا۔ ورنہ ایک اے ایس آئی کی جائز تنخواہ میں نشے کی علت پالنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں نکلتی تھی۔ وہ جانے انجانے جیسے بھی اس عادتِ بد کا شکار ہوا تھا، یہ طے تھا کہ اپنی اس ٹھرک کو پورا کرنے کے لیے اسے ناجائز طریقے ہی اپنانے پڑتے ہوں گے۔ بہر حال، اے ایس آئی کی عادات اور کردار فی الحال اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ اسے تو آفتاب کی طرف سے فکر لاحق ہو گئی تھی۔ اس کی خبر گیری کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس شخص سے رابطہ کرتا جس کی مدد سے اس نے میر پور خاص میں آفتاب کی رہائش کا بندوبست کیا تھا۔ موبائل پر کال وصول کرنے والے اے ایس آئی خالد سے تو اس وقت رابطہ کرنا بالکل فضول ہی تھا۔ وہ شخص ہوش میں ہوتا تو اسے انفارم کرنے کے لیے نہ سہی، اپنی معلومات میں اضافے کے لیے ہی سہی اس سے کوئی استفسار ضرور کرتا لیکن وہ تو اپنی نیند خراب کیے جانے کے غم میں مبتلا تھا۔ نشہ اترنے کے بعد اسے خود کو موصول ہونے والی فون کال یاد بھی رہتی ہے یا نہیں، اس سلسلے میں کچھ بھی وثوق سے کہنا مشکل تھا۔ تمام تر امکانات کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اس اسٹیٹ ایجنٹ سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا جس کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ذریعے آفتاب کو گھر دلایا تھا۔ چھوٹے شہروں میں خبریں ویسے بھی جلدی پھیلتی ہیں اور اسٹیٹ ایجنٹ کے واقفِ حال ہونے کا اس لیے بھی زیادہ امکان تھا کہ کسی حادثے کی صورت میں پولیس نے اگر اپنی تفتیش شروع کر دی تھی تو وہ آفتاب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اس اسٹیٹ ایجنٹ تک ضرور پہنچی ہوگی۔ یہی سب سوچ کر اس نے اسٹیٹ ایجنسی کا نمبر ملا ڈالا۔

"مجھے شمسی صاحب سے بات کرنی ہے۔" دوسری طرف سے "ہیلو" سنائی دیتے ہی اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"بات کر رہا ہوں۔ آپ بولو کہ آپ کون ہو؟" شمسی نے جواب دینے کے ساتھ ہی سوال بھی کیا۔

"میں شہریار عادل بات کر رہا ہوں شمسی صاحب۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔

"ارے صاحب آپ! میں تو خود آپ کو فون کرنے والا تھا۔ یہاں بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ کچھ دیر پہلے میرے پاس دو پولیس والے آئے تھے اور مجھ سے اس آدمی کے بارے میں پوچھ رہے تھے جسے میں نے آپ کے کہنے پر مکان دلایا تھا۔ مجبوراً مجھے آپ کے بارے میں بتانا پڑا۔ پولیس والوں سے پہلے کچھ لوگ اور بھی آئے تھے۔ وہ شہر کے چھٹے ہوئے غنڈے تھے، ان سے اپنی گردن بچانے کے لیے بھی مجھے آپ کے بارے میں بتانا پڑا تھا۔ میرا خیال ہے آپ میری مجبوری کو سمجھیں گے اور برا نہیں مانیں گے۔" اس کا نام سنتے ہی شمسی بوکھلا گیا اور بغیر سیاق و سباق کے اپنی صفائیاں پیش کرنے لگا۔ خود شہریار کے لیے اس بات کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اسٹیٹ ایجنسی سے اس کا حوالہ آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور وہ خود بھی اس حوالے سے خود سے پوچھ گچھ کرنے والوں کو آسانی سے ٹال سکتا تھا۔ غنڈوں کو تو خیر اسے جواب دہی کرنی ہی نہیں تھی۔ اگر وہ چودھری کے گرگے تھے تو اسے یہ معلوم ہو جانے میں کوئی حرج نہیں تھا کہ آفتاب اور کشور کو اس کی سپورٹ حاصل ہے۔ یہ راز وہ پہلے ہی اس کے دفتر میں ٹیلی فون آپریٹر کی صورت میں پائے جانے والے اپنے جاسوس سے جان ہی چکا تھا۔ رہی پولیس تو پولیس والوں کو بھی وہ آرام سے یہ بات بتا سکتا تھا کہ واقفیت کی بنیاد پر آفتاب نے مکان کے حصول کے سلسلے میں اس سے مدد کی درخواست کی تھی چنانچہ اس نے انسانی ہمدردی کے ناتے اس کا یہ کام کروا دیا، باقی وہ آفتاب یا اس کی بیوی کے ہر فعل و کردار سے بری ہے۔ اصل بات جو وہ جاننا چاہتا تھا وہ یہ تھی کہ آفتاب کن حالات کا شکار ہے اور

اس نے آخر اسے کیوں فون کیا تھا؟ چنانچہ شمسی کی وضاحت کے جواب میں رسان سے بولا۔

"میں آپ کی مجبوریوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں شمسی صاحب! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے لیکن مجھے یہ تو بتائیں کہ آخر ایسی کیا افتاد آ گئی جو شہر کے غنڈے اور پولیس بہ یک وقت میرے آدمی کو ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے؟"

"پورا چکر تو مجھے نہیں معلوم بس اتنا پتا چلا ہے کہ احمد کی بیوی بچی کی پیدائش کی وجہ سے اسپتال میں داخل تھی۔ احمد خود بھی وہیں موجود تھا کہ اچانک ہی اسپتال پر غنڈوں نے دھاوا بول دیا۔ دونوں میاں بیوی عجلت میں اسپتال سے فرار ہو گئے اور جلدی میں اپنی بچی اسپتال کی نرسری میں ہی چھوڑ گئے جہاں سے بچی پُراسرار طور پر غائب ہو گئی۔ پولیس والے اس سلسلے میں تفتیش کرتے پھر رہے ہیں۔ انہوں نے مکان کا بھی جائزہ لیا ہے جہاں سے انہیں احمد کے لیے ایک دھمکی آمیز پیغام ملا ہے لیکن پیغام سے یہ ظاہر نہیں کہ پیغام بھیجنے والا کون ہے۔ البتہ پولیس والوں کا کہنا ہے کہ پیغام کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ دشمن احمد کے لیے اجنبی نہیں ہے۔" شمسی نے اپنی معلومات جلدی جلدی اس کے کانوں میں انڈیل ڈالیں۔

"ٹھیک ہے شمسی صاحب! آپ کے تعاون کا شکریہ۔ اگر کسی نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔" اس نے کال منقطع کر دی اور آفتاب کے بارے میں سوچنے لگا۔ فرضی نام کے ساتھ ایک چھوٹے شہر میں قیام کرنے کے باوجود وہ اپنے دشمنوں کی نظر سے محفوظ نہیں رہ سکا تھا اور ان لوگوں نے اسے نہ صرف وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا بلکہ اسے اس کی بچی سے بھی جدا کر دیا تھا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ اسپتال سے پُراسرار طور پر غائب ہونے والی بچی چودھری کے گرگوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے اور شاید اسی وجہ سے آفتاب نے کسی محفوظ مقام پر پہنچنے کے بعد اسے فون کیا تھا۔ لیکن اس کی مجبوری یہ تھی کہ آفتاب کا موبائل اس کے قبضے سے نکل جانے کے بعد اس کے پاس رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اب وہ دوبارہ اسی صورت میں اس سے بات کر سکتا تھا کہ وہ خود اسے فون کرتا۔ ابھی تو وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آفتاب میرپور میں ہی ہے یا وہاں سے نکل چکا ہے۔ ماہ بانو کی تلاش میں ناکامی کے بعد یہ دوسرا مسئلہ تھا جس نے اسے بُری طرح ڈسٹرب کر دیا۔ اچھے خاصے وسائل کا مالک ہونے کے باوجود وہ چند لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام تھا اور ان بے چاروں پر ان کے وطن

کی زمین ہی تنگ پڑ گئی تھی۔ اس کے نزدیک اس مشکل صورتِ حال سے نمٹنے کا یہی طریقہ رہ گیا تھا کہ ان لوگوں کو ملک سے باہر نکال دیتا۔ ملک سے باہر نکلنے کے بعد آفتاب کے لیے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ کسی بھی نشریاتی ادارے میں ملازمت اختیار کر کے سکون سے زندگی گزار سکتا تھا لیکن ماہ بانو کے لیے ضرور مشکل ہو جاتی۔ چھوٹے شہر و سفید پوش گھرانے میں پلنے والی وہ لڑکی جانے بالکل مختلف ماحول میں اکیلی سروائیو کر بھی پاتی یا نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اسے ایک بھیڑیے سے بچاتے بچاتے اپنے ہاتھوں سے بھیڑیوں کے غول میں دھکیل دیتا۔ اپنے ذہن میں ابھرنے والے ایسے کسی خیال پر عمل پیرا ہونے سے پہلے اس کے نتائج کے بارے میں اچھی طرح سوچنا ضروری تھا پھر ابھی تو اصل میں ماہ بانو کا ملنا باقی تھا۔ وہ جانے کہاں اور کس حال میں تھی؟ یہ خیال جب بھی دل میں آتا تھا، درد کی ایک لہر سی تن بدن میں دوڑ جاتی تھی۔ وہ اسے چاہ کر پا نہیں سکا تھا لیکن اس کے خیر و عافیت سے رہنے کی پُرخلوص خواہش بڑی شدت سے رکھتا تھا۔ اس خواہش کو کامیابی حاصل ہوتی یا نہیں لیکن اس وقت اپنی شکست کا سبب بننے والی ماریا کا نمبر موبائل کی اسکرین پر ابھرتے دیکھ کر بُری طرح جھنجلا گیا... مگر دل نہ چاہتے ہوئے بھی کال تو ریسیو کرنی ہی تھی سو مسلسل بجتی گھنٹی کا گلا گھونٹنے کے لیے "یس" کا بٹن پش کر دیا۔

"کہاں غائب تھے آپ؟ آپ سے کسی طرح رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ گھر اور دفتر دونوں جگہ سے جناب کی غیر موجودگی کا پتا چلا اور موبائل بھی آف کر رکھا تھا آپ نے۔ آخر ایسا کیا مسئلہ ہو گیا تھا کہ آپ رابطے کا ہر ذریعہ بند کر کے بیٹھے تھے؟" ماریا کے لہجے میں بیویوں والے استحقاق کے ساتھ ساتھ تجسس بھی تھا اور یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس کی شکایت اس کا حق تھا۔ بیوی کی حیثیت سے وہ جب چاہے، اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر سکتی تھی لیکن اس کے الجھے ہوئے ذہن پر غصہ چھا گیا اور وہ جب بولا تو اس کا لہجہ کافی خراب تھا۔

"تمہیں مجھ سے ایسا کون سا کام آ پڑا تھا کہ ہر طرف میری ڈھونڈ مچا دی۔ میں تمہارا شوہر ہوں کوئی پالتو کتا نہیں جس کی ایک ایک حرکت تمہاری مرضی کے تابع ہو۔ میری بہت سی ذاتی اور پیشہ ورانہ مصروفیات ہیں جن کی تفصیل سے میں تمہیں آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔" وہ اس پر تقریباً الٹ ہی پڑا۔ گھر پر اور دفتر میں دونوں جگہ اسے ماریا کے فون کے بارے میں علم ہو گیا تھا لیکن اس نے ان فون کالز کو اتنی اہمیت

دیکھتے نہیں یہ کتنے پیار سے آکے ملا ہے۔
اس سے بڑا کیا ثبوت ہوگا کہ یہ کتا میرا ہے!

نہیں دی تھی اور یہی سوچا تھا کہ فرصت ملنے پر آرام سے اس سے بات کرے گا۔

"آپ کا موڈ اتنا آف کیوں ہو رہا ہے؟ میں نے کوئی ایسی غلط بات تو نہیں کی۔ میں آپ کی بیوی ہوں اور مجھے حق ہے کہ میں جب چاہے آپ سے رابطہ کر سکوں۔" اس کی خفگی کو محسوس کر کے ماریا نے بھی جوابی خفگی دکھائی جس پر اسے اپنے رویے کی خرابی کا احساس بھی ہو گیا۔ لیکن ماہ بانو کا معاملہ ایسا تھا جس پر وہ ماریا سے کھل کر بات کرتے ہیں گھبراتا تھا اور کھل کر کچھ بتائے بغیر کسی عام سی لڑکی کے لیے بھٹکتے پھرنے کی کوئی دلیل نہیں دی جا سکتی تھی چنانچہ جارحیت کو بہترین مدافعت سمجھتے ہوئے اس نے اپنا لہجہ تبدیل کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اسی ٹون میں بولا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم میری بیوی ہو۔ اس بات کو بار بار یاد دلا کر مجھے اری ٹیٹ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں خود سے رابطہ کرنے سے بھی نہیں روک رہا ہوں لیکن اس بات کی بھی اجازت نہیں دے سکتا کہ تم میرے لمحے لمحے پر نظر رکھو۔ بیوی اور تھانے داری میں کچھ فرق ہونا چاہیے۔ بہتر ہے کہ تم یہ فرق سمجھ لو تاکہ ہم دو مہذب لوگوں کی طرح ایک دوسرے کی شخصی آزادی کو سلب کیے بغیر پُرسکون زندگی گزار سکیں۔" اسے یہ مختصر لیکچر دینے کے بعد اس نے مزید بات جاری رکھنا مناسب نہیں سمجھا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ سلسلہ منقطع کرنے کے بعد وہ اپنے بگڑے ہوئے موڈ کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

پوری طرح بحال بھی نہ کرنے پایا تھا کہ موبائل کی اسکرین پر کسی اور کال کی آمد کا اعلان ہونے لگا۔ اس نے اسکرین پر جگمگاتا جگو کا نمبر دیکھا اور کال ریسیو کرلی۔

''سلام صاحب! مجھے علوم ہے کہ میں نے آپ کی فرمائش پوری کرنے میں خاصی دیر کردی ہے لیکن ایسی خبر لایا ہوں کہ آپ سن کر خوش ہوجائیں گے۔'' اس کی آواز سنتے ہی جگو نے بولنا شروع کیا تو اس کا چڑھا ہوا پارا دھیرے دھیرے نیچے آنا شروع ہوگیا۔ مسلسل مختلف لوگوں سے جاری رہنے والی ٹیلی فونک گفتگو میں یہ پہلی کال تھی جو کال کرنے والے نے اسے کسی خوش خبری کے بارے میں بتایا تھا... ورنہ اب تک اس کی جس کسی سے بھی بات چیت ہوئی تھی، کوفت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔

''اگر ایسی بات ہے تو فوراً خبر سنا ڈالو۔ یہاں اچھی خبروں کا سخت قحط پڑا ہوا ہے۔'' اس کا لہجہ قدرے خوش گوار ہوگیا۔

''تھوڑی تفصیل میں جانا پڑے گا۔ تفصیل کے بغیر جلدی سے خبر سنانے میں کچھ نہیں رکھا ہے۔'' جواباً جگو کی مسکراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ کھردرے مزاج کا غنڈا جو ایک سیاسی پارٹی کے لیے غنڈا گردی کرتا تھا اور خاصے وسائل رکھتا تھا، اس کے سامنے موم ہوا تھا تو صرف اس احسان کے بدلے میں جو اس نے کیا تھا۔

وہ خوش گوار لہجے میں بولا۔ ''اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے۔ تفصیل ہی سنا دو۔ میں تمہاری تفصیل کے لیے وقت نکال لوں گا۔''

''آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ چودھری پر ایک زوردار ضرب لگانی ہے۔ میں چاہتا تو اپنے آدمی پیر آباد بھیج کر کچھ بھی کروا سکتا تھا لیکن وہ کارروائی بس ایسی ہی ہوتی جس سے چودھری کو مالی نقصان پہنچتا یا پھر دو چار بندے زخمی وخمی ہو جاتے۔ اور یہ تو آپ کو بھی علوم ہے کہ چودھری کے پاس ان دونوں چیزوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس لیے میں نے ذرا الگ طریقہ اپنایا اور اپنا ایک بندہ چودھری کے خاص کارندے شیدے کے پیچھے لگا دیا۔ اب میں آپ کو ایک مزے کی گل بتاؤں کہ شیدا جو ہے، وہ چودھری کے حکم پر اس کی بھاگی ہوئی دھی اور اس کے شوہر کو ڈھونڈنے میں لگا ہوا تھا۔ اب جو اس نے میر پور خاص میں ان لوگوں پر ہاتھ ڈالا تو میرے بندے نے فوراً مجھے خبر کردی۔'' جگو کی بات سن کر شہریار کی پیشانی پر تفکر آمیز بل پڑ گئے اور آفتاب کا موبائل اس کے پاس موجود نہ ہونے کا کچھ کچھ سبب سمجھ آنے لگا لیکن ساتھ ہی ذہن میں ڈھیروں اندیشے بھی جاگ اٹھے... چودھری کے بندوں کا میر پور خاص میں آفتاب اور کشور تک جا پہنچنے کا نتیجہ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ پھر آفتاب کا موبائل تھا بھی پولیس کسٹڈی میں جس کا مطلب تھا کہ وہاں کچھ نہ کچھ ہنگامہ آرائی ہوئی ہے اور اس کا نتیجہ جانے کیا نکلا تھا۔ ہو تو یہ بھی سکتا تھا کہ اس ہنگامے میں آفتاب زخمی یا پھر ہلاک ہوگیا ہو اور موبائل سمیت اس کی ساری زیر استعمال اشیا پولیس کی تحویل میں چلی گئی ہوں۔ اپنی تمام تر بے چینی اور تشویش کے باوجود وہ جگو کو ٹوکے بغیر اس کی بیان کردہ تفصیلات سنتا رہا۔

''مجھے جب پتا چلا کہ شیدا چودھری کی بیٹی اور داماد پر ہاتھ ڈالنے جارہا ہے تو میں نے اپنے آدمی سے کہہ دیا کہ شیدے کو کامیابی نہیں ہونی چاہیے۔ دشمن کو نقصان پہنچانے کا ایک طریقہ یہ بھی تو ہوتا ہے کہ دشمن کے دشمن سے دوستی نبھائی جائے۔ بدقسمتی سے میرا آدمی اکیلا تھا اور اسے اپنے ساتھیوں کو جمع کرنے میں تھوڑا وقت لگ گیا۔ اتنی دیر میں شیدے نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اس اسپتال پر حملہ کردیا جدھر چودھری کی دھی داخل تھی۔ قسمت سے وہ اپنے خاوند کے ساتھ ادھر سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئی لیکن اس کی بچی ادھر اسپتال کی نرسری میں ہی رہ گئی۔'' جگو داستان کے اس موڑ پر پہنچا تو شہریار کے ہونٹوں سے بے ساختہ ہی ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ یہ اطمینان آفتاب کے زندہ سلامت ہونے کی خبر سن کر محسوس ہوا تھا اور اب وہ موبائل کے پولیس کی تحویل میں چلے جانے کے سلسلے میں بھی بالکل درست اندازہ لگانے کے قابل ہوگیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ بھاگ دوڑ میں موبائل آفتاب کی جیب سے گر گیا ہوگا اور بعد میں پولیس کو مل گیا۔

''چودھری کے گرگے بھی اسی کی طرح ظالم ہیں۔ جب ماں باپ ہاتھ نہیں آئے تو انہوں نے بچی ہی اسپتال کی نرسری سے غائب کرلی۔'' جگو کی داستان پورے جوش و خروش کے ساتھ جاری تھی۔ ''اس وقت تک میرا آدمی اپنے ساتھیوں کا بندوبست کر چکا تھا۔ اس نے فون پر مجھے تفصیل بتائی تو میں نے اس سے کہا کہ بچی ان لوگوں سے چھین لو اور ان کا حلیہ اتنا بگاڑ دو کہ چودھری انہیں پہچان بھی نہیں سکے۔ میرے خیال میں وہ لوگ اب کافی دن تک بستر سے اٹھ کر اپنے آقا کا کام کرنے کے لائق نہیں ہوسکیں گے۔'' جگو نے واقعی اسے ایسی خبر سنائی تھی کہ سن کر اس کا دل خوش ہوگیا تھا۔ وہ پہلے بھی چودھری کے ایک خاص گرگے بالے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معذور کرکے بستر سے لگا چکا تھا اور اب دوسرے کے بارے میں بھی بھی اطلاع دے رہا تھا۔ بے شک چودھری کے پاس بندوں کی کمی نہیں تھی لیکن اپنے غنڈوں میں سے خاص الخاص غنڈوں سے محروم ہونے پر وہ تلملاتا تو ضرور اور کچھ نہ کچھ کمزور بھی پڑ جاتا۔ دوسرے وہ اس لیے بھی خوش تھا کہ آفتاب اور کشور کی بیٹی چودھری کے قبضے میں جانے سے بچ گئی تھی۔ وہ بچی کو اسپتال سے اٹھائے جانے کا مطلب سمجھتا تھا۔ بچی کے ذریعے چودھری آفتاب کو بلیک میل کرکے اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرسکتا تھا اور ایک بار آفتاب اس کے ہاتھ آجاتا تو پھر وہ اس کے ساتھ جو چاہے سلوک کرتا۔ منتقم مزاج چودھری کے نزدیک تو آفتاب نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اور جسارت کی پاداش میں وہ آفتاب کی تکا بوٹی کروا لینے کے لیے بے چین تھا۔

''بچی کہاں ہے؟'' اس نے جگو کی داستان سننے کے دوران پہلی بار کوئی سوال کیا۔

''بچی فی الحال کراچی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل ہے۔ بہت کمزور بچی ہے، اس پر سے اس کے ساتھ جو سلوک ہوا اس سے وچاری اور بھی ڈھے گئی۔ اسپتال والوں نے کہا ہے کہ کم سے کم آٹھ دس دن اسپتال میں رکھیں گے تب جا کر اس میں کچھ بہتری آئے گی۔ میں نے سوچا آپ کو ساری تفصیل سنا دوں، فیر آپ جو کہیں گے وہ کرلیں گے۔ بچی کے ماں باپ کا پتا علوم نہیں ہے۔ جانے وہ لوگ میر پور سے نکل کر کدھر چلے گئے، پر میں کوشش کروں گا کہ ان کا پتا ٹھکانا علوم کرکے آپ کو بتا دوں۔'' جگو نے اسے تفصیلی جواب دیا۔

''تھینک یو جگو! تم نے بڑا کام کیا ہے۔ آفتاب کا ایڈریس معلوم کرسکو تو اچھی بات ہے ورنہ تو مجھے امید ہے کہ وہ خود بھی مجھ سے رابطہ کرے گا۔ تم مجھے اسپتال کا نام پتا وغیرہ نوٹ کروا دو۔ اگر آفتاب نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں اسے انفارم کردوں گا۔ اور ہاں، اسپتال کا جو بل وغیرہ بنے، وہ بھی مجھے بھجوا دینا۔ بل میں پے کردوں گا۔'' اس نے جگو سے کہا۔

''بل کا کوئی مسئلہ نہیں ہے اے سی صاحب! میرے پاس اتنا تو ہے کہ میں بل کے چند ہزار بھر سکوں۔'' اس کی بات سن کر جگو فوراً بولا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ یہ بل مجھے ہی ادا کرنا چاہیے۔ تم میرے کہنے پر میرے لیے جو کچھ کر رہے ہو، میرے لیے وہی کافی ہے۔ میں تم پر کسی قسم کا زائد بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ تم اپنی رقم اپنے بال بچوں پر خرچ کرو، یہی مناسب ہوگا بلکہ بات نکل ہی گئی ہے تو میرے خیال میں، میں اپنے ذہن میں موجود ایک بات تم سے کہہ ہی دوں۔ مجھے امید ہے کہ تم میری بات پر غور کرو گے۔'' اس نے کچھ کہنے سے پہلے تمہید باندھی۔

''آپ کہہ کر تو دیکھیں اے سی صاحب! مجھے علوم ہے کہ آپ نے کوئی بھلی گل ہی سوچی ہوگی۔ آپ تو ہیں ہی دوجے کا بھلا سوچنے والے آدمی۔'' جگو نے اس کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ شہر لے جا کر کسی اچھے اسکول میں داخل کرواؤ۔ یہاں گاؤں میں اس کی اچھی تعلیم و تربیت ہونا مشکل ہے۔ تمہارے پاس مواقع ہیں تو پھر کیوں تم اپنے بیٹے کو یہاں چھوڑ کر اس کا مستقبل خراب کر رہے ہو۔ بچہ اچھے اسکول کالج میں پڑھے گا تو کارآمد شہری بنے گا ورنہ دوسروں کے لیے بوجھ ثابت ہوگا۔'' اس نے اپنے دل میں پلتا خیال جگو کے سامنے ظاہر کیا۔

''میں خود بھی ایسا ہی سوچتا ہوں اے سی صاحب لیکن اس کی ماں کا سوچ کر عمل نہیں کرپاتا۔ میں بچے کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا تو وہ تنہا رہ جائے گی۔ میں دیکھنے میں جتنا بھی ظالم سہی، پر ہوں اصل میں نرم دل کا۔ مجھ سے اس کی ماں کا تڑپنا برداشت نہیں ہوگا اس لیے اپنی سوچ پر عمل نہیں کر پاتا۔'' اس نے وجہ بیان کرتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔

''یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔ تم بچے کی ماں کو بھی اپنے ساتھ شہر لے جا کر کرائے کے کسی گھر میں رکھ سکتے ہو۔ آخر تمہاری دوسری بیوی بھی تو وہاں رہ ہی رہی ہے، تم پہلی کو بھی لے جاؤ۔ میں بہرحال اس سے زیادہ تمہارے ذاتی معاملے میں مداخلت نہیں کروں گا۔ ایک خیال میرے ذہن میں تھا، وہ میں نے تمہارے سامنے بیان کردیا... آگے تمہاری مرضی ہے کہ تم کیا کرتے ہو اور کیا نہیں۔'' وہ کسی کی ذاتیات میں ضرورت سے زیادہ دخل دینا مناسب نہیں سمجھتا تھا چنانچہ اب بھی فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا۔

''آپ کی گل میرے دل کو لگی ہے اے سی صاحب! میں اس پر ہور غور کروں گا، فیر اپنا فیصلہ سناؤں گا۔'' جگو نے دھیمے لہجے میں جواب دیا جس کو سن کر اس نے مزید کچھ نہیں کہا اور اسپتال کا فون نمبر اور پتا وغیرہ لے کر رابطہ منقطع کردیا اور فوراً ہی اپنے دائیں جانب رکھے گلاس کو اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ مسلسل ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو نے اس کا حلق خشک کردیا تھا اور پھر ایک اندرونی تھکن کا بھی احساس تھا۔ جس کی خاطر، جس کی تلاش میں اس نے اتنے بڑے آپریشن کا بندوبست کروایا تھا وہ نہ جانے کہاں کھو گئی تھی اور شاید واقف

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی نہیں تھی کہ کوئی اتنی شدت کے ساتھ اسے کھوج رہا ہے۔

☆☆☆

چودھری چوٹ کھائے ہوئے درندے کی طرح ادھر سے اُدھر ٹہلتا پھر رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے کبھی کبھی اس کے منہ سے ایسی آوازیں نکلتیں جیسے وہ غرا رہا ہو۔ پے در پے ناکامیوں نے اسے سخت جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اپنی زبان سے نکلے ہوئے ہر حکم کو پورا ہوتا دیکھنے کا عادی تھا لیکن اب جانے اس کے ساتھ کیا ہونے لگا تھا کہ تمام تر کوشش کے باوجود اس کے احکامات کی تعمیل نہیں ہو پاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی راجدھانی میں اس کے خلاف سازشیں اور بغاوتیں ہونے لگی تھیں۔ پہلے کشور نے آفتاب کے ساتھ نکاح کر کے حویلی سے فرار ہو کر اس کے منہ پر اس زور کا طمانچہ مارا کہ وہ آج تک اس چوٹ کی شدت سے بلبلاتا پھرتا تھا پھر وڈی چودھرائن نے سازشوں کے جال بُننے شروع کر دیے۔ یہ وڈی چودھرائن کی ہی سازش تھی کہ فریدہ زندہ سلامت اولاد کو جنم نہ دے سکے اور اس کا بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی موت کی آغوش میں چلا جائے۔ قدرت کی مہربانی سے چودھرائن کی سازش ناکام رہی اور فریدہ اور اس کا بچہ دونوں ہی بچ گئے۔ وہ دونوں ابھی اسپتال میں ہی تھے اور چند دن میں واپس آنے والے تھے۔ چودھری کو اس سازش سے فریدہ کے بھائی چودھری بختیار نے باخبر کیا تھا اور ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی کیا تھا کہ وہ فریدہ کو اس کے ساتھ میکے بھجوا دے۔ وہ اپنی بہن کی جان حویلی میں خطرے میں محسوس کر رہا تھا۔ چودھری نے وڈی چودھرائن کو اس کے مقام کے باوجود اس جرم کی پاداش میں حویلی کے تہ خانے میں ڈلوا دیا۔ تہ خانے کی صعوبتوں میں وڈی چودھرائن نے نہ صرف اپنا یہ جرم تسلیم کیا بلکہ یہ انکشاف بھی کر ڈالا کہ ماہ بانو کو حویلی سے فرار کروا کر ڈاکوؤں کے ڈیرے پر پہنچانے کا کارنامہ بھی اسی کا ہے جو اس نے اپنے بڑے داماد چودھری اشرف شاہ کی مدد سے سرانجام دیا تھا۔

اس انکشاف پر چودھری بڑا پچھتایا۔ اگر اسے شروع میں ہی یہ بات پتا چل جاتی تو وہ ڈاکوؤں کے سردار سے سودے بازی کر کے خود ماہ بانو کو حاصل کر لیتا لیکن افسوس کہ اسے یہ سب آپریشن شروع ہونے کے بعد معلوم ہوا تھا اور اس موقع پر وہ اپنے سارے اختیارات کھو چکا تھا۔ غصے اور جھنجلاہٹ میں اس نے چودھرائن کو خوب زدوکوب کیا لیکن کمان سے نکلا ہوا تیر تو واپس آنے سے رہا۔ دوسری طرف وہ سادھو بھی غائب تھا جسے اس نے شہریار کو ہلاک کرنے کا کام سونپا تھا۔ پولیس میں موجود اپنے مخبروں کے ذریعے اسے آپریشن کی ساری تفصیلات معلوم ہو گئی تھیں۔ ان تفصیلات میں بالکل اچانک شہریار کے موقع پر پہنچ جانے کا ذکر بھی موجود تھا۔ اس کے وہاں پہنچنے کا مطلب تھا کہ سادھو نے اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی اور شہریار کو قتل کرنے کے بجائے اسے ڈیرے تک پہنچا کر غائب ہو گیا۔ چودھری کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ آپریشن کے دوران ڈیرے پر اور اس کے اردگرد کسی لڑکی کو تلاش کیا جاتا رہا تھا اور یہ کام شہریار کے حکم پر کیا جا رہا تھا لیکن لڑکی ہنوز لاپتا تھی۔ چودھری اتنا عقل مند تو تھا ہی کہ اس بات کو سمجھ سکتا کہ شہریار جس لڑکی کو تلاش کروا رہا تھا، وہ ماہ بانو تھی۔ یقیناً اسے کسی ذریعے سے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ ماہ بانو ڈاکوؤں کے قبضے میں ہے۔ شہریار کی اس باخبری پر بھی وہ بُری طرح تلملایا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ حویلی کا ایک راز تھا جس کے شہریار کے علم میں ہونے کا مطلب تھا کہ حویلی میں اس کا کوئی ایسا مخبر موجود ہے جو اسے یہاں کی خبریں دیتا ہے۔

اس سوچ کے بعد جہاں وہ اس مخبر کو پکڑنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا، وہیں اس کے دل میں موجود وڈی چودھرائن کے لیے غصے میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس کا بس چلتا تو وہ بیچ چوراہے پر کھڑا کر کے وڈی چودھرائن کو اس وقت تک کوڑے لگواتا جب تک وہ اپنی جان سے نہ چلی جاتی لیکن وہ اندر کی بات اندر ہی رکھنے پر مجبور تھا۔ وہ اپنی عزت بیچ چوراہے پر نہیں لے جا سکتا تھا۔ دوسروں کی عورتوں کو برہنہ کر کے گاؤں میں گھمانے والے کی ناک اپنی عزت کے معاملے میں بہت لمبی تھی لیکن وہ اپنے مجرموں کو معاف کر دینے کا بھی عادی نہیں تھا۔ وڈی چودھرائن کے لیے وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا ایک ایک پل اذیت اور تکلیف میں گزارے گی۔ اس جیسی تعیشات کی عادی عورت کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اسے ہر آسائش سے محروم کر کے تہ خانے کی تاریکی میں روکھی سوکھی کھا کر زندہ رہنے پر مجبور کیا جائے۔ وڈی چودھرائن کے لیے واقعی وہ سزا بڑی سخت تھی اور وہ الٹے سیدھے کھانوں کی بدولت پیٹ کی بیماریوں کا شکار ہو کر بستر سے لگ گئی تھی لیکن چودھری کو اس پر رحم نہیں آ رہا تھا۔ فی الحال وہ وڈی چودھرائن کے میکے والوں اور خود اپنی ہی اولاد کی مخالفت کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا ورنہ تو شاید اب تک چودھرائن کی موت کا حکم ہی صادر ہو چکا ہوتا۔ اب بھی اس نے چودھرائن کے شدید بیماری کے باعث بیرونِ ملک علاج کے لیے مقیم ہونے کا عذر پیش کر کے سب کے منہ بند کر دیے تھے۔ لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ یہ بہانہ زیادہ دن نہیں چل سکے گا اور اس سے چودھرائن کی علاج گاہ کا نام پتا بتانے کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اس نے چودھرائن کے بارے میں ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا اس لیے ابھی اسی طرح کام چلا رہا تھا۔ فیصلہ ہو جاتا تو پھر وہ اپنی آگے کی منصوبہ بندی کر کے دوسروں کے سامنے کوئی کہانی پیش کرتا۔ اس کی پیش کردہ کہانی کو سچ سمجھا جاتا یا نہیں لیکن اس کی طاقت اور اختیار کے سامنے سب ہی سر جھکانے پر مجبور ہوتے۔ فی الحال وہ چودھرائن والے مسئلے پر سوچ بھی نہیں رہا تھا۔ اسے کچھ دیر قبل ہی شیدے اور اس کے ساتھیوں کی ناکامی کی خبر ملی تھی۔ وہ لوگ آفتاب اور کشور کو گرفتار کرنے کے لیے گئے تھے اور پھر یہ اطلاع بھیج دی تھی کہ وہ دونوں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن وہ لوگ ان کی بچی کو اپنے ساتھ لے کر آ رہے ہیں۔ چودھری کا خیال تھا کہ بچی کو چارے کے طور پر استعمال کر کے وہ اپنے مفرور مجرموں کو اپنے قدموں میں سر جھکانے پر مجبور کر دے گا لیکن پھر اچانک ہی شیدے سے رابطہ ختم ہو گیا۔ آخری اطلاع تک بچی اس کے قبضے میں آ چکی تھی اور وہ میرپور سے روانہ ہو چکا تھا لیکن پھر جانے کیا ہوا کہ اس سے رابطہ ٹوٹ گیا اور اب کئی گھنٹوں بعد معلوم ہوا تھا کہ شیدا اور اس کے ساتھی شدید زخمی حالت میں ہائی وے پر پڑے ملے تھے جہاں سے پولیس کی ایک گشتی پارٹی نے انھیں اسپتال پہنچایا۔ اسپتال میں ایک زخمی چل بسا تھا جبکہ باقی زیرِ علاج تھے۔ ان زیرِ علاج زخمیوں سے چودھری کا تعلق بنتا تھا چنانچہ اسے پولیس کے ساتھ کِک مکا کرنا پڑا اور خاصی بڑی رقم صرف کر کے اس معاملے کو دبائے رکھنے میں کامیاب ہوا۔

ان حالات میں اس کا طیش میں ہونا قابلِ فہم تھا۔ اتنا کچھ خرچ کرنے کے بعد بھی اس کے ہاتھ کچھ نہیں آ سکا تھا اور یہ بات سامنے آئی تھی کہ بچی کو کوئی دوسری پارٹی لے اڑی ہے۔ اس دوسری پارٹی کا تعلق کس سے تھا، یہ بات ابھی تک واضح نہیں ہوئی تھی لیکن یہ تو واضح تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے اس کے مخالفین میں سے ہے اور اس کے مخالفین میں آج کل سب سے اوپر شہریار کا ہی نام تھا۔ شہریار کے آفس میں اس کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دینے والے ٹیلی فون آپریٹر نے اس سلسلے میں اپنی واقفیت سے انکار کر دیا تھا بلکہ اس خدشے کا بھی اظہار کیا تھا کہ شاید اسے ایک مخبر کی حیثیت سے پہچان لیا گیا ہے اور دفتر کے فون سے کوئی ضروری کال کرنے سے گریز کیا جا رہا ہے۔ بہرحال، وہ اس معاملے میں سو فیصد پُریقین نہیں تھا اس لیے اسے اپنی جگہ ٹک کر ہوشیار رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔

حالات و واقعات کا یہ سارا تسلسل چودھری افتخار عالم شاہ کے لیے ناخوش گواری اور ناکامیوں سے بھرا ہوا تھا اس لیے اس کا غضب سمجھ میں آنے والا بھی تھا۔ شدید غصے اور طیش کے باعث اس کا بلڈ پریشر کافی ہائی ہو چکا تھا لیکن وہ خود پر قابو پانے میں ناکام تھا اور منشی کی کئی بار کی استدعا کے باوجود دوا کھانے پر بھی تیار نہیں تھا۔ اس قسم کی کیفیت میں اس کے موبائل کی گھنٹی بجی اور اسکرین پر ڈیوڈ کا نام ابھرا تو اس کی پیشانی پر ناگواری کے اظہار میں بل پڑ گئے لیکن بہرحال ڈیوڈ ایسا بندہ تھا جس سے وہ خود بھی دبتا تھا اور اس کی کال کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ بادلِ ناخواستہ ہی سہی کال ریسیو کر لی۔

”کیا بات ہے... کیا بات کرنے کا موڈ نہیں تھا؟“ ڈیوڈ جیسے چالاک اور ہوشیار شخص سے اس کی ”ہیلو“ میں موجود ناگواری کی خفیف سی جھلک بھی چھپ نہیں سکی اور اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ذرا اپنے مسائل میں الجھا ہوا تھا اس لیے تمہیں ایسا محسوس ہوا ہوگا۔“ چودھری نے وضاحت پیش کی لیکن لہجے کو خوش گوار بنانے میں بہرحال کامیاب نہیں ہو سکا۔

”او کے، تمہارے مسائل تمہارا مسئلہ ہیں۔ ان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ہم یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ذاتی معاملات ہمارے کام پر اثرانداز ہوں۔ ہمارا کام بہت ہی نازک ہے اس لیے تمہیں بہت محتاط رہنا چاہیے۔“

ڈیوڈ کے لہجے میں لاتعلقی اور بے نیازی تھی۔ چودھری اس کے انداز پر اندر اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا اور صرف اتنا بولا۔ ”میں اس بات کو سمجھتا ہوں اور میرے خیال میں اب تمہارے پاس شکایت کی کوئی گنجائش بھی نہیں رہی۔ تمہیں یقیناً معلوم ہو ہی گیا ہوگا کہ جنگل میں ہونے والا آپریشن کس انداز میں ہوا اور پولیس تمہارے پروجیکٹ کے قریب بھی نہیں پھٹک سکی۔“

”ہاں، مجھے اس بارے میں سب معلوم ہے اور خوشی ہے کہ تم نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ اگر پولیس والے اس طرف کا رخ کر لیتے تو ہمیں خاصا نقصان پہنچ سکتا تھا۔ میں تمہاری اور عابد انصاری کی کارکردگی سے بہت خوش ہوں۔ عابد انصاری نے بھی بڑا کام دکھایا اور ایلم کی پہلی کھیپ بڑی آسانی سے نکال لانے میں کامیاب ہو گیا ورنہ سننے میں بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

آرہا تھا کہ جب سے شہریار عادل اے سی کی پوسٹ پر آیا ہے، علاقے سے کچھ بھی نکال لے جانا مشکل ہو گیا ہے۔ تم تو خود حالات سے اچھی طرح واقف ہو۔ تمہارا لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ والا بزنس تو اے سی نے بالکل ٹھپ کر کے رکھ دیا تھا نا۔" ڈیوڈ کا انداز مضحکہ اڑانے والا تھا اور چودھری کو ایسے انداز برداشت کرنے کی عادت نہیں تھی سو تلملا کر رہ گیا اور اپنے بڑبولے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

"اے سی کی کیا حیثیت ہے۔ میں چاہوں تو اس کل کے لڑکے کو مچھر کی طرح مسل کر رکھ دوں لیکن ہمیشہ اس کے بزرگوں سے اپنے پرانے تعلقات کا خیال آجاتا ہے۔"

"اوہ... مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میں رواداری کے جراثیم بھی پائے جاتے ہیں۔ میں نے تو ہمیشہ تمہیں بڑا حسابی کتابی بندہ پایا ہے۔ مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ تم اپنی آن اور دولت کے علاوہ بھی کسی چیز کو اہمیت دیتے ہو۔" ڈیوڈ نے اس پر طنز کا ایک اور تیر پھینکا۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا۔ کبھی موڈ ہوتا تو اس کے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کر لیتا ورنہ ایک آقا کی طرح جس لہجے میں چاہتا گفتگو کرتا۔

"میرا خیال ہے تم یہ ساری فضول باتیں چھوڑ کر مطلب کی بات کرو۔ تم نے کسی کام کے بغیر صرف مجھ سے گپیں لڑانے کے لیے تو فون کیا نہیں ہوگا۔" اس بار چودھری کا میٹر پوری طرح گھوم گیا چنانچہ وہ کڑوے لہجے میں بداخلاقی سے بولا۔

"تم تو ناراض ہو گئے یار! میں نے تو تمہیں شاباش دینے کے لیے فون کیا تھا۔ تمہاری حکمتِ عملی واقعی بڑی زبردست ثابت ہوئی اور پولیس نے اتنا بڑا آپریشن مختصر مدت میں نمٹا لیا۔ اگر پولیس زیادہ عرصہ جنگل میں رہتی تو ہمارے لیے خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔"

"تمہیں اس خطرے سے بچانے کے لیے میں نے بڑی قربانی دی ہے۔ گرفتار ہونے والے ڈاکو میرے نمک خوار تھے اور مشکل حالات میں میرے بڑے کام آتے تھے۔" اس نے احسان جتایا۔

"قربانی کا نام نہ لو۔ تم نے پورا حساب کتاب کر کے ہی قدم اٹھایا ہوگا۔ ہم سے ہونے والے فائدے کا تناسب یقیناً تمہارے ڈاکو دوستوں کے مقابلے میں زیادہ ہی ہوگا جو تم نے ہمارے مفادات کا خیال ان سے زیادہ رکھا۔ ویسے میں نے سنا ہے کہ تمہارے ان نمک خواروں کے قبضے میں تمہاری من پسند ماہ بانو تھی جسے آپریشن کے دوران کوشش کے باوجود تلاش نہیں کیا جا سکا۔ خوب نمک حلالی کا مظاہرہ کیا تمہارے نمک خواروں نے۔ اپنے گاڈ فادر کی محبوبہ کو ہی لے اڑے۔"

دور بیٹھ کر بھی اس کی معلومات حیرت انگیز طور پر اپ ٹو ڈیٹ تھیں۔

"مجھ سے نمک حرامی کر کے انہوں نے اپنے جرم کی سزا پالی ہے اور میں ان اصل مجرموں تک بھی پہنچ گیا ہوں جنہوں نے میرے وفاداروں کو نمک حرامی پر اکسایا تھا۔ وہ مجرم بھی اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔" چودھری نے سنگین لہجے میں اس کے طنز کا جواب دیا۔

"کیا تم مجھے ان اصل مجرموں کا نام بتانا پسند کرو گے؟" ڈیوڈ کے لیے یقیناً یہ ایک انکشاف تھا کہ چودھری کے نمک خوار ڈاکوؤں نے کسی کے اکسانے پر ماہ بانو کو اپنے ڈیرے پر رکھا تھا چنانچہ تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں، وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" چودھری نے سختی سے انکار کر دیا۔

"او کے، ایز یو وش۔ میں نے تمہیں اس وقت شاباش دینے کے علاوہ ایک اہم معاملے پر گفتگو کے لیے فون کیا تھا۔ خوامخواہ ہماری گفتگو طول پکڑ گئی اور فضول بحث میں الجھ کر اصل بات رہ گئی۔" اس کے انکار کا برا مانے بغیر ڈیوڈ نے یکدم ہی گفتگو کا رخ بدل دیا۔

"بولو، میرے پاس بھی وقت کم ہے۔ مجھے کئی اہم کام دیکھنے ہیں۔" ڈیوڈ پر اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لیے وہ رعونت سے بولا جس کی اس نے پروا نہیں کی اور بے نیازی سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ تم سے ہمارے کاروباری مراسم مزید گہرے ہو جائیں۔ پوست کی کاشت کے سلسلے میں تم ہمارے ساتھ جو تعاون کر رہے ہو اس کے علاوہ بھی ہم تمہارے ساتھ مزید کنٹریکٹ کرنا چاہتے ہیں۔"

"وہ کیا؟" چودھری کی رال ٹپکی۔ بے پناہ خاندانی دولت کے علاوہ وہ غریب مزارعوں کا خون چوس کر بھی خوب کماتا تھا۔ اس کے باوجود اس کی دولت کے لیے ہوس کم نہیں ہوتی تھی۔ اس کی بدبختی کا دوزخ ہمیشہ ھل من مزید کا نعرہ ہی لگاتا رہتا تھا چنانچہ ڈیوڈ نے مزید بزنس کی بات کی تو اس کا ہوس پرست ذہن فوراً آنے والی مزید دولت کا اندازہ لگانے لگا۔

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارا ایک جوتوں کا کارخانہ بھی ہے۔ ہم تمہارے اس کارخانے میں ایک لیب بنانا چاہتے ہیں۔ اس لیب میں افیم سے ہیروئن تیار کی جائے گی۔ اس کام کے لیے ہم اپنے دو ایکسپرٹس کو بھجوائیں گے۔ ہمارے وہ ایکسپرٹس پہلے سے ہی ایک علاقے میں کام کر رہے ہیں لیکن

WWW.PAKSOCIETY.COM

اب وہاں حالات بہت مخدوش ہو چکے ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف آپریشن میں فورس ان علاقوں میں داخل ہو چکی ہے۔ دوسری سرکاری ایجنسیاں الگ پیچھے لگی رہتی ہیں۔ منشیات کے معاملے میں ان علاقوں کی بدنامی اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ وہاں رہ کر خود کو نظروں سے بچانا مشکل ہو گیا ہے۔ اسی لیے ہم یہ نیا سیٹ آپ تیار کر رہے ہیں۔" ڈیوڈ کی اس مختصر بریفنگ نے چودھری پر بہت سے عقدے کھول دیے۔

اسے سمجھ آنے لگا کہ ڈیوڈ نے اس کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ پیرآباد سے متصل جنگل اپنے خصوصی جغرافیائی، ارضی اور موسمی حالات کی وجہ سے اس قابل تھا کہ وہاں آسانی سے پوست کی کاشت کی جا سکے۔ وہاں سبزہ بھی تھا اور نہر کا رواں پانی بھی۔ اس کے علاوہ خاصا طویل پہاڑی سلسلہ الگ تھا۔ ڈیوڈ کے ماہرین نے چھوٹی موٹی جینیاتی تبدیلیاں کر کے آرام سے وہاں پوست کے پودے کو کاشت کے قابل بنا لیا تھا۔ بے حد خفیہ طریقے سے کاشت کی گئی اس فصل سے آرام سے افیم حاصل کی جاتی اور پھر اس کے جوتوں کے کارخانے میں ہیروئن بننے کے عمل سے گزر جاتی۔ اگر اس عمل کے دوران کسی قسم کی ناگوار بو وغیرہ پیدا بھی ہوتی تو جوتوں کے ایک بڑے کارخانے میں جہاں چمڑا رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا، اس بو کو الگ سے شناخت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ پھر کارخانے کی وجہ سے جو کور ملی وہ الگ تھی۔ برسوں سے کام کرتے ایک کارخانے پر کون شک کر سکتا تھا کہ وہاں ہیروئن کی تیاری جیسا مہلک اور خطرناک کام ہو رہا ہے۔ وہ قوم یہود کے اس نمائندے کی ذہانت اور منصوبہ سازی پر دل ہی دل میں اش اش کر اٹھا۔ وہ ایسے تباہ کن دماغ کے مالک تھے جب ہی تو اپنی تھوڑی سی تعداد کے باوجود دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ امریکا جیسی سپرپاور بھی ان کے اثر سے محفوظ نہیں تھی۔

"اس کام میں میرے لیے بہت خطرات ہیں۔ اگر کسی وقت سرکاری ایجنسیوں کی نظر پڑ گئی تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ میری خاندانی عزت اور نیک نامی داؤ پر لگ جائے گی۔" اپنے بھاؤ بڑھانے کے لیے اس نے فوری طور پر ہامی بھرنے کے بجائے خدشات کا اظہار شروع کر دیا۔ اس طرح وہ اپنے حصے میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ ہیروئن جیسا زہر کہاں کہاں پھیلے گا اور کس کس کی زندگیاں برباد کرے گا، اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ دولت کا ایسا وفادار پجاری تھا جس کی نظریں اپنی مایا دیوی سے ہٹ کر دائیں بائیں کہیں بھی نہیں پڑتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اس دیوی کے قدموں میں ہی سر جھکائے رکھنے کو زندگی کی معراج سمجھتا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ زندگی کا دورانیہ ہے ہی کتنا طویل۔ خصوصاً اس جیسے انسان کے لیے جو تیزی سے ادھیڑ عمری کی منازل طے کرتا ہوا بڑھاپے کی طرف گامزن تھا۔ یوں تو موت کا کوئی وقت متعین نہیں اور وہ اپنا وار کرنے پر آئے تو ماں کی کوکھ میں پلتے بچے سے لے کر گبرو جوان تک کسی سے رعایت نہیں کرتی لیکن انسان کو عمر کی منازل طے کرتے ہوئے بھی موت کا خیال ذرا مشکل سے آتا ہے، پر بڑھاپے میں تو سب ہی اس کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں اور ہمیشہ یہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ جانے کب موت جسم سے روح کو جھپٹ کر لے جائے اور زندگی کا سارا ہنگامہ پل بھر میں معدوم ہو جائے... مگر وہ چودھری افتخار عالم تھا جو زندگی کے ایک ایک لمحے سے کیف و نشاط نچوڑ لینا چاہتا تھا اور شاید دولت کا کیف ہر شے سے بڑھ کر تھا۔ یہ انسان کے پاس ہو تو وہ سمجھتا ہے دنیا اس کی مٹھی میں ہے۔ چودھری بھی یہ سوچے بغیر کہ وہ چاہے اپنی مٹھی میں ساری دنیا کی دولت سمیٹ لے آخرکار خالی ہاتھ ہی یہاں سے رخصت ہو گا، اپنے لیے دولت کے انبار جمع کرنے میں مصروف تھا۔ دولت کے اس ڈھیر میں مگن اسے تیزی سے ختم ہوتی عمر کی نقدی کا احساس ہی نہیں تھا۔

"خطرات میں تم پہلے سے ہی گھرے ہوئے ہو۔ تمہاری عزت داؤ پر لگنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تم اپنے آدمیوں کی مدد سے پوست کاشت کروا رہے ہو۔ کبھی اس جرم میں بھی پکڑے گئے تو جان چھڑانا مشکل ہو گا لیکن یہ تم بھی جانتے ہو اور ہم بھی جانتے ہیں کہ تمہارے ملک میں یہ مشکل دولت سے آسان ہو جاتی ہے۔ اس لیے تمہارے حق میں بہتر ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت کماؤ اور عیش کرتے رہو۔ کبھی پکڑے بھی گئے تو دولت کے بل بوتے پر آسانی سے بچ نکلو گے۔" ڈیوڈ نے اس کی چال میں پھنسنے کے بجائے نپا تلا جواب دیا۔

"تو پھر یہ دولت واقعی زیادہ ہونی چاہیے۔ اس بار تمہیں مجھ سے پہلے سے زیادہ پرکشش پر معاملات طے کرنے ہوں گے۔" چودھری نے اپنی کوشش ترک نہیں کی اور چاہا کہ ڈیوڈ کی بات پکڑ کر اپنے لیے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کر لے۔

"نہیں، اس بار تمہیں وہ قبول کرنا ہو گا جو ہم تمہیں دیں۔ پہلی بار ہم نے تمہارا بہت خیال کیا تھا لیکن اب سب ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم نے ہمارے ساتھ تعاون نہیں کیا تو ہم خود تمہارے خلاف مخبری کر دیں گے۔ اب تم یہ سوچ لو کہ تمہارے پاس بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہمارا کوئی آدمی جانے نہیں ہے۔ ہمارا تھوڑا بہت مالی نقصان ہو گا جسے برداشت کر کے ہم پھر دوبارہ کہیں اور نیا سیٹ اپ جما لیں گے لیکن تم اور تمہارے آدمی پکڑے جائیں گے۔ بہرحال، ان باتوں سے تم یہ نہیں سمجھو کہ تم ہمارے ساتھ معاملہ کر کے گھاٹے میں رہو گے۔ ہم معاوضہ اپنی مرضی کا دیں گے لیکن وہ اتنا ہو گا کہ تم خوش رہو گے۔" چودھری کو اس کی پوری اوقات بتانے کے بعد ڈیوڈ نے آخر میں ایسی بات بھی کہہ دی کہ اس کی اشک شوئی ہو سکے۔

"دھمکیاں مت دو ڈیوڈ صاحب! ابھی تم خود کہہ چکے ہو کہ ہمارے ملک میں دولت کے بل بوتے پر بچ نکلنا کچھ ایسا مشکل نہیں ہے... اور جہاں تم اتنا کچھ جانتے ہو وہاں یہ بھی ضرور جانتے ہو گے کہ میرے پاس دولت کی پہلے بھی کمی نہیں ہے۔"

"لیکن تم اس دولت میں اضافہ تو چاہتے ہو اور ہمارا ساتھ تمہاری دولت میں کئی ملین کا اضافہ کرے گا۔" چودھری کی ناراضی کی پروا کیے بغیر ڈیوڈ نے ترت جواب دیا اور یہ جواب ایسا تھا کہ چودھری کا منہ بند ہو گیا۔ وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اگر ڈیل ڈیوڈ کی مرضی سے ہوئی، تب بھی وہ نقصان میں نہیں رہے گا۔

"اوکے، یہ بتاؤ کہ کام کب سے شروع کرنا ہے؟ کارخانے میں لیبارٹری قائم کرنے کے لیے وہاں کنسٹرکشن کا کام بھی تو کرنا ہو گا۔" اس نے ایک طرح سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

"ان تمام معاملات کے لیے میرا آدمی آ کر تم سے مل لے گا۔ وہی تمہیں بتائے گا کہ کیا اور کس طرح کرنا ہے۔ تمہیں بس اس سے تعاون کرنا ہو گا۔" اس کے ہامی بھرتے ہی ڈیوڈ کا لہجہ ایک بار پھر تحکمانہ ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے آدمی کو ویل کم کہنے کے لیے تیار ہوں۔" چودھری نے جواب دیا۔

"گڈ! مجھے تم سے یہی امید تھی۔" ڈیوڈ نے اسے شاباشی دے کر سلسلہ منقطع کر دیا اور چودھری اپنے غیرملکی آقا کی پچکار سن کر آنے والی دولت کے تصور سے مسکرانے لگا۔ اس کے حساب سے آج کے برے دن میں اسے یہ پہلی ایسی خوش خبری ملی تھی جو اس کے لیے طمانیت بخش تھی... اور بھلا انسان وہ بھی پستی میں گرا ہوا انسان کہاں جانتا ہے کہ وہ جس شے کو اپنے لیے خیر سمجھ رہا ہے وہی سب سے بڑا شر ہے۔

☆☆☆
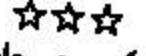
"بس بھئی، اب رک جاؤ۔ چلتے چلتے پیروں میں درد ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر اور چلے تو میں بے ہوش ہو کر گر جاؤں گی۔" وہ تینوں مسلسل سفر میں تھے۔ پکڑے جانے کے خوف نے انہیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ جلد از جلد جتنا ممکن ہو، اتنی دور نکل جائیں چنانچہ وہ اپنی تھکن کی پروا کیے بغیر کبھی دوڑ کر اور کبھی چل کر فاصلہ بڑھانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ ان کا یہ سفر تقریباً بے سمت تھا اور اسلم اپنے اندازوں کی بنیاد پر اب تک راہ کا تعین کرتا رہا تھا۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد اب جا کر انہیں کچھ سکون ہوا تھا کہ ان کا تعاقب نہیں کیا جا رہا ہے اور اب وہ قدرے محفوظ ہیں۔ شاید تحفظ کا ہی احساس تھا جو لالی کی زبان پر اپنی تھکن کا تذکرہ آ گیا تھا اور اس نے کچھ دیر رکنے کی استدعا کی تھی۔

"اگر تم بے ہوش ہو کر گر گئیں تو یہ میرے لیے بڑا خوشی کا مقام ہو گا۔ میں سوچوں گا کہ بڑی مصیبت سے آسانی سے جان چھوٹی اور خس کم جہاں پاک کہہ کر ہاتھ جھاڑتا ہوا آرام سے آگے بڑھ جاؤں گا۔" اسلم نے اپنے قدم روکے بغیر اسے بے مروتی سے جواب دیا۔

"مجھے معلوم ہے تم ایسا نہیں کر سکو گے کیونکہ چاہے میں تمہیں جتنی بھی بری لگتی ہوں لیکن تمہارا دل اتنا برا نہیں ہے کہ ایک انسان کو اس تنہا و ویران جگہ پر بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر جانے پر آمادہ ہو جائے۔" اس کی بے مروتی کو خاطر میں لائے بغیر لالی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور خود اطمینان سے دھپ کر کے ایک پتھر پر براجمان ہو گئی۔ اس کی اس حرکت پر اسلم رک کر اسے غصے سے گھورنے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ کوئی اتنی لڑنے جھگڑنے والی بات نہیں ہے۔ ہم خطرے سے کافی دور نکل آئے ہیں اور کچھ دیر یہاں رک کر آرام کر سکتے ہیں۔" اب تک خاموش تماشائی بنی ماہ بانو نے ان کے درمیان مداخلت کرتے ہوئے جھگڑے کو ختم کرنے کی کوشش کی اور خود بھی لالی کے قریب ہی ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔

"اگر آپ دونوں خواتین کا یہی اصرار ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم یہاں رک جاتے ہیں اور کچھ پیٹ پوجا کا بندوبست کرتے ہیں ورنہ تو میرا خیال تھا کہ کچھ وقت اور گزر جائے تو پھر کہیں رکیں گے اور رات کا کھانا کھا کر سو جائیں گے۔ ابھی تو دن کی تھوڑی روشنی باقی ہے۔" اسلم گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے خود بھی قریب ہی ٹک گیا اور اپنی رائفل ایک جانب پڑے پتھر سے ٹکا دی۔

"اگر ایسی بات ہے تو پھر چلو چلتے ہیں۔ جہاں اتنی ہمت کی ہے تھوڑی دیر اور برداشت کر لیں گے۔" اس کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

توجیہہ سن کر لی فوراً کھڑی ہو گئی لیکن اب اسلم کی توجہ بھٹک چکی تھی۔ وہ اردگرد کی ہر شے کو چھوڑ کر ماہ بانو کے پیروں کی طرف متوجہ تھا۔ شفاف رنگت والے بھرے بھرے پاؤں اس نے ابھی ابھی جوتوں سے باہر نکالے تھے اور طویل مسافت کے گواہ چھالوں کو نرمی سے اپنی مخروطی انگلیوں سے سہلا رہی تھی۔ اس کے چھالوں کو دیکھ کر اسلم کا دل تڑپ گیا۔ ماہ بانو لڑکی تھی جسے وہ ہمیشہ ہتھیلی کا چھالا بنا کر بہت پیار سے رکھنا چاہتا تھا لیکن عجیب ہی بات تھی کہ وہ آبلہ پا بیٹھی تھی اور وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

”اب خود جم کر بیٹھ گئے ہو۔ میں کہہ رہی ہوں کہ چلو تو تمہیں سنائی ہی نہیں دے رہا۔“ لی کی نظروں نے یہ سارا منظر اچھی طرح دیکھا تھا چنانچہ لہجے میں حسد کی آگ سمو کر تیز لہجے میں اس سے بولی۔

”نہیں، اب رہنے دو۔ اب جب ہم رک ہی گئے ہیں تو ذرا سا وقت اور کیا دیکھنا۔ تم لوگ آرام کر لو۔ میں کھانے کے لیے کچھ لاتا ہوں۔ صبح ہم ذرا جلدی چل پڑیں گے۔“ نہایت معقولیت سے سفر دوبارہ شروع کرنے سے انکار کرتا ہوا وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور چہرے پر ذرا سی غصے کی سرخی لیے کھڑی لی کی طرف دیکھ کر پہلے مسکرایا اور پھر آسمان پر نظر دوڑاتا ہوا پُرسوچ انداز میں بولا۔ ”لگتا ہے یہاں کہیں قریب ہی پانی کا کوئی ذخیرہ ہے۔ اگر تم ان پرندوں کو غور سے دیکھو تو اندازہ ہوگا کہ یہ ایک ہی سمت میں رخ کر رہے ہیں۔“ لی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا لیکن دل میں اس سے اتفاق کیے بغیر نہیں رہ سکی۔ دن بھر اڑانیں بھرتے پنچھی شام ڈھلے اپنے مساکن میں واپس لوٹ رہے تھے اور واقعی ایک مخصوص سمت میں اتر رہے تھے۔

”چلو تم بھی کیا یاد کرو گی۔ آج تمہیں کسی پرندے کا مزے دار سا گوشت خود بھون کر کھلاتا ہوں۔ ایسا زبردست ذائقہ ہوگا کہ زندگی بھر بھول نہیں سکو گی۔“ لہجے کو خوش گوار بناتے ہوئے وہ اپنی رائفل اٹھا کر اس سمت میں آگے بڑھ گیا اور دانستہ اس جانب دیکھنے سے گریز کیا جہاں ماہ بانو بیٹھی تھی۔

وہ برسوں سے لی کو جانتا تھا اور اس کا خوب مزاج آشنا تھا اس لیے سمجھ سکتا تھا کہ اس کا زیادہ التفات ماہ بانو کے لیے لی کے دل میں نفرت کو بڑھا دے گا اور وہ اس کی دشمن بن جائے گی۔ ہم سفروں میں سے کسی کو بھی دشمن بنا کر چلنا بڑی نادانی کی بات تھی، سو وہ یہ نادانی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اونچے نیچے ناہموار راستے پر پیر جما کر چلتا ہوا وہ آگے بڑھا تو ایک چھوٹے سے ٹیلے کی اوٹ میں پہنچ کر اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ یہاں ایک کافی بڑے گڑھے میں اچھا خاصا پانی جمع تھا۔ یہ یقیناً بارش کا پانی تھا جس میں ڈھیروں کائی اگ آئی تھی لیکن اس کے باوجود پانی کا یہ ذخیرہ پرندوں کی پیاس بجھانے کے لیے کارآمد تھا۔ اب بھی نوبان کئی پرندے جمع تھے اور کنارے پر بیٹھ کر وقتاً فوقتاً اپنی چونچیں پانی میں ڈبو کر پانی پی رہے تھے۔ وہ نہایت خاموشی سے ایک جگہ ٹک گیا اور اپنی رائفل کو سنگل شاٹ پر سیٹ کر کے سامنے رو کے ایک صحت مند بطخ نما پرندے کا نشانہ باندھنے لگا۔ وہ لوگ جن حالات میں ڈیرے سے نکلے تھے، اپنے ساتھ زیادہ کھانے پینے کا سامان نہیں لا سکے تھے۔ خوراک کے نام پر ان کے پاس چنے، گڑ کی ڈلیاں اور بس پانی ہی موجود تھا چنانچہ یہ ضروری تھا کہ جہاں شکار کا موقع مل سکے، وہاں اس سے استفادہ کیا جائے۔ ڈیرے سے اتنی قلیل خوراک کا ذخیرہ لے کر وہ نکلا بھی اسی بھروسے پر تھا اور اب رائفل سے نشانہ باندھے اپنی نشانہ بازی کی مہارت کا مظاہرہ کرنے ہی والا تھا۔ جیسے ہی اس کا منتخب کیا ہوا پرندہ فوکس ہوا، اس نے رائفل کی لبلبی دبا دی۔ انسان اور اس کی ایجادات کی آوازوں سے محروم پہاڑوں کا یہ ویران سلسلہ جہاں پرندوں کی چہچہاہٹ کے سوا کچھ نہیں سنائی دیتا تھا، رائفل کے اس اکلوتے فائر سے گونج اٹھا۔ یک دم ہی وہاں ایک ہلچل سی مچ گئی اور برسوں بلکہ شاید صدیوں سے بغیر کسی انسانی مداخلت کے وہاں سکون سے بسنے والے پرندے گھبرا کر شور مچاتے ہوئے فضا میں چکرانے لگے۔ وہ رائفل چھوڑ کر خود اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے اس پرندے کی طرف بھاگا جو اس کی گولی کا نشانہ بن کر زخمی ہوا تھا اور بُری طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ پرندے کو اس کے سر سے پکڑ کر اس کے گلے پر چھری پھیر کر حلال کرنے کی نیت سے اس نے اپنے پیر کی طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ وہاں بندھا خنجر نکال سکے لیکن ایک آواز پر بُری طرح چونک کر پلٹا۔ کسی نے بہت زور سے اسلم کہہ کر پکارا تھا اور پکارنے والی آواز مردانہ تھی اس لیے اس کا اس طرح چونکنا سمجھ آتا تھا۔

پلٹتے ہی اس کی نظروں نے ایک بہت ہی خوفناک منظر دیکھا۔ اس کے سامنے لی اور ماہ بانو ساتھ ساتھ کھڑی تھیں اور ایک رائفل کی نال نے انہیں اپنی زد میں لے رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ سے پھڑکتے ہوئے پرندے کی گردن چھوٹ گئی اور اس نے بے بسی سے اس سمت دیکھا جہاں اس کی رائفل پڑی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

رائفل اس کی پہنچ سے بہت دور تھی۔ وہ بہت زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتا، تب بھی اس حد تک کامیاب نہیں ہوسکتا تھا کہ نلی اور ماہ بانو کو زد میں لیے کھڑے جمرو کی رائفل کے شعلہ اگلنے سے قبل اس تک پہنچ جاتا۔ ہاں، وہ جمرو ہی تھا جو نہ جانے کس طرح ان تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور اب کسی عفریت کی طرح دانت نکوستا ہوا ان کے سروں پر کھڑا تھا۔

"نہ نہ میرے ہیرو! رائفل کی طرف بڑھنے کی غلطی نہ کرنا۔ یہ غلطی کی تو سمجھ لینا کہ اِدھر تو ہلا، اُدھر میں نے گولی چلائی۔ ہاں، یہ تو بتا دے کہ پہلی گولی تیری محبوبہ کی کھوپڑی میں اتاروں یا اس عاشقہ کی جو وچاری نہ تو فلموں کی ہیروئن بن سکی ہو ورنہ ہی تیری۔ پچ پچ وچاری کی قسمت ہی ماڑی ہے۔ ورنہ شکل کے تو ہم تم دونوں ہی گواہ ہیں کہ یہ وچاری رج کے سوہنی تھی۔" جمرو نے اس کی نظروں کا زاویہ پہچان لیا تھا اس لیے فوراً ہی اسے تنبیہ کرڈالی۔

"فضول بکواس نہ کر اور جو چاہتا ہے صاف صاف بتا دے۔" ان دونوں کو رائفل کی زد میں دیکھ کر وہ اندر سے خاصا پریشان ہوگیا تھا لیکن اپنی اس پریشانی کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور سخت لہجے میں بولا۔

"چاہتا تو میں تیری جان ہوں لیکن اس سے پہلے یہ بتا کہ تو بغل میں یہ دو دو چڑیاں دبائے کدھر جارہا تھا۔ یہ تو اتفاق کی بات ہے کہ ڈیرے پر پولیس کا ریڈ ہوتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلا ورنہ دوسروں کی طرح رک کر مقابلہ کرنے کی حماقت نہیں کی۔ وہ پولیسیے جس طرح فائر پر فائر کر رہے تھے، صاف پتا لگ رہا تھا کہ وڈی تیاری کے ساتھ آئے ہیں اور کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے سوچا مارے جانے یا گرفتار ہونے سے بہتر ہے کہ بھاگ نکلوں۔ بھاگنے کے لیے اس راستے کو چنتے ہوئے مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ اِدھر تم لوگوں سے ٹاکرا ہوجائے گا۔ وہ تو اچانک ہی یہ دونوں نظر آگئیں تو میں حیران رہ گیا۔ تو نے تو سب سے زیادہ پھرتی دکھائی وہاں سے بھاگنے میں بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ تو پولیس والوں کے پہنچنے سے پہلے ہی اُدھر سے بھاگ نکلا تھا۔ اچانک افراتفری میں بھاگا ہوتا تو ان دونوں کو لے کر نکلنا آسان نہیں ہوتا پھر تمہارے حلیے بھی بتا رہے ہیں کہ تم لوگ پوری تیاری سے بھاگے تھے۔ سچ بتا کہ کہیں تو نے ہی تو پولیس کو مخبری نہیں کر دی تھی؟ تجھے معلوم ہوگا کہ پولیس کب ڈیرے پر حملہ کرے گی اس لیے تو پہلے ہی سے بھاگ نکلا۔" ذرا کی دیر میں جمرو نے جو اندازے قائم کیے تھے، وہ کسی حد تک صحیح تھے لیکن زیادہ تر الزام تراشی کے زمرے میں آتے تھے۔

اس کے ان الزامات کو سن کر اسلم ہنستا گیا اور دانت پیستے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔ "جس تھالی میں کھاؤ اس میں چھید کرنا تمہاری فطرت ہوسکتی ہے، میری نہیں۔ میں گروہ کو چھوڑنے کے ارادے سے ضرور وہاں سے نکلا تھا لیکن غداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غداری بزدلوں کا شیوہ ہے اور میں تیری طرح بزدل نہیں ہوں۔"

"میں نے تجھے بزدل کہا بھی کب ہے؟ تو تو ہیرو ہے ہیرو۔ جب ہی تو دو دو لونڈیوں کو بغل میں لے کر گھوم رہا ہے۔ یہ سالی نلی تو سالوں سے تیری دیوانی ہے پر قسمت دیکھو کہ یہ چار دن کی آئی لونڈیا تیرے دل پر ایسی چڑھ گئی کہ تو اس کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑنے پر راضی ہوگیا۔ ایسا قبضہ جمایا تو نے اس پر کہ ہم تو اسے چھونے کو ترس گئے۔ اب میں تیرے سامنے ہی اس کی مٹی پلید کروں گا۔ وڈا ترسایا ہے تو نے ہمیں اس کے لیے۔ اب میں اپنے دل کے سارے ارمان نکالوں گا۔" جمرو کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ افراتفری میں بس اپنی رائفل لے کر ہی ڈیرے سے بھاگ سکا ہے۔۔۔ اور صرف اس وجہ سے کہ وہ تنہا تھا اور اس کے ساتھ اسلم کی طرح دو نازک اندام خواتین نہیں تھیں، ان کا طے کردہ فاصلہ ان سے قلیل وقت میں پاٹ کر وہاں تک آپہنچا ہے لیکن اس سب کے باوجود اس کی خباثت اپنے عروج پر تھی۔ نہ تو اس کی آنکھوں سے ٹپکتی ہوس میں فرق آیا تھا اور نہ ہی ہونٹوں پر دوڑتی شیطانی مسکراہٹ جدا ہوسکی تھی۔ وہ اب بھی وہی جمرو تھا جو ڈیرے پر ہوتا تھا۔

"اگر تو نے ماہ بانو کو انگلی بھی لگائی تو میں تجھے کتے کی موت ماروں گا۔" اس کی باتیں سن کر اسلم کا پارا چڑھ گیا اور وہ اس کے ہاتھ میں دبی رائفل کی پروا کیے بغیر غضب ناک ہوکر اس پر جھپٹنے کے لیے تیار ہوگیا۔

"وہیں رک جا اسلم ورنہ ایک سیکنڈ میں گولی اس کی کھوپڑی کے اندر ہوگی۔" جمرو نے فوراً ہی رائفل کی نال ماہ بانو کے سر سے لگادی اور اسے دھمکی دی۔ اسلم نے شدید بے بسی کے احساس کے ساتھ اپنے قدموں کو روک لیا۔ اسی پل اس کا شکار کیا ہوا پرندہ تڑپنا پھڑکنا چھوڑ کر ساکت ہوگیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اب تیرا ہیرو پن نہیں چل سکے گا۔ زیادہ منہ زوری دکھانے کی کوشش کرے گا تو اس پرندے کی طرح ہی زمین پر گرا اپنے خون میں لت پت مردہ پڑا ہوگا۔ ادھر اس ویرانے میں کوئی تجھے کفن دفن دینے کے لیے بھی نہیں ملے گا۔" جمرو کا لہجہ کسی درندے کی غراہٹ لیے ہوئے تھا۔ اسلم کو اپنی جان کی پروا نہیں تھی لیکن وہ صرف اس لیے خود کو قابو میں رکھے ہوئے تھا کہ اس کی ذرا سی لغزش ماہ بانو کی زندگی کا چراغ گل کرسکتی تھی۔ یہ تو اپنی جگہ طے تھا کہ وہ جیتے جی جمرو کو اس کے ناپاک عزائم میں کامیاب نہیں ہونے دے گا لیکن انتہائی صورت سے پہلے ایسی کوئی جذباتی حرکت کرنا جو ماہ بانو کے لیے نقصان دہ ثابت ہو، کسی طور مناسب نہیں تھا۔

"للّی جانم! ذرا ادھر سے وہ رائفل تو اٹھا کر میرے پاس لے آ۔ یہ ادھر پڑی رہی تو اپنا ہیرو خواہ مخواہ اس تک پہنچنے کے لیے پھڑکتا رہے گا۔" اسلم کو ساکت ہوتے دیکھ کر جمرو نے طنزیہ لہجے میں للّی کو حکم دیا۔ وہ فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل کے لیے حرکت میں آگئی اور ایک ایک قدم مضبوطی سے رکھتی ہوئی رائفل کی طرف بڑھی۔ ماہ بانو کے سر سے رائفل کی نال لگائے کھڑے جمرو کی نگاہیں چابک دستی سے اس کی اور اسلم کی بہ یک وقت نگرانی کرتی رہیں۔ للّی کے رائفل لے کر واپس پلٹنے تک اس نے کہیں کوئی موقع نہیں دیا کہ اسلم اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا پاتا۔

"شاباش، تجھ میں ایک یہی گل اچھی ہے کہ کبھی کسی فرمائش کو پورا کرنے سے انکار نہیں کرتی۔ تو نے وڈی پیاس بجھائی ہے میرے بدن کی۔ تیری اس خدمت کے صلے میں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تجھے جان سے نہیں ماروں گا۔" اسے رائفل سمیت واپس پلٹتا دیکھ کر جمرو نے چہک کر کہا۔

"لیکن میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کرسکتی۔ تو اسلم کو کچھ کرسکے، اس سے پہلے میں تجھے جان سے ماردوں گی۔" اس کی جانب آتی للّی یکدم ہی اس سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر رک گئی اور رائفل کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے غرائی۔

"یہ تو کیا کررہی ہے؟" جمرو بوکھلا گیا۔

"تو نے مجھے اسلم کی عاشقہ کہا تھا تو پھر تو یہ کیوں بھول گیا کہ میں اسلم کی خاطر کچھ بھی کرسکتی ہوں۔" للّی نے اسے جواب دیا۔

"رائفل پھینک دے للّی ورنہ میں اسے گولی ماردوں گا۔" جمرو نے اسے دھمکی دی۔

"ماردے۔ یہ مرگئی تو میری راہ کا کانٹا آپ ہی نکل جائے گا۔" للّی نے بے نیازی سے جواب دیا۔ اس جواب کے بعد جمرو کسی نئی حکمتِ عملی سے کام لیتا، اس سے قبل ہی اسلم تقریباً اڑتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ للّی میں الجھ کر اس کی توجہ بٹ گئی اس لیے وہ ایک پل کے لیے اسلم کی طرف سے غافل ہوگیا تھا اور اسلم کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ اس نے سب سے پہلے جمرو کے رائفل والے ہاتھ کو ہی قابو میں کیا اور وحشیانہ طاقت سے کام لے کر ایک ہی جھٹکے میں اس کے ہاتھ سے رائفل چھین لی۔ بدحواسی کا شکار ہوجانے والا جمرو فوری طور پر خود کو سنبھال نہیں سکا اور لڑکھڑاتا ہوا پیچھے گر گیا۔ اسلم نے رائفل کو نال کی طرف سے ڈنڈے کی طرح پکڑا اور جمرو پر پل پڑا۔ اس کے چار پانچ ضربیں لگانے تک تو جمرو اپنے دفاع میں کچھ نہیں کرسکا اور ادھر ادھر لڑھکتا رہا لیکن پھر اسے بھی ایک موقع مل ہی گیا۔ یہ موقع اسے اس پتھر کی صورت میں ملا تھا جس کے قریب وہ لڑھکتا جا گرا تھا۔ پتھر بہت بڑا نہیں تھا اور آسانی سے اس کے بائیں ہاتھ میں سما گیا تھا۔ اس نے اپنی جگہ پڑے پڑے اسے پوری قوت سے اسلم کی طرف اچھال دیا۔ پتھر اڑتا ہوا اس کے پیٹ میں جا کر لگا۔ خوش قسمتی سے وہ پتھر کسی سخت چٹان کے حصے کے بجائے مٹی کا ڈھیلا ثابت ہوا ورنہ جمرو نے جس طاقت سے اسے اس کی طرف اچھالا تھا، اس کا حشر نشر ہوجاتا۔ اب بھی وہ لڑکھڑا سا گیا اور سنبھلنے تک جمرو کو اٹھ کر کھڑے ہونے کی مہلت مل گئی۔ اور اس کے ایک ہی حملے نے اسلم کے ہاتھوں سے رائفل گرادی تھی۔

اس کی اور اسلم کی دشمنی کی بنیاد تب ہی پڑ چکی تھی جب اسلم کا دل ماہ بانو پر اس بری طرح آگیا تھا کہ اس نے اسے سب کے ہاتھوں کا کھلونا بننے...... کے بجائے سردار کے قدموں میں اپنا سارا مال و متاع ڈھیر کرکے محفوظ و مامون کر دیا تھا۔ عورت کا رسیا جمرو اس صورتِ حال پر بڑا جھلایا تھا۔ اس کی رال مسلسل ماہ بانو پر ٹپکتی رہی تھی لیکن وہ باوجود کوشش کے اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ ماہ بانو کو لے کر شروع ہونے والی ان دونوں کے مابین یہ چپقلش دوسرے جھگڑوں کا سبب بھی بنی تھی اور وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے تھے۔ خصوصاً جمرو تو موقع کی تلاش میں ہی رہتا تھا کہ کب اسلم کا کانٹا بیچ سے نکلے اور اس کی ماہ بانو تک رسائی ہوسکے۔ آج بدترین حالات میں بھی جب اسے لگا کہ وہ اسلم کو قابو کرسکتا ہے تو اس نے فوراً ہی اس کے خلاف کمر کس لی لیکن اب دونوں کے ہی نہتے ہو جانے کی صورت میں طاقت کا توازن تقریباً برابر ہوچکا تھا اور فتح اسے ہی حاصل ہوتی تھی جو خود کو زیادہ بڑا شہ زور ثابت

کردیتا۔ طاقت کے اس توازن کو اگر کوئی بگاڑ سکتا تھا تو وہ للّی تھی۔ وہ اسلم کی حمایتی تھی اور اس وقت اسلم کی لوڈڈ رائفل لیے وہاں کھڑی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے ان دونوں کے جھگڑے میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی اور خاموشی سے ان کے مابین جاری لڑائی کو دیکھ رہی تھی۔

جمرو نے کھڑے ہوتے ہی اسلم کی طرف چھلانگ لگائی۔ اتفاق سے یہی حرکت اسلم نے بھی کی اور نتیجتاً دونوں فضا میں ہی ایک دوسرے سے بری طرح ٹکرائے اور ان کے سروں کے درمیان ہونے والی ٹکر کی آواز واضح طور پر سنائی دی۔ ٹکرانے کے بعد دونوں ہی پیچھے کی طرف الٹ کر گر پڑے اور دونوں ہی نے بے مثال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو ایک بار پھر اپنے قدموں پر کھڑا کرلیا۔ کھڑے ہوتے ہی وہ ایک بار پھر ایک دوسرے پر جھپٹے۔ اسلم کے دائیں ہاتھ کا گھونسا جمرو کے جبڑے پر پڑا اور اس کی بتیسی ہل کر رہ گئی۔ زخمی منہ سے جاری ہونے والا خون اس کی باچھوں سے نکل کر بہنے لگا مگر اسے ان چوٹوں کی پروا ہی کہاں تھی۔ اپنی چوٹ پر منہ سے ذرا سی بھی آواز نکالے بغیر اس نے اسلم کے کان پر ایک جوابی گھونسا رسید کیا۔ گھونسا خاصی قوت سے رسید کیا گیا تھا۔ اسلم کو یوں لگا جیسے اس کے کان کا پردہ پھٹ گیا ہو۔ بری طرح بلبلاتے ہوئے اس نے اپنا گھٹنا موڑ کر جمرو کے پیٹ میں مارا۔ اس چوٹ کو کھا کر جمرو بری طرح ڈکرایا لیکن اسلم کو چھوڑ کر پیچھے ہٹنے کے بجائے اس سے چمٹ گیا اور کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح اسلم کی گردن کو گرفت میں لے کر دبا دے۔ اسلم نے طرح دینے کی کوشش کی لیکن پھر بھی اس کی گردن جمرو کے ہاتھ میں آگئی اور اس نے پوری قوت سے اسے دبانا شروع کردیا۔ جواباً اسلم نے بھی اس کے ساتھ یہی حرکت کی۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کا گلا دبا کر ایک دوسرے کی جان لینے کے درپے تھے لیکن خود گرفت میں ہونے کے باعث پوری طرح زور لگانے سے قاصر تھے۔

"تم رائفل لے کر ایسے خاموش کیوں کھڑی ہو؟ اس لڑائی کو ختم کیوں نہیں کرواتیں؟" بہت دیر سے خاموش ماہ بانو نے محوِ تماشا للّی کو یہ صورتِ حال دیکھ کر ٹوکا۔

"یہ لڑائی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہاں جمرو کی لاش نہیں گر جاتی۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"تم پاگل ہوگئی ہو کیا؟ انسان کی لاش گرنے کا ذکر ایسے کررہی ہو جیسے کسی کیڑے کوڑے کی بات ہو۔۔۔ اور ویسے بھی کیا ضروری ہے کہ لاش جمرو کی گرے۔ اسلم کو بھی تو کچھ ہوسکتا ہے۔" ماہ بانو نے برہمی کا اظہار کیا۔

"میرا اسلم شیر ہے۔ اسے کسی کے ہاتھوں مات ہو، اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ادھر اگر کسی کی لاش گرے گی تو وہ جمرو ہی ہوگا اور تم یہ سمجھ لو کہ جمرو کا مرنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے ورنہ اس کے ارادے تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔" للّی کا جواب سن کر اسے خاموش ہونا ہی پڑا۔ دوسری طرف وہ دونوں ایک دوسرے کو گلا دبا کر ہلاک کرنے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد ایک بار پھر ایک دوسرے کو ضربیں لگانے لگے تھے۔ اسلم کے پنچ نے جمرو کا بایاں رخسار ادھیڑ ڈالا تھا اور رخسار سے بہنے والا خون باچھوں سے بہتے خون کے ساتھ مل کر اس کے بھیانک چہرے کو مزید بھیانک بنا رہا تھا۔ اس زخم کو کھانے کے بعد وہ خود بھی پیچھے نہیں رہا تھا اور اسلم کی ناک پر اتنی بری طرح سر مارا تھا کہ اس کی نکسیر پھوٹ پڑی تھی۔ ناک سے بہنے والے خون نے اس کے ہونٹوں کو تر کردیا تھا لیکن وہ دونوں ہی اپنی حالت سے بے خبر دیوانہ وار لڑنے میں مصروف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ زندگی اور موت کی لڑائی ہے۔ اس لڑائی میں جو ذرا ڈھیلا پڑا، وہ جان سے جائے گا اس لیے بچاؤ صرف اسی میں تھی کہ ہر زخم کی شدت کو حوصلے سے برداشت کرکے لڑائی کو جاری رکھا جائے۔

وہ دونوں ہی اپنی پوری جان سے لڑ رہے تھے اور ابھی تک کسی کا پلڑا بھاری نہیں ہوسکا تھا۔ ایک کی لات چلتی تو دوسرے کا ہاتھ فوراً ہی اگلے کا مزاج پوچھ ڈالتا۔ اب بھی اسلم نے جمرو کی گردن کا نشانہ لے کر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا لیکن وہ عین وقت پر جھکائی دے گیا اور وار اس کی گردن کے بجائے پشت پر لگا۔ پشت پر محسوس ہونے والی وار کی شدت نے جمرو کو بتایا کہ اگر اس کی گردن زد میں آجاتی تو گردن کی ہڈی ٹوٹنے سے محفوظ نہ رہتی۔ اس نے غصے میں جھکے جھکے ہی اسلم کے پیٹ پر سر کی زوردار ٹکر ماری۔ ان کی لڑائی کی ابتدا ہی میں اسلم پیٹ پر پتھر کی زوردار ضرب کھا چکا تھا، اسی مقام پر ایک اور چوٹ لگی تو وہ فوری طور پر خود کو سنبھال نہیں سکا اور پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ جمرو پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا فوراً ہی اچھل کر اس کے سینے پر سوار ہوگیا اور اس کے سر اور چہرے پر تابڑ توڑ گھونسے مارنے لگا۔ خود کو ان گھونسوں کی زد سے بچانے کے لیے اسلم نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کرلیے لیکن جمرو کے ہاتھ کہاں رکنے والے تھے۔ اس نے گھونسوں کا سلسلہ روک کر اسلم کے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑنے کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کوشش کی تاکہ اسے سخت زمین سے ٹکرا کر اس کی کھوپڑی کھول سکے۔ اسلم بھی کوئی مٹی کا مادھو نہیں تھا کہ ہر چوٹ سہتا ہی چلا جاتا۔ جمرو سے پہلے اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا اور پھر اپنی تمام تر جسمانی قوت صرف کر کے اسے اپنے اوپر سے اچھال دیا۔ جمرو اس کے اوپر سے گرا ضرور لیکن چاروں شانے چت نہ ہوا اور فوراً ہی اسپرنگ کی طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسلم بھی دو چار سیکنڈز کے فرق سے کھڑا ہو گیا تھا لیکن یہ چند سیکنڈ کا فرق لڑائی میں بہت بڑا تھا۔ جمرو نے اس کا فائدہ اٹھایا اور اس کے کھڑا ہونے سے قبل ہی اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اسلم کھڑا ہوا تو اسے حملے کی مہلت دیے بغیر اس نے اسے بازوؤں میں اٹھایا اور کچھ فاصلے پر کھڑی لّلی پر دے مارا۔ لّلی کے لیے یہ حملہ قطعی غیر متوقع تھا۔ اسے خود کو بچانے یا ایک طرف ہٹنے کی قطعی مہلت نہیں مل سکی اور وہ اسلم کی زد میں آ کر چاروں شانے چت گر پڑی۔

گرنے کے نتیجے میں اس کے ہاتھ میں موجود رائفل نکل کر اس سے دور جا گری۔ اس بار جمرو نے اسلم پر حملہ کرنے کے بجائے رائفل کی طرف جست لگائی اور اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ لّلی کے اوپر جا گرنے والا اسلم جب تک کھڑا ہوا، لڑائی کا نقشہ بدل چکا تھا۔ طاقت کا توازن جمرو کے حق میں جھکا ہوا تھا اور وہ کسی رعایت کے لیے تیار نہیں تھا۔ رائفل ہاتھ لگتے ہی اس نے اسے سیدھا کیا اور بے دریغ اسلم پر فائر داغ دیا۔ فائر کی گونج کے ساتھ ہی فضا میں ایک نسوانی چیخ بھی سنائی دی۔ یہ لّلی کی چیخ تھی جو اسلم کی طرف فائر ہوتے ہی زمین سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اسلم کی طرف جاتی گولی کو اپنے سینے پر روک لیا تھا۔ حالات کی چکی میں پس کر بدتوق اور بے کشش ہو جانے والی لّلی کے سینے سے فوراً ہی خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اور وہ زمین پر گر پڑی۔ اسلم کی جگہ لّلی کو زد میں آتے دیکھ کر جمرو ایک پل کے لیے گڑبڑا گیا تھا اس لیے دوسرا فائر نہیں کر سکا۔ اس کی اس پل بھر کی غفلت کا اسلم نے فائدہ اٹھایا اور پنڈلی پر بندھا خنجر کھینچ کر نکالنے کے بعد برق رفتاری سے جمرو کی طرف پھینک دیا۔ طویل مشق سے حاصل ہونے والی مہارت نے اس لمحے اسے مایوس نہیں کیا اور خنجر جمرو کے سینے کی بائیں طرف کی پسلیوں سے گزرتا ہوا سیدھا اس کے دل میں پیوست ہو گیا۔ دل میں اتر جانے والے خنجر نے یم تیم جمرو کے سارے کس بل نکال دیے اور وہ لہراتا ہوا زمین پر آ رہا۔ اس کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ دوبارہ زمین پر سے نہیں اٹھ سکے گا۔ اسلم نے اس کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی اور لّلی کی طرف لپکا۔ اس سے قبل ماہ بانو اس کے قریب پہنچ چکی تھی اور اس کا سر اپنی گود میں لے لیا تھا۔

"یہ تم نے کیا کیا لّلی؟" اسلم گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو تھامتے ہوئے دکھ سے بولا۔

"تمہیں اپنا بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تو سوچا تم پر قربان ہی ہو جاؤں۔ اب تم خوش رہنا کہ لّلی کبھی تمہاری راہ میں نہیں آئے گی۔" وہ اپنے پپڑی جمے ہونٹوں سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بدقت بولی۔

"میں تم سے اتنی نفرت تو نہیں کرتا تھا کہ تمہاری جان کے درپے ہو جاتا۔" وہ واقعی بہت دکھی تھا۔

"لیکن میں تو تم سے اتنی محبت کرتی تھی نا کہ تم پر خود کو قربان کر دیتی۔" شدید تکلیف کے عالم میں بھی وہ غضب کی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"تم نے مجھے بڑا مقروض کر دیا۔ تمہارے اتنے بڑے احسان کا بدلہ میں کیونکر اتار پاؤں گا۔" اسلم کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں، وہ بھی ایک ایسی عورت کے لیے جس سے اس نے ہمیشہ کراہت محسوس کی تھی۔

"تم میرا سر اپنی گود میں لے کر میرے مرنے تک یہیں بیٹھے رہو۔ میں تمہیں دیکھتے دیکھتے موت کی آغوش میں چلی جاؤں گی تو سمجھوں گی کہ زندگی سے سب کچھ پا لیا۔" اس نے اپنی خواہش بیان کی۔ ماہ بانو نے آنسو بہاتی آنکھوں کے ساتھ اس پگلی سی عورت کا سر اپنی گود سے اٹھا کر اسلم کے زانوؤں پر رکھ دیا۔ بے حد دل شکستہ سا اسلم دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ یہاں اس ویرانے میں وہ اس کے لیے بس اتنا ہی کر سکتا تھا کہ اس کی زندگی کے آخری لمحات اس کی خواہش کے مطابق بنا سکے۔ لّلی کے سینے سے جاری خون کا بہاؤ صاف بتا رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک زندگی سے اپنا رشتہ جوڑے رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ وہ لوگ کسی آبادی میں ہوتے تو وہ پھر بھی کوشش کرتا کہ لّلی کو کسی اسپتال تک پہنچا دے لیکن وہ تو خود ہی بے سمت تھا۔ اسے خود ہی معلوم نہیں تھا کہ وہ کسی ٹھکانے تک پہنچنے میں کامیاب ہو بھی سکے گا یا نہیں۔

"اسلم۔۔۔" اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو اس پر مرکوز رکھے لّلی نے آہستہ سے اسے پکار کر خیالات سے باہر نکالا۔

"ہوں۔۔۔ بولو۔" وہ فوراً ہی اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"اگر۔۔۔ ہو سکے تو کبھی میرے ماں باپ سے۔۔۔" اس کی زبان لڑکھڑانے لگی اور یوں لگا کہ وہ اپنا جملہ مکمل نہیں کر پائے گی لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور بہت دھیمی آواز میں بولی۔

"ان سے میرے لیے معافی۔۔۔" جملہ اب بھی ادھورا ہی تھا لیکن مفہوم واضح ہو چکا تھا۔

"میں پوری کوشش کروں گا۔" اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ یہاں سے نکل سکے گا یا نہیں لیکن ایک مرتے ہوئے انسان کی موت کو آسان کرنے کے لیے اس سے وعدہ کر ڈالا۔ اس اثنا میں ماہ بانو چلو میں تالاب سے پانی بھر لائی تھی۔ اس نے وہ پانی لّلی کے خشک ہونٹوں پر ٹپکایا۔ پانی کے چند قطرے اس کے حلق سے نیچے اترے اور باقی پانی باچھوں سے بہہ نکلا۔ اب اس میں کچھ بھی بولنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک حسرت بھری نظر ماہ بانو اور اسلم کے چہروں پر ڈالی اور پھر جسم کو لگنے والے آخری جھٹکے کے ساتھ اس کی وہ بڑی بڑی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں جنہیں دنیا میں آ کر پہلی بار کھولنے کے بعد جب اس نے اپنے باپ کو دیکھا تھا تو اس نے بڑی محبت سے اس کا نام غزالہ رکھا تھا۔ وہ عزت دار آدمی اپنی غزالی آنکھوں والی پگلی اولاد سے بہت محبت کرتا تھا لیکن بیٹی اس چاہنے والے باپ کی عزت کی لاج نہیں رکھ سکی اور شوبز کی چکاچوند سے اس بری طرح متاثر ہوئی کہ غزالہ سے لیلیٰ اور لّلی بن گئی۔ اسے لیلیٰ اور لّلی بننے والوں میں سے نہ تو کوئی مجنوں کی طرح اس کا دیوانہ ثابت ہو سکا اور نہ ہی کسی نے لّلی کا پھول جان کر قدر کی۔

خودسری اور عاقبت نااندیشی کا شکار وہ لڑکی بری طرح روندی گئی اور ایک ویرانے میں ایسی موت مری کہ اس کا کوئی خونی رشتہ اس کے مردہ جسم کے قریب بیٹھ کر نوحہ کرنے والا نہیں تھا۔ دو افسردہ چہرے اگر اس پر آنسو بہا رہے تھے تو وہ بھی صرف اس لیے کہ اس نے محبت کو اپنے دل میں جگہ دی تھی۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر ایک لاش اور بھی پڑی تھی۔ مرنے والا وہ شخص اس سے بھی زیادہ بدقسمت تھا۔ زندگی بھر اس نے جو ظلم کمایا تھا، اس کے عوض اسے مرتے وقت پانی کے چند قطرے اور کوئی ایک بھی آنسو بہانے والی آنکھ میسر نہیں آ سکی تھی۔ زندگی اپنے آپ کو ڈھنگ سے نہ برتنے والوں کے ساتھ یہی سلوک کرتی ہے۔ جو لوگ متعین اصولوں سے ہٹ کر زندگی کے ساتھ پیش آتے ہیں، انہیں زندگی اگر عمر بھر ڈھیل دیتی بھی رہے تو خود سے جدا کرتے وقت اس بے دردی سے پیش آتی ہے کہ دیکھنے والوں کو ہمیشہ یاد رکھنے والا سبق دے ڈالتی ہے لیکن اس سبق کو یاد رکھنے کی فرصت ہی کسے ہوتی ہے۔ اگر انسان دوسروں کے تجربات سے سبق حاصل کر کے سدھرنے والا ہوتا تو پھر خسارے میں کیوں رہتا؟

☆☆☆

شبانہ بہت مضطرب تھی۔ اسے افسوس تھا کہ وہ آفتاب سے وعدہ کرنے کے باوجود اس کی بیٹی کو اس تک پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اسے اس بات کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ اس کے کچھ کرنے سے قبل ہی بچی کو اسپتال کی نرسری سے غائب کر دیا گیا تھا۔ وہ آفتاب کو اس واقعے کی اطلاع دے کر معذرت بھی کر چکی تھی اور آفتاب نے اس کی معذرت کو قبول بھی کر لیا تھا، اس کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھی۔ اس کا دل اس سے مطالبہ کر رہا تھا کہ وہ کچھ ایسا کرے کہ آفتاب اور کشور کو ان کی کھوئی ہوئی خوشی واپس مل جائے۔ آفتاب کے ساتھ اس کے دل کا عجیب ہی معاملہ تھا۔ وہ بہت اچانک ہی اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا اور چھا گیا تھا۔ محبت جس طرح اس کے دل پر وارد ہوئی تھی، اس طرح کے واقعات عام نہیں ہوتے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی ایک پل بھی ایسا نہیں تھا جسے گرفت میں لے کر کہا جا سکتا کہ اس پل محبت نے اس کے دل میں جگہ بنائی تھی۔ وہ بہت خاموشی سے اس کے دل میں اترا تھا۔ دیکھا جائے تو ان کا تعلق بھی بہت سرسری سا تھا۔ اس کا اور آفتاب کا بس چند دن کا تو واسطہ تھا۔ وہ بچی کی پیدائش کے سلسلے میں اسپتال میں داخل اپنی بیوی کی دیکھ بھال کے لیے اس کے ساتھ رہ رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے کتنی دیوانہ وار محبت کرتا ہے، یہ اس کے ایک ایک انداز سے پتا چلتا تھا۔ شبانہ بہ طور نرس کشور کی دیکھ بھال کے فرائض انجام دے رہی تھی اور اس قسم کی خدمات انجام دینا اس کا برسوں کا معمول تھا لیکن اس کے ساتھ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ کسی اور کی محبت کو دیکھ کر اتنی بری طرح متاثر ہوئی کہ خود ہی محبت میں مبتلا ہو گئی۔

اپنے دل میں پیدا ہونے والی اس انوکھی محبت کے لیے وہ ابھی پوری طرح حیران بھی نہیں ہو سکی تھی کہ آفتاب و کشور کے دشمن ان تک پہنچ گئے۔ اس موقع پر شبانہ نے ان دونوں میاں بیوی کو غیر معمولی تعاون دیتے ہوئے نہ صرف وہاں سے فرار ہونے میں مدد دی بلکہ یہ وعدہ بھی کر لیا کہ نرسری میں داخل ان کی بیٹی ان تک پہنچا دے گی۔ حالات نے اسے یہ وعدہ وفا کرنے کی مہلت نہیں دی البتہ وہ خود ملازمت سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

مستقل ہونے پر مجبور کر دی گئی۔ اسپتال کی ملازمت سے فارغ ہونے کا مطلب تھا کہ اسے رہائش کے لیے اسپتال کی طرف سے ملا ہوا کوارٹر بھی خالی کرنا تھا۔ برسوں سے مقیم ایک جگہ سے منتقلی کے لیے ساز و سامان کو سمیٹنا بھی ایک وقت طلب کام تھا اور اس وقت وہ اسی مرحلے سے گزر رہی تھی۔ ایک سوٹ کیس میں اپنے کپڑے رکھنے کے بعد اسے بند کرتے ہوئے یکدم ہی اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے فوراً اپنے کام کو روکا اور اپنی اس کولیگ کو فون کرنے لگی جو اسپتال میں ریکارڈ کیپر کے فرائض انجام دیتی تھی۔

''روبی! ذرا ریکارڈ میں دیکھ کر مجھے مسز آفتاب کا رہائشی پتا تو بتا دو۔'' رابطہ ملتے ہی اس نے اپنی ساتھی سے مطالبہ کیا۔

''تم اس کے ایڈریس کا کیا کرو گی؟'' اس کی ساتھی نے چونک کر پوچھا۔

''بس کچھ کرنا ہے نا، تم یہ بتاؤ کہ مجھے ایڈریس دے رہی ہو یا نہیں؟'' اس نے دوستانہ دھونس سے کام لیا۔

''اچھا میں بتاتی ہوں۔ تم تھوڑی دیر انتظار کرو۔ میں خود تمہیں فون کر کے ایڈریس نوٹ کروا دوں گی۔'' دوسری طرف سے مزید کوئی سوال کیے بغیر فوراً ہامی بھر لی گئی تو اس نے لائن کاٹ دی اور ایک طرف پڑی کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ اس کے اردگرد بہت کام بکھرا ہوا تھا لیکن اب یہ سب غیر ضروری ہو گیا تھا اور وہ سب سے پہلے اپنے دل میں آنے والے خیال کو عملی جامہ پہنانا چاہتی تھی۔ آفتاب کے لیے کچھ نہ کر سکنے کے ملال نے اسے اکسایا تھا کہ وہ اس کے کسی طرح تو کام آئے اور اس خواہش نے اسے یہ راہ سجھائی تھی کہ وہ آفتاب کی رہائش گاہ پر جا کر اس کا ضروری نوعیت کا سامان وہاں سے اٹھا کر اسے پہنچا دے۔ اس تدبیر کے سوچنے میں یہ لالچ بھی کارفرما تھا کہ اس طرح سے آفتاب سے ایک اور ملاقات کا موقع میسر آ سکتا ہے۔ دل کی باتوں میں آ کر اس نے بہت سے دوسرے نکات فراموش کر دیے تھے۔ وہ بھول گئی تھی کہ آفتاب اور کشور کا معاملہ پولیس کے ہاتھ میں ہے اور اسپتال میں ہونے والی ہنگامہ آرائی کے بعد یقینی طور پر پولیس بھی ریکارڈ سے ان کا پتا لے کر وہاں پہنچی ہو گی۔

اپنی ہی دھن میں مگن اس نے روبی کا فون آنے تک کا وقت بہ مشکل گزارا اور پھر اس سے پتا لیتے ہی روانہ ہو گئی۔ وہاں ٹیکسی وغیرہ تو چلتی نہیں تھیں، البتہ اسپتال کے باہر اسے رکشا ضرور مل گیا۔ رکشے میں سوار ہو کر وہ اپنی منزل کی طرف بڑھی۔ راستے سے اس نے ایک لاک میکر کو بھی ساتھ لے لیا تاکہ اس کے گھر کا بند قفل کھلوا سکے۔ لاک میکر بھی بے چارہ کہاں جانتا تھا کہ ایک معزز نظر آنے والی خاتون اس سے کسی اور کے گھر کا تالا کھلوانے لے جا رہی ہے۔ اس نے وہاں پہنچ کر آرام سے لاک کھولا اور اپنے معاوضے کے ساتھ واپسی کا کرایہ لے کر بخوشی واپس روانہ ہو گیا۔ شبانہ اس کی روانگی کے بعد گھر میں داخل ہوئی تو وہاں اس گرد سے واسطہ پڑا جو چند دن کسی گھر کے بند رہنے سے اس کا حصہ بن جاتی ہے لیکن یہاں کچھ اور بھی تھا۔ گرد پر بہت سے قدموں کے نشان نمایاں تھے اور سامان بھی خاصا بکھرا ہوا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ وہاں کچھ لوگوں نے آ کر تلاشی لی ہے۔ جوش و جذبات میں بھرے اس کے ذہن کو یہ دیکھ کر دھچکا لگا اور عقل نے خطرے کی سیٹی بجاتے ہوئے اسے فوراً وہاں سے نکل جانے کا مشورہ دیا لیکن اسی لمحے اس کی نظر دیوار پر چپکے اس کاغذ پر پڑ گئی جس پر دھمکی آمیز پیغام تحریر تھا۔

''اگر اپنی بچی زندہ سلامت چاہتے ہو تو اس شخص کے پاس چلے آؤ جس سے بھاگتے پھر رہے ہو۔'' پیغام دینے والے کا کوئی نام پتا موجود نہ ہونے کے باوجود یقیناً پیغام کے الفاظ اس شخص کے لیے بہت واضح تھے جسے یہ پیغام دیا گیا تھا۔ شبانہ کشمکش و پیچ میں پڑ گئی کہ اس پیغام کو آفتاب تک پہنچایا بھی جائے یا نہیں۔ اگر وہ اسے پیغام پہنچا دیتی تو یقیناً بچی کی محبت میں وہ پیغام دینے والے کے پاس بھاگا جاتا۔ جو شخص بھرے اسپتال میں اپنے غنڈے بھیج کر اسے گھیرنے کی کوشش کر سکتا تھا، وہ کس نوعیت کا دشمن ہو گا شبانہ کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ اس کی نوخیز و خاموش محبت آفتاب کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ دوسری طرف اسے یہ بھی احساس تھا کہ آفتاب اور کشور اپنی بیٹی کی جدائی میں تڑپ رہے ہوں گے۔ تذبذب میں مبتلا وہ ایک ایسے دوراہے پر آ کھڑی ہوئی جہاں سے کسی ایک فیصلے پر پہنچنا بہت دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ کشمکش و پیچ کی اس کیفیت میں مبتلا وہ ذہن میں ابھرنے والے خطرے کے احساس کو بھی فراموش کر بیٹھی اور اس وقت ہوش میں آئی جب کسی نے چپکے سے اس کے پیچھے آ کر گردن پر پسٹل کی نال رکھ دی۔ بے ساختہ ردعمل کے طور پر وہ فوراً ہی بدک کر پیچھے کی طرف پلٹی۔ اس کے عقب میں پولیس کی وردی میں ملبوس ایک پینتیس چھتیس سالہ آدمی کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں دبے پسٹل کا رخ اس کی طرف ہی تھا۔

''کک۔۔۔ کون ہو تم؟'' شبانہ نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''یہ تو تم مجھے بتاؤ گی کہ تم کون ہو اور اس طرح اس گھر میں چوری چھپے گھس کر کیا کر رہی ہو؟'' جواباً پولیس والے نے اس سے کڑک دار لہجے میں باز پرس کی۔

''مم۔۔۔ میں۔۔۔ میں ان لوگوں سے ملنے آئی تھی۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے ایک بودا سا بہانہ پیش کیا۔

''دروازے کا تالا زبردستی کھول کر؟'' پولیس والے نے طنز سے پوچھا تو اس کا حلق خشک ہو گیا اور وہ وہیں سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

''تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہو گا۔ وہیں چل کر ہم تم سے اگلوائیں گے کہ تم یہاں کیا کر رہی تھیں۔'' پولیس والے نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے اسے پسٹل کی نال سے اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

''میں کوئی مجرم نہیں ہوں۔ نہ ہی چوری چکاری کرنے کے ارادے سے یہاں آئی تھی۔ یہ لوگ میرے جاننے والے ہیں اور میں صرف اتنا چاہتی تھی کہ اگر یہاں ان کا کوئی ضروری سامان ہو تو وہ لے جاؤں تاکہ بعد میں انہیں دے سکوں۔'' تھانے جانے کے نام سے شبانہ کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا لیکن اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی جسے سن کر پولیس والے کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''یہ ساری وضاحتیں تھانے جا کر پیش کرنا بی بی! میں اپنی ڈیوٹی کر رہا ہوں۔ مجھے حکم تھا کہ اگر کوئی شخص زبردستی اس مکان میں گھستا ہوا نظر آئے تو اسے گرفتار کر کے تھانے پہنچا دوں۔'' پولیس والے نے سختی سے جواب دیا اور ایک بار پھر آگے بڑھنے کا اشارہ کرنے لگا۔ شبانہ کو چار و ناچار قدم آگے بڑھانے پڑے۔ ایک بڑے اسپتال کی نرس کی حیثیت سے شہر میں کئی لوگ اس سے آشنا تھے سو اس کے لیے پولیس کی نگرانی میں تھانے پہنچنا رسوائی کا سبب بن سکتا تھا۔ قدرے زیادہ عمر کی ہونے کے باوجود وہ بہرحال تھی تو ایک کنواری لڑکی ہی چنانچہ اس صورتِ حال پر گھبرا کر رونے لگی۔ تھانے پہنچنے تک اس کے آنسوؤں کا تسلسل جاری رہا تھا۔

''اوئے نورے یہ تو کسے اٹھا لایا ہے؟'' پولیس والا جو کہ عہدے کے اعتبار سے سنتری تھا، اسے لے کر تھانے کے ایک کمرے میں داخل ہوا تو وہاں کرسی پر اکڑ کر بیٹھے شخص نے سوال کیا۔

''بڑے کام کی چیز لایا ہوں سر جی! آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔'' نورے کے نام سے پکارے جانے والے سنتری نے خوشامدانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے، اسے پچھلے کمرے میں بند کر دے۔ رات کو دل خوش کریں گے۔ ابھی تو اگر ایس ایچ او صاحب کی نظر پڑ گئی تو وہ قبضہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔'' ایس ایچ او کی غیر موجودگی میں ان کی کرسی پر اکڑ کر بیٹھے اے ایس آئی نے جواب دیا۔ یہ وہی اے ایس آئی خالد تھا جس سے شہریار کی آفتاب کے موبائل پر بات ہوئی تھی۔ شہریار نے تو آفتاب سے رابطے کے لیے اس کا نمبر ملایا تھا لیکن دوسری طرف سے شراب کے نشے میں مدہوش اے ایس آئی خالد نے اناپ شناپ بکنا شروع کر دیا۔ اب شبانہ اسی اے ایس آئی کے سامنے پیش کی گئی تھی اور اس نے پہلے مرحلے میں ہی اپنی خباثتِ فطرت کا مظاہرہ کر دیا تھا۔ پہلے سے ہی خوف سے زرد پڑی شبانہ کا رنگ اس کا جملہ سن کر مزید زرد پڑ گیا اور ٹانگیں کانپنے لگیں۔

''آپ اس طرح سے بھی اپنا دل خوش کر لیجیے گا سر جی پر میں تو آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ یہ لڑکی ماسٹر کو جانتی ہے۔ ابھی میں اسے اس کے گھر سے ہی پکڑ کر لا رہا ہوں۔ آپ اس سے اگلوائیں کہ ماسٹر کدھر ہے؟''

سنتری کی اطلاع پر اے ایس آئی خالد کے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے اور وہ شبانہ کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لینے لگا۔ ظاہری طور پر تو اے ایس آئی خالد اپنے فرائض منصبی انجام دیتے ہوئے اسپتال میں ہونے والی ہنگامہ آرائی کے متعلق انکوائری پر مامور تھا لیکن اندر سے وہ مقامی غنڈے سومرو سے ملا ہوا تھا۔ سومرو وہ شخص تھا جس نے اسپتال میں ہونے والی ہنگامہ آرائی میں شیدے کا ساتھ دیا تھا اور اب بھی اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ آفتاب اور کشور کا کوئی کھوج لگے تو شیدے کے آقا چودھری افتخار عالم شاہ سے بڑا انعام حاصل کر سکے۔ اسی لالچ میں اس نے اے ایس آئی سے ساز باز کر رکھی تھی۔

''یہ تو تو نے بڑا کام کیا۔ چل پھر پہلے اس شہزادی سے بھی معلوم کر لیتے ہیں کہ ماسٹر کہاں ملے گا؟ لیکن پہلے اسے پچھلے کمرے میں لے چل۔ یہ میرا اپنا کیس ہے، ایس ایچ او صاحب کو ہوا بھی لگ گئی تو وہ اپنا حصہ مانگنے بیٹھ جائیں گے۔'' اے ایس آئی نے اپنی کرسی چھوڑ دی۔

''خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ مجھے یہاں سے جانے دو۔ میں کچھ نہیں جانتی۔'' اپنے ساتھ متوقع سلوک کو جان کر شبانہ نے اے ایس آئی کے سامنے گڑگڑانا شروع کر دیا لیکن

وہ کانوں میں روئی ٹھونس کر بیٹھا تھا۔ ذرا بھی اس کی درد بھری التجا پر کان نہ دھرے اور اس کا سنتری شبانہ کو کھینچتا ہوا عقبی سمت موجود ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں ایک جھلنگا سی چارپائی کے علاوہ بیٹھنے کی کوئی اور شے موجود نہیں تھی۔ البتہ ایک دیوار پر کیلوں سے رسی کا گچھا، پلاس، چمڑے کی بیلٹ اور اسی طرح کا کچھ دوسرا سامان لٹکا ہوا تھا۔ شبانہ نے خود کو یہاں کھینچ کر لائے جانے کے دوران چیخنے چلانے اور مزاحمت کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن ایک تنومند آدمی کے آگے اس کی ذرا پیش نہ چلی تھی اور وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے اس کمرے تک لے آیا تھا۔

''ایس ایچ او صاحب تھانے پہنچ گئے ہیں۔ تم اس کا منہ بند کر کے بٹھاؤ، میں تھوڑی دیر میں فارغ ہو کر یہاں آتا ہوں۔'' اے ایس آئی خالد جو پیچھے کہیں رک گیا تھا، تیز تیز قدموں سے چلتا وہاں پہنچا اور اپنے ماتحت کو یہ ہدایات دے کر جھپاک سے باہر نکل گیا۔ سنتری نے حکم کی تعمیل میں پھرتی سے کام لیا اور سب سے پہلے شبانہ کے منہ میں اسی کا دوپٹا چھین کر ٹھونس دیا۔ اب یہ بھی امید نہیں رہی تھی کہ وہ چیخ چلا کر کسی کو اس طرف متوجہ کر سکے۔ ویسے بھی ایس ایچ او کا کردار اس سے ملاقات کیے بغیر بھی اس کے سامنے آ چکا تھا۔ اے ایس آئی خالد نے جن الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ خود بھی کافی حریص اور بدفطرت ہے۔

اس کی آواز کا گلا گھونٹنے کے بعد سنتری نے اس کے ہاتھ پیر بھی رسی کی مدد سے باندھ دیے اور پھر اسے جھلنگا سی چارپائی پر دھکیل کر خود بھی تیزی سے باہر نکل گیا۔ ادھر ایس ایچ او بس یونہی راؤنڈ مارنے کے لیے تھانے آیا تھا۔ اس نے بے دلی سے ایک نظر روزنامچے پر ڈالی، عملے کو بلاوجہ چند سخت سست سنائیں اور پھر کسی ضروری سرکاری کام سے جانے کا بہانہ کر کے تھانے سے نکل کھڑا ہوا۔ اس کے جانے کے بعد اے ایس آئی خالد اور اس کے ساتھی سنتری نے عقبی کمرے کا رخ کیا۔ تھانے میں موجود مختصر عملے میں سے چند کو اس بات کی بھنک پڑ چکی تھی کہ یہاں کوئی عورت لائی گئی ہے لیکن انہوں نے دخل اندازی کی کوشش نہیں کی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ جو بھی معاملہ ہے، وہ جلد سامنے آ جائے گا اور کسی بھی قسم کے فائدے کی صورت میں وہ محروم نہیں رہیں گے۔

''اوئے نورے! تو تو بڑا ظالم ہے۔ اتنی سوہنی مس صاحب کو ایسے باندھ بوندھ کر ڈال دیا ہے۔ چل کچھ نہیں تو اس کا منہ ہی کھول دے۔ اچھی بھلی آواز ہے بے چاری کی اور تم نے اس کا گلا ہی گھونٹ دیا۔'' چارپائی پر پڑی شبانہ کو دیکھ کر اے ایس آئی مکاری سے بولا تو سنتری نے آگے بڑھ کر شبانہ کے منہ میں ٹھنسا اس کا دوپٹا نکال لیا۔ منہ کھلتے ہی وہ بری طرح کھانسنے لگی۔ شاید کپڑے کی وجہ سے اس کا حلق خشک ہو کر چھل گیا تھا۔

''اسے پانی پلا یارا'' اے ایس آئی نے بیزاری سے حکم دیا جس کی تعمیل میں نورا جست کے ایک گندے سے گلاس میں پانی لے آیا اور شبانہ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ نرسنگ کے پیشے سے وابستہ شبانہ جو عام حالات میں حفظانِ صحت کے اصولوں کا بہت خیال رکھتی تھی، اس گندے گلاس سے شائفت پانی کے کئی گھونٹ پی گئی۔

''ہاں بھئی شہزادی! اب شروع ہو جا اور بتا کہ وہ ماسٹر کدھر ہے؟'' کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑے اے ایس آئی نے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے جدا ہوتے ہی اس سے سوال کیا۔

''مجھے کچھ نہیں معلوم۔ وہ کوئی میرا جاننے والا نہیں ہے۔ اسپتال میں میری ڈیوٹی اس کی بیوی کے کمرے میں تھی، بس میں اسی حوالے سے اسے جانتی تھی۔ بعد میں جب وہ اور اس کی بیوی اسپتال سے فرار ہو گئے تو اس نے فون کر کے مجھ سے اپنی بیٹی کے سلسلے میں مدد کی درخواست کی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ اس کی بیٹی اغوا ہو چکی ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ اگر ہو سکے تو میں اس کے گھر جا کر ایک بار جائزہ لے لوں کہ وہاں کا کیا حال ہے۔'' شبانہ درمیانی وقفے میں اپنے ذہن میں ایک قدرے معقول کہانی تراش چکی تھی لیکن اس کہانی کے ایک نکتے کو پکڑ کر ہی اے ایس آئی نے اس سے ایک نکیلا سوال کر ڈالا۔

''تم اسے کس طرح اطلاع دیتیں۔ تمہیں اس کا ایڈریس یا کوئی فون نمبر وغیرہ یاد ہے؟''

''نن۔۔۔ نہیں۔'' وہ گڑبڑائی۔ ''اس نے کہا تھا کہ وہ خود ہی کسی وقت فون کرے گا۔''

''میرے خیال میں اس سالی کو مرمت کی ضرورت ہے۔ نورے اتو ٹائم برباد نہ کر۔ اس کے سارے ناخن پلاس سے پکڑ کر کھینچ لے۔'' تجربہ کار و گھاگ اے ایس آئی نے فوراً ہی اندازہ کر لیا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہے چنانچہ سرد لہجے میں اپنے ماتحت کو حکم دیا۔ وہ فوراً ہی حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہو گیا اور چارپائی پر پڑی شبانہ کے دائیں ہاتھ کی چھنگلی کا ناخن پلاس میں دبا کر پوری قوت سے کھینچ لیا۔ نفاست سے سیٹ کیا نیل پالش سے سجا ناخن جڑ سے اکھڑ گیا

اور اذیت کی ایک لہر سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ شبانہ کسی ذبح کیے جانے والے جانور کی طرح چیخنے لگی۔

"رکنے کی ضرورت نہیں ہے نورے۔ جب تک اسے اپنے یار کا پتا اور فون نمبر یاد نہ آجائے تو اس کا ایک ایک ناخن اکھاڑتا رہ۔" اس کی چیخوں کو خاطر میں لائے بغیر اے ایس آئی بے رحمی سے بولا۔ نورے نے فوراً ہی شبانہ کا ہاتھ پکڑ کر دوسرا ناخن بھی کھینچ ڈالا۔ یہ ناخن آدھا ہی ٹوٹا تھا لیکن شبانہ کو لگا کہ اس کے جسم سے روح پرواز کر گئی ہے۔ وہ تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو گئی۔ فوراً ہی اس کے چہرے پر پانی چھینک کر اسے ہوش میں لایا گیا۔ وہ کراہتی ہوئی ایک بار پھر آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں درد کی بے پناہ لہریں اٹھ رہی تھیں اور وہ باوجود کوشش کے اس درد کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔

"اس کے زخموں پر نمک اور مرچ چھڑکو۔" ایس آئی خالد نے ایک بار پھر بے رحمی سے حکم دیا۔ اس حکم کی بھی فوری تعمیل کی گئی اور شبانہ کی خونم خون انگلیوں میں گویا انگارے سے بھر گئے۔ وہ اذیت سے چیخنے لگی۔

"بول ماسٹر کا اتا پتا بتائے گی یا تیری تیسری انگلی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے؟ پر یاد رکھنا اب کی بار تیرا سارے ناخن اکھیڑنے تک رکے گا نہیں۔" ایس آئی نے سرد اور ظالمانہ لہجے میں اس سے کہا تو اس کی روح اندر تک لرز اٹھی۔ یہ تکلیف ایسی نہیں تھی کہ وہ عام سی لڑکی اسے سہہ پاتی۔ درد بھرے انداز میں روتے ہوئے بولی۔

"میرے پاس ان لوگوں کا کوئی پتا نہیں ہے بس ایک ٹیلی فون نمبر ہے۔ آفتاب صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر مجھے ان کی بیٹی امید کے بارے میں کوئی خبر ملے تو میں اس نمبر پر فون کر کے انہیں اطلاع دے دوں۔"

"ٹھیک ہے، وہ فون نمبر بتا۔" اے ایس آئی نے اسے حکم دیا۔

"نمبر میرے موبائل میں ہے اور موبائل اس بیگ میں جو تم لوگوں نے مجھ سے چھین لیا ہے۔" اس نے کچھ کچھ اپنے حواس یکجا کرتے ہوئے جواب دیا۔

"جا بھئی نورے تو جا کر اس کے موبائل میں نمبر چیک کر۔ میں اسے چیک کرتا ہوں۔" اے ایس آئی نے خباثت سے ایک آنکھ کا کونا دباتے ہوئے سنتری کو حکم دیا تو وہ دانت نکالتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی اے ایس آئی شبانہ پر پل پڑا۔ اس کا چیخنا چلانا، رونا دھونا سب بے کار گیا اور وہ اس درندے کی بربریت کی بھینٹ چڑھ گئی۔ بے سدھ سے سنبھال کر رکھی گئی دوشیزگی کی دولت یوں لٹی کہ وہ کچھ کر ہی نہیں سکی اور اذیت ناک انداز میں سسکتی رہی لیکن اسے کہاں معلوم تھا کہ اذیت کا یہ سلسلہ یہیں پر ختم ہونے والا نہیں ہے اور بھی بہت سے گدھ ہیں جو بظاہر تو عوام کی خدمت و حفاظت کے لیے جسموں پر وردی سجائے گھومتے ہیں لیکن درحقیقت ان کی بوٹیاں نوچنے کے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ بے بس شبانہ تو ان کا بہترین شکار تھی، وہ اسے کیوں چھوڑتے چنانچہ وہ بے چاری تھانے کی چار دیواری کے اندر لٹتی رہی اور باہر چوراچکے حرے سے گھومتے رہے۔ کوئی نہیں تھا جو اس مظلوم لڑکی کی دادرسی کرتا، جو اپنی خاموش محبت کے جرم میں اتنی بڑی سزا کاٹ رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ شخص جس کی خاطر وہ اس مصیبت میں گرفتار ہوئی تھی، اس سے بہت دور اپنی محبوب بیوی کی دل جوئی میں مصروف تھا۔ شاید خاموش محبتوں کا نصیب ہی یہ ہوتا ہے، محبت کرنے والا اندر سے جل مرتا ہے لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو پاتی۔

☆☆☆

"چودھری صاحب! وڈی چودھرائن کی حالت وڈی خراب ہے۔ انہیں کھانا ہضم ہی نہیں ہو رہا ہو وہ الٹیوں پہ الٹیاں کر رہی ہیں۔ جو نوکرانی انہیں کھانا پہنچانے جاتی ہے، اس کا کہنا ہے کہ کل سے انہوں نے کچھ نہیں کھایا، صرف پانی ہی پر ہیں ہو وہ بھی ان کے پیٹ میں نہیں ٹھہر رہا۔ ابھی وہ دوپہر کا کھانا پہنچانے گئی تھی تو بتا رہی تھی کہ وڈی چودھرائن بالکل نڈھال پڑی ہے اور پکار کا جواب نہیں دے رہی۔ اب آپ بتائیں چودھری صاحب کہ کیا کرنا ہے؟ اگر کچھ ہو ہوا گیا تو کہیں مشکل نہ کھڑی ہو جائے۔" منشی اللہ رکھا چودھری کے سامنے دست بستہ کھڑا دھیمی آواز میں اسے تہ خانے میں قید وڈی چودھرائن کی حالت سے آگاہ کر رہا تھا۔

"مرتی ہے تو مر جائے۔ مجھ سے غداری کرنے کا مزہ تو چکھے وہ۔" چودھری نے غصے سے جواب دیا۔

"دیکھ لیں چودھری صاحب، کہیں مشکل نہ ہو جائے۔ چودھرائن کے میکے والوں کو بھنک بھی پڑ گئی تو وہ طوفان اٹھا دیں گے۔ خیر، ان کا آپ کا تو کوئی مقابلہ نہیں، پر اصل پریشانی آپ کی اپنی اولاد کی ہے۔ آدمی دنیا سے لڑ لے، پر اپنی اولاد کا مقابلہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اگر چھوٹے چودھری مراد شاہ آپ کے خلاف بھڑک اٹھے تو آپ کو مشکل ہو جائے گی۔" منشی نے اسے عقل کی راہ دکھائی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اسے سوچ بچار میں مبتلا ہوتا دیکھ کر منشی ایک طرف ہاتھ باندھے خاموش کھڑا ہو گیا۔ اسی اثنا میں اس کا موبائل وائبریٹ کرنے لگا۔ اس نے دیکھا تو شیدے کے دوست سومرو کا نمبر تھا۔ سومرو کے ذریعے وہ ابھی تک آفتاب اور کشور کو تلاش کروانے کی کوشش کر رہا تھا اس لیے اس کی کال سننا ضروری تھا۔ کال سننے کے لیے وہ دبے قدموں کمرے سے باہر نکل گیا۔

"ہاں بولو، کیا گل ہے؟" کال ریسیو کر کے اس نے خشک لہجے میں فون کیا۔

"آپ کے لیے خوش خبری ہے۔ آپ کو جن لوگوں کی تلاش تھی، ان کا پتا مل گیا ہے۔ وہ حیدرآباد کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں آپ کو ہوٹل کا نام، ٹیلی فون نمبر اور ان دونوں کا کمرا نمبر بتا سکتا ہوں لیکن اس کے لیے پہلے آپ کو دو لاکھ ادا کرنے ہوں گے۔ جس اے ایس آئی نے یہ سب معلوم کیا ہے، اس کا یہی مطالبہ ہے۔" سومرو نے اسے اطلاع دی۔

"رقم مل جائے گی لیکن یاد رکھنا کہ خبر غلط نہیں ہونی چاہیے۔" منشی نے دھمکی دی۔ چودھری کا دست راست ہونے کی وجہ سے اس کے پاس اتنا اختیار تو تھا ہی کہ وہ دو لاکھ کی رقم اپنی صوابدید پر خرچ کر سکے۔

"آپ کب تک رقم بھجوا دیں گے؟" سومرو پکا کاروباری تھا، اس کی دھمکی کا اثر لیے بغیر اپنے مطلب کی بات پوچھی۔

"رقم آج رات سے پہلے تم تک پہنچ جائے گی لیکن تم پتا تو بتاؤ۔" منشی نے جھنجلا کر اس سے مطالبہ کیا۔

"میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ اے ایس آئی پہلے رقم کا مطالبہ کر رہا ہے۔"

"اس اے ایس آئی کی تو ایسی کی تیسی۔ جب میں نے کہہ دیا کہ رقم مل جائے گی تو بس مل جائے گی۔ ہم کوئی تمہاری طرح تھرڈ ریٹ غنڈے نہیں ہیں کہ اپنی زبان سے پھر جائیں۔" منشی جھنجلایا۔

"معاف کرنا صاحب! ہم بے شک غنڈے ہیں لیکن ہمارے اپنے اصول ہیں۔ آپ کو ہم سے معلومات اسی صورت میں ملیں گی جب ہم تک رقم پہنچے گی۔" سومرو اس کے لہجے پر مزید اکڑ گیا اور اپنی بات کہہ کر فون بند کر دیا۔ منشی بکتا جھکتا گالیاں دیتا واپس چودھری کے کمرے میں پہنچا۔

"کی گل اے منشی۔ وڈا غصے میں دکھائی دے رہا ہے؟" اندر پہنچتے تک منشی نے اپنی زبان کو تو قابو کر لیا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے چودھری نے بھانپ لیا کہ وہ غصے میں ہے۔ جواباً منشی نے اسے ساری بات بتا دی۔

"چنگی گل ہے، تو اس کتے کو رقم بھجوا دے۔ پہلے اپنا کام ہو جائے، بعد میں اسے اس کی جرأت کا مزہ بھی چکھا دیں گے۔" تفصیل سن کر چودھری نے سرد لہجے میں اپنا حکم سنایا۔

"چنگا چودھری صاحب۔" منشی فوراً حکم کی بجا آوری کے لیے تیار ہو گیا۔

"تو اس کام کو نبیڑ، فیر نیچے چل کر چودھرائن کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔" منشی کی عدم موجودگی میں چودھری کسی فیصلے پر پہنچ چکا تھا چنانچہ اس سے بولا۔ جواباً منشی "بلاں چودھری صاحب" کہتا ہوا حرکت میں آ گیا۔ اس کی واپسی پندرہ منٹ سے بھی کم وقفے میں ہو گئی۔ اس دوران چودھری بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر کم زیادہ ہوتے بل بتا رہے تھے کہ وہ سوچ وبچار میں مبتلا ہے۔ منشی واپس آیا تو وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ تہ خانے تک پہنچنے کا راستہ حویلی کے الگ تھلگ گوشے میں تھا اور اس گوشے میں کوئی بھی بلا اجازت قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ منشی نے وہاں پہنچ کر اپنے کرتے کی جیب سے چابیاں نکالیں اور تالا کھولنے لگا۔ اس کے تالا کھولنے کے بعد وہ اور چودھری سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچے۔ سیلن زدہ فضا والا یہ تہ خانہ چودھری کے بزرگوں میں سے کسی نے تعمیر کروایا تھا اور اس میں الگ الگ کئی کمرے تھے۔ چودھری اور منشی اس کمرے کی طرف بڑھے جس میں وڈی چودھرائن کو رکھا گیا تھا۔ منشی نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چودھری کے لیے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی بدبو کا ایک بھبکا سا باہر آیا۔ چودھری نے فوراً ہی اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا اور پھر اندر داخل ہوا۔ وڈی چودھرائن فرش پر بچھی چٹائی پر آنکھیں بند کیے نڈھال لیٹی تھی اور اس کے اردگرد اس کی اپنی الٹیوں کی غلاظت پھیلی ہوئی تھی۔ کروفر والی وڈی چودھرائن قید کے چند دنوں میں نچڑ کر رہ گئی تھی اور کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ یہ وہی عورت ہے جو جسم پر ڈھیروں ڈھیر سونا لادے، بیش قیمت لباس میں ملبوس حویلی پر حکمرانی کیا کرتی تھی۔ دروازہ کھلنے اور قدموں کی چاپوں کی آواز سے کسی کے آنے کا اندازہ کر کے چودھرائن نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ ان آنکھوں میں موت کی آمد صاف پڑھی جا رہی تھی۔ چودھری کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نفرت کی لہر دوڑ گئی۔

"دیکھ لیا چودھرائن مجھ سے غداری کا انجام! میں نے تو تجھے حویلی کی مالکن بنا رکھا تھا، پر تجھے عزت راس نہیں آئی

ہو رتو میری ہی جڑیں کاٹنے لگی۔ اب دیکھ تو کس حال میں پڑی ہے۔ یہاں پڑے پڑے ہی تو مر جائے گی اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی۔" برسوں سے زندگی کی ساتھی عورت کو اس حال میں دیکھ کر بھی اس کے دل میں رحم کا کوئی جذبہ نہیں جاگا اور وہ نفرت بھرے لہجے میں بولا۔

"میرا خون تجھے بہت مہنگا پڑے گا چودھری۔ تو دیکھ لینا کہ تیری حویلی کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔" وڈی چودھرائن کی آواز ٹھیک طرح سے نہیں نکل پا رہی تھی پھر بھی اس آواز میں بسی نفرت کی آنچ چودھری تک پہنچ رہی تھی۔

"چل تو یہی خوش فہمی دل میں لے کر دنیا سے چلی جا۔ اس طرح شاید تیری موت کچھ آسان ہو جائے ورنہ تو مجھے تیری حالت بڑی پتلی نظر آرہی ہے۔" چودھری نے استہزائیہ قہقہہ لگاتے ہوئے اسے جواب دیا پھر منشی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"یہ نمک حرام مر جائے تو اس کی لاش یہیں دفن کر دینا۔ مجھے اطلاع دینے کی کوئی لوڑ نہیں ہے۔" اس حکم کو دے کر وہ واپس پلٹ گیا۔ ہکا بکا منشی اس کے پیچھے تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ چودھری نے یہ کس قسم کا فیصلہ کیا ہے۔ دوسری طرف بستر پر بے بس پڑی چودھرائن، چودھری کو گندی گندی گالیاں دے رہی تھی لیکن اس کی آواز اتنی نحیف تھی کہ کمرے کی فضا تک ہی محدود تھی۔ آخر بولتے بولتے اسے زور کا ٹھسکا لگا تو گالیوں کا یہ سلسلہ تھما اور وہ میلے کچیلے تکیے میں منہ دے کر بری طرح کھانسنے لگی۔ اس کی حالت سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ چراغِ آخرِ شب ہے جو بس بجھنے کو ہی ہے۔ ادھر چودھری تہ خانے سے نکل کر منشی سے پوچھ رہا تھا۔

"تجھے معلوم ہے نا منشی کہ میں نے لندن جانا ہے۔ ادھر میں تین چار دن یا بہت ہوا تو ہفتہ بھر رہوں گا۔"

"جی سرکار۔" چودھری کی آنکھوں میں موجود سوچ کی پرچھائیوں کو دیکھتے ہوئے منشی نے تابع داری سے جواب دیا۔

"میں ادھر سے روانہ ہو جاؤں، تب سب کو یہ گل بتانا کہ وڈی چودھرائن کی حالت بہت خراب ہے اس لیے چودھری صاحب لندن گئے ہیں۔" اپنے ذہن میں پکتی کھچڑی کا ڈھکن کھولتے ہوئے اس نے منشی سے کلام کا سلسلہ شروع کیا۔

"بہت بہتر سرکار۔" برسوں سے نمک خوار منشی نے فرماں برداری سے جواب دیا۔ اسے کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا کہ چودھری کے ذہن میں کیا منصوبہ ہے۔ یہ تو اسے پہلے ہی معلوم تھا کہ چودھری نے وڈی چودھرائن کے غیاب کے سلسلے میں سب کو یہ کہہ کر مطمئن کر رکھا ہے کہ وہ شدید بیمار ہے اور لندن کے ایک اسپتال میں زیرِ علاج ہے۔ تہ خانے کی تاریکی میں سزا بھگتتی قریب المرگ چودھرائن کے سلسلے میں مزید یہ پروپیگنڈا کرنا کہ لندن میں اس کی حالت تشویش ناک ہے اس لیے چودھری صاحب لندن جا رہے ہیں، خاصا معنی خیز تھا۔ حالانکہ چودھری درحقیقت ڈیوڈ کے حکم پر لندن جا رہا تھا۔ وہاں چودھری کے جوتوں کے کارخانے میں ہیروئن کی خفیہ لیبارٹری کے قیام کے سلسلے میں کچھ ضروری امور طے ہونے تھے۔ ابتدا میں تو یہ پروگرام تھا کہ ڈیوڈ کا کوئی نمائندہ خود آکر اس سے ملے گا لیکن پھر اچانک ہی پروگرام میں تبدیلی کرتے ہوئے چودھری کو لندن روانگی کے احکامات مل گئے۔ اسے وہاں کس سے اور کہاں ملنا تھا، یہ ابھی تک نہیں بتایا گیا تھا۔ حاکمانہ مزاج رکھنے والے چودھری کے لیے اس انداز سے کوئی کام کرنا بہت مشکل تھا لیکن ساتھ ہی وہ بلا کا حریص بھی تھا اور جو خطیر دولت ملنے والی تھی اس سے محروم ہونا بے وقوفی سمجھتا تھا چنانچہ خلافِ مزاج کام کرنے پر راضی ہو گیا تھا۔

"چودھرائن کی حالت تو نے دیکھ لی ہے۔ ایک آدھ دن میں یا تو وہ آپ ہی مر جائے گی یا تو خود اس کا پتا صاف کروا دینا۔ میرے پاس یہ چنگا موقع ہے کہ میں اس مصیبت سے جان چھڑا لوں۔ تو خفیہ طریقے سے لاش تہ خانے سے نکلوا کر شہر پہنچا دینا اور ادھر کسی برف خانے میں رکھوا دینا۔ میں لندن سے واپس پہنچ کر جب ائرپورٹ پر اتروں گا تو تب حویلی میں خبر دینا کہ وڈی چودھرائن گزر گئی ہے اور چودھری صاحب ان کی میت لے کر حویلی پہنچ رہے ہیں۔" چودھری کا منصوبہ واضح تھا۔ مزید جزئیات بھی وقت کے ساتھ طے کی جا سکتی تھیں۔ اصل میں چودھری غصے میں چودھرائن کے لیے تہ خانے کی قید کی سزا نافذ کر کے پھنس گیا تھا۔ اب اگر وہاں سے اسے زندہ نکال کر آزاد کر دیا جاتا تو وہ انتقام پر اتر آتی اور اس کے لیے مشکلات کھڑی کر دیتی اس لیے موجودہ صورتِ حال سے نمٹنے کا سب سے اچھا حل یہی تھا کہ چودھرائن کا وجود ہی مٹا دیا جائے اس طرح نہ بانس رہتا اور نہ ہی بانسری بجتی۔

"تسی فکر نہ کرو چودھری صاحب! میں سب سمجھ گیا ہوں۔ آپ سرکار جب لندن سے واپس آئیں گے تو یہاں سب ٹھیک ملے گا۔" رمز شناس منشی کے لیے اتنی تفصیلات کافی تھیں، باقی کام وہ خود انجام دے ڈالتا۔ چودھری کے لیے کام کرنے والے ایسے نمک خواروں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی جو صفائی سے یہ سارا کام نمٹا دیتے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہو پاتی۔

"مجھے تجھ پر بھروسا ہے منشی۔ ایک تو ہی تو ہے جسے کوئی بھی کام کہہ کر میرا بوجھ آدھا ہو جاتا ہے۔" چودھری نے اعتراف کیا۔

"میں آپ کا نمک خوار ہوں سرکار! وقت پڑا تو آپ پر اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔ مجھے تو یہ ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے بندوں کی نااہلی آپ کے سامنے شرمندہ کروا دیتی ہے ورنہ میرا بس چلے تو آپ کی زبان سے حکم نکلنے سے پہلے اس کی تعمیل ہو جائے۔" منشی نے فوراً خوشامد کی۔ اس خوشامدانہ رویے کی وجہ سے بھی وہ چودھری کا منظورِ نظر تھا۔

"میں سمجھتا ہوں۔ مینوں معلوم ہے کہ تو کوئی مار دھاڑ کرنے والا بندہ نہیں ہے، نہ ہی اب تیری ایسی عمر ہے کہ لڑکے بالوں کی طرح بھاگ دوڑ کر سکے۔ پر تو اتنا خیال رکھا کر کہ ان منڈوں کی رسی کھینچ کر رکھ۔ اب بھی دیکھ لے کہ پچھلے دنوں شیدے اور اس کے سنگیوں نے کیسی بے پروائی دکھائی ورنہ تو اب تک ہمارا مسئلہ حل ہو چکا ہوتا۔" چودھری اس کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اپنے مخصوص کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ شیدے کی نااہلی کا اسے اب تک غصہ تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی آفتاب کی بیٹی امید کو لے کر آرہے تھے کہ راستے میں کسی نے انہیں چھاپ لیا۔ اس کارروائی میں شیدا اتنا شدید زخمی ہوا تھا کہ اگر جلد اسپتال نہیں پہنچایا جاتا تو زخموں کی تاب نہ لا کر وہیں دم توڑ دیتا۔ اب بھی اس کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس کے ساتھیوں میں سے دو تو موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے جبکہ باقی بھی شدید زخمی تھے۔ ان لوگوں کی حالت دیکھ کر صاف ظاہر تھا کہ حملہ آوروں نے انہیں موت کے گھاٹ اتارنے کی پوری کوشش کی تھی۔ وہ لوگ چلتے ہوئے چودھری کے خاص کمرے تک پہنچے تو باہر مؤدب کھڑے ایک ملازم نے پھرتی سے دروازہ کھول دیا۔ چودھری پورے کروفر کے ساتھ چلتا ہوا اندر داخل ہو گیا جبکہ اس سے ایک قدم پیچھے چلتے منشی کو ملازم نے اشارے سے روک لیا۔ روکنے کے بعد ملازم نے اسے جو خبر دی، اسے سن کر منشی خوش ہو گیا اور جوش و خروش میں بھرا ہوا کمرے میں چلا گیا۔ اس دوران چودھری نے اپنے شاہانہ تخت پر نشست جمائی تھی اور حقے کی نے منہ سے لگائے اپنے پسندیدہ مشغلے میں مصروف تھا۔ حقہ پینا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اگرچہ بڑی پارٹیوں میں یا شہری افسران سے ملاقات کے دوران سگار اور پائپ سے بھی شغل کر لیتا تھا لیکن حقہ اسے سب سے بڑھ کر محبوب تھا۔

"ایک خوش خبری ہے چودھری صاحب!" منشی نے اندر داخل ہوتے ہی اس سے کہا۔

"سنا ڈال، آج کل ویسے بھی اچھی خبریں کم ہی ملتی ہیں۔" حقے کی نے منہ سے ہٹا کر چودھری نے اس سے کہا۔

"وہ سادھو پکڑا گیا ہے۔ وہ اپنی گھر والی اور دھی کے ساتھ گجرات جانے والی بس میں بیٹھا تھا کہ ہمارے بندوں کے ہاتھ لگ گیا۔ اس کے پاس سے اچھی خاصی رقم بھی ملی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس نے یہ رقم شہریار سے ڈیرے کا پتا بتانے کے لیے لی تھی پر اس کا کہنا ہے کہ وہ فرماں بردار حضوری کا تھا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ شہریار کو راستے سے بھٹکا کر موقع ملتے ہی جان سے مار دے لیکن اس کی کوشش ناکام ہو گئی اور وہ سرکار کے خوف سے بھاگ نکلا۔" ابھی جو تفصیلات دروازے پر راستہ روکنے والے ملازم نے اس کے گوش گزار کی تھیں، وہی اس نے چودھری کے سامنے دہرا دیں۔

"ہو سکتا ہے وہ ٹھیک کہہ رہا ہو، پر ہمارے لیے اب وہ بیکار ہے۔" ساری بات سن کر چودھری رعونت سے بولا۔

"پھر کیا حکم ہے سرکار! اس کا کام تمام کر دیا جائے؟" منشی نے اس کا موڈ بھانپتے ہوئے سوال کیا۔

"کرنا تو یہی پڑے گا پر ہم اسے آسان موت نہیں دینا چاہتے۔ اس نے ایک طرح سے ہمارے ساتھ غداری کی ہے اور غداروں کو نمونۂ عبرت بنانا ضروری ہوتا ہے۔ تو ایسا کر کہ اس کی گھر والی اور دھی کو تو حویلی کے خدمت گاروں میں شامل کر دے اور اسے وہ جو گاؤں کی پرلی طرف سوکھے کنوئیں کے ساتھ برگد کا درخت ہے، اس کے ساتھ باندھ کر ہاتھ پیروں میں میخیں ٹھکوا دے۔ اس کے منہ میں کپڑا بھی یاد سے ٹھنسوا دینا۔" چودھری کے اذیت پسند اور شیطان فطرت دماغ نے سزا کا ایک نیا ڈھنگ نکال لیا۔ اس نے سادھو کو سزا دینے کے لیے جس مقام کا انتخاب کیا تھا، وہاں لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بالکل نہیں تھا۔ کوئی اکا دکا ہی ادھر جا نکلتا تو الگ بات تھی ورنہ کنوئیں کا پانی خشک ہو جانے کے بعد وہ متروک ہو گیا تھا اور برگد کا درخت آسیب زدہ مشہور تھا چنانچہ گاؤں والے کچھ خوف کے باعث اور کچھ ضرورت نہ ہونے کے سبب اس طرف کا رخ نہیں کرتے تھے۔ اس پر سے جب سادھو کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا جاتا تو وہ کسی کو اپنی مدد کے لیے پکار بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ وہاں یقیناً ایک اذیت ناک موت مرتا اور جانے اس کے مرنے کے کتنے عرصے بعد اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی لاش دریافت ہوتی۔ چودھری کے لیے یہ سب اہمیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ وہ خود لندن کی آزاد فضاؤں کے لیے پرواز کرنے والا تھا جہاں عیش و عشرت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ مزید دولت اس کی منتظر تھی۔ وہ لندن میں رہ کر مزے لوٹ کر واپس آتا تو یہاں وڈی چودھرائن کا کانٹا بھی نکل چکا ہوتا۔ دیکھا جائے تو وہ اب بھی پورے مزے میں تھا۔ اگر ایک کشور والی پھانس سینے میں نہ گڑی ہوتی تو راوی اس کے لیے چین ہی چین لکھتا۔

☆☆☆

"آپ کے لیے کسی مشتاق صاحب کا فون ہے سر۔"

"اوکے ملا دو۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اگلے ہی لمحے لائن ملا دی گئی۔ دوسری طرف حسب توقع آفتاب ہی تھا جو یقینی طور پر بہت پریشانی میں مبتلا تھا چنانچہ رسمی گفتگو کے بجائے براہ راست بولا۔ "مجھے آپ کے مشورے اور مدد کی ضرورت ہے سر۔"

"میرا موبائل نمبر نوٹ کرلو اور اس پر کال کرو۔" اس نے آفتاب کو مزید گفتگو کا موقع دیے بغیر سنجیدگی کے ساتھ حکم دیا اور تیزی سے اپنا نمبر نوٹ کروا دیا۔ ٹیلی فون آپریٹر کے چودھری کا مخبر ہونے کا شک ہو جانے کے بعد سے وہ کوئی بھی اہم نوعیت کی گفتگو لینڈ لائن پر کرنے سے گریز کرنے لگا تھا۔ عبدالمنان نے مشورہ بھی دیا تھا کہ آپریٹر اور مشتبہ کلرک کو کہیں اور ٹرانسفر کر دیا جائے لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔ موجودہ مخبر ان کی نظروں میں تھے اس لیے وہ ان سے آرام سے احتیاط کر سکتے تھے۔ بعد میں چودھری کوئی نیا مخبر بنا ڈالتا اور وہ نظر میں نہ آپاتا تو پریشانی میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

"سوری سر! میں اپنا موبائل کھو بیٹھا ہوں اور آپ کا موبائل نمبر میری یادداشت میں محفوظ نہیں رہا اس لیے مجبوراً مجھے دفتر کے نمبر پر کال کرنا پڑی۔" چند لمحوں میں ہی اس کے موبائل پر آفتاب کی کال آ گئی اور اس نے معذرت خواہانہ لہجہ اپنایا۔

"مجھے معلوم ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہیں کس سلسلے میں میرے مشورے اور مدد کی ضرورت ہے۔" اس نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"یعنی آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ میری بیٹی چودھری کے قبضے...." آفتاب کی آواز رندھ سی گئی۔

"تمہاری بیٹی چودھری کے قبضے میں نہیں ہے۔ اسے چودھری تک پہنچنے سے پہلے ہی آزاد کروا لیا گیا تھا۔ اس وقت وہ کراچی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ میں تمہیں ایک کانٹیکٹ نمبر دے رہا ہوں۔ اس نمبر پر رابطہ کر کے تم کراچی پہنچ جاؤ۔ میرا آدمی تمہیں تمہاری بیٹی تک پہنچا دے گا۔" اس نے آفتاب کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے فوری طور پر اسے امید کے بارے میں بتا دیا۔

"تھینک یو ویری مچ سر۔ آپ کے مجھ پر پہلے بھی بہت احسان ہیں لیکن یہ احسان اتنا بڑا ہے کہ میں چاہوں بھی تو کبھی نہیں اتار سکوں گا۔" آفتاب جذباتی ہو گیا۔ بیٹی کے زندہ سلامت اور محفوظ مقام پر ہونے کی خوشی اتنی بڑی تھی کہ اس نے تفصیلات جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ حقیقتاً کشور کے امید کے بارے میں سوال جواب اور خود اپنی ذاتی کیفیات کی وجہ سے وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ خود سے اپنے آپ کو چودھری کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ شہریار کو اس نے اپنے اس ارادے سے باخبر کرنے اور مشورہ کرنے کے لیے ہی فون کیا تھا۔

"میں تمہیں تمہاری بہت سی خوبیوں کی وجہ سے پسند کرتا ہوں آفتاب! تم چودھری جیسے شخص کے سامنے ڈٹ کر جس طرح پیر آباد میں اسکول چلا رہے تھے، اس چیز نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اگر تم اپنے مخصوص راستے سے ہٹ کر دوسری سمت میں نہ جا نکلتے تو ہم ایک دوسرے کے بہت اچھے معاون ثابت ہوتے۔ بہرحال، اب تم جن حالات کا شکار ہو، ان میں سے بچاؤ کا سب سے بہترین حل یہ ہے کہ تم کچھ سالوں کے لیے ملک چھوڑ کر باہر چلے جاؤ۔ تم ایک ذہین اور مخلص آدمی ہو اور ایسا شخص جان بچا بچا کر بھاگنے کے چکر میں ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھے گا تو ضائع ہو جائے گا۔ فی الحال تم اپنے اسکول والے پروجیکٹ پر کام کرنے کے قابل نہیں رہے ہو لیکن تمہارے پاس قلم کی طاقت تو ہے نا۔ یہاں سے دور کہیں سکون سے بیٹھو گے تو اپنے قلم اور دماغ کا بہتر استعمال کر سکو گے۔" اس نے بہت سنجیدگی کے ساتھ آفتاب کو ایک مخلصانہ مشورہ دیا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔ مجھے اب اسی نہج پر سوچنا ہوگا۔ اگرچہ میں پڑھے لکھے افراد کے بیرون ملک منتقل ہونے کا شدید مخالف رہا ہوں لیکن اب حالات ایسے ہیں کہ میں ملک میں رہ کر تو نہیں البتہ یہاں سے دور رہ کر کچھ نہ کچھ خدمت انجام دے سکوں گا۔ کچھ بھی نہ کرنے سے تو یہی بہتر ہوگا کہ میں کچھ تو کر سکوں۔" آفتاب شاید خود بھی پہلے سے اسی نہج پر سوچ رہا تھا چنانچہ اس سے فوراً ہی متفق ہو گیا۔

"وِش یو آل دا بیسٹ۔ جا کر اپنی بیٹی سے ملو اور پھر بیرون ملک منتقلی کے سلسلے میں کارروائی شروع کر دو۔ اگر کہیں پر میری مدد کی ضرورت محسوس ہو تو بتا دینا، میں جو کر سکا ضرور کروں گا۔" اس نے اتنا کہہ کر گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا اور آفتاب سے اجازت چاہی۔ اس کال سے فارغ ہونے کے بعد اس نے انٹرکام پر عبدالمنان سے اندر آنے کا کہا۔

"یس سر!" وہ فوراً ہی حاضر ہو گیا۔

"پیر آباد چلنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کافی دن ہو گئے وہاں کا دورہ نہیں کیا۔ چودھری سے تھوڑی چھیڑ چھاڑ ہی کر لیں گے۔ ذرا پتا تو چلے کہ حالیہ ناکامی نے اس پر کیا اثر ڈالا ہے۔"

"اوکے سر! میں مشاہرم خان سے گاڑی تیار کرنے کا کہہ دیتا ہوں۔ آپ بتا دیں کہ کب تک نکلنا ہے؟" عبدالمنان فوراً مستعد ہو گیا۔

"بس پندرہ منٹ بعد نکلتے ہیں۔" اس نے بتایا تو عبدالمنان باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد اس نے میجر ذیشان کا نمبر ملایا۔

"کیا خبریں ہیں میجر صاحب! آپ کی طرف سے بالکل خاموشی ہے۔ ہم نے جو بندہ آپ کے حوالے کیا تھا، اس سے کچھ اور معلومات حاصل ہوئیں یا نہیں؟" سلسلہ ملنے کے بعد اس نے پہلے تو رسمی علیک سلیک کی پھر استفسار کیا۔ اس کا یہ استفسار اشیش کمار المعروف غلام محمد کے بارے میں تھا۔ اشیش سینیئر طور پر را کا ایجنٹ تھا جو مولوی کا روپ دھار کر چھوٹے گاؤں دیہاتوں کے مدرسوں میں معصوم ذہنوں کو بھٹکانے اور دین کی غلط تصویر کشی کر کے انہیں شدت پسند بنانے کے مشن پر کام کر رہا تھا۔ اس کے ایک ساتھی شاہ نواز کے بھی اللہ آباد میں اسی جرم میں ملوث ہونے کے شواہد ملے تھے۔ شاہنواز تو گرفتار ہونے سے قبل ہی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ فرار کے وقت اشیش بھی اسی کے ساتھ تھا لیکن وہ یہاں سے نکل کر ایک اور دیہات میں روپ بدل کر اپنے مشن پر جت گیا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ آفتاب اور کشور بھی پناہ کے لیے اسی دیہات تک پہنچ گئے۔ یوں اشیش کی وہاں موجودگی کا انکشاف ہوا اور شہریار نے میجر ذیشان کی مدد سے اسے گرفتار کر لیا۔ میجر ذیشان ملتستان کی پہاڑیوں میں تباہ ہونے والے شدت پسندوں کے ایک اہم ٹھکانے سے متعلق انکوائری کرنے والی انٹیلی جنس کی ٹیم میں شامل تھا۔ موساد کی خاص ایجنٹ لنڈا نے اپنے حسن کے ہتھیار سے اسے زیر کیا اور بہت سی اہم معلومات حاصل کر کے اڑ گئی۔ میجر ذیشان یوں بھی محب وطن تھا۔ اس واقعے کے بعد احساسِ شرمندگی نے اسے مزید اکسایا کہ وہ دشمنوں کے خلاف برسرپیکار ہو جائے چنانچہ اس نے شہریار سے تعاون قبول کر لیا۔ اس کی حب الوطنی کو دیکھتے ہوئے شہریار نے اشیش کو اس کے حوالے کرنا منظور کر لیا تھا لیکن مسلسل یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا کہ معاملہ اب کہاں تک پہنچا۔

"ہم اس سے زیادہ کارآمد معلومات حاصل کرنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ اس نے یہ اعتراف ضرور کر لیا ہے کہ شاہنواز اس کا ہی ساتھی تھا جس کا اصل نام انل پانڈے ہے اور انل پانڈے ہی وہ آدمی ہے جس نے اپنے ٹرینڈ کیے ہوئے لڑکوں کی مدد سے نہ صرف نور پور میں خودکش دھماکا کروایا تھا بلکہ وہ اور بھی کئی مقامات پر ایسا کروا چکا ہے اور اب بھی مسلسل اس کام میں مصروف ہے۔ لیکن اس نے پانڈے کے ٹھکانے سے ناواقفیت کا اظہار کیا ہے۔ اب معلوم نہیں کہ وہ حقیقت میں بے خبر ہے یا کافی سخت جان ثابت ہوا ہے کہ ہم اس سے پانڈے کا پتا اگلوانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں۔ بہرحال، جو بھی ہو آپ اطمینان رکھیں کہ ہم ان ملک دشمنوں کی گردن تک ضرور پہنچیں گے۔" میجر ذیشان نے اسے مختصر الفاظ میں ساری تفصیل کہہ سنائی۔

"میرے ڈرائیور کا خیال ہے کہ انٹیلی جنس والے بہت سست جا رہے ہیں۔ اگر میں پانڈے کو آپ کے بجائے اس کے حوالے کرتا تو وہ چند گھنٹوں میں ہی اس سے سب کچھ اگلوا لیتا۔" اس نے مسکراتے ہوئے ایک موقع پر پیش کیے جانے والے مشاہرم خان کے خیالات سے آگاہ کیا۔

"ہو سکتا ہے کہ واقعی ایسا ہو لیکن ہم اپنی جگہ مجبور ہیں۔ اشیش کے ملک دشمن ہونے کے باوجود ہم اس کے ساتھ انسانیت سوز سلوک نہیں کر سکتے۔ کم از کم مجھے اپنی وردی کا بہت پاس رہتا ہے اور اس وردی کو پہن کر میں کوئی بھی کام قانون یا ضابطے سے ہٹ کر کرنا مشکل سے ہی پسند کرتا ہوں۔ کبھی لگا کہ وردی میرے مقصد کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے تو پھر اسے اتار کر میدان میں اتروں گا۔" اس کے ہلکے پھلکے جملے کا میجر ذیشان نے بھرپور سنجیدگی سے جواب دیا۔

"مجھے آپ کی مجبوریوں کا احساس ہے میجر صاحب لیکن بس سینے میں ہر دم ایک آگ سی جلتی رہتی ہے جو مجبور کرتی ہے کہ کسی ملک دشمن کو اس سرزمین پر چلنے پھرنے اور سانس لینے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس لیے کبھی کبھی میں خود بھی اپنے ڈرائیور ہی کی طرح جذباتی ہو جاتا ہوں۔" اس نے فوراً ہی وضاحت دی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"میں سمجھتا ہوں۔ میرے اپنے جذبات بھی آپ سے مختلف نہیں ہیں لیکن فوجی تربیت اظہار کی اجازت نہیں دیتی۔ میں نے آپ سے کہا ہے نا کہ جس روز لگا کہ میں حدود و قیود میں رہ کر کام نہیں کر سکوں گا، اس روز خود کو زنجیروں سے آزاد کروا لوں گا۔" میجر ذیشان کا لہجہ سنجیدہ مگر نرم تھا۔

"میری خواہش ہے کہ ایسی نوبت نہ آئے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ نے آرمی اپنے شوق سے ہی جوائن کی ہو گی۔ اگر ایسا نہیں بھی ہے تو بہرحال آپ ایک اچھے اور محب وطن آفیسر ہیں اور ہمارے اداروں کو ہر جگہ آپ جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ پھر آپ کو اس مقام تک پہنچانے میں وطنِ عزیز کا کثیر سرمایہ بھی تو خرچ ہوا ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ ہماری فوج آپ سے محروم ہو۔ بہرحال مجبوری اور حالات کے تحت آپ کوئی بھی فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہیں۔" اس نے میجر ذیشان کے سامنے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا پھر ایک آدھ مزید رسمی جملے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ فون کال سے فارغ ہوا ہی تھا کہ عبدالمنان نے اسے گاڑی تیار ہونے کی اطلاع دے دی۔ وہ چودھری سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے خیال سے مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

اس کے اور چودھری کے درمیان جو جنگ جاری تھی، اس میں ابھی تک کسی کو واضح برتری حاصل نہیں ہوئی تھی۔ کبھی چودھری اس پر ضرب لگا دیتا اور کبھی وہ اسے زک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا۔ ایک طرف اگر اپنی طاقت اور گھمنڈ کا بت سلامت رکھنے کے لیے ہر حربہ آزمایا جا رہا تھا تو دوسری طرف وہ اس بت کو پاش پاش کر دینے کی خواہش میں شدت سے کوشاں تھا۔

پہلے وہ قانونی راستے سے چودھری سے نمٹنے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن جب چودھری نے اس پر کئی اوچھے وار کر ڈالے تو وہ خود بھی انگلیاں ٹیڑھی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کام میں اسے جگو کا زبردست تعاون بھی میسر آ گیا تھا۔ جگو کے شدید بیمار بیٹے کی خاطر اپنا دورہ منسوخ کر کے اسے اسپتال پہنچاتے ہوئے اسے گمان بھی نہیں تھا کہ جو کام وہ محض انسانی ہمدردی کے باعث کر رہا ہے، وہ آگے چل کر اس کے لیے کتنا سودمند ثابت ہوگا۔ اس کے اکلوتے احسان کے بدلے میں جگو اس کا ایسا گرویدہ ہوا تھا کہ اس کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا۔ حالانکہ وہ شہر میں رہ کر جس سیاسی پارٹی کے لیے غنڈا گردی کر رہا تھا، یقیناً اس کی بھی بہت سی ذمے داریاں اس کے سر پر ہوں گی مگر شہریار کے کام کے آگے اس نے کبھی اپنی کسی مصروفیت کا عذر پیش نہیں کیا تھا اور ہر بار فوراً ہی لبیک کہا تھا۔

دفتر سے نکل کر پیرآباد پہنچنے میں جو طویل وقت صرف ہوا، اس میں وہ عبدالمنان کے ساتھ ضلع میں جاری ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں بات چیت کرتا رہا۔ نورپور میں کام مکمل ہو چکا تھا۔ اسکول اور اسپتال کے لیے عملے کا انتخاب بھی کیا جا چکا تھا اور امید تھی کہ چند ایک روز میں وہاں درس و تدریس اور علاج معالجہ شروع ہو جائے گا۔ اللہ آباد میں انہوں نے شاہنواز کے خالی کیے ہوئے مدرسے کی عمارت کو ہی ٹھیک کروا کر وہاں فوری طور پر دو اساتذہ کا تقرر کر دیا تھا۔ اس طرح وہاں ایک طرح سے اسکول شروع ہو گیا تھا۔ اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے اس کا دائرۂ کار بہت وسیع نہیں تھا۔ اگر وہ مضبوط خاندانی پس منظر کا مالک نہ ہوتا تو جو کچھ کر رہا تھا، وہ بھی کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہونے کے باوجود اپنے نیچے والوں سے غافل نہیں ہو پاتے اور خواہش مند رہتے ہیں کہ بے چارگی کی زندگی گزارنے والے ان افراد کو کم از کم بنیادی انسانی حقوق تو حاصل ہو جائیں۔ اپنی اسی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ برسرِپیکار تھا لیکن اس کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ اسے اپنے ان پروجیکٹس کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرنے کے علاوہ دوسرے محاذوں پر بھی لڑنا پڑ رہا تھا۔ ایک طرف چودھری اور اس کے گرگے اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہتے تھے تو دوسری طرف را کے ایجنٹوں سے بھی وقتاً فوقتاً بھیڑ ہوتی رہتی تھی۔

اندرونی اور بیرونی ان دشمنوں سے نمٹنے کے چکر میں وہ اپنی توجہ کسی ایک نقطے پر مرکوز رکھنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا تھا۔ پھر اس کی ذاتی زندگی بھی ایک بڑے طوفان سے گزری تھی۔ اس کے دل نے جسے چاہا تھا، وہ اس پر اپنی چاہت کے اظہار کا ابھی فیصلہ بھی نہیں کر سکا تھا کہ بالکل حادثاتی طور پر ماریا اس کی زندگی میں آ گئی۔ ماریا پڑھی لکھی باشعور عورت تھی جسے ناپسند کرنے کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتا کہ وہ ایک کم عمر، نازک سی، قدرے کم تعلیم یافتہ دوشیزہ پر مرمٹا تھا اور ستم بالائے ستم یہ تھا کہ وہ راحتِ دل خود نہ جانے کن مصائب میں پھنسی ادھر سے ادھر بھٹکتی پھر رہی تھی۔ اگر ماہ بانو کی زندگی میں ہی کچھ ٹھہراؤ اور سکون آ جاتا تو اس کے دل کو چین آ جاتا اور وہ یہ سوچ کر کہ بے شک میں اسے اپنا نہیں سکا لیکن وہ جہاں ہے خوش ہے، صبر کر لیتا۔ اب تو یہ صورتِ حال تھی کہ اس نے ڈاکوؤں کی سرکوبی کے بہانے ماہ بانو کی تلاش میں اتنا بڑا

آپریشن کروا ڈالا تھا لیکن ماہ بانو ہی غائب تھی۔ اس کے ساتھ ہی جمرو اور اسلم نامی ڈاکو کے علاوہ ایک اور قیدی عورت لکی بھی غائب تھی۔ وہ چاروں جانے کہاں اور کس سمت میں نکل گئے تھے کہ جنگل میں سرچ آپریشن کرنے والی پولیس پارٹی بھی ان کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی تھی۔

اپنی سوچوں میں غلطاں پیرآباد تک کا سفر کیسے طے ہوا، معلوم ہی نہیں ہو سکا۔ وہ اس وقت چونکا جب مرکزِ صحت کے باہر لگی لوگوں کی بھیڑ پر نظر پڑی۔ بھیڑ میں شامل لوگوں کے چہروں پر دور سے ہی غصے کی جھلک نظر آ رہی تھی اور وہ زور زور سے بول رہے تھے۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" وہ مضطرب ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ ماریا وہاں آئی ہوئی ہے اور اس کی موجودگی میں مرکزِ صحت کے باہر نظر آنے والے اس ناخوش گوار منظر نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ شاید کسی مریض کی موت واقع ہو گئی ہے اور مریض کے لواحقین اس کے مرنے کا الزام ماریا یا دوسرے ڈاکٹرز کے سر دھر کر ان کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔

مشاہرم خان نے اس کے حکم پر گاڑی اسی مقام پر روک لی اور وہ گاڑی سے اتر کر ہجوم کی طرف بڑھا۔ مشاہرم خان بے مثال پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا اس کے ساتھ ہی چپک گیا۔ اس نے اپنی اسٹین گن بھی گاڑی کی سیٹ کے پیچھے سے نکال کر ساتھ ہی لے لی تھی تاکہ اگر کوئی شہریار کے ساتھ بدسلوکی کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہو تو ڈر کر دبک جائے۔ عبدالمنان اگرچہ غیر مسلح تھا پھر بھی جرأت مندی کا مظاہرہ کرتا ہوا اس کے بائیں جانب چوکنا ہو کر چل پڑا۔

"لو ڈبے صاحب آ گئے۔ اب ان کے سامنے ماتم رکھو۔" ہجوم میں سے کسی نے شہریار کو دیکھ کر ہانک لگائی۔

"یہ تو وڈی چنگی گل ہے۔ اب یہ آپ ہی اپنی گھر والی سے نمٹ لیں گے۔" زہرخند لہجے میں یہ جملہ نہ جانے کس نے ادا کیا تھا لیکن شہریار کو اپنے ذہن میں کلبلاتے ہوئے خدشات کی تصدیق ہوتی محسوس ہوئی۔ اس کا رخ اگرچہ مرکزِ صحت کے دروازے کی طرف تھا لیکن دو بزرگ صورت دیہاتیوں کے سامنے آ جانے پر قدم روکنے پڑے۔

"سلام صاحب۔" ان دونوں نے اس سے باقاعدہ کلام کا آغاز کرنے سے پہلے سلامتی بھیجی جس کا اس نے بہ آوازِ بلند جواب دیا اور پھر خود ہی پوچھ لیا۔

"کیا مسئلہ ہے بزرگو! آپ لوگ اس طرح یہاں کیوں جمع ہیں؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"یہاں ہم اس بدمعاش زنانی کے لیے کھڑے ہیں جسے اسپتال والوں نے پناہ دے رکھی ہے۔ اس عورت نے بہت وڈا جرم کیا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اسے ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ ہم گناہ گارن کو آپ سزا دے لیں گے۔ باقی ہمارا اسپتال والوں سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔" دونوں میں سے ایک نے کسی حد تک معاملے کی وضاحت کی۔ شہریار کے سامنے ادب کا مظاہرہ کرنے کے باوجود اس کے لہجے سے طیش جھلک رہا تھا۔

"کون ہے وہ عورت اور اس نے کیا جرم کیا ہے؟" اس نے ہموار لہجے میں سوال کیا۔ خود سے ہم کلام ہونے والے کے الفاظ نے اسے کسی حد تک یہ اطمینان تو دلا دیا تھا کہ درپیش مسئلے کا براہِ راست ماریا سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن پھر بھی ایک کھٹک سی تو تھی کیونکہ ہجوم میں سے کسی نے واضح طور پر اس کی گھر والی یعنی ماریا سے اس کے نمٹنے کا ذکر کیا تھا۔

"شہزادی نام ہے جی اس عورت کا اور اس کا جرم اتنا وڈا ہے کہ آپ بھی سن کر کانوں کو ہاتھ لگائیں گے۔ ساری حیاتی گزر گئی پر پہلے کبھی ایسی گھناؤنی حرکت کرنے والی عورت سے سامنا نہیں ہوا۔ وہ۔۔۔ تو عورت کے نام پر دھبا ہے دھبا۔" عمر رسیدہ شخص اپنی کان کی لو کو ہاتھ لگا کر بولا اور ساتھ ہی عورت کو ایک موٹی سی گالی بھی دے ڈالی۔

"آپ کی بڑی مہربانی ہوگی بزرگو اگر آپ مجھے اس عورت کا جرم بھی بتا دیں۔" ابھی تک اصل معاملہ سامنے نہیں آیا تھا اور وہ دونوں سسپنس ہی پھیلانے میں لگے ہوئے تھے اس لیے اس پر جھنجلاہٹ سی طاری ہونے لگی پھر بھی اس نے اپنے لہجے کو قابو میں رکھ کر رسان سے سوال کیا۔

"وڈا گھناؤنا کام کیا ہے جی اس نے۔ اس سے پہلے یہ تو خیر بھی سننے میں آیا تھا کہ لوگ مردوں کا کفن چرا لیتے ہیں لیکن وہ ڈائن تو کفن چوروں سے بھی بڑھ کر نکلی۔ اس بلا نے تو مردے ہی چبانے کی کوشش شروع کر دی۔" بزرگ کا وہ انکشاف یقیناً بہت ہولناک تھا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس جرم میں ایک عورت ملوث پائی گئی تھی۔

"یہ کب کا واقعہ ہے؟ اس عورت کو آپ لوگوں نے کب پکڑا؟" اس نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس طرح کے جرائم تو عام طور پر رات کی تاریکی میں انجام دیے جاتے ہیں لیکن یہاں آثار بتا رہے تھے کہ عورت دن کی روشنی میں یہ کام کرتی ہوئی پکڑی گئی ہے۔ اگر وہ رات میں پکڑی گئی ہوتی تو یہاں مرکزِ صحت میں اسے پناہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ لوگ جس طرح مشتعل نظر آ رہے تھے، اس سے صاف ظاہر تھا کہ اگر وہ رات میں گرفتار ہوئی ہوتی تو اب تک اس کا بھرکس نکالا جا چکا ہوتا۔

"زیادہ دیر نہیں گزری جی، بس یہی کوئی گھنٹا بھر ہوا ہوگا۔ گل یہ ہے کہ دو دن پہلے مختار موچی کا نو دس سال کا پتر اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ چھوٹا بچہ تھا اس لیے کوئی قل وغیرہ کروانے کی لوڑ ہی نہیں تھی کہ کوئی فاتحہ وغیرہ پڑھنے بچے کی قبر پر جاتا پر کاکے کی ماں اچانک ہی مچل گئی کہ مجھے اپنے کاکے کی قبر پر جانا ہے۔ اس کی ضد دیکھ کر مختار اسے قبرستان لے گیا۔ دوپہر کے وقت ادھر کوئی مشکل سے ہی جاتا ہے۔ کسی کو اپنے مرحومین کے لیے فاتحہ پڑھنی بھی ہو تو وہ عصر مغرب کے درمیان ادھر کا رخ کرتا ہے شاید اسی وجہ سے شہزادی نے اپنے گندے کام کے لیے وہ وقت چنا تھا۔ مختار اور اس کی گھر والی قبرستان پہنچے تو یہ دیکھ کر ان کی چیخیں نکل گئیں کہ ان کے کاکے کی قبر پاسے سے کھلی ہوئی ہے اور شہزادی ایک تیز چھرے سے اس کی ٹانگ کاٹ رہی ہے۔ ان لوگوں کی چیخ پکار سن کر وہ قبرستان سے بھاگ نکلی۔ شاید اس کا ارادہ گاؤں سے باہر نکلنے کا تھا لیکن مختار بھی شور مچاتا ہوا اس کے پیچھے ہی دوڑ پڑا۔ مختار کی ٹانگ میں ہلکا سا لنگ ہے اس لیے وہ بہت تیز نہیں بھاگ سکتا، پر اس کے شور مچانے پر ادھر ادھر کام کرتے لوگ چوکنے ہو گئے اور شہزادی کو جا لیا۔ مختار نے پکڑنے والوں کو سارا قصہ سنایا تو انہوں نے غصے میں آ کر شہزادی کی ٹھکائی شروع کر دی۔ ہو سکتا تھا وہ موقع پر ہی جان سے ماری جاتی لیکن اسی وقت آپ کی بیگم صاحب کی گڈی ادھر پہنچ گئی۔ انہوں نے کسی کی کچھ بھی سنے بغیر زبردستی شہزادی کو اپنی گڈی میں بٹھایا اور ادھر لے آئیں۔ مارنے والے آپ کی بیگم سے تو جھگڑا نہیں کر سکتے تھے نا اس لیے شہزادی کو ان کے حوالے کر دیا تھا، پر اب سارے گاؤں کا یہی کہنا ہے کہ شہزادی کا جرم بہت گھناؤنا ہے اور اسے ایسے ہی معافی نہیں دی جا سکتی۔ ڈاکٹر صاحب کو اسے ہمارے حوالے کرنا ہوگا ورنہ ہم خود اسے دیکھ لیں گے۔" اس شخص نے سارا قصہ مع اپنے مطالبے کے اس کے سامنے بیان کیا تو وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ وہ لوگوں کے جذبات اور ماریا کی دخل اندازی دونوں کی وجہ سمجھ رہا تھا۔ لوگوں کے نزدیک شہزادی نامی عورت کا جرم انسانیت سوز اور ناقابلِ معافی تھا جبکہ ماریا جیسی پڑھی لکھی عورت کسی بھی انسان کو ماورائے عدالت سزا دینے کی قائل نہیں ہو سکتی تھی۔

"اگر آپ لوگ تھوڑی دیر انتظار کر سکیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں اندر جا کر صورتِ حال معلوم کرتا ہوں پھر آپ لوگوں سے مزید بات کروں گا۔" اس نے نہایت مصلحانہ انداز میں ان لوگوں سے کہا۔ بظاہر اس کے مخاطب وہ دونوں بزرگ ہی تھے لیکن اس نے آواز اتنی بلند رکھی تھی کہ ہجوم میں شامل دوسرے افراد بھی سن سکیں۔

"اندر جا کر یہ خود بھی اپنی گھر والی سے مل جائے گا۔ افسوس کہ چودھری صاحب پنڈ میں نہیں ہیں ورنہ وہ آپ ہی یہ معاملہ نبیڑ لیتے۔" اس بار یوں کھلے عام اپنے خلاف ہرزہ سرائی کرنے والا اس کی نظر میں آ گیا۔ وہ یقیناً چودھری کا کوئی پٹھو تھا جو اپنے آقا کا نمک حلال کرنے کے لیے مسلسل زہر اگل رہا تھا جس کا مجمع پر کوئی خاص اثر ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان لوگوں کے لیے شہریار محض مستقبل کے سہانے سپنے دکھانے والا کوئی سیاست دان نہیں تھا بلکہ ایک ایسا شخص اور ایمان دار افسر تھا جس نے ہر موقع پر ان کی عملی مدد کی تھی۔ ایسے شخص کے خلاف بھڑکنا اتنا بھی آسان نہیں ہوتا چنانچہ ہجوم میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی البتہ اس شخص کی زہرافشانی کے نتیجے میں اسے اتنا علم ضرور ہو گیا کہ چودھری پنڈ سے باہر ہے۔

"پھر مجھے اجازت ہے؟" اس نے چودھری کے پٹھو کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے سامنے کھڑے دونوں عمر رسیدہ افراد سے کہا۔

"آہو جی، بالکل۔۔۔ جیسی تہاڈی مرضی ہے۔"

ایک بااختیار افسر کا اپنے ساتھ عاجزانہ رویہ انہیں بے حد متاثر کر گیا اور انہوں نے بیک وقت اسے خوشی سے اجازت دے ڈالی۔ اس نے آگے بڑھ کر مرکزِ صحت کے دروازے پر دستک دی۔ مشابرم خان اور عبدالستان اس کی پشت پر اس طرح آ کھڑے ہوئے کہ ہجوم اور اس کے مابین فاصلہ قائم ہو گیا۔ اس کی دستک کے جواب میں دروازہ کھلتا تو ہجوم میں سے کوئی فرد ان دونوں کو ہٹائے بغیر اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا اور ان دونوں کی اصل طاقت مشابرم خان کے ہاتھ میں موجود اسٹین گن تھی جسے اس نے خاص طور پر نمایاں کر رکھا تھا۔

اس کی دستک کے جواب میں اندر سے بہت احتیاط کے ساتھ ذرا سا دروازہ کھولا گیا اور ایک مردانہ سرگوشی سنائی دی۔ یہ ڈاکٹر داور تھا جو اسے اندر آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ شہریار دروازے میں بننے والے مختصر خلا سے جیسے ہی اندر داخل ہوا اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔

"تھینکس گاڈ کہ آپ یہاں آ گئے ورنہ صورتِ حال بہت خراب ہو سکتی تھی۔" ڈاکٹر داور کے چہرے کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ وہ شاید اندر کسی درز سے باہر کا منظر دیکھتا رہا تھا جب ہی اس کی پہلی دستک کے ہی جواب میں فوراً دروازہ کھول دیا تھا۔

"آپ کو مجھے فون کر کے انفارم کر دینا چاہیے تھا۔" اس نے قدرے سرد لہجے میں ڈاکٹر داور کو یاد کروایا۔

"ڈاکٹر ماریا نے کئی بار ٹرائی کیا لیکن نہ جانے کیوں آپ کا نمبر مل ہی نہیں رہا تھا۔" اس نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ اس اثنا میں وہ داور کے ساتھ ایک کمرے میں پہنچ چکا تھا جہاں ماریا بستر پر دراز ایک نحیف سی عورت کی نبض دیکھ رہی تھی۔ عورت کے جسم کے مختلف حصوں پر بندھی پٹیاں ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ اچھی خاصی زخمی ہے۔ تاہم وہ ہوش میں تھی اور آہستہ آہستہ کراہ رہی تھی۔

"کچھ معلوم ہوا اس عورت سے کہ یہ کون ہے اور ایسی حرکت کرتے ہوئے کیوں پائی گئی؟" اس نے خود کو مطلع نہ کیے جانے پر ماریا سے الجھے بغیر مطلب کا سوال کیا۔

"ابھی صرف اس کا اور اس کے خاوند کا نام معلوم کیا ہے۔ لوگوں کی مار پیٹ کے نتیجے میں یہ اچھی خاصی زخمی ہو گئی تھی اس لیے میں نے کسی بھی طرح کی پوچھ گچھ سے پہلے اس کی ڈریسنگ کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ اب آپ آ گئے ہیں تو اس کیس کو خود ہینڈل کریں۔ میں نے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی ذمے داری پوری کر دی ہے۔" اس نے شہریار کو اپنی چھوڑی ہوئی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ہاں بی بی! کون ہو تم اور ایسی گھناؤنی حرکت کیوں کی تم نے؟" اس نے عورت کی طرف دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں سوال کیا۔ جواب میں وہ اسے محض اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ کر رہ گئی۔ ان آنکھوں میں دنیا جہاں کا خوف، بے بسی اور مظلومیت تھی۔ آنکھوں کے ان تاثرات کو دیکھ کر اسے خود اپنے اس خیال کی تردید کرنی پڑی کہ وہ کوئی سفلی علم یا جادو ٹونا کرنے والی عورت ہے۔ مردوں اور قبرستان سے اس قسم کے کالے علم کرنے والوں کا خصوصی تعلق ہوتا ہے اس لیے اسے یہ قصہ سن کر سب سے پہلے یہی خیال آیا تھا کہ پکڑی جانے والی عورت اسی کیٹگری سے تعلق رکھتی ہوگی لیکن وہ تو کوئی بہت ہی مظلوم عورت معلوم ہوتی تھی جو اس کے سوال کے جواب میں محض اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"اس کا نام شہزادی ہے۔ اس کا شوہر اقبال عرف بالا چودھری کی ملازمت کرتا تھا لیکن پھر کسی جھگڑے وغیرہ میں زخمی ہو کر معذور ہو گیا اور اب مستقل بستر پر زندگی گزار رہا ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

عورت کے بجائے ماریا کی طرف سے جواب موصول ہوا جسے سن کر وہ چونک گیا۔ کہنائی ہوئی خوب صورتی والی وہ کمزور سی عورت بالے کی بیوی ہوگی، اسے ذرا بھی گمان نہیں گزرا تھا۔ عورت کا نہ صرف لباس بہت معمولی تھا بلکہ چہرے سے بھی غربت برس رہی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ چودھری کے ایک ایسے جاں نثار کی بیوی تھی جو اپنی صحت مندی کے دور میں چودھری کا بڑا سر چڑھا تھا۔ یقیناً اس جاں نثاری کی اسے چودھری سے ٹھیک ٹھاک قیمت بھی ملتی ہوگی پھر ایسا کیا ہوا تھا کہ جگو کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے معذور ہو جانے والے بالے کی بیوی مختصر مدت میں ہی برسوں کی فاقہ زدہ نظر آنے لگی تھی۔

"بالا کہاں ہے؟" لمحہ بھر عورت کی حالت کے بارے میں سوچنے کے بعد اس نے ایک بار پھر براہ راست اس سے سوال کیا۔ بے شک بالا معذور تھا لیکن اس کی بیوی جس مذموم حرکت میں ملوث پائی گئی تھی، اس کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ گاؤں والوں نے اسے یکسر نظر انداز کر ڈالا ہو اور گھر سے یہاں تک اٹھا کر نہ لائے ہوں لیکن ہجوم میں اسے بالے کی کوئی جھلک نظر نہیں آئی تھی۔

"وہ اور میری ساس بچوں کو لے کر دو دن سے کسی رشتے دار کے گھر گئے ہوئے ہیں۔" شہزادی نامی اس عورت نے دھیمی آواز میں جواب دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ہائے میرا کاکا، علوم نہیں میرا دودھ پیتا بچہ کس حال میں ہوگا۔ اس کی ظالم دادی تو کاکے کا رونا برداشت نہیں کرتی، اس کی بھوک پیاس کا کیسے خیال رکھے گی۔" شہزادی کی چپ ٹوٹی تو وہ مسلسل دہائیاں دیتے ہوئے رونے لگی۔ اس سے باز پرس کرنے کا ارادہ رکھنے والے شہریار کو اندازہ ہوا کہ عورت خود کسی بڑی ٹریجڈی کا شکار ہے۔ اس نے ماریا کو اشارہ کیا کہ اسے دلاسا دے کر پانی وغیرہ پلائے تاکہ وہ مزید بات چیت کرنے کے قابل ہو سکے۔ اس کے اشارے پر ماریا حرکت میں آگئی اور تھوڑی ہی دیر میں اس نے عورت کو اس حد تک سنبھال لیا کہ وہ اس کے سوالوں کا جواب دے سکے۔

"دیکھو بی بی، تمہارے اوپر ایک سنگین الزام ہے۔ لوگوں کا بس نہیں چل رہا کہ تمہارے ٹکڑے اڑا کر رکھ دیں۔ بہتر ہے کہ تم مجھے تفصیل سے ساری کہانی سنا دو پھر میں دیکھوں گا کہ تمہارے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔" اس نے سنجیدہ لیکن نرم لہجے میں عورت سے دریافت کیا تو اس کا بین کرنا بند ہو گیا اور وہ دھیمی سسکیوں کے درمیان بتانے لگی۔

"بالے نے میرے ساتھ اپنی طاقت کے زور پر زبردستی ویاہ کیا تھا۔ ویاہ کے بعد وہ اور اس کی ماں دونوں میرے لیے بڑے ظالم ثابت ہوئے۔ دونوں میں سے جس کا جب دل چاہتا، مجھے بری طرح دھنک کر رکھ دیتا۔ بالا معذور ہو کر بستر سے لگا تو مجھے سکون ملا کہ چلو ظالموں میں سے ایک تو کم ہوا لیکن وہ وڈا ظالم آدمی ہے۔ اب بھی جب من کرتا ہے، لیٹے لیٹے بھی کوئی چیز پھینک کر مجھ پر دے مارتا ہے۔ میری ساس بھی بڑی چلتی پرزہ عورت ہے۔ جب سے بالا معذور ہوا تھا، ہور چودھری نے اس پر سے ہاتھ اٹھایا تھا وہ کوششوں میں لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح اس کا علاج ہو سکے۔ ڈاکٹروں نے تو خیر جواب دے دیا تھا اس لیے وہ پیروں فقیروں کے چکر کاٹ رہی تھی۔ ہفتہ بھر پہلے وہ جانے کس پیر کے پاس گئی تھی کہ واپسی میں خوشی خوشی آئی ہور اس کے آنے کے بعد دونوں ماں بیٹے چپکے چپکے باتیں کرتے رہے۔ مجھے دونوں میں سے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ میں نے بھی نہ پوچھا کہ مجھے علوم تھا میرے پوچھنے پر دونوں کچھ بتانے والے نہیں ہیں۔ پر جب دو دن پہلے مختار موچی کا منڈا مرا تو بالے نے مجھے وڈے پیار سے اپنے پاس بلایا ہور بولا کہ شہزادی اگر تو مدد کرے تو میرا علاج ہو سکتا ہے ہور میں ایک واری فیر اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر کما سکتا ہوں۔ مجھے بالے کے علاج سے تو کوئی مطلب نہیں تھا، پر اس کی صحت کے ساتھ میرے بچوں کی روٹی جڑی ہوئی تھی اس لیے میں فوراً مدد کرنے کو تیار ہو گئی۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ اماں ایک بہت پہنچے ہوئے پیر کے پاس گئی تھی جس نے امید دلائی ہے کہ میرا علاج ہو سکتا ہے لیکن علاج کے لیے کسی ایسے مردے کی ہڈیوں کا انتظام کرنا ہوگا جو ہفتہ دس دن کے اندر مرا ہو۔ پیر صاحب ان ہڈیوں کا سفوف بنا کر اس پر خاص دم کرنے کے بعد دوا تیار کریں گے جس کو کھا کر میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ ساری گل سن کر مجھے وڈی گھن آئی جی ہور میں نے یہ کہہ کر بالے کو ٹالنے کی کوشش کی کہ بھلا ایسی ہڈیاں ہمیں کہاں سے ملیں گی۔ اس پر بالے نے مجھے مختار موچی کے پتر کی یاد دلائی۔ میں نے صاف منع کر دیا کہ میں یہ کام نہیں کر سکتی۔ مجھے تو پہلے ہی اس کاکے کے مرنے کا وڈا افسوس تھا، اس کی قبر کھود کر ہڈیاں نکالنے کے لیے کیسے راضی ہوتی؟ میرے انکار پر میری ساس اور بالے نے مجھے وڈا مارا، پر میں نے ہاں نہیں کی۔ مجھے ضد پر اڑا دیکھ کر دونوں ماں بیٹے نے دوجی چال چلی۔ وہ دونوں بچوں کو لے کر گھر سے چلے گئے اور جاتے جاتے

بول گئے کہ اب بچوں کی شکل تب ہی دیکھنے کو ملے گی جب میں ان کا کام کر دوں گی۔ دو دن ہو گئے جی انہیں گئے ہوئے۔ میرا چھوٹا کاکا تو ابھی کچھ کھاتا پیتا بھی نہیں۔ علوم نہیں ننھی جان ماں کے دودھ کے بغیر کیسے جی رہا ہوگا؟" اس نے ایک بار پھر آنسوؤں سے رونا شروع کر دیا۔ اس کی داستان واقعی بڑی دردناک تھی جسے سن کر وہ اپنے دل میں افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

"تمہاری ساس اور شوہر کہاں گئے ہیں؟" اس نے شہزادی سے دریافت کیا۔

"یہ انہوں نے مجھے نہیں بتایا۔"

"تو پھر تم انہیں کام ہو جانے کی اطلاع کیسے دیتیں؟"

"میری ساس نے کہا تھا کہ تین دن بعد ایک آدمی آکر علوم کرے گا۔ تو ہڈیاں نکال لے تو اس پر سے گوشت وغیرہ صاف کر کے گھر کے صحن میں دفنا دینا۔ وہ بندہ تجھ سے ہڈیاں لے جائے گا ہور ہم لوگ بچوں کو لے کر واپس آجائیں گے۔ میں ایسا گندہ کام کبھی نہیں کرتی لیکن ماں ہوں نا، بچوں کی محبت میں مجبور ہو گئی۔" وہ عورت واقعی مظلوم تھی لیکن باہر موجود ہجوم اس کی مظلومیت سے واقف نہیں تھا اور اسے ظالم اور مجرم سمجھ کر چیر پھاڑ کر رکھ دینا چاہتا تھا۔ شہریار نے بہت افسوس سے بستر پر دراز اس آنسو بہاتی عورت کو دیکھا۔ وہ عورت جہالت کی کوکھ سے جنم لینے والے ظلم کا شکار ہوئی تھی اور ایک ایسے گھناؤنے جرم میں مبتلا ہو گئی تھی جس کے لیے شاید قانون کی کتابوں میں تو کوئی بہت سخت سزا مقرر نہیں تھی لیکن معاشرہ جسے ہرگز بھی معاف نہیں کر سکتا تھا۔ اگر شہزادی اور اس کے سسرال والے بے شک پڑھنا لکھنا نہیں جانتے لیکن دین کی سمجھ بوجھ اور خوفِ خدا رکھتے تو ہرگز اس حرکت کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اب بالے کے معاملے کو ہی دیکھا جاتا تو اس کی معذوری سراسر ایک طبی مسئلہ تھا۔ اس کے اہلِ خانہ کو اگر اس کے لیے کچھ کرنا ہی تھا تو طبی ماہرین سے رائے لیتے اور ان کے پیچھے بھاگ دوڑ کرتے۔ اگر وہ ان کی طرف سے مایوس ہو گئے تھے اور دوا کے بعد دعا کا ہی آسرا رہ گیا تھا تو براہ راست اللہ سے مانگنے میں کیا حرج تھا۔ وہ جو شہ رگ سے بھی قریب ہے، کیا ان کی پکار نہیں سنتا۔ بہرحال یہ بڑا پیچیدہ معاشرتی اور مذہبی مسئلہ تھا جس کے بارے میں فی الحال شہریار لب کشائی نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی تو اسے باہر موجود مشتعل ہجوم کو سنبھالنے کا مسئلہ درپیش تھا ورنہ کچھ بعید نہ تھا کہ وہ لوگ زیادہ دیر گزر جانے کی صورت میں اس کی وہاں موجودگی کا بھی خیال نہیں کرتے اور مرکزِ صحت کی در و دیوار پر ہلا بول دیتے۔ دروازے پر کھڑا مسلح مشابرم خان انہیں کہاں تک قابو میں رکھ سکتا تھا۔ اگر ہجوم پیش رفت پر اتر آتا تو مشابرم خان کے لیے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ ان لوگوں پر گولیوں کی برسات کر دیتا۔ وہ سارے بے گناہ لوگ تھے جو ایک نہایت افسوس ناک واقعے پر اپنے غم و غصے کا اظہار کرنے وہاں جمع ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی گولی کا نشانہ بنانا سراسر ظلم ہوتا اور وہ یہ جانتا تھا کہ تخریب کار اور پانڈے جیسے ملک دشمنوں کے لیے دل میں سخت نفرت رکھنے والا مشابرم خان باہر موجود لوگوں میں سے کسی کے ساتھ بھی سخت برتاؤ نہیں کر سکتا۔ آخر کار بہت سوچنے سمجھنے کے بعد اس نے ایک فیصلہ کیا اور قریب ہی کھڑے ڈاکٹر داور کو مخاطب کر کے گمبھیر لہجے میں بولا۔

"آپ دروازے کے پاس جا کر میرے پی اے کو ہدایت دیں کہ وہ ان دونوں افراد کو اندر بھجوا دے جن سے تھوڑی دیر پہلے میں بات چیت کر رہا تھا۔" ڈاکٹر داور اس سے ہدایت ملتے ہی تیزی سے حرکت میں آگیا۔

"بہتر ہے کہ تم ان خاتون کو کوئی سکون آور دوا دے دو۔ میں اسے ان لوگوں سے بچا کر لے بھی جاؤں گا تو اس کا ٹھکانا لاک اپ میں ہی ہوگا۔ مجبوری کے تحت ہی سہی اس سے ایک بڑا اخلاقی جرم تو ہوا ہے جس کے لیے اسے قانون کا سامنا کرنا ہوگا۔" ڈاکٹر داور کے باہر جانے کے بعد اس نے ماریا سے انگریزی میں کہا تو وہ سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے انجکشن تیار کرنے لگی۔ اسے اس کام میں معروف چھوڑ کر وہ خود بھی باہر نکل گیا۔ دونوں بزرگان سے اس کمرے سے ہٹ کر بات چیت کرنا ہی مناسب رہتا۔ وہ انتظار گاہ کے طور پر استعمال ہونے والے بیرونی کمرے میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ ڈاکٹر داور کے پیچھے ان دونوں کی شکلیں نظر آگئیں۔ شاید وہ دونوں اس کے اندر داخل ہونے کے بعد دروازے کے بالکل قریب ہی کھڑے رہے تھے اس لیے پیغام ملتے ہی فوراً اندر چلے آئے۔

"بات یہ ہے بزرگو!" انہیں سامنے بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔ "فی الحال ملزمہ بے ہوش ہے۔ گاؤں والوں کے اسے زد و کوب کرنے کے نتیجے میں وہ خاصی زخمی ہوئی ہے اور اگر اسے کچھ ہو گیا تو اس مار پیٹ میں ملوث لوگوں کو بھی قانون کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ وہ عورت چاہے جتنی بھی بڑی مجرم تھی، کسی عام آدمی کو اس پر ہاتھ اٹھانے اور تشدد کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

موجودہ حالات میں یہی بہتر ہے کہ میں اسے یہاں سے لے جاؤں پھر اس کے ہوش میں آنے کے بعد قانون کے مطابق اس کے خلاف کارروائی کی جائے۔'' نہایت ہموار لہجے اور دھیمی آواز میں ادا کیے ان جملوں میں ایک دھمکی بھی پوشیدہ تھی جسے ان دونوں بزرگ صورت افراد نے فوراً ہی محسوس بھی کرلیا چنانچہ جب ان میں سے ایک نے گفتگو کا آغاز کیا تو اس کا لہجہ بڑا مصالحانہ تھا۔ آخرکار ان کے درمیان یہ طے ہو گیا کہ شہزادی کو شہریار اپنے ساتھ لے جائے گا اور وہ دونوں گاؤں والوں کو سمجھانے بجھانے کے ساتھ اس بات کا یقین دلائیں گے کہ شہزادی کو اس کے جرم کی قرارِ واقعی سزا ملے گی۔ ان دونوں سے اس نے جان بوجھ کر اصل قصے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ ذکر کرتا تو یقیناً شہزادی کے لیے آسانی پیدا ہوجاتی لیکن اس کے اپنے ذہن میں جو منصوبہ پل رہا تھا، اس پر عمل درآمد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان دونوں کے باہر روانہ ہونے کے بعد وہ واپس پلٹ کر شہزادی والے کمرے میں آیا۔ اس دوران وہ خواب آور انجکشن کی ڈوز ملنے کے نتیجے میں سو چکی تھی۔ اسے اپنی نگرانی میں ایمبولینس میں روانہ کرنے کے بعد وہ خود بھی روانگی کے لیے پر تول رہا تھا کہ یکدم ہی ایک نیا ہنگامہ شروع ہو گیا اور منتشر ہو کر ادھر ادھر ٹولیوں میں بٹ جانے والے لوگ دیوانہ وار ایک سمت میں بھاگ کھڑے ہوئے۔

''کیا ہوا؟ کیا مسئلہ ہے؟'' اس نے باہر موجود عبدالمنان سے پوچھا تو اس نے ایک مدقوق سے نوجوان کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس نوجوان کو مشابرم خان نے گردن سے پکڑا ہوا تھا اور کھینچ کر اسی طرف لا رہا تھا۔

''کون ہے یہ؟'' اس نے سخت لہجے میں مشابرم خان سے سوال کرتے ہوئے نوجوان کا جائزہ لیا۔ وہ گاؤں کے مردوں کے عمومی لباس سے ہٹ کر جینز کی گھسی ہوئی پینٹ اور چیک دار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ قمیص اس کے دبلے پتلے جسم پر بہت زیادہ ڈھیلی ہونے کے علاوہ سائز میں اتنی بڑی تھی کہ آستین کے کف موڑ لینے کے باوجود اس کی کلائیاں چھپ گئی تھیں۔ شاید اس نوجوان نے اپنا شوق پورا کرنے کے لیے دیگر خصوصیات کو نظر انداز کر کے محض پسند کی بنیاد پر کسی لنڈا بازار سے یہ قمیص خرید لی تھی اور اچھا خاصا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ اس کی شخصیت کو یہ عجیب و غریب تاثر دینے میں اس کے لباس کے علاوہ بھی دیگر عوامل کارفرما تھے۔ لڑکے کے گال بالکل بیٹھے ہوئے تھے اور بڑی بڑی آنکھیں باہر کی طرف ابلی اس کے زرد چہرے کو خوفناک بنا رہی تھیں۔ سر کے لمبے اور الجھے ہوئے بالوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ حلیے سے کوئی آوارہ گرد لگنے کے باوجود لڑکے کے چہرے پر ایسی مسکینیت تھی کہ اس پر کسی مجرم کا گمان نہیں ہو رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟'' مشابرم خان کی طرف سے جواب وصول ہونے سے قبل ہی وہ لڑکے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا ہے صاحب! میں بے قصور ہوں۔'' کپکپاتا ہوا لڑکا اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

''یہ دور سے بھاگتا ہوا ادھر آیا تھا اور جانے کیا بولا تھا کہ لوگ اس طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہم لوگ دور ہونے کی وجہ سے اس کی بات صحیح سے سن نہیں سکے لیکن میں نے اسے دیکھ لیا تھا اس لیے دوڑ کر پکڑ لایا۔'' اس بار مشابرم خان نے لب کشائی کی اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے ساتھ ایک سمت میں اشارہ کیا۔

''ہاں بھئی، کیا بات تھی جسے سن کر لوگ یوں بھاگ کھڑے ہوئے؟'' اس نے نرم گرم سے لہجے میں لڑکے سے دریافت کیا۔

''ادھر پرانے کنوئیں کے پاس برگد کے درخت سے کسی نے سائیں بابا کو میخیں گاڑ کر رسی سے باندھا ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ مر گیا ہے۔'' لڑکے نے تھوک نگلتے ہوئے جو انکشاف کیا، اسے سن کر اس کے وجود میں پھریری سی دوڑ گئی۔ سائیں بابا کا تخاطب جانے کس شخص کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ اس کی معلومات کے مطابق تو ڈاکوؤں کے ڈیرے تک پولیس کی اور پھر بعد میں خود اس کی راہنمائی کرنے والا سادھو بھی سائیں بابا کہلاتا تھا۔ وہ سادھو چودھری کا گماشتہ تھا جو جنگل میں اس پر قاتلانہ حملہ کرنے کے بعد موقع ملتے ہی فرار ہو گیا تھا اور پھر کہیں اس کا کوئی نام و نشان نہیں ملا تھا۔ اب اگر یہ سائیں بابا وہی سادھو تھا تو اس کا واضح مطلب تھا کہ اسے اس انجام تک چودھری نے ہی پہنچایا ہوگا۔ شہریار نے بے شک اس سادھو کو غیر متعلقہ اور کم اہم جان کر نظر انداز کر دیا تھا لیکن چودھری نے تو اسے ناکام اور مفرور مجرم ہی جانا ہوگا جس کے سینے میں اس کے کئی اہم راز پوشیدہ تھے۔ پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ چودھری کو اس رقم کی بھنک مل گئی ہو جو سادھو نے ڈیرے تک کا راستہ دکھانے کے لیے شہریار سے وصول کی تھی۔ اپنے اس باغی اور مفرور مجرم کو نشانِ عبرت بنانے کے لیے ایسی سولی چڑھا دینا چودھری جیسے بندے کے لیے ناممکن نہیں تھا۔ چند لمحوں میں ہی یہ سب کچھ سوچ لینے کے بعد شہریار نے خود اس مصلوب کو دیکھنے کا فیصلہ کیا اور گاڑی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''چلو چل کر دیکھتے ہیں۔''

مشابرم خان اور عبدالمنان پیروی کرتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھے۔

مشابرم خان نے لڑکے کی گردن چھوڑ دی تھی لیکن اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا کیونکہ وہ لڑکا جائے وقوعہ تک ان کی راہنمائی کر سکتا تھا۔ گاڑی میں اسے مشابرم خان کے ساتھ آگے والی سیٹ پر بٹھایا گیا جبکہ عبدالمنان کو شہریار کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھنا پڑا۔ وہ لوگ منٹوں میں ہی مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے۔ سامنے ہی ایک لرزہ خیز منظر تھا۔ برگد کے سن رسیدہ درخت کے چوڑے تنے سے سادھو کو اس طرح سے باندھا گیا تھا کہ اس کے ہاتھ پیر پوری طرح کھول کر ان میں میخیں گاڑ دی گئی تھیں۔ لمبی لمبی میخوں نے اعضا کو چھید ڈالا تھا اور جسم میں بننے والے ان سوراخوں سے خون رس رس کر بہتا درخت کے نیچے کی زمین میں جذب ہو گیا تھا۔ اگر وہاں سے سادھو کو ہٹا لیا جاتا تو زمین کی حالت دیکھ کر یوں لگتا جیسے وہاں کسی جانور کو ذبح کیا گیا ہے۔ سادھو کی حالت البتہ ذبح کیے جانے والے جانور سے بھی زیادہ ابتر تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور زندگی کی رمق سے عاری چہرہ یوں ڈھلکا ہوا تھا کہ تھوڑی سینے سے آ لگی تھی۔ شہریار دیکھ رہا تھا کہ سادھو کو اس حالت میں دیکھ کر لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔ ایک انسان کے ساتھ اتنی بربریت دیکھ کر خود اس کے اپنے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے پھر بھی اس نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا اور لاش کو نیچے اتارنے کا حکم دیا۔ اس کے حکم کی تعمیل میں مشابرم خان کے ساتھ گاؤں کے دو تین جوان بھی شامل ہو گئے۔ اس موقع پر شہریار کی گاڑی کی ڈکی میں پڑے وہ اوزار بہت کام آئے جو کسی ایمرجنسی کی صورت میں گاڑی کی مرمت کے خیال سے رکھے گئے تھے۔ ورنہ میخیں جس طرح ٹھونکی گئی تھیں انھیں صرف ہاتھوں کی مدد سے نکالنا ممکن نہیں ہوتا۔ میخیں اکھاڑنے کے بعد سادھو کے جسم کے گرد لپٹی رسی کھولی گئی اور پھر اس کا جسم زمین پر رکھنے کے بعد اس کے منہ میں ٹھونسا گیا کپڑا باہر نکالا گیا۔ کپڑا نکلتے ہی سادھو کا سینہ تیزی سے پھولا۔

''یہ تو ابھی زندہ ہے صاحب۔'' اس کے بالکل قریب موجود مشابرم خان نے پُرجوش لہجے میں بتایا تو شہریار تیزی سے آگے بڑھا۔

''اس کے منہ میں پانی ڈالو۔'' اس نے اضطراری طور پر حکم دیا۔ متروک کنوئیں کے پاس پانی کہاں سے آتا۔ عبدالمنان نے... پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑی میں رکھے فلاسک سے پانی نکالا اور سادھو کے کھلے ہوئے منہ میں ڈال دیا۔ منہ میں ڈالے جانے والے پانی کا بیشتر حصہ باہر آ گیا لیکن جو چند قطرے حلق سے نیچے اترے انھوں نے بھی کافی کام دکھایا اور سادھو تیز تیز سانس لینے لگا۔

''اسے ہیلتھ سینٹر لے چلتے ہیں۔ وہاں سے فرسٹ ایڈ دلوانے کے بعد کسی اسپتال میں شفٹ کر دیں گے۔'' سادھو کی سانسوں کا سلسلہ بحال ہوتے دیکھ کر اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ایک انسانی زندگی کو بچا لینے کی خواہش کے ساتھ ساتھ اس وقت اس کے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ یقینی طور پر چودھری کے ظلم کا نشانہ بننے والا سادھو ہوش میں آنے کے بعد اس کے خلاف ایک اچھا گواہ ثابت ہوگا۔ اس کے منہ سے الفاظ نکلتے ہی ہدایت پر عمل کیا جانے لگا اور چار پانچ لوگ آگے بڑھے کہ زخمی سادھو کو اس کی گاڑی میں منتقل کر سکیں۔ پہلے شخص کے ہاتھ لگاتے ہی سادھو نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ان کھلی آنکھوں میں سے آنکھ کے سفید سفید ڈیلے تو نظر آ رہے تھے لیکن پتلیوں کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ لمحہ بھر آنکھیں کھلی رکھنے کے بعد اس نے پھر سے بند کر لیں اور پھر اس کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اس جھٹکے کے لگتے ہی اس کا پہلے ہی ڈھیلا پڑ جانے والا جسم بالکل لٹک گیا اور صاف محسوس ہوا کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ حقیقتاً اس کی جن علامتوں کو دیکھ کر ان لوگوں نے زندگی کی امید باندھی تھی، وہ دیے کی بجھتی لو کی آخری پھڑپھڑاہٹ تھی۔ سادھو کی موت کا منظر دیکھ کر شہریار کے شانے مایوسی اور بے بسی سے ڈھلک سے گئے۔ جانے چودھری کی بری قدرت نے کتنی دراز رکھی تھی کہ کسی طور اسے پکڑائی میں لینے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اب سادھو کی موت کی تصدیق، اس کے ورثا کی تلاش اور تدفین کے مراحل ہی باقی رہ گئے تھے جن کے لیے اس کی موجودگی کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ اس سلسلے میں چند ہدایات جاری کرنے کے بعد وہ تھکے تھکے سے انداز میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

''وہ اطلاع لے کر آنے والا لڑکا کہاں ہے؟'' گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اسے اس لڑکے کا خیال آیا جس نے سادھو کے بارے میں اطلاع دی تھی اور پھر جس کی راہنمائی میں وہ لوگ یہاں تک پہنچے تھے۔

''افراتفری میں اس پر نظر رکھنا ممکن نہیں رہا تھا اس لیے وہ موقع کا فائدہ اٹھا کر نکل گیا۔ البتہ میں نے اس کے بارے میں لوگوں سے معلومات حاصل کی ہیں۔'' جواب میں شرمندہ سے عبدالمنان نے وضاحت پیش کی اور اپنی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کارکردگی کا اظہار کرنے کے لیے بتانے لگا۔ ”لڑکے کا نام اعظم ہے۔ چند سال پہلے کمانے کے لیے گاؤں سے شہر گیا تھا۔ کچھ نہ کچھ کمانے دھمانے بھی لگا لیکن ساتھ ہی نشے کی علت میں بھی گرفتار ہو گیا۔ کبھی کبھار ہی گھر والوں سے ملنے کے لیے یہاں آتا ہے۔ اتفاق سے اب بھی کل رات سے آیا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں بتانے والے کا خیال ہے کہ اپنے نشے کی ڈوز لینے کے لیے اس نے آبادی سے ہٹ کر اس طرف کا رخ کیا ہوگا لیکن سادھو کی لاش دیکھ کر گھبرا گیا اور الٹے قدموں دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا جہاں سب لوگ جمع تھے۔“

عبدالمنان کی پیش کردہ رپورٹ سن کر وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ لڑکے کا سراپا اب بھی اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا۔ وہ زیادہ عمر کا معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن نشے نے اس کے جسم کو گھن کی طرح چاٹ لیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اعظم اور اس جیسے دوسرے نوجوانوں کے لیے افسوس کرنے لگا۔ ہمارے ملک کا سب سے بڑا المیہ ہی یہ تھا کہ اس کے نوجوان تیزی سے تباہ ہو رہے تھے۔ کسی کو نشے کے زہر نے ناکارہ کر دیا تھا تو کوئی خود غرض لیڈروں کے سیاسی مفادات کی بھینٹ چڑھا ہوا تھا۔ سازشوں کا شکار نوجوانوں کی اس بھیڑ میں جو گنتی کے چند کارآمد ذہن بچے تھے، ان میں سے بھی ایک بڑا حصہ مادی ترقی اور روشن مستقبل کی تلاش میں بیرونِ ملک منتقل ہونا پسند کرتا تھا۔ ایسے میں ملک کے مستقبل کے لیے کوئی اچھی امید باندھی بھی جاتی تو کس سے؟ خود اس کے اپنے جیسے سرپھرے تو شاید دو چار ہی تھے اور ان کا ہی دم غنیمت تھا کہ ملک ابھی تک سلامت تھا ورنہ سازشوں کے اس ازدحام میں کب کی یہ ناؤ ڈوب چکی ہوتی۔ وہ افسردگی کے بہت گہرے احساس کے ساتھ وہاں سے بروانہ ہوا۔ اپنے طور پر تو وہ چودھری سے چھیڑ چھاڑ کے خیال سے یہاں آیا تھا لیکن گاؤں میں گھستے ہی پے در پے ہونے والے افسوس ناک واقعات کا سامنا کرنا پڑا کہ طبیعت ہی مضمحل ہو کر رہ گئی۔

”چودھری کے بارے میں کچھ معلوم ہوا کہ وہ کہاں ہے؟“ اسے معلوم تھا کہ عبدالمنان اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے کا عادی تھا چنانچہ اس یقین کے ساتھ کہ چودھری کی گاؤں میں عدم موجودگی کا سن کر اس نے اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور معلوم کیا ہوگا، اس سے پوچھا۔

”چودھری کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اس کی بیوی نمبر ون شدید بیمار ہے اور لندن میں زیرِ علاج ہے۔ چودھری اس کی طرف سے تشویش ناک اطلاعات سن کر لندن گیا ہے۔“ حسبِ توقع عبدالمنان نے اسے مایوس نہیں کیا۔ اس کی فراہم کردہ معلومات کو سن کر وہ صرف ایک ہنکارا بھر کر رہ گیا اور کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا حالانکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ چودھری کی پہلی بیوی یعنی وڈی چودھرائن ہی وہ ہستی تھی جس کی وجہ سے ماہ بانو ڈاکوؤں کے ڈیرے پر پہنچ گئی تھی۔ اس لالچی عورت نے صرف اور صرف اپنی اولاد کو جاگیر کا وارث بنائے رکھنے کے لیے ہر طرح کی گھناؤنی چالیں چلی تھیں اور اب وہ شدید بیماری کی حالت میں لندن کے کسی اسپتال میں زیرِ علاج تھی تو اسے اس سے کیا غرض ہو سکتی تھی۔

”گاڑی روکو۔“ ابھی انہوں نے گاؤں کی حدود پار بھی نہیں کی تھیں کہ اس نے اچانک مشابرم خان کو حکم دیا۔ اس نے پھرتی سے بریکیں لگا کر اس کے حکم کی تعمیل کی۔

”تم گاڑی سے اتر جاؤ۔ یہاں سے آگے عبدالمنان ڈرائیو کرے گا۔“ اس کے اس عجیب و غریب حکم پر وہ دونوں ہی حیران رہ گئے۔

”تم واپس گاؤں جا کر بالے کے گھر کی نگرانی کرو اور اس آدمی کو گھیر کر میرے پاس لاؤ جو شہزادی سے مُردے کی ہڈیاں وصول کرنے کے لیے آنے والا ہے۔“ اس کے اس دوسرے جملے نے اس کے حکم کی وضاحت کر دی اور مشابرم خان سر کو تفہیمی جنبش دیتا ہوا گاڑی سے اتر گیا۔ عبدالمنان نے برابر والی سیٹ سے کھسک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی پھر اس کا اشارہ ملتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ بیک ویو مرر میں گاؤں کی طرف جاتا مشابرم خان صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس کی کامیابی کے لیے دعا کرنے لگا۔ مشابرم خان کامیاب ہوتا تو وہ ایک خطرناک فتنے کی بیخ کنی کے لیے ٹھوس اقدامات کرنے کے لائق ہو پاتا۔ اس نے اے سی کا منصب سنبھالتے ہی جو جنگ لڑنے کا آغاز کیا تھا، اس میں چودھری افتخار عالم شاہ ہی اس کا واحد ٹارگٹ نہیں تھا بلکہ وہ تو ہر اس شخص کے خلاف محاذ کھولنے کو تیار تھا جو اس کے دائرۂ کار میں فتنہ و فساد پھیلا رہا تھا۔ یہ جنگ کتنی طویل ثابت ہوتی اور اسے کہاں تک لے جاتی، وہ نہیں جانتا تھا۔ اسے خبر تھی تو بس اتنی کہ وہ ایک گرداب میں اتر چکا ہے اور اب اس سے مقابلہ کرنا ہے۔

☆☆☆

”تم تھک گئی ہو گی۔ ویسے بھی اب رات سر پر آ گئی ہے، بہتر ہے کہ یہاں رک کر آرام کر لیں۔“ وہ اس پہاڑی سلسلے میں بے سمت سفر کیے جا رہے تھے۔ اسلم روانہ ہونے سے پہلے ہی اس بات کی وضاحت کر چکا تھا کہ اسے پہاڑی سلسلے میں سے نکل کر کسی آبادی تک پہنچنے کا راستہ معلوم نہیں ہے لیکن جنگل کے جانے پہچانے راستوں سے گزر کر جانے میں زیادہ خطرات کا سامنا ہے اس لیے بہتر ہے کہ اندازے سے پہاڑوں میں ہی سفر کیا جائے اور کوشش کر کے کسی بستی تک پہنچنے کے بعد بڑے شہر کا رخ کیا جائے۔ اب وہ اسی تگ و دو میں معروف تھے اور بے سمت راستوں پر چلتے چلتے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ شام کے سائے ڈھلنے لگے تو ماہ بانو کی ابتر ہوتی حالت دیکھ کر اس نے یہ تجویز پیش کی جسے اس نے فوراً قبول کر لیا۔ تھکن اتنی شدید تھی کہ اگر دل میں آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی چاہ نہ ہوتی تو وہ کب کی ہمت چھوڑ کر کہیں بیٹھ گئی ہوتی۔

ڈیرے سے روانہ ہونے کے بعد ان کا بیشتر وقت بھاگنے اور چلنے میں ہی گزر رہا تھا۔ پہلے یہ ڈر تھا کہ کہیں پیچھے سے آنے والا ان کا کوئی دشمن انہیں گھیرنے میں کامیاب نہ ہو جائے اس لیے وہ دیوانہ وار دوڑتے رہے تھے اور اب پہاڑی سلسلے کی ان بھول بھلیوں سے نکلنے کی کوششوں میں معروف تھے۔ یہ کوششیں ابھی تک بار آور ثابت نہیں ہوئی تھیں لیکن ہمت چھوڑ کر بیٹھا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ بے عملی کی صورت میں بھوک اور پیاس کا شکار انہیں کیا جاتا اور شاید دنیا میں اس سے بدترین موت کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی بیماری یا حادثے کا شکار ہو کر مرنے والوں کے مقابلے میں فاقہ کشی سے مرنے والوں کو بہت وقت لگتا ہے اور جان کنی کے عالم میں جتنا وقت گزرے، موت اتنی ہی اذیت ناک ہو جاتی ہے۔

اسلم کی طرف سے رکنے اور آرام کرنے کی پیشکش ملتے ہی اس نے اپنے قدم روک لیے اور ایک ہموار قطعہ زمین دیکھ کر وہاں بیٹھ گئی۔ لیٹنے کے لیے بھی اسے اسی جگہ کو استعمال کرنا تھا۔ وہ جس بے سروسامانی کے عالم میں تھے، اس میں کسی بستر وغیرہ کے تکلف کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ذرا سی صاف اور ہموار جگہ مل گئی تھی تو یہی بہت کافی تھا اور اب اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں لمبی تان کر سو جائے۔

”ابھی سونا نہیں، پہلے کچھ کھا پی لو اس کے بعد آرام سے سو جانا۔“ اس کے ارادوں کو بھانپتے ہوئے اسلم نے اسے ٹوکا اور اپنی پشت پر لدا تھیلا کھول کر اس میں سے کچھ نکال کر اس کے سامنے رکھا۔ روشنی نہ ہونے کے باوجود وہ جانتی تھی کہ اسے کھانے کے لیے کیا دیا گیا ہے۔ یہ ان پرندوں کا گوشت تھا جنہیں اسلم نے تالاب کے کنارے سے شکار کر کے بھون لیا تھا۔ بغیر نمک مرچ کے صرف لکڑیوں کی آگ پر بھونے گئے گوشت کے یہ پارچے ذائقے سے قطع نظر محض پیٹ کی آگ بجھانے کے کام آ رہے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ سخت ہو کر چبانے کے اعتبار سے بھی بہت دشوار غذا ثابت ہو رہے تھے لیکن وہی بات تھی کہ جسم و جاں کا رشتہ جوڑے رکھنے کے لیے کچھ تو چاہیے ہی تھا چنانچہ وہ اسلم کے ہاتھ سے گوشت کا وہ ٹکڑا تھام کر آہستہ آہستہ چبانے لگی۔ خود اسلم بھی اسی عمل میں معروف ہو گیا۔

شدید بھوک کے باوجود اس کے حلق سے چند نوالوں سے زیادہ نہ نگلے گئے اور اس نے گوشت کا ادھ کھایا پارچہ اسلم کی طرف بڑھا دیا۔

”ٹھیک سے کھا لو۔ اتنا کم کھا کر تم اتنے سخت ماحول میں کیسے زندگی کی جدوجہد کر سکو گی۔“ اسلم نے اسے سمجھایا۔

”بس میں اس سے زیادہ نہیں کھا سکتی۔“ اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

”اچھا تو ایسا کرو کہ تھوڑے سے چنے کھا لو۔“ کچھ سوچتے ہوئے اسلم نے اسے پیشکش کی جس پر اس کا سر فوراً ہی اثبات میں ہل گیا۔ اسلم نے چنوں سے بھری تھیلی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ تھیلی میں سے مٹھی بھر کر چنے نکالنے کے بعد اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے وہ یکدم ہی جھجک سی گئی۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ اسلم نے یہ چنے ایسے حالات کے لیے سنبھال رکھے تھے جب انہیں کوئی اور غذا میسر نہ آ سکے۔ پرندوں کا بھنا ہوا گوشت محفوظ کرتے ہوئے ہی اس نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ جب تک یہ گوشت کھانے کے لائق رہے گا، وہ اسی پر گزارہ کریں گے لیکن ماہ بانو کی گوشت سے بے رغبتی دیکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اس کے لیے اپنی بے پناہ محبت کا مظاہرہ کیا تھا اور اسے کھانے کے لیے چنے پیش کر دیے تھے۔ اسلم کی اپنے لیے اس بے تحاشا محبت کو محسوس کرتی وہ بہت آہستگی سے مٹھی میں موجود چنے ٹونگنے لگی۔ بہت آہستگی سے کھانے کے باوجود بھی وہ مٹھی بھر چنے جلد ہی ختم ہو گئے۔ ان کے خاتمے پر اس نے بوتل میں سے تھوڑا سا پانی پیا اور سونے کی نیت سے لیٹ گئی۔ پہلے کبھی وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کسی غیر مرد کی موجودگی میں اس طرح کا چست لباس پہن کر لیٹ سکے گی لیکن اسلم نے اس کی جھجک کافی حد تک ختم ہو گئی تھی۔ دن رات کے اس ساتھ میں اسلم نے خود کو ہر طرح سے قابلِ اعتماد ثابت کیا تھا اور وہ محسوس کر سکتی تھی کہ دل میں اس کے لیے شدید پسندیدگی کے جذبات رکھنے کے باوجود وہ کبھی اس کی طرف حریص نظروں سے نہیں دیکھتا تھا اور پھر اب وہ جن حالات سے گزر رہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے، وہ اتنے مختلف اور انوکھے تھے کہ معمول کے رویوں کا اظہار کرنا ذرا مشکل ہی تھا۔ یہ بقا کی جدوجہد تھی جس میں انہیں مرد و زن کی تخصیص کے بغیر اپنا اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ اس کے لیٹنے تک اسلم بھی اپنا کھانا پینا ختم کر چکا تھا اور اب گہری ہوتی تاریکی میں کسی پہاڑی درندے کے حملے سے بچنے کے لیے الاؤ روشن کر رہا تھا۔

الاؤ جل جانے کے بعد وہ خود بھی ایک سمت کروٹ کے بل لیٹ گیا جبکہ ماہ بانو تو الاؤ سے اڑتی چنگاریوں کو دیکھتے ہوئے اپنے حالات کا تجزیہ کرنے لگی۔ شمو پری کے لیے کھائے جانے والے مٹھی بھر چنوں نے اسے بچپن کی یاد دلا دی تھی۔ بچپن میں اکثر اسکول سے واپسی میں ابا اسے ڈھیروں میٹھے چنوں کے ساتھ رنگین مرمرے اور بتاشے خرید کر دے دیتے تھے اور وہ راستے بھر مٹھیاں بھر بھر کر مزے سے کھانے کے بعد خالی ہاتھ گھر لوٹتی تھی تو بے بے یونیفارم بدلا کر منہ ہاتھ دھلواتے ہی کھانے کی پلیٹ لیے اس کی خوشامدیں کرنے لگتی تھی کہ تھوڑا سا کھا لے۔ چنوں، مرمروں اور بتاشوں سے بھرے ہوئے ننھے سے پیٹ میں گنجائش ہی نہیں رہتی تھی کہ وہ بے بے کے اتنی محبت سے منہ میں ڈالے گئے نوالوں کو نگل سکے۔ بس منہ بناتی ادھر ادھر بھاگتی رہتی تھی اور بے چاری بے بے سخت تشویش میں مبتلا ہو جاتی تھی کہ کڑی کھانا ہی نہیں کھاتی۔ اس موقع پر ابا اس کے ساتھ مثالی اتحاد کا مظاہرہ کرتے تھے اور بے بے کے بار بار پوچھنے پر بھی کبھی اعتراف نہیں کرتے تھے کہ اسے اس کی فرمائش پر کیا کچھ کھلا چکے ہیں۔

بچپن کے وہ ناز و نعم سے بھرے دن کب کے لد چکے تھے اور اگر کچھ سامنے تھا تو زندگی کے گرداب اور الجھنیں۔ چودھری نے اس کی زندگی کو ایسا بھیانک موڑ دیا تھا کہ وہ ایک گرداب سے نکلتی تھی تو دوسرے میں پھنس جاتی تھی۔ اس ظالم بدنظر شخص نے اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ بے بے اور ابا جن کی وہ لاڈلی اکلوتی بیٹی تھی، اس سے محبت کرنے کے جرم میں چودھری کے ظلم کی بھینٹ چڑھ گئے تھے اور اس نے ان سے اس کا اتا پتا اگلوانے کے چکر میں انہیں سخت اذیتیں دے کر ہلاک کر ڈالا تھا۔ جنم دینے والی ماں الگ پاگل ہو کر گاؤں کی گلیوں میں رلتی پھرتی تھی۔ ایک بہن اور بھائی کو موت کے سفاک پنجوں نے اپنی گرفت میں لے کر جدا کر دیا تھا جبکہ باقی بچ جانے والی ایک بہن سسرال والوں کی خدمت و اطاعت میں مصروف تھی۔ گھر بار، پڑھائی لکھائی، سہیلیاں ہر شے چھوٹ گئی تھی اور کچھ باقی بچا تھا تو مصائب کا گرداب۔ زندگی کے طوفانوں کو سہارتے شہریار سے ملاقات ہوئی تو دل اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا لیکن وہ بھی کسی اور کا ہو گیا۔ اب اگر زندگی میں کچھ باقی بچا تھا تو وہ اسلم کی ذات تھی جو اس سے غیر مشروط محبت کرتا تھا۔ حالات کا ستایا ہوا اسلم جسے زندگی کے مصائب نے ڈاکو بنا دیا تھا، اس سے مل کر اس طرح اس کی محبت میں مبتلا ہوا کہ اس کے مطالبے پر یک بیک اپنی مجرمانہ زندگی ترک کرنے کے لیے راضی ہو گیا اور اب وہ کسی مناسب مقام پر پہنچنے کی جدوجہد میں ان پہاڑوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔

جب وہ ڈیرے سے نکلے تو تین تھے اور ان کے ساتھ للی نام کی وہ عورت بھی تھی جو کبھی شوبز میں اپنا مقام بنانے کے چکر میں گھر سے نکل کر ڈاکوؤں کے ڈیرے پر پہنچ گئی تھی۔ اسلم کی محبت میں مبتلا للی نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنی محبت کا ثبوت دے دیا تھا۔ اگر للی عین وقت پر اسلم کے سامنے آ کر اس کی طرف جانے والی گولی اپنے وجود پر نہ کھاتی تو آج اسلم زندہ نہ ہوتا۔ اس نے جبرو سے للی کی ہلاکت کا انتقام لیتے ہوئے اسے جہنم واصل تو کر دیا تھا لیکن خود بھی اس عورت کے لیے اداس تھا جس کے کردار پر بھروسا نہ کرتے ہوئے اس نے کبھی اس کی محبت کو قبول نہیں کیا تھا۔ تھرکتے شعلوں اور رقصاں چنگاریوں پر نظر جمائے اپنی زندگی کی کہانی دہراتے دہراتے بالآخر وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ اس گہری نیند سے وہ دو ڈھائی گھنٹے بعد جاگی۔ جاگنے کا سبب ٹھنڈی ہوتی رات میں محسوس ہونے والی حاجت تھی۔ وہ بے چین سی ہو کر اپنی جگہ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ الاؤ اب بھی روشن تھا اور کچھ فاصلے پر اسلم پہلو کے بل لیٹا سو رہا تھا۔ وہ آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور قضائے حاجت کے لیے ایک سمت میں چل پڑی۔ اپنے پڑاؤ سے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں ایک چٹان کی اوٹ میں اسے مناسب جگہ نظر آ گئی۔ اس جگہ بیٹھ کر فارغ ہونے کے بعد وہ کھڑی ہوئی تو واپسی کے راستے کو مسدود پایا۔ اندھیرے میں بھی چمکتی وہ دو سرخ آنکھیں ایسی نہیں تھیں کہ ان سے خوف کھائے بغیر رہا جا سکتا۔ اس کے پورے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی اور وہ بے ساختہ ہی چند قدم پیچھے ہٹی۔ بدقسمتی سے پیچھے ڈھلوان سطح تھی۔ وہ کسی طور اپنے قدموں کو سنبھال نہیں سکی اور بری طرح چیختی ہوئی لڑھکتی چلی گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے ضلع کے سب سے بڑے گاؤں بیر آباد کا چوہدری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا ہے اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ بیر آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہریار کا سہارا پا کر مکمل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چوہدری کی قباحت پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ آفتاب اور کشور خفیہ نکاح کر لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی بیر آباد سے ہے۔ چوہدری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چوہدری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چوہدری اسے اغوا کروا لیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شہریار اپنے ڈرائیور مشاہد خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاندے منتقل کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کر لیتے ہیں۔ گرو جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور چوہدری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور، آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ چوہدری افتخار کو کشور کے غیاب کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کیونکہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چوہدری، ماسٹر آفتاب کو اغوا کرا لیتا ہے۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو جاتی ہے اور اسی دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کہ شہریار ہوتا ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہریار، ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جگو کا سہارا لیتا ہے اور جگو آفتاب کو چوہدری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ ماہ بانو آری کسنڈی میں پہنچ جاتی ہے۔ شہریار ماہ بانو کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے کراچی منتقل کر دیتا ہے۔ ادھر چوہدری کے کارندے بابر کو مار کر آفتاب اور کشور کا پتا لگا لیتے ہیں لیکن وہ وہاں سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ بہا گرو (ورما) کے لوگ ورما کو اسپتال سے نکال لے جاتے ہیں۔ لیاقت رانا پر قاتلانہ حملے کی خبریں سن کر شہریار پریشان ہو جاتا ہے اور انھیں دیکھنے کے لیے لاہور جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ راستے میں ڈاکٹر ماریا کی طبیعت کی خرابی کے باعث انھیں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں مختصر قیام کرنا پڑتا ہے اور اسی قیام کے دوران وہ ماریا کے قریب ہو جاتا ہے۔ ماہ بانو ایک بار پھر چوہدری کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ ادھر شہریار اپنے قدم بہکنے پر خود کی اور ماریا کی نظروں میں گر جاتا ہے اور ماریا کی طرف سے گفتگو سن کر اس سے شادی کر لیتا ہے۔ بڑی چوہدرائن اپنے داماد سے ماہ بانو کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کرتی ہے اور اشرف شاہ، ماہ بانو کو چوہدری کی قید سے نکال کر ڈاکوؤں کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ ماہ بانو ڈاکوؤں کے چنگل میں ہوتی ہے۔ وہاں موجود ڈاکو اسلم ماہ بانو کو پسند کرنے لگتا ہے۔ آفتاب شہریار کو فون کر کے اسے را کے ایجنٹ کی اسلام آباد میں موجودگی کا بتاتا ہے۔ ایک رات غلام محمد نامی را کا ایجنٹ آفتاب کے گھر پر دھاوا بول دیتا ہے۔ اس لڑائی میں کشور کو گولی لگتی ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے تاہم غلام محمد پکڑا جاتا ہے۔ شہریار، مشاہد خان اور فورس کی مدد سے اس پر قابو پاتا ہے۔ کشور کی زندگی بچا لی جاتی ہے۔ اس دوران آفتاب کو پتا چلتا ہے کہ چوہدری کے گرنے کا اسے دکھ ہوتا رہے ہیں۔ آفتاب اور کشور میر پور خاص آ جاتے ہیں۔ ادھر فریدہ چوہدرائن کی سازش کا شکار ہو کر سیڑھیوں سے گر جاتی ہے۔ اس کی جان بچ جاتی ہے اور اس کے ہاں ایک بیٹے کی پیدائش ہوتی ہے۔ راحیلہ کو ڈاکٹر طارق ہوٹل میں چھوڑ کر امریکا چلا جاتا ہے۔ راحیلہ واپس اپنے گھر آ جاتی ہے۔ اس کی نگرانی پر مامور شہریار کا آدمی اسے رپورٹ دیتا ہے۔ شہریار جگو کو فون کر کے چوہدری کی سرمست کرانا چاہتا ہے۔ عبدالستار شہریار کو بتاتا ہے کہ ماہ بانو ڈاکوؤں کے پاس ہے۔ شہریار، مختار مراد کو ٹیلی فون کر کے جنگل میں آپریشن پر زور دیتا ہے۔ ادھر چوہدری کے کہنے پر ڈاکو شہریار کے گھر پر دھاوا بول دیتے ہیں اور زیور اور نقدی لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ آفتاب کے ہاں ایک لڑکی کی پیدائش ہوتی ہے۔ ماہ بانو کو اسلم کے ذریعے شہریار کی شادی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ صدمے سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو اسلم کو شادی کی آفر کرتی ہے مگر ساتھ میں شرط رکھتی ہے کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھ چھوڑ دے اور عزت کی زندگی گزارے تب وہ اس سے شادی کرے گی۔ آفتاب چوہدری کو خط لکھ کر نانا بننے کی نوید سناتا ہے۔ چوہدری چراغ پا ہو جاتا ہے اور آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ وہ چھوٹی چوہدرائن ناہید کو حویلی کی ذمے داریاں دے دیتا ہے جبکہ بڑی چوہدرائن کو تہ خانے میں قید کروا دیتا ہے۔ ادھر اسلم اور ماہ بانو ڈاکوؤں کی پناہ گاہ سے بھاگنے کا پروگرام بناتے ہیں۔ للّی ان کی بات سن لیتی ہے اور زبردستی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔ چوہدری کے کارندے آفتاب کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اسپتال پر دھاوا بول دیتے ہیں تاہم آفتاب اور کشور وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر اس افراتفری میں ان کی نوزائیدہ بچی وہیں رہ جاتی ہے۔ چوہدری کے آدمی بچی کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ وہ بچی کو لے کر نکل رہے ہوتے ہیں کہ راستے میں ہتھیار بردار افراد انھیں دبوچ لیتے ہیں اور بچی کو ان سے لے لیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو، اسلم اور للّی ڈیرے سے بھاگ نکلتے ہیں۔ پولیس ڈیرے پر آپریشن کر کے تمام ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیتی ہے تاہم ماہ بانو کی بازیابی ممکن نہیں ہوتی اور وہ ڈاکو اسلم اور جمرو بھی ہاتھ نہیں آتے۔ شہریار اس صورت حال پر بہت افسردہ ہوتا ہے۔ ادھر آفتاب شہباز کو فون کر کے اپنی بچی کے بارے میں دریافت کرتا ہے اور موجودہ صورت حال کا سن کر اسے افسوس ہوتا ہے۔ جگو کی زبانی شہریار کو پتا چلتا ہے کہ آفتاب پر چوہدری کے کارندے دھاوا بول دیتے ہیں تاہم جگو کے آدمی ان کی تمام کوششیں ناکام بنا کر آفتاب کی بچی کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ شہریار اس خبر پر خوش ہوتا ہے۔ ادھر ڈیوڈ ہیئروئن کا لالچ دے کر چوہدری کو اس کے جوتے کے کارخانے میں ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب قائم کرنے پر آمادہ کر لیتا ہے۔ اسلم، ماہ بانو اور للّی سفر کے دوران ایک جگہ رکتے ہیں۔ اسلم ان کے لیے کھانے کا انتظام کرنے کے لیے شکار کرنے نکلتا ہے مگر ایک آواز پر چونک کر پلٹتا ہے۔ ایک رائفل کی نال نے للّی اور ماہ بانو کو اپنی زد میں لے رکھا ہوتا ہے تاہم موقع ملنے پر اسلم، جمرو پر جا پڑتا ہے اور دونوں کے درمیان خونی تصادم ہوتا ہے۔ للّی اس تصادم میں جمرو کی گولی کا شکار بنتی ہے۔ جمرو، اسلم کے چاقو کا شکار ہو کر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ ادھر شبانہ آفتاب کی مدد کرنے کے چکر میں پولیس کے ہاتھوں دھر لی جاتی ہے۔ جلد ہی اس کی آبرو لٹ جاتی ہے۔ وہ لوگ آفتاب کا فون نمبر پتا کر کے اس کی قیام گاہ کا پتا لگا لیتے ہیں اور چوہدری سے پیسوں کے عوض اس کا پتا بتا دیتے ہیں۔ آفتاب کو شہریار کے ذریعے پتا چلتا ہے کہ اس کی بچی خیریت سے ہے۔ ماہ بانو اور اسلم پہاڑی سلسلے میں آرام کی غرض سے رک جاتے ہیں۔ رات کو ماہ بانو قضائے حاجت کے لیے اٹھتی ہے تو ایک جگہ سے دو سرخ آنکھیں چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹتی ہے اور ڈھلوان پر پھسلتی ہوئی لڑھکتی چلی جاتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ تیزی سے لڑھکتی ہوئی نیچے جارہی تھی اور اس کی انگلیاں خودکار انداز میں زمین کو ٹٹولتی کسی ایسی شے کو تلاش کر رہی تھیں جسے گرفت میں لے کر وہ اپنے لڑھکتے جسم کی حرکت کو روک سکے لیکن ہر بار سنگ ریزوں اور نکیلے پتھروں کی چبھن مایوسی کا پیغام دیتی تھی۔ نرم و نازک ہتھیلیوں میں کئی زخم لگ چکے تھے لیکن فی الحال وہ اتنی وحشت زدہ تھی کہ اس تکلیف کو محسوس نہیں کرسکتی تھی۔ اسے اپنا انجام صاف نظر آرہا تھا۔ شاید اس کی زندگی کے چند سیکنڈ ہی باقی رہ گئے تھے۔ اگر وہ یونہی لڑھکتی رہتی تو یقینی طور پر کسی گہری کھائی میں جا گرتی اور اتنی بلندی سے کسی گہری کھائی میں گرنے کا مطلب تھا کہ اس کی ہڈیاں اتنے حصوں میں تقسیم ہوتیں کہ ان کی گنتی کرنا بھی ممکن نہیں رہتا۔

وہ زندگی جو بار بار موت کے منہ سے نکل کر اسے واپس ملتی رہی تھی، آخرکار ان پہاڑوں میں ساتھ چھوڑنے والی تھی۔ زندگی باوفا تھی تو اسے چوہدری کے چنگل سے بھی نجات ملتی رہی تھی اور وہ ڈاکوؤں کے ڈیرے سے بھی نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ بلتستان کے برفانی پہاڑوں میں واقع دہشت گردوں کے کیمپ میں بھی اس کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکی تھی اور وہ وہاں سے فرار کی کوشش میں اس ابوالاجح سے بھی بچ نکلی تھی جس میں وہ ستم رسیدہ لڑکا عمران پھنس کر اپنی جان سے چلا گیا تھا۔ مرنے سے پہلے عمران نے اسے زندگی سے مایوس نہ ہونے کا مشورہ دیتے ہوئے یہ احساس دلایا تھا کہ اللہ اس کی زندگی کی بار بار حفاظت اس لیے کررہا ہے کہ یقینی طور پر اس سے کچھ خاص کام لینا چاہتا ہے۔ وہ خاص کام ابھی تک اس کے سامنے نہیں آسکا تھا اور وہ یونہی بھول بھلیوں میں بھٹکتی پھر رہی تھی لیکن عمران کی وہ بات یاد آتے ہی اس کے موت کے ڈر سے منجمد ہوتے ذہن کو امید کی حرارت میسر آگئی اور مایوسی کی تاریکی سے نکل کر امید کی روشنی میں سانس لینے کے پہلے ہی لمحے میں قدرت نے اس کی مدد کا بندوبست کردیا۔ وہ کوئی مضبوط جھاڑی تھی جو اچانک ہی اس کے دائیں ہاتھ کی گرفت میں آگئی تھی۔ جھاڑی گرفت میں آئی تو اس کا تیزی سے نیچے جاتا ہوا جسم جھٹکا کھا کر رک گیا۔ اس اچانک لگنے والے جھٹکے نے اس کے پورے شانے میں درد کی لہر دوڑا دی لیکن وہ درد زندگی کی امید بن کر آیا تھا اس لیے قابلِ برداشت تھا۔ اس نے بایاں ہاتھ بھی بڑھا کر جھاڑی پر اپنی گرفت مضبوط کرلی اور اپنے معلق پیروں کو اس ڈھلوان پر کہیں ٹکانے کی کوشش کرنے لگی۔ موجودہ حالت میں بھی وہ کوئی اتنی محفوظ و مامون نہیں تھی لیکن کسی کھائی میں گر کر ہڈیوں کے چور چور ہوجانے کے مقابلے میں یہ حالت بہت بہتر تھی کہ امید کی کوئی کرن تو نظر آئی تھی۔

اندھیرے میں چمکتی ان سرخ آنکھوں کو دیکھ کر گھبراہٹ میں پاؤں رپٹنے سے لے کر یہ عارضی سہارا میسر آجانے تک مشکل سے چند سیکنڈز ہی گزرے تھے، پر ان چند سیکنڈوں میں ہی وہ ایک ایسے تجربے سے روشناس ہوئی تھی جس نے اس کی روح کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے جانا تھا کہ زندگی کی محبت اور موت کا خوف اللہ نے انسان کی جبلت میں اس حد تک شامل کیا تھا کہ مشکل ترین حالات میں بھی جینے کی خواہش دم نہیں توڑتی تھی۔ اس نے بہت سے ایسے لوگ دیکھے تھے جو ذرا سی مصیبت پڑنے پر اپنے لیے موت کی بددعائیں مانگتے تھے لیکن اسے یقین تھا کہ ان لوگوں میں سے اگر کسی کو بھی اس پہاڑی ڈھلوان سے دھکا دے دیا جاتا تو وہ موت کو سامنے دیکھ کر بالکل اسی طرح ہاتھ پاؤں چلاتا جس طرح وہ خود کو بچانے کے لیے کوشش کرتی رہی تھی۔ اسے یہ بھی یقین ہوچلا تھا کہ خودکشی کے ذریعے موت کو گلے لگانے والے بھی آخری لمحوں میں موت کے پنجوں سے بچ نکلنے کی خواہش کرتے ہوں گے۔ یہ اور بات کہ بازی ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ان کی یہ خواہش تکمیل کے مراحل سے گزر پاتی ہو۔ اس کا ثبوت یہ بھی تھا کہ عام طور پر ایک بار خودکشی کی کوشش میں ناکام ہونے والے کو دوبارہ ایسی کوشش کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ کوئی ایک آدھ خصوصی کیس ہو تو بات الگ تھی۔ بہرحال وہ دنیا کے دوسرے انسانوں کے طرزِ فکر سے قطع نظر اس وقت اپنی زندگی بچنے کی امید پیدا ہونے پر خوش تھی اور دل سے اللہ کا شکر ادا کرتی ہوئی اس قابل ہوچکی تھی کہ اپنے اطراف میں ابھرتی ڈوبتی آوازوں کو سن سکے۔ وہ چونکہ لڑھکتی ہوئی کافی نیچے آگئی تھی اس لیے یہ آوازیں بہت واضح نہیں تھیں البتہ وہ یہ اندازہ ضرور قائم کرسکتی تھی کہ ان آوازوں میں کسی جانور کی غراہٹیں اور ایک سے زیادہ انسانوں کے بولنے کی آوازیں شامل ہیں۔ جانور تو یقیناً وہی تھا جس کی سرخ آنکھیں اچانک نظر آنے پر وہ گھبرا گئی تھی البتہ انسانوں کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ دوست تھے یا دشمن۔

سنائی دینے والی ان آوازوں میں سے کوئی ایک آواز اسلم کی بھی ہو سکتی تھی کیونکہ یہ تو کسی طور ممکن نہیں تھا کہ جانور کی غراہٹیں اور اس کی اپنی اضطراری چیخیں اسلم کی نیند میں مخل نہ ہوئی ہوں اور وہ بے سدھ پڑا سوتا رہا ہو۔ یہ خیال دل میں آتے ہی اس نے اسلم کو پکارنے کا ارادہ کیا تاکہ کم از کم وہ اتنا تو جان لے کہ ماہ بانو زندہ ہے اور مدد کی منتظر ہے۔ بے سروسامانی کے عالم میں وہ اس کی کس طرح مدد کرتا یہ سوال اپنی جگہ تھا لیکن یہ زندگی بچانے کی وہی جبلی خواہش تھی جو اسے اسلم کو پکارنے پر اکسا رہی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اسے پکارتی، اوپر سے اسلم کی تشویش میں ڈوبی ہوئی پکار سنائی دی۔ وہ اس کا نام لے کر اسے آوازیں دے رہا تھا۔ اس کی آواز ماہ بانو کے لیے زندگی کا بلاوا تھی چنانچہ اس نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کر کے اسلم کی پکار کا جواب دیا۔

”تم ٹھیک تو ہو نا ماہ بانو؟“ اس کے جواب سے اس کے زندہ ہونے کا یقین ہو جانے پر اسلم کی آواز میں خوشی کی چمک سی محسوس ہو رہی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں مگر یہاں پھنسی ہوئی ہوں۔ زیادہ دیر گزری تو میرا ہاتھ چھوٹ جائے گا اور میں نیچے کھائی میں گر جاؤں گی۔“ اس نے کوشش کی کہ مختصر الفاظ میں اسلم کو اپنی حالت سے باخبر کر سکے کیونکہ ان دونوں کے مابین جتنا فاصلہ تھا، انہیں ایک دوسرے تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے خاصی قوت صرف کرنی پڑ رہی تھی۔

”پریشان مت ہو۔ میں تمہارے پاس آنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ اسلم نے اسے تسلی دی۔ اس کے بعد اوپر سے اسے بہت مدھم سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یوں لگتا تھا کہ اسلم کسی سے مشاورت کر رہا ہو۔ وہ دوسرا شخص کون تھا جس سے اسلم مشاورت کر رہا تھا؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ البتہ یہ بات طے ہو چکی تھی کہ ان پہاڑوں میں ان کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ وہ جس جانور سے ڈری تھی اور بعد میں بھی جس کی غراہٹیں سنتی رہی تھی، اب اس کے بارے میں بھی اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ کوئی کتا تھا جس کی خوفناک غراہٹیں اب دوستانہ ”بھوں بھوں“ میں بدل چکی تھیں۔ سارا ماحول اندھیرے کی لپیٹ میں ہونے کی وجہ سے وہ کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھی اور صرف سماعت پر زور دے کر ہی اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ کچھ دیر کی بھنبھناہٹوں کے بعد اسے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے سخت زمین میں کوئی چیز ٹھونکی جا رہی ہو۔ وہ لوگ خود تو بے سروسامانی کے عالم میں ڈیرے سے نکلے تھے، اس لیے وہ یہ امید نہیں کر سکتی تھی کہ اسلم اوپر سے کوئی رسی پھینک کر اسے کھینچ لینے کا ارادہ رکھتا ہو البتہ دل میں یہ خوش فہمی ضرور پیدا ہو گئی تھی کہ شاید وہاں موجود دوسری پارٹی کے پاس ایسا ساز و سامان موجود ہو۔

وہ اپنی بصارت پر زور دیتے ہوئے اندھیرے میں گھور گھور کر ایسی کسی شے کو تلاش کرنے لگی جس پر رسی کا گمان ہو سکے لیکن کامیاب نہیں ہو سکی البتہ کچھ ٹھونکے جانے کی آوازیں تھوڑے تھوڑے وقفے سے سنائی دے رہی تھیں۔ معلوم نہیں اسلم اسے یہاں سے نکالنے کے لیے کیا تدبیر کر رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی لیکن اپنے بازوؤں میں لمحہ بہ لمحہ بڑھتے اس درد سے بے چین ہونے لگی تھی جو لٹکے رہنے کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ ایک جھاڑی کے سہارے پورے جسم کا بوجھ اٹھانے والے اس کے بازو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ شل ہوتے جا رہے تھے۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ پاؤں کسی جگہ ٹکا کر کچھ بوجھ ان کے سہارے بھی برداشت کر سکے لیکن پیروں کو کوئی ایسی سطح نہیں مل رہی تھی جس پر وہ مسلسل انہیں ٹکا کر رکھ سکے بس لمحہ بھر کے لیے ہی کہیں ٹک پاتے اور پھر ہوا میں معلق ہو جاتے۔ اوپر سے وقفے وقفے سے سنائی دینے والی ٹھک ٹھک کی آوازیں اگر زندگی کا پیغام نہ سنا رہی ہوتیں تو اتنی تکلیف دہ حالت میں لٹکنا مزید دشوار ہو جاتا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ گزرتے وقت کے ساتھ وہ آوازیں نزدیک آتی جا رہی ہیں پھر اسلم کی آواز نے اس کے اندازے کی تصدیق بھی کر دی۔

”ہمت سے کام لینا ماہ بانو! بس تھوڑی دیر کی بات اور ہے پھر میں تم تک پہنچ جاؤں گا۔“ پہلے کے مقابلے میں وہ اس کے کافی نزدیک سے بولتا ہوا اس کی ہمت بندھا رہا تھا۔

”میری فکر نہ کرو، میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے اسلم کی تسلی کروانی چاہی لیکن اس کی آواز اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ جس مشکل میں گرفتار تھی، اس کا عکس اس کی آواز میں بھی جھلک رہا تھا۔ بازوؤں کی طاقت کے بل بوتے پر اپنے پورے جسم کا بوجھ اٹھانا اتنا دشوار کام تھا کہ موسم گرم نہ ہونے کے باوجود بھی اس کے جسم کے ہر مسام نے پسینا پھوٹ پڑا تھا۔ ہتھیلیوں پر پھوٹنے والے پسینے کے قطرات سب سے زیادہ تکلیف دہ تھے کہ ان کی وجہ سے اسے جھاڑی کو اپنی گرفت میں رکھنا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ گزرتا وقت جہاں اس کی ہمت کو کم کر رہا تھا، وہیں اندھیرے کی دبیز چادر ہلکی ہونے لگی تھی اور بہت آہستگی سے نمودار ہوتے سپیدۂ سحر میں دھندلے دھندلے سے مناظر نظر آنے لگے تھے۔

ان مناظر میں سب سے زیادہ قابل توجہ وہ ہیولا تھا جو آہستہ آہستہ اس کے قریب آ رہا تھا۔ وہ یقیناً اسلم تھا اور اس کے طریقہ کار اور جرأت کو دیکھ کر وہ حیرت سے ششدر رہ گئی تھی۔ وہ کسی کوہ پیما کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے پاس جانے وہ کون سی شے تھی جسے وہ زمین میں گاڑ کر ٹھونکتا، اکھاڑتا اس پر ہاتھ یا پیر کا بوجھ ڈالتا نیچے اتر رہا تھا۔ اس کا کام کسی پیشہ ور کوہ پیما کے مقابلے میں زیادہ دشوار تھا کیونکہ ایک تو وہ اوپر سے نیچے کی طرف آ رہا تھا، دوسرے اس کے پاس سہارا لینے کے لیے کوئی رسی بھی موجود نہیں تھی۔

اس بے سروسامانی کی وجہ سے اس کی نیچے اترنے کی رفتار بھی بہت کم تھی۔ اسلم کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو یہ طریقہ ہرگز بھی استعمال نہ کرتا۔ اسلم نے بھی شاید خود کو اس لیے اتنی مشکل میں ڈالا تھا کہ یہ ماہ بانو کی زندگی کا معاملہ تھا اور وہ اس کی زندگی کو ہمیشہ اپنی زندگی پر ترجیح دیتا آیا تھا۔ اس کے طرزِ عمل کو دیکھ کر اسے ہمیشہ یہی محسوس ہوا تھا کہ شاید وہ اپنی جان اس پر نچھاور کرنے کے لیے ہی اس دنیا میں آیا ہے۔ اب بھی وہ جس خطرناک طریقے سے اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ بڑے دل گردے کی بات تھی۔ اسے ایک بار پھر بڑے دل سے اسلم کی بے پناہ محبت کا قائل ہونا پڑا۔ وہ خود شہریار سے محبت کرتی تھی اور کئی بار یہ بھی محسوس کیا تھا کہ شہریار بھی اس کی ذات میں دلچسپی لے رہا ہے لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ کبھی شہریار بھی اس کے لیے ایسی جاں نثاری دکھا سکے گا۔ موت اور زندگی کے مابین جھولتے اپنے وجود کے لیے اسلم کی وہ بے تحاشا محبت محسوس کر کے اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ ان آنسوؤں نے دھندلاتے ہوئے منظر کو کچھ اور بھی دھندلا دیا لیکن وہ مجبور تھی کہ ہاتھ اٹھا کر ان آنسوؤں کو صاف نہیں کر سکتی تھی چنانچہ چپ چاپ انہیں بہنے دیا۔

”اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤ ماہ بانو۔“ جانے کتنے لمحے اور بیت گئے تھے جب اس نے اپنے بالکل قریب سے اسلم کی آواز سنی۔ اس نے سر اٹھا کر اسلم کی سمت دیکھا۔ آنکھوں سے ساون برس جانے کے بعد اب سامنے کا منظر زیادہ واضح تھا۔ اس نے اسلم کا اپنی جانب بڑھا ہوا ہاتھ بالکل واضح طور پر دیکھا اور پھر پہلی بار اس ہاتھ کو پورے خلوص سے تھام لیا۔

”تمہیں اپنے بازو میرے گرد لپیٹ کر میری پیٹھ پر سوار ہونا ہوگا کیونکہ میرے لیے اپنے ہاتھوں کو آزاد رکھنا ضروری ہے۔“ بے ترتیب سانسوں کے ساتھ اسلم نے اسے ہدایت دی جیسے سمجھتے ہوئے اس نے پورا پورا عمل کیا۔ ان لمحات میں وہ اسلم سے اتنی قریب ہو گئی تھی کہ ان دونوں کی سانسیں آپس میں الجھنے لگی تھیں اور جس طرح اس کے دھڑ دھڑاتے دل کی آواز اسلم کی سماعتوں میں اتر رہی تھی، اسی طرح وہ اس کے جسم کے گرد اپنے بازو حمائل ہونے کے باعث اس کے سینے پر رکھے اپنے ہاتھ پر اس کے دل کی ایک ایک دھڑکن محسوس کر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ نمودار ہوتی روشنی میں اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اسلم اب تک کس چیز کو زمین میں ٹھونک کر اس کی مدد سے نیچے اترتا رہا تھا۔ وہ دو عدد خنجر تھے جن میں سے ایک تو یقینی طور پر اسلم کا ہی تھا اور دوسرا لازماً اس نے اوپر موجود افراد یا فرد سے حاصل کیا تھا۔ ان خنجروں کو وہ ایک پتھر کی مدد سے زمین میں ٹھونک رہا تھا اور ایک چھوٹے سے رسی کے ٹکڑے میں پھندا لگا کر اکھاڑتا جا رہا تھا۔ غنیمت تھا کہ پہاڑی علاقہ ہونے کے باوجود ڈھلان کی زمین زیادہ سخت نہیں تھی اور ڈھلوان بھی اتنی عمودی نہیں تھی کہ سیدھے نیچے جا پڑنے کا شدید خطرہ ہو۔ ہلکی سی روشنی میں وہ یہ بھی دیکھ سکتی تھی کہ جس جھاڑی کو اس نے تھام رکھا تھا، اس کے علاوہ بھی کئی جھاڑی نما پودے وہاں موجود ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر تھے کہ ان کی مدد سے ڈھلوان پر اترنا یا چڑھنا ممکن نہیں تھا۔

اسلم کی پیٹھ پر سوار اس کے اعضا سے اپنے اعضا پیوست کیے اس کا اوپر کی سمت سفر جاری رہا۔ اسلم کا جسم بھی اسی کی طرح سخت مشقت کے باعث پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ ایک دوسرے کے پسینے کی بو محسوس کرتے وہ اس کشش کو بھی محسوس کر رہے تھے جو اللہ نے آدم و حوا کے مابین تخلیق کی ہے۔ سخت مخدوش حالات میں بھی ان کے جسم سنسنا رہے تھے۔ ماہ بانو کے لیے یہ تجربہ بہت عجیب تھا۔ صنفِ مخالف سے اس قدر قربت کا یہ اس کی زندگی میں پہلا انوکھا موقع تھا اور وہ اندر ہی اندر سکڑنے کے باوجود خود کو اسلم سے جدا کرنے سے قاصر تھی۔ اس موقع سے قبل ایک بار چودھری نے بھی اس کے وجود کو اپنے جسم تلے روندنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے ذہن پر چودھری کے بدبودار اور وحشی لمس کا نقش ہمیشہ کے لیے ثبت ہو کر رہ گیا۔ اس کے بعد ہوٹے کے ایک کیمپ میں ڈیوڈ نامی غیر ملکی سیاح اور بلتستان کے پہاڑی کیمپ میں زیرِ تربیت ایک وحشت گرو نے اور ڈیرے پر جمرو نے بھی اسے پامال کرنے کی کوشش کی تھی۔ خوش قسمتی سے ایسے ہر موقع پر اس کی عزت کا موتی محفوظ رکھنے کے لیے قدرت نے کوئی نہ کوئی بندوبست کر دیا تھا لیکن وہ مرد کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

قربت کے ہیبت ناک تصور میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

آج کا تجربہ اس کے پچھلے ہر تجربے سے مختلف تھا۔ آج جو مرد اس کے قریب تھا وہ اپنے کسی سفلی جذبے کی تسکین کے لیے اس کے قریب نہیں آیا تھا بلکہ اس کے لیے زندگی کا پیامبر بن کر آیا تھا۔ ان کی آپس کی یہ قربت بھی اتفاقاً اور ضرورتاً تھی لیکن وہ...... بھرپور طریقے سے اس قربت کو محسوس کر رہی تھی۔ اس لمس میں بڑی مٹھاس اور چاشنی تھی۔ یہاں تک کہ شہریار کے خیال نے بھی اسے اسلم سے کہیں بھٹکایا تھا نہ اسے یہ محسوس ہوا تھا کہ وہ اسلم کے اتنے قریب ہو کر شہریار سے کسی قسم کی بے وفائی کی مرتکب ہو رہی ہے۔ یہ شاید اسلم کی بے پناہ محبت تھی جس نے اس کے دل پر شہریار کا قبضہ ہونے کے باوجود بھی وہاں چپکے سے نقب لگا کر کسی گوشے میں جگہ بنالی تھی۔ ان لمحات میں وہ محسوس کر سکتی تھی کہ اس نے شہریار کی شادی کا سن کر محض جذبات میں اپنی زندگی کو کارآمد بنانے اور اسلم کو سدھارنے کے خیال سے...... شادی کا جو فیصلہ کیا تھا، آج اس فیصلے میں اس کی دلی رضا بھی شامل ہو گئی تھی۔ اگر وہ دونوں ان مہیب حالات سے نکل جانے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ یقیناً بہت خوشی سے اسلم کے گھر میں بسنا قبول کر لیتی۔

"آجاؤ دوست! مبارک ہو کہ تم دونوں کو ایک نئی زندگی مل گئی ورنہ میں تو ڈر ہی رہا تھا کہ کہیں تم بھی اپنی ساتھی کے ساتھ کھائی میں نہ جا گرو۔" وہ اپنی سوچوں اور تجزیوں میں منہمک تھی اس لیے واپسی کا سفر سست ہونے کے باوجود وقت گزرنے کا احساس نہیں کر سکی اور قریب سے سنائی دینے والی اجنبی مردانہ آواز سن کر چونکی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اس نے سہارے کے لیے اسلم کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اسے ہموار سطح پر پہنچنے کے لیے مدد دے رہا تھا۔ جیسے ہی وہ لوگ ہموار سطح پر پہنچے، ماہ بانو اسلم سے الگ ہو گئی۔ اسلم زمین پر گر کر ہانپنے لگا۔ وقت کے اس گزرنے والے دورانیے میں اس نے زندگی اور موت کی جنگ لڑی تھی۔ اس جنگ میں اس کے مقابل اپنے جیسا کوئی انسان نہیں تھا بلکہ وہ پہاڑی ڈھلوان تھی جس پر اگر ایک بار بھی قدم غلطی کر بیٹھتے تو اس کا اور ماہ بانو کا ٹھکانا اس کھائی میں ہی ہوتا جہاں سے ان کی ہڈیاں بھی ملنی مشکل تھیں۔

ماہ بانو خود بھی اسلم کے قریب ہی گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ اگرچہ واپسی کے سفر میں اسے خود کوئی جسمانی مشقت نہیں اٹھانی پڑی تھی اور اسلم نے ہی اس کا سارا بوجھ ڈھویا تھا لیکن موت کے پنجوں سے بچ نکلنے کی بے یقینی سی خوشی نے اعصاب کو شل کر دیا تھا۔

"لو پانی پی لو۔" چند لمحے گزرنے کے بعد اسے اپنے قریب سے وہی اجنبی آواز سنائی دی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ بڑھے ہوئے بالوں اور گھنی داڑھی والا ایک سرخ و سفید جواں سال آدمی تھا جو اس کی طرف پانی کی بوتل بڑھا رہا تھا۔ اسلم کو اس نے شاید اس کی سانسیں سنبھل جانے کا موقع دینے کے لیے پانی کی پیشکش نہیں کی تھی۔ ماہ بانو نے اس کی بڑھائی ہوئی بوتل فوراً ہی جھپٹ لی اور بے تابی سے بڑے بڑے گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے لگی۔ تقریباً آدھی بوتل پانی پینے کے بعد اس کے حواس ذرا بحال ہوئے تو اس نے کھسیانے پن کے ساتھ اجنبی کو بوتل واپس کر دی جسے اس نے ایک نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ وصول کر لیا۔ اس دوران میں اسلم بھی خود کو سنبھال چکا تھا اور اپنی جگہ پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ مرد نے پانی کی بوتل اب اس کی طرف بڑھائی تو وہ بھی کافی سارا پانی پی گیا لیکن اس کے انداز میں ماہ بانو کے مقابلے میں کافی ٹھہراؤ تھا۔ کچھ دیر قبل شدید مشقت سے گزرنے کے باوجود اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا تھا۔ یہ سخت جانی ڈیرے پر گزرنے والی زندگی کی دین تھی۔ وہ برسوں ایک ڈاکو کی حیثیت سے اپنے شب و روز گزارتا رہا تھا۔ اس زندگی میں مار پیٹ، بھاگ دوڑ اور اچھل کود سے لے کر موسم کی سختیاں سہنے تک سب کچھ شامل تھا اس لیے اس کی قوت برداشت ایک عام انسان سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ پھر کچھ کمال اس کی فطری صلاحیتوں کا بھی تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں جب جو کام انجام دینا پڑے اسے بہت احسن طریقے سے انجام دیتے ہیں۔ جب وہ ایک طالب علم تھا تو اس حیثیت سے بھی اپنی ذہانت کا لوہا منواتا رہا تھا۔ ڈاکو بنا تو برسوں پرانے اپنے سے کہیں زیادہ تجربہ کار ڈاکوؤں پر بازی لے گیا اور اب ماہ بانو کے محافظ کی حیثیت سے بھی وہ اپنا کردار بہ خیر و خوبی نبھا رہا تھا۔

"میرے خیال میں یہاں سے ہٹ کر تمہارے پڑاؤ کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں الاؤ جل رہا ہے، ہمیں حرارت بھی ملتی رہے گی اور کسی درندے کے حملے کا خوف بھی نہیں رہے گا۔ اس کے علاوہ میں تمہیں مزیدار سی چائے بھی بنا کر پلاؤں گا۔" ان دونوں کی حالت سنبھلتے دیکھ کر اجنبی مرد نے ان سے کہا۔ اس کے لہجے میں موجود نرمی نے ماہ بانو کو سمجھا دیا کہ وہ جو کوئی بھی ہے، دوستانہ مزاج رکھتا ہے۔ یوں بھی اگر وہ دوستی کے بجائے دشمنی کا مظاہرہ کرتا تو وہ اور اسلم نہ تو اتنے سکون سے بیٹھ پاتے اور نہ ہی وہ انہیں پینے کا پانی پیش کرتا۔

اسلم نے اجنبی کی تجویز قبول کر لی تھی چنانچہ وہ خاموشی سے کھڑا ہو گیا اور پھر وہ سہ رکنی قافلہ پڑاؤ کی طرف بڑھنے لگا۔ ان کے ساتھ بڑے بالوں والا وہ جسیم کتا بھی تھا جس کے اندھیرے میں اچانک سامنے آجانے سے وہ اتنی خوف زدہ ہوئی تھی کہ اس کا پاؤں ڈھلوان پر پھسل گیا تھا۔ پڑاؤ قریب ہی تھا چنانچہ وہ لوگ چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے فوراً ہی وہاں پہنچ گئے۔ اسلم کے جلائے گئے الاؤ کی آگ کافی کم ہو چکی تھی۔ دھیرے دھیرے پھیلتے صبح کے اجالے میں اب آگ میں مزید اضافے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ کچھ دیر اور گزرتی تو ٹھنڈک کا احساس بھی ختم ہو جاتا اور اندھیرے میں کسی درندے کے حملے کا خطرہ بھی نہیں رہتا۔ اب بھی موسم بہت شدید ٹھنڈا نہیں تھا لیکن پہاڑی علاقہ ہونے اور کہر کی وجہ سے گرمائش کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ سورج نکلتا تو صورت حال یکسر تبدیل ہو جاتی۔

"تم دونوں میں سے کسی کو گڑ ناپسند تو نہیں ہے۔ میں چائے میں میٹھے کے لیے گڑ استعمال کروں گا۔" اجنبی نے الاؤ کے قریب پہنچ کر اپنی پیٹھ پر لدا بڑے سائز کا تھیلا اتار کر ایک طرف رکھ دیا تھا اور اس میں سے ایک چھوٹی سی پتیلی اور دیگر سامان نکال کر چائے بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ان کے پوچھے گئے سوال پر اسلم نے گڑ کے استعمال پر کوئی اعتراض نہ ہونے کا عندیہ دیا تو وہ مطمئن ہو کر ایک بار پھر اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ وہ دونوں جس بے سروسامانی کا شکار تھے، اس میں کھانے پینے کے لیے جو کچھ بھی مل جاتا انہیں نعمت ہی لگتا۔ پسند ناپسند کی عیاشی تو صرف ان لوگوں کے لیے ہوتی ہے جو اپنے پُرسکون گھروں میں بہتر وسائل کے ساتھ شب و روز گزار رہے ہوں۔

"یہ کون ہے؟" اجنبی پوری تندہی سے چائے بنانے میں مصروف ہو گیا تو ماہ بانو نے اسلم سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ میں تو تمہاری چیخ سن کر جاگا تھا اور پھر آواز کی سمت میں دیوانہ وار بھاگ کر وہاں تک پہنچا تو یہ شخص اپنے کتے سمیت نظر آیا۔ تمہیں غیر موجود پا کر شاید میں وحشت کے عالم میں اس سے ٹکرا جاتا لیکن اس نے خود ہی آگے بڑھ کر اپنے دوست ہونے کا اعلان کیا اور پھر بتایا کہ تمہارا ساتھی میرے کتے سے گھبرا کر نیچے پھسل گیا ہے اور ہمیں آپس میں الجھے بغیر پہلے یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ میرے لیے یہ آدمی اتنا قابل بھروسا نہیں تھا لیکن تمہاری زندگی میرے لیے ہر خطرے سے بڑھ کر اہم تھی۔ میں نے اس کے کہنے پر تمہیں پکارا اور جواب میں تمہاری آواز سن کر پھر سے جی اٹھا۔ اب سوال یہ تھا کہ تمہیں وہاں سے کیسے نکالا جائے۔ میرے پاس کوئی ایسا انتظام بھی نہیں تھا۔ اس شخص نے خود ہی مجھے تدبیر سجھائی کہ کوہ پیماؤں کے طریقہ کار پر عمل کرتے ہوئے تم تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ایک خنجر میرے پاس تھا، دوسرا اس سے مل گیا۔ بس پھر میں تم تک پہنچنے کے لیے دیوانہ وار میدانِ عمل میں کود گیا۔ اس شخص نے پیشکش کی تھی کہ وہ یہ کام انجام دے سکتا ہے لیکن میں تمہارے سلسلے میں کسی پر اعتماد کیسے کر سکتا تھا۔ وہ اگر نیچے اترتا تو اس کے پیش نظر ایک دوسرے انسان کی جان بچانے کا کام ہوتا اور وہ کوئی کوتاہی بھی کر سکتا تھا جبکہ میرے لیے تو یہ اپنی زندگی بچانے والی بات تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ تم خیریت سے اوپر آنے میں کامیاب ہو گئیں۔ خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو میرے پاس بھی اسی اندھی کھائی میں کودنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔" اس نے ساری داستان مختصراً سناتے ہوئے آخر میں اپنے جذبات کا بھی اظہار کر دیا تھا جن کے سچ ہونے میں ماہ بانو کو کوئی شک نہیں تھا۔

"یہ لو بھئی گرما گرم چائے ہے اور اس کے ساتھ یہ روغنی روٹیاں بھی کھاؤ۔ اس ویرانے میں، میں تمہاری بس اتنی ہی مہمان نوازی کر سکتا ہوں۔" جتنی دیر میں اسلم نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا، اجنبی نے چائے تیار کر لی اور اپنے تھیلے میں سے پلاسٹک کی تھیلی میں لپٹی روٹیاں نکال کر چائے کے ساتھ پیش کیں۔ وہ دونوں یہ نعمتیں سامنے پا کر کھل اٹھے۔ پچھلی رات ان دونوں نے کھانے کے نام پر جو کچھ کھایا تھا، وہ سانسوں کی ڈور جوڑے رکھنے کے کام تو آ سکتا تھا لیکن شکم سیری بہرحال نہیں ہو سکی تھی۔

"تم بھی تو ہمارا ساتھ دو نا۔" منہ میں پانی بھر آنے کے باوجود اسلم نے کھانا شروع کرنے سے پہلے اجنبی سے کہا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ چائے صرف ان دونوں کو پیش کی گئی ہے اور خود اس نے اپنے لیے چائے نہیں نکالی۔

"میرے پاس چائے کی مزید پیالیاں موجود نہیں اس لیے میں اچھے میزبان کی طرح مہمانوں کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا پسند کروں گا۔" اس نے نہایت صاف گوئی سے وجہ بتا دی۔ اس مرحلے پر وہ لوگ یہ شک نہیں کر سکتے تھے کہ اجنبی نے ان کی چائے میں کچھ ملا کر انہیں بے ہوش یا ہلاک کرنے کا انتظام کیا ہو گا۔ وہ شخص بالکل اچانک ان سے ٹکرایا تھا۔ اس سے نہ تو ان کی دشمنی تھی اور نہ ہی دوستی۔ اگر وہ کوئی لٹیرا یا ڈاکو ہوتا تو بھی ان لوگوں کی بے سروسامانی دیکھ کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان کے پاس سے اسے کچھ نہیں مل سکے گا چنانچہ اس پر کوئی شک کرنے کے بجائے وہ پیٹ کی آگ بجھانے میں مصروف ہو گئے۔

''اگر ہمارا میزبان اس دوران اپنا تعارف بھی کروا دے تو اچھا ہوگا۔ اس ویرانے میں ملنے والے اتنے مہربان میزبان سے تعارف حاصل کر کے ہمیں خوشی ہوگی۔'' دو تین لقمے حلق سے نیچے اتارنے کے بعد اسلم نے اس سے فرمائش کی۔

''میرا نام شفقت راؤ ہے۔ میں ٹالی والا پنڈ کا رہنے والا ہوں پیشے کے اعتبار سے تاجر ہوں اس لیے مستقل اپنے پنڈ میں نہیں رہ پاتا اور زیادہ وقت شہر میں گزارتا ہوں۔'' اس نے اپنا جو مختصر تعارف کروایا اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس کا لہجہ اتنا رواں اور زبان اتنی صاف کیوں ہے، ورنہ اتنی دیر سے اسلم کو اس کی زبان کی وجہ سے ہی اسے کسی گاؤں کا رہائشی سمجھنے میں تامل تھا اور کسی دور دراز شہر سے آنے والے کا ان پہاڑوں میں موجود ہونا سمجھ سے بالاتر۔ ویسے تو کسی گاؤں کے رہائشی کو بھی اس طرف آنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ نامساعد حالات میں اپنے بچاؤ کے لیے اس پہاڑی سلسلے کے ساتھ واقع کسی گاؤں کا باشندہ اس طرف کا رخ کر سکتا تھا۔

''تعارف کچھ ادھورا سا ہے راؤ صاحب! ان پہاڑوں میں تو آپ اپنے کسی تجارتی دورے پر نہیں ہو سکتے۔'' چائے کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے اسلم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ویسے چائے شفقت راؤ کے دعوے کے مطابق واقعی مزیدار تھی اور انہیں اس لیے اور بھی زیادہ مزے کی لگ رہی تھی کہ کافی طویل وقفے کے بعد ایسی کوئی نعمت میسر آسکی تھی۔

''ابھی تو ملے ہیں۔ آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان لیں گے۔ آپ فرمائیں، آپ دونوں کون ہیں؟ اتنا تو میں بھی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ آپ دونوں بھی عام حالات میں اس طرف نہیں آنکلے ہوں گے۔'' شفقت راؤ نے نہایت سہولت سے گفتگو کا رخ ان دونوں کی طرف موڑ دیا۔

''میں اسلم صحیح ہوں اور یہ میری بیوی ماہ بانو ہے۔ آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا کہ ہم عام حالات میں اس طرف نہیں آئے ہیں بلکہ ایک حادثے کی وجہ سے راستہ بھٹک کر یہاں آنکلے ہیں اور اب ان پہاڑوں سے نکلنے کے لیے مارے مارے پھر رہے ہیں۔'' اسلم نے محتاط الفاظ میں اپنا تعارف کروایا۔ اسلم کے خود کو بیوی قرار دیے جانے پر ماہ بانو کے چہرے پر سرخی کی لہری دوڑ گئی۔ وہ پہلے ہی چست جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ہونے کی وجہ سے بدن چرائے کچھ جھینپی ہوئی بیٹھی تھی، اس تعارف پر مزید جھینپ گئی لیکن موجودہ حالات میں یہی تعارف سب سے مناسب بھی تھا۔ اگر اسلم اسے بیوی کے بجائے کوئی دوست قرار دیتا تو اس کے کردار کو مشکوک سمجھا جا سکتا تھا۔ مرد و زن کی دوستی معاشرے کے بہت زیادہ مغرب کے نقشِ قدم پر چل پڑنے کے باوجود ایک مخصوص طبقے کو چھوڑ کر مشرق میں ابھی تک معیوب ہی سمجھی جاتی تھی اور خصوصاً دیہاتوں میں تو اس کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں تھا۔

''اندھیرے میں تمہاری بیوی کو میں لڑکا سمجھا تھا اور بات چیت کے خیال سے اپنے بکتے سمیت ان کی طرف بڑھا تھا۔ وہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ نیچے پھسل جانے والا شخص لڑکا نہیں بلکہ کوئی خاتون ہیں۔ میں بھابی جی سے معافی چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے انہیں اتنی پریشانی اٹھانی پڑی۔'' وہ بڑے مہذبانہ انداز میں وضاحت پیش کرتا ہوا معذرت کرنے لگا۔

''کوئی بات نہیں راؤ صاحب! کبھی کبھی انسان کسی ایسی غلطی میں ملوث ہو جاتا ہے جس کا اسے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ آپ بس یہ شکر ادا کریں کہ یہ محفوظ ہے۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میں آپ کے بےقصور ہونے کے باوجود بھی آپ کو معاف نہیں کر پاتا۔'' اس بار بھی اسلم نے جواب دیا اور ہلکے پھلکے انداز میں اپنے لیے ماہ بانو کی اہمیت بھی جتا دی۔

''بہت خوش نصیب ہیں بھابی جی کہ انہیں تمہارے جیسا چاہنے والا آدمی ملا۔ یہ تو بتاؤ تم انہیں لے کر یہاں کہاں نکلے ہوئے تھے۔ وضع قطع سے تو اس علاقے کے رہنے والے نہیں لگتے؟'' شفقت راؤ عمر میں اسلم سے بڑا تھا چنانچہ اس کے ساتھ ذرا بےتکلفانہ طرزِ تخاطب سے کام لے رہا تھا۔ ساتھ ہی ان کے بارے میں جاننے کے لیے بھی متجسس تھا اس لیے ایک بار پھر گھما پھرا کر اپنا سوال کر ڈالا۔ اسلم اس دوران میں اپنے ذہن میں ایک کہانی تیار کر چکا تھا لہٰذا اس بار اس کے سوال کو ٹالنے کے بجائے اطمینان سے بولا۔

''ہم کراچی کے رہنے والے ہیں۔ میں وہاں ایک کراٹے کلب چلاتا ہوں۔ ماہ بانو کو پنجاب کی دیہی زندگی دیکھنے کا بہت شوق تھا اس لیے میں اسے ان علاقوں میں گھمانے کے خیال سے لے کر نکلا تھا۔ اتفاق سے ہم شروع میں ہی حادثے کا شکار ہو گئے۔ ہوا کچھ یوں کہ ہم پیر آباد نامی گاؤں میں گھومتے گھومتے جنگل کی طرف نکل پڑے اور وہاں ہمیں ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ انہوں نے ماہ بانو کے زیورات سمیت ہمارا کیمرا اور دوسری قیمتی اشیا چھین لیں۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی کہ چلو مال گیا تو گیا جان و آبرو تو محفوظ ہے لیکن وہ بہت ہی حرام خور تھے۔ انہوں نے کوشش کی کہ ماہ بانو کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں چنانچہ مجھے اپنے جوڈو کراٹے کے کمالات دکھانے پڑے۔ میری خاموشی پر وہ لوگ مجھے کاٹھ کا الو سمجھ بیٹھے تھے اس لیے اچانک حرکت میں آنے پر بوکھلا گئے۔ ان کے دو ساتھیوں کو تو میں نے اچھا خاصا زخمی کر دیا تھا۔ ان کی رائفلیں بھی چھین لی تھیں لیکن وہ تعداد میں زیادہ تھے اور مسلح بھی چنانچہ پہلے گھبرا کر بھاگے پھر پلٹ کر فائرنگ کرنے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اکیلا ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ماہ بانو رائفل چلا لیتی ہے لیکن اس کا نشانہ زیادہ اچھا نہیں ہے۔ بس یہی سوچ کر میں فائرنگ کا ہلکا پھلکا جواب دیتا ہوا اسے لے کر بھاگ نکلا۔ بھاگتے ہوئے سمت کا تعین کرنا ممکن نہیں تھا چنانچہ ہم بےخبری میں ان پہاڑوں کی طرف آنکلے۔ یہاں سے واپس جنگل میں گھس کر پیر آباد پہنچنے کی کوشش کرنے میں خدشہ تھا کہ دوبارہ ڈاکوؤں سے سامنا نہ ہو جائے اس لیے ہم نے سوچا کہ ان پہاڑوں سے گزر کر کسی اور طرف کی آبادی میں نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی کوشش میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔'' اس نے شفقت راؤ کو ایک ایسی کہانی سنا ڈالی جو ان کی وضع قطع کے ساتھ میل کھا سکے۔

''تم خوش قسمت ہو بھائی کہ ان ڈاکوؤں سے بچ نکلے ورنہ لوٹ مار کرنے اور عورتوں کے معاملے میں ان کی شہرت بڑی خراب ہے۔ ویسے میں تمہیں ایک خوش خبری سنا ڈالوں کہ پولیس نے جنگل میں ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن شروع کر رکھا ہے۔ میں جب ٹالی والا سے نکلا تھا اس وقت یہ خبر ریڈیو پر سنی تھی۔ آگے کیا حالات و واقعات پیش آئے اس کا مجھے معلوم نہیں۔'' شفقت راؤ نے ڈیرے پر پولیس آپریشن کی تصدیق کر ڈالی جسے سن کر اسلم نے سکون کا سانس لیا کہ وہ خوش قسمتی سے آپریشن شروع ہونے سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا ورنہ دوسری صورت میں یا تو وہ پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن جاتا یا پھر جیل کی تاریک کوٹھری میں پڑا ہوتا۔۔۔ اور اب جو یہ نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کا روشن خواب آنکھوں میں کروٹیں لینے لگا تھا، اس کا کہیں کوئی نام و نشان بھی نہیں ہوتا۔

''آپ اپنے بارے میں بتائیں کہ آپ کیسے ان پہاڑوں میں آنکلے؟'' شفقت راؤ کو اپنی طرف سے کافی حد تک مطمئن کرنے کے بعد اس نے اس کے بارے میں دریافت کیا۔

''میں بھی کچھ مشکل حالات میں ہی اس طرف آیا ہوں لیکن تم میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ میں بےسروسامانی کے عالم میں نہیں نکلا بلکہ پوری تیاری کے ساتھ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نکلا ہوں اور ان پہاڑی راستوں سے خاصا واقف بھی ہوں۔ بس حالات ایسے تھے کہ میرا ٹالی والا میں رہنا ممکن نہیں رہا تھا لیکن مجھے خوشی ہے کہ میں وہاں سے کچھ ایسا کر کے نکلا ہوں کہ میرے پیچھے میرے دشمن اپنے زخم چاٹتے پھریں گے بلکہ ان میں سے کئی نیست و نابود ہو گئے ہوں گے۔'' شفقت راؤ کے لہجے میں آگ کے شعلے لپک رہے تھے اور آنکھیں غم و غصے کے اتھاہ سمندر میں ڈوبی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''کیا کوئی خاندانی دشمنی کا معاملہ تھا؟'' اس سے ہمدردی محسوس کرتے ہوئے اسلم نے اندازے کی بنیاد پر سوال کیا۔ گفتگو کے اس سلسلے میں نہ صرف وہ اور ماہ بانو کھانے پینے سے فارغ ہو چکے تھے بلکہ شفقت راؤ بھی پیالی خالی ہو جانے کے بعد چائے پی چکا تھا۔ اس نے صرف چائے پینے پر ہی اکتفا کیا تھا اور روٹی روٹیوں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔

''خاندانی دشمنی تو نہیں تھی لیکن ایسے شخص سے دشمنی تھی جس نے میرے خاندان کو تباہ کر کے رکھ دیا۔'' شفقت راؤ کی آنکھوں کی اداسی اس کے لہجے میں بھی اتر آئی اور بھرّائی آواز مدھم پڑ گئی۔

''زخم خوردہ لگتے ہو۔ کچھ ہمیں بھی بتاؤ کہ تم پر کیا گزری؟'' اسلم نے شفقت راؤ کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ماہ بانو بھی شروع ہی سے ان دونوں کی گفتگو توجہ سے سن رہی تھی اور اس وقت اس کے اندر بھی تجسس جاگ اٹھا تھا کہ شفقت کے حالات سے آگاہ ہو سکے تاہم اس نے زبان سے کچھ کہنے سے گریز ہی کیا تھا اور بظاہر غفلت شفقت کی کہانی سننے کی منتظر تھی۔

''چھوڑو یار! کیا کرو گے میرا دکھ سن کر؟ میں ایسا کرتا ہوں کہ تمہیں اپنے پنڈ تک پہنچنے کا راستہ سمجھا دیتا ہوں۔ میں تمہیں ان پہاڑوں میں اتنی واضح نشانیاں بتاؤں گا کہ تم آرام سے ٹالی والا تک پہنچ جاؤ گے۔ وہاں میری بہن کا گھر ہے۔ اس کا خاوند میرا جگری دوست ہے۔ تم ان کے گھر چلے جانا اور انہیں بتانا کہ شفقت راؤ کے مہمان ہو۔ وہ تمہارا ہر

WWW.PAKSOCIETY.COM

طرح سے خیال رکھیں گے اور انتظام کر دیں گے کہ تم اپنے گھر یا جہاں کہیں بھی چاہو جا سکو۔" شفقت راؤ نے موضوع کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں ایک پرکشش پیشکش کی۔

"آپ کی اس مہربانی کا شکریہ راؤ صاحب! آپ کا ہم پر یہ بہت بڑا احسان ہوگا لیکن دل میں ایک خلش سی رہے گی کہ ہم اپنے محسن کا دکھ بھی نہ جان سکے۔" اسلم نے بہت محتاط الفاظ میں اصرار کیا جس کا راؤ پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ افسردہ سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا۔

"میں دکھوں کی تشہیر کا قائل نہیں ہوں لیکن تم اتنا اصرار کر رہے ہو تو میں مسلسل انکار کر کے تمہاری دل آزاری نہیں کر سکتا۔" وہ جیسے خیالوں میں ڈوب گیا اور اس کے چہرے پر چھائی اداسی کے بادل مزید گہرے ہونے لگے۔ اس کھوئی کھوئی کیفیت میں اس نے اپنی داستان کا آغاز کیا۔

"میں ایک خوش حال اور خوش وخرم گھرانے کا مالک تھا۔ ورثے میں زمینیں ملی تھیں لیکن میں نے زراعت کا پیشہ اپنانے کے بجائے تجارت سے روزی کمانا پسند کیا اور ورثے میں ملی ہوئی زمینیں بیچ کر اپنا کام شروع کر دیا۔ کچھ تعلیم یافتہ بھی تھا اور کچھ قسمت بھی مہربان تھی کہ اللہ نے روزی میں برکت دی۔ والدین نے گاؤں کے رواج کے مطابق کم عمری میں ہی شادی کے بندھن میں باندھ دیا تھا۔ میری بیوی میری چچازاد تھی اور ہر اعتبار سے ایک اچھی عورت تھی۔ میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں کئی کئی دن گھر سے باہر رہتا لیکن وہ اللہ کی بندی زبان پر حرف شکایت نہ لاتی بلکہ جب بھی میں پلٹ کر واپس آتا، ہر ہر طرح سے میری خدمت کرتی۔ اللہ نے ہمیں ایک بیٹی اور بیٹے کی نعمت سے نوازا تھا۔ بیٹی کو میں نے کم عمری میں ہی اپنی بہن کے بیٹے سے بیاہ دیا۔ بیٹا اس سے چار سال چھوٹا تھا اور اس سال میٹرک کا امتحان دینے والا تھا۔ میں نے اکلوتے بیٹے کی تعلیم پر خاص توجہ دی تھی اور اسے بورڈنگ میں رکھ کر پڑھوا رہا تھا۔ وہ بس چھٹیوں میں گاؤں آتا تھا اور سب کا بہت لاڈلا تھا۔ تم یقین جانو کہ اس جیسا ہونہار اور ذہین لڑکا پورے پنڈ میں کوئی اور نہیں تھا۔ میں اس کا باپ ہونے کی وجہ سے یہ بات نہیں کہہ رہا بلکہ سارا پنڈ یہی کہتا تھا کہ شفقت راؤ کے پتر کا کوئی اور جوڑی دار نہیں ہے۔ میں جب اس کی تعریفیں سنتا تو میرا سینہ فخر سے پھول جاتا لیکن پھر وہ ہوا جس نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔" وہ دونوں دیکھ سکتے تھے کہ بیٹے کا ذکر آتے ہی شفقت راؤ کی آنکھوں کا کرب کچھ اور بھی بڑھ گیا ہے۔ پھر وہ اپنے بیٹے کے لیے مستقل "تھا" کا صیغہ استعمال کر رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کی دردبھری داستان کا سرا اس کے بیٹے سے ہی جڑا ہوا ہے۔ ان دونوں کی خود پر جمی نظروں سے بے خبر شفقت راؤ اپنے ہی دکھ میں ڈوبا بولتا رہا۔

"سولہ سال کی عمر کچھ اتنی زیادہ نہیں ہوتی اور والدین اس عمر کی اولاد کو عموماً بچہ سمجھنے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں لیکن حقیقت میں عمر کا یہی دور سب سے زیادہ نازک ہوتا ہے اور اپنے رنگ دکھاتا ہے۔ میرے بیٹے صداقت کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ پتا نہیں کیسے اور کیوں وہ اپنے اسکول میں آنے والی ایک نئی ٹیچر کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ سولہ سال کے ایک لڑکے کی خود سے چھ سات سال بڑی لڑکی سے وہ محبت بڑی عجیب تھی۔ وہ ایک بار چھٹیوں پر گھر آیا تو گھر پر بھی اپنی اس ٹیچر کا ذکر کرتا رہا۔ اسے اس کا ہنسنا بولنا، پہننا اوڑھنا سب کچھ بہت بھاتا تھا اور وہ بات بات پر اپنی رعنا مس کا ذکر نکال بیٹھتا تھا۔ ہم نے اس کی باتیں سنیں لیکن اس تعلق کو استاد شاگرد کے گہرے تعلق سے بڑھ کر اہمیت نہیں دی۔ اصل کہانی تو اس وقت پتا چلی جب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ آخری بار صداقت چھٹیوں میں گھر پر رہنے کے لیے آیا تو بہت بجھا بجھا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ میں ان دنوں گاؤں میں نہیں رک سکا اور ایک اہم کاروباری معاملے کی وجہ سے شہر چلا گیا۔ میرے پیچھے صداقت کو دورے پڑنے لگے اور وہ الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگا۔ کبھی راتوں کو اٹھ کر ننگے پاؤں گھر سے نکل جاتا اور کپڑوں سمیت ہی تالاب کے ٹھنڈے پانی میں نہانے لگتا۔ کبھی بیٹھے بیٹھے بلند آواز سے رونے لگتا اور اپنا سر دیواروں سے ٹکرانے لگتا۔ میری بیوی اس کی حالت دیکھ کر بہت گھبرائی۔ گاؤں کے دوسرے لوگوں سے بھی کچھ چھپا ہوا نہیں تھا۔ سب نے یہی رائے دی کہ صداقت پر کسی جن بھوت کا اثر ہو گیا ہے اور اسے علاج کے لیے نالی والے پیر سائیں کے ڈیرے پر لے جانا چاہیے۔

"پیر سائیں کی وہ خانقاہ زیادہ پرانی نہیں تھی لیکن اس کے عقیدت مند بہت سارے تھے۔ میری گھبرائی ہوئی پریشان بیوی نے سب کی رائے کو مانتے ہوئے ادھر کا رخ کیا۔ میری بیٹی اور داماد نے تھوڑی سی مخالفت بھی کی لیکن گاؤں کا واحد ڈاکٹر صداقت کی بیماری سمجھنے سے قاصر تھا اس لیے دعا دم میں کوئی حرج نہ سمجھتے ہوئے بالآخر انہوں نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور صداقت کی بربادی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی گئی۔ بظاہر صداقت درگاہ پر حاضری کے بعد سنبھل گیا اور دیوانوں والی حرکتیں چھوڑ کر سکون سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہنے لگا۔ اس کی شوخی روٹھ جانے کے باوجود بھی کافی سمجھا گیا کہ وہ اب دیوانوں کی سی حرکتیں نہیں کرتا۔ میں کاروباری دورے سے واپس آیا تو مجھے بھی یہ ساری اطلاعات ملیں لیکن آنکھوں سے دیکھنے اور سننے میں فرق ہوتا ہے۔ پیر سائیں پر عقیدہ نہ ہونے کے باوجود میں نے صداقت کی صحت یابی کی وجہ سے خاموشی اختیار کرلی اور صداقت چھٹیوں کے باقی ماندہ دن گزار کر واپس بورڈنگ چلا گیا۔ وہ جتنے عرصے گاؤں میں رہا، پابندی سے پیر سائیں کے پاس جاتا رہا تھا۔ ایسا کیوں تھا یہ تو بہت بعد میں سمجھ آیا اور بہت سی باتیں بھی بعد میں اس وقت سامنے آئیں جب مجھے اس کے بورڈنگ سے فوری طور پر پہنچنے کے لیے کال کی گئی۔ میں اس وقت لاہور میں تھا۔ بورڈنگ اسکول سے کال آنے پر میں فوراً وہاں پہنچا۔ مجھے سخت پریشانی تھی کہ آخر اس طرح اچانک بلانے کی کیا وجہ ہے؟ میں صداقت کی ساری فیسیں وغیرہ پابندی سے ادا کرتا تھا اور صداقت بھی ایسا بچہ نہیں تھا کہ اس کی طرف سے کسی کو شکایت کا موقع ملے۔ بہرحال میں حیران پریشان وہاں پہنچا تو پرنسپل سے ملاقات کے پہلے ہی لمحے میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ پرنسپل کے چہرے کے تاثرات بہت گمبھیر تھے۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملا کر ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا تو میں نے دیکھا کہ وہاں پولیس کی وردی میں ملبوس ایک شخص اور بھی بیٹھا ہوا ہے لیکن میں اندازہ نہیں لگا سکا کہ اس پولیس والے کی وہاں موجودگی اور میرے بلاوے کے درمیان کوئی تعلق بنتا ہے۔ میں نے اسے بھی پرنسپل کا کوئی ملاقاتی تصور کیا جو میری طرح اپنے بچے کے سلسلے میں بلایا گیا تھا لیکن جب پرنسپل نے گفتگو کا آغاز کیا تو میری ہر غلط فہمی دور ہوگئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اس بار جب صداقت چھٹیوں میں گھر گیا تھا تو کیا میں نے اس میں کوئی غیر معمولی پن محسوس کیا تھا؟ اس سوال کو سن کر میں سمجھا کہ شاید صداقت کے دوروں کا سلسلہ پھر سے شروع ہوگیا ہے چنانچہ میں نے بغیر کسی لگی لپٹی کے پرنسپل کو سب کچھ بتا دیا اور اس سے پوچھا کہ کیا صداقت نے وہاں کسی قسم کی پریشانی کھڑی کردی ہے؟ پرنسپل نے میرے سوال کا براہ راست جواب نہیں دیا بلکہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولا کہ راؤ صاحب مجھے افسوس ہے کہ آپ اپنے بیٹے کے بارے میں غلط فہمی کا شکار رہے اور بہت سے حقائق نہیں جان سکے۔ پھر انہوں نے مجھے صداقت کے اپنی ٹیچر کے عشق میں مبتلا ہونے کا قصہ سنایا۔ انہیں یہ ساری معلومات اس کے ایک ایسے کلاس فیلو سے حاصل ہوئی تھیں جس نے صداقت کی بہت دوستی تھی۔ کچھ باتیں مس رعنا نے بھی بتائیں۔

''ان دونوں کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق صداقت، مس رعنا کی اسکول میں آمد کے پہلے دن سے ہی ان پر فریفتہ ہوگیا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ مس رعنا سے بات چیت کے مواقع نکال سکے۔ وہ اسے ریاضی پڑھاتی تھیں اور صداقت ریاضی میں اچھا خاصا ذہین ہونے کے باوجود کلاس میں سوال سمجھ نہ آنے کا بہانہ کرکے فری پیریڈ یا بریک ٹائم وغیرہ میں بھی ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ مس رعنا اکثر حیران ہوتی تھیں کہ صداقت کو سب اتنی مشکل سے سمجھ آتا ہے لیکن وہ ہر ٹیسٹ میں پورے پورے نمبر لیتا ہے لیکن یہ بات ان کے لیے زیادہ عرصہ معما نہیں رہی اور اسٹاف روم میں دوسری ٹیچرز سے گفتگو کے دوران میں انہیں پتا چل گیا کہ صداقت تو ہمیشہ سے ہی ریاضی میں بہت اچھا ہے اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے کہ صداقت کے اس مضمون میں پورے نمبر نہ آئے ہوں۔ اس حقیقت کے سامنے آنے کے بعد مس رعنا نے صداقت کے دیگر رویوں پر غور کیا تو انہیں سمجھ آگئی کہ وہ صرف ان سے قریب رہنے کے لیے ریاضی کے سوالات کلاس میں سمجھ نہ آنے کا عذر کرکے فارغ اوقات میں ان کے پاس چلا آتا ہے۔ صداقت تقریباً ہر روز انہیں سرخ گلاب کا پھول دیا کرتا تھا جسے وہ ایک شاگرد کی استاد سے گہری وابستگی کا اظہار سمجھ کر قبول کرلیتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ موقع پاکر ان کے لباس، چلنے کے انداز یا آنکھوں کی رنگت وغیرہ کی تعریف بھی کردیا کرتا تھا لیکن مزاجاً قدرے لاابالی ہونے کی وجہ سے مس رعنا نے ان باتوں کو اہمیت نہیں دی تھی لیکن جب ایک بار وہ صداقت کی طرف سے ٹھٹکیں تو انہیں اس کا ہر رویہ سمجھ آنے لگا اور اندازہ ہوگیا کہ صداقت کی ان کے لیے پسندیدگی استاد کے لیے شاگرد کی عمومی پسندیدگی نہیں ہے بلکہ وہ کسی اور ہی زاویے سے انہیں دیکھتا ہے۔ اس اندازے کے بعد وہ اس پر ظاہر کیے بغیر تھوڑی سی محتاط ہوگئیں اور حفظ ماتقدم کے طور پر اسے موقع پاکر اپنی منگنی اور عنقریب ہونے والی شادی کے بارے میں بھی اطلاع دے دی۔ ان کا خیال تھا کہ اس بارے میں جان کر صداقت ان کی طرف سے مایوس ہوجائے گا لیکن اس نے بالکل ہی مختلف ردعمل کا مظاہرہ کیا اور نہایت بے باکی سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے ان سے اپنی منگنی توڑ ڈالنے کی استدعا کی۔

''مس رعنا نے اسے بہت سمجھایا۔ سختی اور نرمی دونوں سے کام لے کر دیکھا۔ اسے اپنے اور اس کے درمیان موجود تعلق کی نوعیت کے علاوہ عمروں کے فرق کا بھی احساس دلایا

لیکن صداقت کچھ سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ مس رعنا چاہتیں تو اسکول انتظامیہ سے صداقت کی شکایت بھی کرسکتی تھیں لیکن انہیں معلوم تھا کہ اس شکایت کے نتیجے میں صداقت کو بورڈنگ اسکول سے نکالا بھی جاسکتا ہے۔ ان کی نرم دلی نے یہ منظور نہ کیا کہ صداقت جیسا ذہین اور لائق طالب علم اپنے اتنے اہم تعلیمی سال میں کسی مشکل سے دوچار ہو چنانچہ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر خود جاب چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس فیصلے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں ڈر محسوس ہونے لگا تھا کہ صداقت کی دیوانگی انہیں بدنام نہ کر ڈالے۔ بات اسکول کی حدود سے نکل کر اگر ان کے گھر یا ہونے والے سسرال تک پہنچ جاتی تو ان کے لیے بڑی شرمندگی کا مقام ہوتا۔ ان کے اسکول چھوڑنے کا سن کر صداقت بہت مضطرب ہوا۔ اس نے کوشش کی کہ کسی طرح مس رعنا سے رابطہ کرکے انہیں فیصلہ بدلنے پر مجبور کردے لیکن اس موقع پر مس رعنا نے بہت سختی سے کام لیا اور صداقت کے رابطہ کرنے کی ہر کوشش ناکام بنا دی۔ اتفاق سے اسی عرصے میں چھٹیوں کا بھی آغاز ہوگیا اور صداقت کو پنڈ آنا پڑا۔ آنے سے پہلے اسے یہ اڑتی خبر بھی مل گئی تھی کہ مس رعنا کی عنقریب شادی ہونے والی ہے چنانچہ وہ بہت زیادہ ذہنی دباؤ کے ساتھ گھر واپس آیا تھا۔

''اس ذہنی دباؤ نے جہاں اس پر خاموشی طاری کردی وہیں اسے دورے بھی پڑنے لگے۔ پنڈ کے لوگوں نے اپنی کم علمی میں ان دوروں کو کسی جن یا بھوت پریت کا سایہ سمجھ کر پیر سائیں کے ڈیرے کی راہ دکھائی اور حیرت انگیز طور پر صداقت کے دوروں میں افاقہ بھی ہوگیا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں پر صداقت کا کوئی روحانی علاج نہیں ہوا تھا بلکہ اسے نشے کا عادی بنا دیا گیا تھا۔ اداس اور دل گرفتہ صداقت کو نشے سے حاصل ہونے والی خود فراموشی میں عافیت محسوس ہوئی اور وہ چھٹیاں ختم ہونے کے بعد پنڈ سے بورڈنگ جاتے ہوئے خاصا ذخیرہ ساتھ لے گیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنی ماں سے اپنی پسندیدہ ٹیچر کی شادی پر قیمتی تحفہ دینے کے بہانے خاصی رقم حاصل کرلی تھی پھر میری طرف سے اسے کھلا جیب خرچ بھی ملتا تھا جس کا کافی حصہ اس کے پاس جمع تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح اس نے اپنی تباہی کا سامان جمع کرلیا اور بورڈنگ جا پہنچا۔ اس کے قریبی دوست نے اسے چوری چھپے سگریٹ پیتے دیکھ کر کئی بار ٹوکا اور اس بری عادت کو ترک کرنے کی نصیحت کی لیکن صداقت ہر بار وعدہ کرکے مکر جاتا۔ درحقیقت وہ اگر کوشش کرتا بھی تو کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ نشے کے عفریت سے پیچھا چھڑانا اچھے اچھوں کے لیے مشکل ہوتا ہے وہ تو پھر رنج میں مبتلا ایک نوعمر لڑکے کا معاملہ تھا۔ اس کا دوست بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ صداقت نشہ کرنے لگا ہے۔ وہ تو بس اسے سگریٹ نوشی کا عادی ہی سمجھتا رہا اور اس عادت کو مس رعنا کے غم سے منسوب کرکے گزرتے وقت کے ساتھ صداقت کے سدھر جانے کی امید کرتا رہا لیکن صداقت کیسے سدھر سکتا تھا؟ اس کی تعلیمی کارکردگی بھی متاثر ہونے لگی جس پر اساتذہ نے اس سے بازپرس کی تو اس نے چھٹیوں کے دوران میں اپنی طویل علالت کی کہانی سنا کر ابھی تک ذہنی اور جسمانی طور پر فٹ نہ ہوسکنے کا بہانہ بنا دیا۔

''صداقت کا ریکارڈ اچھا تھا اس لیے اس بہانے کو قبول کرلیا گیا۔ ویسے بھی اس کی گرتی ہوئی صحت خود بھی اس کے بہانے کو تقویت دے رہی تھی۔ یہ حالات شاید لمبے عرصے تک جاری رہتے لیکن ہوا کچھ یوں کہ مس رعنا کو ان کی شادی کی خوشی میں ان کے شوہر کے ساتھ اسکول میں ایک دعوت دی گئی۔ یہ دعوت اسٹاف ممبران کی طرف سے تھی اور اس کا طالب علموں سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن بچے اپنی ٹیچر کو بنے سنورے روپ میں ان کے شوہر کے ساتھ دیکھنے کے لیے کلاس روم سے بے تاب ہوکر نکلنے لگے تو پرنسپل نے مس رعنا کو اجازت دے دی کہ وہ جن کلاسز میں پیریڈز لیتی تھیں، ان میں دو دو منٹ کے لیے چکر لگالیں۔ وہ صداقت کی کلاس میں بھی گئیں اور اس کے لیے ان کا وہ بنا سنورا روپ دیکھنا غضب ہوگیا۔ اس نے بہ مشکل اسکول ٹائم گزارا اور پھر خود کو نشے میں ڈبو کر اذیت سے نجات حاصل کرنے کے چکر میں اتنی اوور ڈوز لے لی کہ برداشت کی حد ہی جواب دے گئی۔ اسے بہت دیر تک غائب پاکر اس کا دوست جب اسے ڈھونڈتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں بیٹھ کر اس کی دانست میں صداقت محض سگریٹ نوشی کرتا تھا تو وہاں اسے صداقت اس حال میں ملا کہ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے اور ہاتھ پیر ٹیڑھے ہوگئے تھے۔ اس نے فوراً انتظامیہ کو خبر دی اور ان لوگوں نے فوراً اسے اسپتال منتقل کردیا لیکن کوئی تدبیر کام نہ آئی اور صداقت نے اسپتال میں دم توڑ دیا۔'' اس مقام پر آکر شفقت راؤ کا حوصلہ دم توڑ گیا اور وہ کہانی کے تسلسل کو جاری رکھنے سے محروم ہوکر رونے لگا۔ اسلم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب گیا اور شانے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے خاموش دلاسا دینے کی کوشش کی۔ ایک ایسے باپ کے سامنے ہمدردی اور تسلی کے سارے الفاظ ہیچ تھے جس نے اپنے اکلوتے اور ہونہار بیٹے کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہو۔ ماویا تو

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی یہ المناک داستان سن کر دل گرفتہ ہو گئی تھی اور ان کی سیاہ آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے پھر بھی اس نے ضبط کا مظاہرہ کیا اور شفقت راؤ کے سامان میں ہی سے پانی کی بوتل نکال کر اسے پانی پیش کیا۔ چند گھونٹ پانی پی کر اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھال لیا اور کچھ دیر لب سی کر بیٹھ گیا۔

اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے ان دونوں میں سے کسی کو حوصلہ نہ ہو سکا کہ اسے داستان آگے بڑھانے کے لیے کہیں۔ ویسے انہوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ شفقت کی داستان کسی ایک فرد سے حاصل کردہ معلومات پر مشتمل نہیں ہے اور اس نے مختلف لوگوں کے بیانات کے علاوہ اپنے قیاسات کی مدد سے بھی اپنے بیٹے کی دردناک داستان کے تانے بانے جوڑے ہیں۔ آخرکار اس نے اپنی خاموشی کو توڑتے ہوئے ایک بار پھر داستان کا منقطع ہو جانے والا سلسلہ جوڑا۔

''تم لوگ شاید اندازہ لگا سکو کہ پرنسپل کی زبانی صداقت کی موت کی اطلاع سن کر مجھ پر کیا گزری ہو گی؟ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ صداقت کی موت نشے کی اوور ڈوز کی وجہ سے واقع ہوئی ہے اور موت کے طبعی نہ ہونے کی وجہ سے پولیس کو اس معاملے میں ملوث کرنا پڑا ہے۔ اس وقت مجھے پرنسپل کے کمرے میں پولیس والے کی موجودگی کا سبب سمجھ آیا۔ وہ مجھ سے جاننا چاہتا تھا کہ کیا میں صداقت کے نشہ استعمال کرنے سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ کن ذرائع سے نشہ حاصل کر رہا ہے؟ میں صداقت کی موت کی خبر سن کر اتنا حواس باختہ ہو گیا تھا کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی جواب دے گئی تھیں۔ میں انسپکٹر کو اس کے کسی سوال کا جواب نہ دے سکا اور صداقت کا جسدِ خاکی لے کر چنڈ واپس آ گیا۔ پورے چنڈ میں کہرام سا مچ گیا۔ صداقت کی ماں بیٹے کی لاش دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ اس کا دماغی توازن اب تک درست نہیں ہوا ہے اور وہ سارا وقت یا تو گم صم بیٹھی رہتی ہے یا پھر خیالوں میں صداقت سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ سچ پوچھو تو میں خود بھی کئی دن تک ہوش میں نہیں آ سکا تھا۔ بعد میں دوستوں، رشتے داروں کے حوصلہ دینے پر ذرا سنبھلا تو پھر بیٹھ کر سارا حساب کتاب جوڑا۔ میں نے تم لوگوں کو صداقت کے نشے کا عادی ہونے کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا لیکن درحقیقت یہ بات مجھے بعد میں سمجھ آئی تھی کہ وہ اس علت میں کیسے مبتلا ہوا۔

''چھٹیوں میں اسے پڑنے والے دوروں اور پیر سائیں کے ڈیرے پر لے جانے اور وہاں جا کر سنبھل جانے والا معاملہ یاد آنے پر مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ ایسی جگہوں پر بھنگ، چرس اور افیون جیسے نشوں کا استعمال عام ہے۔ پھر میں کھوج میں پڑ گیا۔ میں نے اپنے کاروبار سمیت ہر شے کو چھوڑ کر اس معاملے کی تحقیق شروع کر دی اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہاں پر دیسی نشوں کے علاوہ ہیروئن بھی دستیاب ہے جس میں ایسے افراد کو مبتلا کیا جاتا ہے جو صاحبِ حیثیت ہوں اور اس کی منہ مانگی قیمت ادا کر سکیں۔ صداقت کی موت کے ذمے داروں کو کھوج نکالنے پر مجھ پر جنون سوار ہو گیا۔ مس زہرا کا عشق تو بس ایک بہانہ تھا۔ نوعمری میں لڑکے اس طرح کے معاملات میں پڑ ہی جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ سنبھل بھی جاتے ہیں۔ بالفرض اگر صداقت خود سے نہ سنبھل پاتا تو میں کسی بڑے ماہرِ نفسیات سے اس کا علاج بھی کروا سکتا تھا لیکن جعلی پیر سائیں نے اس کی ذہنی ابتری کا فائدہ اٹھا کر اسے اور میرے خاندان کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا، میں اسے کسی صورت معاف نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں خود کو تباہ کرنے والے کو بھی تباہ کر ڈالوں گا اور ایسی اذیت ناک موت سے دوچار کروں گا کہ وہ بھی میرے بیٹے کی طرح تڑپ تڑپ کر مرے۔ میرے نزدیک پیر سائیں کے ساتھ ساتھ ڈیرے کے دوسرے افراد بھی اس جرم میں برابر کے شریک تھے اس لیے ان سب ملعونوں کے ساتھ اس جگہ کا وجود بھی مٹا دیے جانے کے قابل تھا۔'' شفقت راؤ کی آنکھیں یہ سب کہتے ہوئے لہو رنگ ہو گئی تھیں اور لہجے میں آتش فشاں کا سا قہر تھا۔ طویل عرصہ مار دھاڑ اور لوٹ مار میں گزارنے والے اسلم کو بھی اپنے بدن میں جھرجھری سی محسوس ہوئی۔

''اس جگہ کو تباہ کرنے کا منصوبہ تیار کرنے کے بعد میں کاروبار کی دیکھ بھال کے بہانے چنڈ سے روانہ ہو گیا لیکن اسی رات خاموشی سے واپس بھی آ گیا۔ یہ میں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ اپنا کام نمٹانے کے بعد عام راستے سے چنڈ سے نکلنے کے بجائے اس پہاڑی سلسلے کا راستہ استعمال کروں گا۔ اپنے اس منصوبے کی وجہ سے میں نے ضرورت کا سارا سامان جمع کر لیا تھا۔ بہانے سے بیٹی سے روغنی روٹیاں بھی پکوا لی تھیں۔ یہ سارا چکر اس لیے تھا کہ کوئی کارروائی مکمل ہونے کے بعد مجھے گاؤں سے جاتا ہوا نہ دیکھے۔ میں بیٹا کھو چکا تھا لیکن بیوی اور بیٹی کے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ بیٹی اپنے گھر کی تھی اور بیوی بھی فی الحال اس کے ساتھ ہی رہ رہی تھی لیکن میں یہ بات سمجھتا ہوں کہ عورت کے لیے شوہر اور باپ دونوں کے گھر اہمیت رکھتے ہیں۔ شوہر کے گھر رہ کر اگر معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے تو میکے کا مان اسے تحفظ کا احساس دلاتا ہے۔ میں اپنی بیٹی اور بیوی کو اس عزت اور تحفظ سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا ورنہ میرے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ ڈیرے کو تباہ کرنے کے بعد علی الاعلان ذمے داری قبول کر لوں۔ بہرحال اپنے تحفظات کا خیال رکھتے ہوئے میں نے رات کے آخری پہر پیش قدمی کی اور ایک کنستر میں پیٹرول لے کر ڈیرے کی طرف چلا گیا۔ میرا وفادار کتا اس وقت بھی میرے ساتھ تھا۔ اگر کہیں سے کوئی مداخلت ہونے کا خطرہ ہوتا تو یہ بھونک کر مجھے پیشگی باخبر کر دیتا لیکن خیر گزری اور کوئی رکاوٹ سامنے نہیں آئی۔ میں نے پیر سائیں کے ڈیرے کے اطراف پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ رات کے اس آخری پہر میں وہاں سناٹا طاری تھا۔ دوسرے یہ بھی ڈر نہیں تھا کہ پیر سائیں اور اس کے چیلوں کے علاوہ دوسرے افراد بھی موجود ہوں گے اسی لیے میں نے اس وقت کا انتخاب کیا تھا۔ اپنے سامان کا تھیلا میں پہلے ہی پہاڑی سلسلے کے آغاز میں ایک محفوظ جگہ پر چھپا کر رکھ چکا تھا اس لیے وہاں سے بھاگ کر سیدھا اسی طرف گیا۔ سفر کا آغاز کرنے سے پہلے میں نے دیکھ لیا تھا کہ ڈیرے میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ اس آگ نے میرے دل میں لگی آگ کو کافی ٹھنڈک پہنچائی اور اب مجھے یہ اطمینان ہے کہ میں نے نہ صرف اپنے بیٹے کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا بلکہ ایک ایسے ٹھکانے کو بھی تباہ کر ڈالا جہاں سے میرے بیٹے جیسے اور نہ جانے کتنے نوجوانوں کو تباہ و برباد کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔'' یہ الفاظ کہتے ہوئے شفقت راؤ کے لہجے میں اطمینان در آیا تھا اور اب وہ یوں چپ بیٹھا تھا جیسے کہنے کو کچھ بھی باقی نہ بچا ہو۔ داستان مکمل ہو گئی تھی اور داستان گو کے خاموش ہونے کے بعد ہی سامعین کو بھی اردگرد کا ہوش آ سکا تھا۔ پو پھٹنے سے شروع ہونے والی اس داستان کی طوالت نے اتنا وقت لے لیا تھا کہ سورج سروں پر چڑھ آیا تھا اور مسافروں کو یاد دلا رہا تھا کہ یونہی بیٹھے رہنا ان کی منزل کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

لندن پہنچ کر چودھری نے ڈیوڈ کی ہدایت کے مطابق میٹرو ہوٹل میں کمرا بک کروا لیا لیکن اب انتظار کی کوفت میں مبتلا سخت بوریت کا شکار تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ڈیوڈ کا نمائندہ اس سے کب ملنے آئے گا؟ وہ کسی بھی وقت آ سکتا تھا اور اس کی آمد تک وہ ہوٹل کے کمرے تک محدود رہنے پر مجبور تھا۔ یہ صورتِ حال اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس کا حکمرانی کا عادی ذہن اس صورتِ حال کو تسلیم کرنے سے ہمیشہ ہی چڑتا تھا۔ وہ ہمیشہ سے احکامات اور ہدایات جاری کرنے کا عادی تھا لیکن یہاں اسے دوسروں کی ہدایات کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ یہ خواری اس نے دولت کی حرص میں مول لی تھی حالانکہ دولت کی اس کے پاس کوئی کمی بھی نہیں تھی۔ وہ اتنے اثاثوں کا مالک تھا کہ اس کی آنے والی نسلیں بھی آرام سے بیٹھ کر کھا سکتی تھیں لیکن حرص اور لالچ کے دوزخ کا پیٹ کہاں بھرتا ہے۔ دولت کے لیے اس نے ساری زندگی کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ غریب مزارعوں کا خون چوسنے سے لے کر لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ تک ہر کام وہ بے کھٹک کرتا رہا تھا کہ اس کے خزانوں میں اضافہ ہوتا رہے۔ اس جیسے شخص کے لیے ہیروئن کے کاروبار میں شامل ہو کر خطیر دولت کمانے کا موقع ایسا نہیں تھا کہ وہ اسے نظرانداز کر دے۔ اس موقع سے مستفید ہونے کے لیے اس نے اپنی بالادستی کو قربان کرنا بھی منظور کر لیا تھا اور اب میٹرو ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا انتظار کی گھڑیاں کاٹ رہا تھا۔

وہ فی الحال لندن کی رنگینیوں سے محظوظ ہونے سے معذور تھا اس لیے ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والے شباب اور سامنے رکھی شراب کی بوتل سے ہی دل بہلانے پر مجبور تھا۔ پُرتعیش کمرے میں موجود بڑی سی گلاس ونڈو سے باہر کا نظارہ صاف نظر آ رہا تھا۔ رم جھم برستی برسات میں لندن شہر کے باسیوں کے معمولات جاری تھے۔ وہ برسات کے ساتھ ساتھ لحہ لحہ بھیگتی رات سے بھی بے نیاز نظر آتے تھے۔ دنیا کے ہر بڑے شہر کی طرح لندن کے باسیوں کے لیے بھی دن اور رات کا فرق بہت زیادہ معنی نہیں رکھتا تھا۔ البتہ چودھری مضطرب تھا۔ یوں تنہائی میں وقت گزارنا اس کے لیے کٹھن ہو رہا تھا کہ نہ یہاں جاہ و جلال دکھانے کے لیے غلام و خدام تھے اور نہ ہی دل بہلانے کے لیے وہ عورتیں جو اپنی بے بسی کی وجہ سے یا پھر دولت کے لالچ میں وقتاً فوقتاً اس کے بیڈ روم کی زینت بنتی رہتی تھیں۔ تیز اثر وہسکی اور ٹی وی اسکرین پر نظر آتے جلووں نے اس کے جذبات کو اور بھی زیادہ برانگیختہ کر دیا تھا اور وہ سوچنے لگا تھا کہ انتظار کو ترک کر کے باہر نکل کھڑا ہو کہ اسی دم اس کے کمرے کے دروازے پر دھیمی اور مہذبانہ دستک ابھری۔

''کون؟'' اس نے چونک کر محتاط انداز میں پوچھا۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ دروازے پر ڈیوڈ کا نمائندہ ہی موجود ہوتا۔

''ویٹر سر!'' باہر سے نہایت دھیمی آواز میں اس کے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM

سوال کا جواب دیا گیا۔

”کم اِن۔“ اس نے الجھن آمیز انداز میں ویٹر کو اندر آنے کی اجازت دی۔ فوراً ہی آہستگی سے دروازہ کھول کر ایک خوش شکل اور بے داغ وردی والا نوجوان اندر داخل ہوا۔ چودھری زبان سے کچھ کہے بغیر استفسار بھری نظروں سے اسے گھورنے لگا۔

”آپ ہمارے ہوٹل میں کسی قسم کی بے آرامی تو محسوس نہیں کر رہے سر؟“ باوردی ویٹر نے خلیقانہ لہجے میں سوال کیا۔

”اگر مجھے تکلیف ہوئی تو ہوٹل انتظامیہ کو آگاہ کر دوں گا۔ تمہیں مجھے اس طرح ڈسٹرب نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ چودھری نے بگڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا اور وہسکی کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔

”سوری سر! آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن آپ تنہا ہیں اور جب سے آئے ہیں کمرے سے باہر بھی نہیں نکلے تو میں نے سوچا کہ آپ کو یہیں کوئی تفریح فراہم کرنے کے بارے میں پوچھا جائے۔“ ویٹر کا مودبانہ جواب خاصا معنی خیز تھا جسے سن کر چودھری چونک پڑا۔

”کیسی تفریح۔۔۔؟“ اس نے ویٹر کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”تنہائی میں شراب کی بوتل کے ساتھ ساتھ اگر کوئی خوب صورت ساتھی بھی مل جائے تو اس سے بہتر تفریح کیا ہو گی؟“

اس کا جواب بڑا واضح تھا۔ انتظار کی کوفت میں مبتلا چودھری سوچ میں پڑ گیا۔ ڈیوڈ کے نمائندے کی آمد کسی بھی وقت متوقع تھی لیکن ضروری نہیں تھا کہ وہ اگلے چند گھنٹوں میں اس سے ملنے آ جاتا۔ وہ آئندہ روز بھی آ سکتا تھا اور بالفرض اگر جلدی بھی آ جاتا تو اس سے نیچے ہال میں ملاقات کی جا سکتی تھی۔ اگر وہ کمرے کی تنہائی میں ملاقات پر مصر ہوتا تو بھی اس کو تھوڑی دیر انتظار کروا کر وہ ویٹر کی فراہم کی گئی تفریح کو فارغ کر سکتا تھا۔ یہ سب سوچنے کے بعد اس نے ویٹر کی طرف پہلی بار دوستانہ انداز میں مسکرا کر دیکھا اور بولا۔

”او کے، تم اسے لے آؤ۔ اگر واقعی تمہاری فراہم کردہ تفریح نے میرا دل خوش کر دیا تو تمہیں کمیشن کے علاوہ بھی انعام ملے گا۔“

”مجھے یقین ہے سر کہ آپ مایوس نہیں ہوں گے۔“ ویٹر نے اعتماد سے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جانے کے بعد چودھری کو خیال آیا کہ لندن جیسے آزاد شہر میں ہوٹل کے ویٹر کو اس طرح کی دلالی کی کیا ضرورت پیش آئی ہے؟ یہاں دوستی کے نام پر بھی سب کچھ ہو جاتا ہے اور پیشہ ور عورتیں بھی اپنا شکار تلاش کرنے میں ماہر ہوتی ہیں۔ ہوٹل کا یہ ویٹر شاید خاص طور پر ایشیائی افراد کی تاک میں رہتا تھا کہ ان کی اس قسم کی خدمت سرانجام دے کر اپنا کمیشن کھرا کر سکے۔ معاملہ جو بھی تھا بہر حال، اب تو وہ ویٹر سے ہامی بھر چکا تھا چنانچہ وہسکی کے ساتھ شغل کرتے ہوئے آنے والی کا انتظار کرنے لگا۔ انتظار کے یہ لمحے زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئے اور جلد ہی دروازے پر دستک کی آواز ابھری پھر اس کی خمار آلود ”کم اِن“ کے جواب میں آہستگی سے دروازہ کھولا گیا۔ چودھری کا رخ دروازے کی طرف ہی تھا لیکن وہ براہ راست اس طرف دیکھنے کے بجائے جھک کر اپنے لیے پیگ تیار کر رہا تھا۔ گلاس میں برف کے کیوبس ڈالتے ہوئے اس کی نظروں نے دو سڈول ٹانگوں کو حصار میں لیا۔ سیاہ نازک پٹیوں والی اونچی ایڑی کی سینڈل میں قید پاؤں کسی بھی قسم کے کپڑوں سے آزاد تھے اور سیاہ سینڈل پیروں کی گوری رنگت کو بے حد نمایاں کر کے دکھا رہی تھی۔ چودھری کی نظروں نے آہستگی سے اوپر کا سفر طے کرنا شروع کیا۔ ایڑی سے لے کر گھٹنوں تک وہاں بنا کسی رکاوٹ کے نظارہ ہی نظارہ تھا۔ گھٹنوں سے اوپر کا سفر شروع ہوا تو سیاہ اسکرٹ کی جھلک دکھائی دی اور پھر اوپر کی سمت سفر کرتے ہوئے اسکرٹ کا بلاؤز بھی یکدم ہی اختصار اختیار کر گیا۔ ٹانگوں ہی کی طرح بے حد خوب صورت بازو نہ صرف آستین کی جھنجھٹ سے آزاد تھے بلکہ شانوں پر بھی کپڑے کی کسی دھجی کا نام و نشان نہیں تھا۔ لمبی صراحی دار گردن میں موجود نقرئی نیکلس میں جڑے سیاہ پتھر گردن کے نیچے کے حصے میں جھولتے ہوئے نہ صرف اس حصے کو مزید نمایاں کر رہے تھے بلکہ اپنی خوش نصیبی پر رشک کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

صراحی دار گردن سے اوپر ایک بے حد حسین چہرہ فٹ تھا جسے چمکتی بالوں کی سیاہ لٹیں شرارت پر مائل نظر آتی تھیں۔ اس چہرے کو دیکھتے ہی چودھری ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور سیاہ مسکراتی ہوئی آنکھوں کو حیرت و مسرت سے تکتے ہوئے کچھ کہنے کی خواہش میں ہونٹوں کو بے ڈھنگے پن سے جنبش دے کر رہ گیا۔ وہ ایک کال گرل کی حیثیت سے اس کے سامنے آئی تھی اور آنکھوں اور بالوں کی بدلی ہوئی رنگت کی وجہ سے کافی مختلف لگ رہی تھی لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے سامنے موجود اس قتالہ کو پہچان نہ سکے۔ بلاشک وشبہ وہ لنڈا ہی تھی جس کے حسن وشباب سے وہ امریکا کی رنگینیوں میں رہ کر لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔

”ہائے۔“ لنڈا نے ایک ادا سے کہا اور دروازہ بند کر کے لہراتی ہوئی اس کے قریب آ کر سامنے والی کرسی سنبھال لی۔

”ہیلو، واٹ آ پلیزنٹ سرپرائز! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہوٹل کے اس کمرے میں تم سے ملاقات ہو سکے گی۔“ اپنی بے تحاشا خوشی کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے چودھری نے گلاس واپس میز پر رکھا اور لنڈا کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”آپ جیسا سچا چاہنے والا ہو تو ملاقات کا موقع تو نکالنا ہی پڑتا ہے۔“ گہری سرخ لپ اسٹک سے سجے اس کے تراشیدہ ہونٹ مسکرائے اور اس نے چودھری کے مصافحے کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کو پرجوش انداز میں تھام لیا۔ چودھری تو گویا اسے سامنے پا کر ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

”موقع تو تم نے خوب نکالا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے جس نمائندے سے ملاقات کے لیے لندن بلایا جا رہا ہے وہ تم ہو گی، وہ بھی اس انداز اور روپ میں۔“ چودھری نے اپنی حیرت وخوشی کا اظہار کیا اور ایک دوسرا پیگ تیار کر کے لنڈا کی طرف بڑھایا۔

”میں پانی کی طرح ہوں چودھری صاحب! کسی بھی روپ میں ڈھل جاتی ہوں اور ایک نیا نام اپنا لیتی ہوں۔ یہاں آپ کو مجھے پامیلا کے نام سے بلانا ہو گا۔ رہی اس نمائندے کی بات جس سے آپ کو ملاقات کرنی ہے تو وہ میں نہیں ہوں۔ مجھے آپ درمیانی پارٹی سمجھ لیں۔ اصل معاملات آپ کو کسی اور سے طے کرنا ہوں گے۔“ گلاس سے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے جواب دیا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اس انداز سے بیٹھ گئی کہ چودھری کو اپنا دل اچھل کر حلق میں آتا ہوا محسوس ہوا۔

”تم درمیان میں رہو گی میرے لیے یہ کافی ہے۔ میری طرف سے سارے معاملات تم ہی طے کر لینا۔“ چودھری نے فدویانہ لہجے میں جواب دیا۔

”معاملات وہ آپ سے ہی طے کریں گے کیونکہ آپ کو ہی ان کی ہدایات پر عمل کرنا ہو گا۔ میں بس دونوں طرف سے ضامن ہوں۔ آپ کو پے منٹ کرنے کی ذمے داری ہماری ہو گی جبکہ دوسری پارٹی کو میں آپ کی طرف سے یہ یقین دہانی کرواؤں گی کہ آپ کام ان کے مطلوبہ معیار کے مطابق ہی کریں گے۔“ لنڈا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”او کے، جیسا تم مناسب سمجھو ویسا کر لیں گے۔ یہ بتاؤ کہ ابھی کیا پروگرام ہے؟ اگر ڈنر نہیں کیا ہے تو میں روم سروس سے کہہ دیتا ہوں۔ ڈنر کے بعد اطمینان سے پرانی یادوں کو تازہ کریں گے۔ ڈنر سے بریک فاسٹ تک کا وقت یادوں کو تازہ کرنے کے لیے بہت مناسب ہوتا ہے۔ ویسے بھی سنا ہے کہ اس ہوٹل میں بڑا زبردست بریک فاسٹ سرو کیا جاتا ہے۔“ کال گرل کے روپ میں اپنے کمرے تک آنے والی لنڈا کو وہ بڑے سلیقے سے شب بسری کی دعوت دے رہا تھا یا پھر کنفرم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آیا ویٹر نے اسے جس تفریح کو فراہم کرنے کا وعدہ کر کے اسے اس کے کمرے تک پہنچایا تھا، اب اس کا کوئی امکان رہا تھا یا نہیں۔

”ڈنر میں نے نہیں کیا ہے۔ وہ میں آپ کے ساتھ ہی کروں گی لیکن یہاں نہیں۔ ہم لوگ ڈنر کے لیے کہیں اور چل رہے ہیں وہیں کام کی بات بھی ہو گی۔“ لنڈا کا جواب اس کے لیے مایوس کن تھا۔ اس جواب سے ظاہر تھا کہ وہ کال گرل کے روپ میں یہاں آئی ضرور ہے لیکن شب بسری کا ارادہ نہیں رکھتی بلکہ اس کی اولین ترجیح کام ہی ہے۔

”ٹھیک ہے، میں تیار ہوتا ہوں۔“ چودھری نے وہسکی کا خالی گلاس میز پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی تو وہ عمدہ ڈنر سوٹ میں ملبوس تھا۔ مغربی لباس زیب تن کیے اس کا یہ روپ اگرچہ بہت سوں کے لیے اجنبی تھا لیکن درحقیقت وہ اس سے قبل بھی یورپی ممالک میں قیام کے دوران ڈنر پارٹیز وغیرہ میں اس لباس کو پہننا پسند کرتا تھا۔

”ویری اسمارٹ۔“ لنڈا نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے اس کی تعریف کی۔

”تھینک یو۔“ چودھری تفاخرانہ انداز میں مسکرایا۔ پھر اس سے پوچھنے لگا۔ ”ابھی کچھ دیر بیٹھنا ہے یا پھر چلیں؟“

”ابھی تھوڑی دیر میں نکلتے ہیں۔ پہلے آپ ویٹر کو بلا کر اس کے سامنے میرے لیے پسندیدگی کا اظہار کر دیں اور اسے یہ بھی بتا دیں کہ آپ مجھے شاپنگ کے لیے لے جا رہے ہیں۔“ وہ اپنا تیار کردہ پیگ پورا پی چکی تھی اور اب لائٹر کی مدد سے سگریٹ سلگا رہی تھی۔

چودھری نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے فوراً ہی ویٹر کو بلا لیا اور اس سے وہی کچھ کہا جو لنڈا نے اس سے کہنے کو کہا تھا۔ ساتھ ہی طے شدہ کمیشن کے علاوہ کچھ اور رقم بھی اسے عنایت کر دی۔ طے شدہ رقم سے زیادہ ملنے پر وہ خوش ہو گیا اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بناتی لنڈا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

''مجھے یقین تھا سر کہ آپ مجھ سے خوش ہوں گے، اگر آپ کہیں تو میں آپ کے واپس ہوٹل آنے سے پہلے آپ کے کمرے میں ریڈ وائن کی بوتل پہنچا دوں؟ بارہ بجے کے بعد شفٹ چینج ہو جائے گی اور شاید واپسی میں آپ کی مجھ سے ملاقات نہ ہو سکے۔''

''تھینکس، ہمیں جس چیز کی ضرورت ہوئی روم سروس سے خود ہی منگوا لیں گے۔ ابھی تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ مس پامیلا کیا پینا پسند کریں گی۔'' اس نے ویٹر کو غیر ضروری طور پر بے تکلف کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی اسے پوری طرح یقین نہیں تھا کہ لنڈا واپسی میں اس کے ساتھ ہوٹل آئے گی یا ڈنر سے ہی رخصت ہو جائے گی۔

''اوکے سر! ایز یو وش۔'' ویٹر مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی بے نیازی سے سگریٹ پیتی لنڈا نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلی اور کھڑی ہو گئی۔ رواج کے مطابق چودھری نے دروازہ کھول کر اسے پہلے باہر نکلنے کا موقع دیا اور پھر خود بھی باہر آنے کے بعد اس کے شانے پر بازو پھیلا کر اسے خود سے نزدیک کر لیا۔ بازو کے حصار میں موجود لنڈا کا ریشم سا جسم اس کے ڈھلتے وجود میں برق سی دوڑا گیا۔

''تم چاہتیں تو مجھ سے براہِ راست بھی ملنے آ سکتی تھیں۔ اتنا لمبا چوڑا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی؟'' اپنی بے اعتدال ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے لنڈا سے پوچھا۔

''بس احتیاطی تدبیر سمجھ لیں۔ ہم جو نازک کام کر رہے ہیں اس میں ہر لمحے احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ میدان میں موجود حریف پارٹیوں اور اینٹی نارکوٹکس کے عملے سے بچنے کے لیے احتیاط ہی سب سے مناسب ہے۔ میں جس طرح ویٹر کو گھیر کر آپ تک پہنچی ہوں، کوئی تصور بھی نہیں کر سکے گا کہ یہ عورت کال گرل کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتی ہے۔ واپسی میں میرے پاس موجود ڈھیر سارے شاپنگ بیگز مزید اس امر کی یقین دہانی کروا دیں گے کہ ایک چالاک کال گرل نے اپنی اداؤں کے جال میں پھانس کر بے وقوف ایشیائی کو مزید بے وقوف بنا ڈالا۔'' وہ مسکراتے ہوئے اپنے عمل کی توجیہ پیش کر رہی تھی۔ لفٹ میں ان دونوں کے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں تھا اس لیے وہ اطمینان سے بات کر رہے تھے۔ یہ الگ بات کہ لنڈا نے اسے جو وضاحت پیش کی تھی، وہ بالکل درست نہیں تھی۔ اس نے جو بہروپ بھرا تھا اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو موساد کی ٹاپ ایجنٹ لنڈا پارکر کی

لندن میں موجودگی کا علم ہو سکے۔ وہ اور ڈیوڈ موساد کے وسیع مقاصد کے لیے کام کرنے والے دو اوریجنل ایجنٹ تھے جو ظاہری طور پر منشیات کے کاروبار میں ملوث تھے اور اسی حیثیت سے چودھری سے ملتے بھی رہے تھے لیکن درحقیقت ان کا اس بزنس سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اپنے طے شدہ منصوبے پر عمل کر رہے تھے اور چودھری کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی کہ ان کا موساد سے کوئی تعلق ہے۔

''تم میں یہی تو خوبی ہے کہ تم حسین ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہو ورنہ عورت کے اندر ان دونوں خوبیوں کا یکجا ہونا مشکل ہوتا ہے۔'' لنڈا کے قرب سے پگھلتے چودھری نے بے ڈھنگے انداز میں ہنستے ہوئے اس کی تعریف کی جسے اس نے ایک پُریقین مسکراہٹ کے ساتھ وصول کیا۔

''ہم ٹیکسی میں سفر کریں گے۔'' باہر نکل کر چودھری نے پارکنگ کی طرف رخ کرنا چاہا تو لنڈا نے اسے ٹوک دیا۔

''ٹیکسی میں۔۔۔ مگر کیوں؟''

''احتیاط کی وجہ سے ورنہ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے ہوٹل میں کمرا بک کروانے کے ساتھ ہی ایک شاندار کار بھی کرائے پر لے لی ہے اور ہم چاہیں تو اس کار میں سفر کر سکتے ہیں لیکن میں اسے محفوظ نہیں سمجھتی۔'' اس نے بجلیاں گراتی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دے کر ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف رخ کیا۔ اگلے پون گھنٹے میں چودھری نے دیکھا کہ وہ کتنی محتاط ہے۔ ہوٹل سے وہ جس ٹیکسی میں چلے تھے، اسے ایک جگہ چھوڑنے کے بعد انہوں نے مزید دو ٹیکسیاں اور تبدیل کی تھیں، تب کہیں جا کر اس تنگ و تاریک اپارٹمنٹ میں پہنچے تھے جہاں ایک کرخت صورت آدمی ان کا منتظر تھا۔ اس آدمی نے بہت لیے دیے انداز میں ان کا استقبال کیا یہاں تک کہ وہ لنڈا کے بے تحاشا حسن سے بھی متاثر نظر نہیں آ رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ میں فضول تکلفات میں پڑنے کے بجائے براہِ راست کام کی بات شروع کر دوں تو تم لوگ برا نہیں مانو گے۔'' کمرے میں پڑے بوسیدہ صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے کھردرے لہجے میں کہا اور پھر ان کی طرف سے کوئی جواب آنے کا انتظار کیے بغیر خود ہی بولنا شروع کر دیا۔

''ہم منشیات کی تجارت میں نمایاں ترین مقام رکھنے والی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں اور ہماری تنظیم کی برتری کی کئی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم آنے والے وقت اور حالات کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ افغانستان کے

ساتھ ساتھ پاکستان کے شمالی علاقے افیون کی کاشت کے لیے بہترین ثابت ہوتے رہے ہیں اسی لیے ہم نے ان علاقوں میں ہیروئن تیار کرنے کی لیبارٹریاں وغیرہ بھی تعمیر کروائی تھیں لیکن بدلتے ہوئے حالات میں تنظیم کے بڑوں کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا ہے کہ ہماری فصلیں اور لیبارٹریاں بھی اب حکام کی نظر میں آ سکتی ہیں۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا ہے کہ اب یہ کاروبار کہیں اور شفٹ کیا جائے۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ ہمارے پاس کوئی متبادل انتظام ہو اور اسی کے لیے کثیر سرمایہ خرچ کر کے تحقیق کے بعد تمہارے گاؤں سے متصل جنگل میں افیون کی کاشت کروائی گئی۔ کئی مختلف قسم کے ارضی ماحول یکجا ہو جانے کی وجہ سے وہ جنگل ہماری نظر میں آیا تھا اور ہم نے کچھ معمولی جینیاتی تبدیلیوں کے بعد وہاں افیون کی کاشت کروائی تھی۔ فصل تیار ہو جانے کی وجہ سے ہم پہلے مرحلے میں کامیاب رہے۔ لیکن اصل کامیابی تب ہوتی جب اس افیون سے مطلوبہ معیار کی ہیروئن تیار ہو پاتی۔ اس لیے پہلی فصل تیار ہوتے ہی اسے سب سے پہلے قبائلی علاقے کی لیبارٹری میں پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔ وہاں ہمارے ماہرین نے اس پر کام کیا اور یہ خوش خبری سنائی کہ معمولی سے فرق کے ساتھ اس افیون سے کامیابی کے ساتھ ہیروئن تیار کر لی گئی ہے۔ اس کامیابی کے بعد ہم دوسرے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس طرح تمہاری زمین پر افیون کاشت کی گئی ہے، اسی طرح وہیں ہیروئن کی تیاری کے لیے لیبارٹری بھی قائم کی جائے۔ اس سلسلے میں تمہارا جوتوں کا کارخانہ پہلے ہی سے ہماری نظر میں تھا۔'' اس کا مخاطب چودھری تھا اور اپنی پوری گفتگو کے دوران میں وہ لنڈا کو نظرانداز کر کے مسلسل اسی کی طرف متوجہ رہا تھا۔ اس کی یہ خوداعتمادی اور بے نیازی چودھری کو بے چین کر رہی تھی۔ اس کے نزدیک تو لنڈا ہی بڑی طاقتور عورت تھی لیکن اگر کوئی شخص اسے نظرانداز کر رہا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ اس سے بھی اونچی پوزیشن پر ہے۔ ایسے شخص سے یہ امید تو کی ہی نہیں جا سکتی تھی کہ وہ اسے کوئی اہمیت دیتا اور یہی بات چودھری کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔

''مجھے ان میں سے بیشتر باتوں کا علم ہے اور میں پوری کوشش کروں گا کہ اپنے کارخانے میں آپ کے معیار کے مطابق لیبارٹری تعمیر کروا سکوں۔'' احساسِ کمتری سے نکلنے کے لیے اس نے خود کو حالات سے واقف ظاہر کر کے خود ہی اپنے آپ کو مورل سپورٹ دینے کی کوشش کی۔

''تمہیں اس سلسلے میں زحمت کرنے کی ضرورت

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
اکتوبر 2011 ۔۔۔ سسپنس کے
آوارہ گرد

آدھی ادائی
انسانی بصارت جب دھوکے کا شکار ہوتی ہے تو بہت گہری چوٹ کھاتی ہے اور بعض اوقات سنبھل کر چلنے کے باوجود بھی کیچڑ میں دھنس جاتے ہیں...... آخری صفحات پر محی الدین نواب کے قلم سے ایک دوشیزہ کے رنج و الم کا قصہ

صحرا بہ صحرا
اولین صفحات کی رونق...... تاریخی سفر کی روداد...... مغل دورِ حکومت کے عبرت اثر واقعات
ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم کا جادو

اقبالِ جرم
ملک صفدر حیات کی ڈائری سے
روش روش بدلتی ایک اور مجرم کی داستان فکر

حضرت حزقیل علیہ السلام
رضوانہ ساجد ایک اور نبی کا احوال لے کر حاضر ہیں...... بنی اسرائیل کی سرکشی کا تسلسل...... جب قدم قدم پر وہ بھٹک جاتے اور اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کا باعث بن جاتے تھے۔

سرگزشت: کشکول بھاری، مجلس شعر و سخن آپ کے خط

مزید: کاشف زبیر، منظر امام، تنویر ریاض، ش۔ صغیر ادیب، سلیم انور، محمد رضوان سلیمان کی پرفکر تحاریر آپ کی نذر۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں۔ لیبارٹری کی تعمیر اور عملے کی بھرتی ہمارا دردِسر ہے۔ تمہیں صرف ہماری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔ فی الحال یہ جان لو کہ تمہارے کارخانے میں آگ لگ گئی ہے جس میں چار ورکرز سمیت سب کچھ جل کر خاکستر ہو گیا ہے۔" اس نے سپاٹ سے لہجے میں جو اطلاع دی اسے سن کر چودھری اچھل پڑا اور اس کا ہاتھ بے ساختہ موبائل نکالنے کے لیے اپنی جیب کی طرف بڑھا۔ لنڈا کی ہدایت پر وہ ہوٹل سے نکلنے سے قبل اپنا موبائل آف کر چکا تھا اس لیے جانتا تھا کہ اگر کسی نے پاکستان سے اسے اطلاع دینے کی کوشش بھی کی ہوگی تو کامیاب نہیں ہوسکا ہوگا۔

"موبائل واپس جیب میں رکھ لو۔ تمہارے لوگوں سے زیادہ بہتر اطلاعات میں تمہیں دے سکتا ہوں کیونکہ وہاں آگ میرے کہنے پر ہی لگائی گئی ہے۔" اس نے سرد آواز میں چودھری کو حکم دیا لیکن مال سے بے حد محبت کرنے والا چودھری اتنے بڑے نقصان کا سن کر ابھی تک تپتا یا ہوا تھا۔

"تم نے وہاں آگ کیوں لگوائی؟ تمہاری اس حرکت سے مجھے بھاری مالی نقصان اٹھانا پڑے گا۔" چودھری نے احتجاج کیا۔

"مجھے علم ہے کہ وہاں کی ہر شے انشورڈ ہے اس لیے تم قطعی نقصان میں نہیں رہو گے۔ اس کے باوجود ہم تمہیں اس کے بدلے معقول رقم فراہم کر دیں گے۔" اس نے اپنی مستقل بے نیازی کے ساتھ جواب دیا جسے سن کر چودھری کا چہرہ کھل اٹھا۔

"لیبارٹری کی خفیہ تعمیر کے لیے ضروری تھا کہ کارخانے کے عملے کو وہاں سے ہٹا دیا جائے۔ تم بلا جواز عملے کو زیادہ دن کی چھٹیاں نہیں دے سکتے تھے۔ آگ لگنے کے بعد عملے کو گھر بٹھانے کے علاوہ کارخانے کی ازسرِنو تعمیر کا بہانہ بھی ہاتھ آ گیا ہے۔ تعمیرِ نو کی آڑ میں ہم زیرِزمین لیبارٹری آرام سے تعمیر کر سکتے ہیں۔ اس کام کے لیے اعتماد کے بندے فراہم کرنا البتہ تمہاری ذمّے داری ہوگی۔ چاہے جتنی بھی رقم خرچ کرنی پڑے، تم اعتماد کے آدمیوں کی مدد سے یہ کام کروا لینا۔ ہم اپنے مستقبل کے لیے کام کر رہے ہیں اس لیے نفع کے بغیر بھی سرمایہ کاری کرنے کے لیے تیار ہیں۔" وہ بہت بے تکلے انداز میں بات کر رہا تھا۔ چودھری جیسے دبنگ آدمی کی بھی مجال نہیں تھی کہ اس کے سامنے زیادہ بول سکے۔ ویسے بھی اس نے کثیر معاوضے کے عوض ان لوگوں کے لیے کام کرنے کا معاہدہ کر کے ایک طرح سے خود کو ان کی ملازمت میں دے دیا تھا اس لیے عادت کے برخلاف تابع داری تو کرنی ہی تھی۔ وہ ہمہ تن گوش ہو کر اس آدمی کی ہدایات سننے لگا جس نے اسے اپنا نام تک بتانا گوارا نہیں کیا تھا۔ اس شخص نے ایک فولڈر نکال کر درمیان میں رکھی میز پر پھیلا لیا تھا اور نقشہ دکھا کر اسے سمجھا رہا تھا کہ کس طرح سے کارخانے کے نیچے لیبارٹری کی تعمیر ہونی ہے۔ چودھری اس نقشے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ساتھ ہی اسے ان لوگوں کے وسیع وسائل کا اندازہ بھی ہو گیا تھا جنہوں نے اس کی مدد کے بغیر اس کے کارخانے کے ایک ایک انچ کے بارے میں نہ صرف معلومات حاصل کر لی تھیں بلکہ ایک نیا تعمیراتی نقشہ بھی بنوا کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

"تمہیں اپنے آدمی کی مدد سے صرف تعمیراتی کام کروانا ہوگا۔ مشینوں اور حفاظتی آلات کی تنصیب کا کام میرے اپنے آدمی کریں گے۔ ہیروئن کی تیاری کے لیے کام کرنے والے ماہرین بھی ہم ہی بھجوائیں گے البتہ نچلا عملہ تمہیں خود بھرتی کرنا ہوگا۔ اس بات کا انتظام میں کر دوں گا کہ تمہیں ایک ایسے آدمی سے ملوا دوں جو کام کے افراد کی بھرتی میں تمہاری مدد کر سکے۔" وہ پوری تیاری کے ساتھ اس سے ملاقات کرنے آیا تھا۔ چودھری خلافِ عادت اس کی ایک ایک ہدایت ذہن نشین کرتا رہا۔

"میں اپنی بات مکمل کر چکا ہوں۔ مزید ہدایات ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً تم تک پہنچتی رہیں گی۔ اگر تم کوئی سوال کرنا چاہتے ہو تو کر لو۔" فولڈر چودھری کی طرف کھسکا کر وہ خود سیدھا بیٹھ گیا اور صوفے کی پشت سے کمر ٹکالی۔

"میں ضرورت پڑنے پر تم سے کہاں رابطہ کر سکوں گا اور یہ بھی بتا دو کہ تمہیں کس نام سے پکاروں؟" چودھری نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔

"فی الحال تمہیں مجھ سے رابطہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں نے تمہیں مکمل تیار پلان دیا ہے۔ تعمیر کے لیے رقم تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دی جائے گی۔ اگر رابطے کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں خود تمہیں فون کر لوں گا۔ رہی نام کی بات تو ہمارے ہاں نام نہیں ہوتے، البتہ تم مجھے مسٹر الفا کے نام سے یاد رکھو۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ کوڈ نیم ہے اور کام چلانے کے لیے کافی ہے۔ ایک دوسرے کے اصل نام جاننا ہمارے لیے غیر ضروری ہے۔"

اس نے اپنے مخصوص سپاٹ انداز میں جواب دیا جسے سن کر چودھری اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور ردِعمل میں خود بھی اسی کی طرح کا سرد لہجہ اپناتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ہماری ملاقات کا مقصد پورا ہو گیا ہے اور اب مزید کوئی بات باقی نہیں رہی ہے اس لیے اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک، اب تم یہاں سے جا سکتے ہو البتہ مس پامیلا کو رکنا ہوگا۔" مسٹر الفا نے شانے اچکاتے ہوئے جو جواب دیا اسے سن کر چودھری کو زبردست جھٹکا لگا۔

"لیکن پامیلا میرے ساتھ آئی ہے اور اصولاً اسے میرے ساتھ ہی واپس جانا ہوگا۔" فوری جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اس نے احتجاج کیا۔

"ساتھ آنے والے ساتھ واپس جائیں، یہ کوئی اصول نہیں ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ دنیا میں ایک ساتھ آنے والے جڑواں افراد بھی کبھی ایک ساتھ دنیا سے واپس نہیں جاتے تو پھر تمہارا اور مس پامیلا کا اس اپارٹمنٹ سے ایک ساتھ واپس جانا کیا ضروری ہے؟ یہ یہاں سے میرے ساتھ بھی واپس جا سکتی ہے۔ مجھے اس سے کچھ اہم معاملات طے کرنے ہیں جن پر میں تمہاری موجودگی میں بات کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔" وہ عجیب سلگانے والے انداز میں بولا تو چودھری کا چہرہ احساسِ توہین سے سرخ پڑ گیا۔

اس کی کیفیت محسوس کر کے لنڈا نے دخل اندازی کی اور نرمی سے اسے مخاطب کر کے بولی۔ "چودھری صاحب! آپ واپس چلے جائیں۔ بعد میں کسی وقت میں خود آپ سے رابطہ کر لوں گی۔"

"اور تمہاری اس احتیاط کا کیا ہوگا؟ میں ویٹر سے کہہ کر آیا ہوں کہ ہم شاپنگ کے لیے جا رہے ہیں اور واپس ہوٹل ہی آئیں گے۔" لنڈا کو رکنے پر آمادہ دیکھ کر چودھری تنک کر بولا۔

"آپ یہاں سے سیدھے ہوٹل جانے کے بجائے راستے میں کسی پب پر اتر جائیے گا اور وہاں وقت گزار کر ہوٹل پہنچیے گا۔ اس سے ویٹر کو یہ تاثر ملے گا کہ ہم نے ہوٹل سے باہر ہی کہیں اپنے معاملات نمٹا لیے ہیں اور آپ اکیلے واپس آ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کسی کال گرل کو کوئی بھی ہمیشہ تو اپنے ساتھ نہیں رکھتا۔" لنڈا نے نرم لہجے میں اسے تدبیر بتائی۔

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں باہر ہی رک کر تمہارا انتظار کروں اور تم مسٹر الفا سے تنہائی میں بات کر کے مجھ سے آ ملو۔" وہ کسی صورت لنڈا کو وہاں چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"تم نے شاید میری بات غور سے نہیں سنی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ مس پامیلا میرے ساتھ یہاں سے جائے گی اور ظاہر ہے اس دوسری جگہ میں تمہیں اپنا دم چھلا بنا کر نہیں لے جاؤں گا۔ دوسری بات یہ کہ اپارٹمنٹ میں نے صرف ایک ہفتے کے لیے کرائے پر لیا تھا اور کچھ دیر میں مجھے اسے چھوڑ کر چلے جانا ہے۔ اور تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ ہمارے کام میں بحث مباحثے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ تم بے شک لینڈ لارڈ ہو لیکن اب تنظیم میں شامل ہونے کے بعد تمہیں حکم سننے اور اسے بے چون وچرا تسلیم کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی ورنہ سخت نقصان میں رہو گے۔" چودھری کی تجویز کا جواب لنڈا کے بجائے مسٹر الفا کی طرف سے آیا جو کہ خاصا سخت اور اہانت آمیز تھا۔ چودھری دانت کچکچا کر رہ گیا البتہ لنڈا نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی بھی ردِعمل کے اظہار سے منع کر کے بے دست و پا کر دیا تھا اس لیے اس بار اس کی زبان بند ہی رہی۔

"او کے چودھری صاحب تو پھر آپ روانہ ہوں۔ میں ابھی لندن میں ہی ہوں، آپ سے دوبارہ رابطہ کر لوں گی۔" چودھری کو پسپا ہوتے ہوئے دیکھ کر اس نے اسے تسلی کے چند حروف بھی پکڑا دیے جنہیں سن کر وہ خاموشی سے باہر نکل گیا لیکن غصے اور مایوسی سے مزاج سخت بگڑا ہوا تھا۔ کچھ گھنٹوں قبل رات لنڈا کے قرب میں گزارنے کے خیال سے طبیعت میں جو سرشاری سی پیدا ہو گئی تھی، اب اسے کسی اور کی بانہوں میں جاتا دیکھ کر سخت تکدر میں بدل گئی تھی۔

☆☆☆

شہریار کی ہدایت پر مشاہدم خان مسلسل بابے کے گھر کی نگرانی کر رہا تھا۔ اسے اس شخص کا انتظار تھا جو بابے کی بیوی کے بیان کے مطابق کسی پیر سائیں کا نمائندہ یا مرید تھا اور جسے اس سے وہ ہڈیاں وصول کرنے کے لیے آنا تھا۔ بابے کی بیوی شہزادی نے تازہ قبر کھود کر اس میں دفن بچے کی لاش کے پیر کاٹ کر حاصل کرنا تھا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے سے پہلے ہی پکڑی گئی اور قریب تھا کہ گاؤں والے اسے اس جرم میں مار مار کر ہلاک ہی کر ڈالتے کہ ماریا کے موقع پر پہنچ کر مداخلت کرنے سے اس کی جان بخشی ہو گئی۔ اس قبیح فعل پر آمادہ نہ ہونے کے باوجود شہزادی کو صرف اور صرف اس لیے ہی یہ کام کرنا پڑا تھا کہ ہر ماں کی طرح اس کے لیے بھی اپنے بچوں کی جدائی برداشت کرنا ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ اس بے چاری کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی ساس اور شوہر بچوں کو لے کر کس جگہ گئے ہیں اور اس طریقے سے علاج کرنے کے دعوے دار پیر سائیں کہاں پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے شہریار نے مشاہدم

WWW.PAKSOCIETY.COM

خان کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ جیسے ہی پیر سائیں کا ہرکارہ ہڈیاں وصول کرنے وہاں پہنچے، اسے گرفت میں لے لیا جائے۔

مشابرم خان نے گھر کی نگرانی کے لیے باہر رہنے کے بجائے دیوار پھاند کر اندر جانا پسند کیا تھا۔ اگر وہ بالے کے گھر کے باہر کھڑا ہو کر نگرانی کرتا تو فوراً ہی نظر میں آجاتا اور گاؤں والوں کے سوال وجواب کا سامنا کرنا پڑتا چنانچہ اس نے دیوار پھلانگ کر اندر ہی جانا پسند کیا لیکن کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ وہ کوفت زدہ سا ایک کمرے میں بیٹھ گیا۔ اگر کوئی آتا تو یقیناً دروازے پر ہی دستک دیتا اور وہ بے خبری میں اسے آسانی سے چھاپ سکتا تھا۔

بیٹھے بیٹھے جب بہت ہی زیادہ بوریت ہونے لگی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا اور اس میں سامان بھی مختصر ہی تھا اس لیے وہاں جائزہ لینے کے لیے کچھ خاص نہیں تھا۔ وہ اکتا کر باہر صحن میں نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ صحن میں سے دھپ کی آواز سنائی دی۔ صاف محسوس ہوا تھا کہ کوئی دیوار پھلانگ کر اندر کودا ہے۔ وہ دم سادھ کر اپنی جگہ رک گیا اور دروازے کی جھری میں سے جھانک کر صحن کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں کا منظر اس کے سمعی اندازے کی تصدیق کر رہا تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا سا لڑکا تھا جو محتاط انداز میں اسی کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں وہ موجود تھا۔ لڑکے کی پیش قدمی دیکھ کر مشابرم خان تیزی سے دروازے کے بائیں جانب کی دیوار سے چپک گیا۔ اب اگر دروازہ کھولا جاتا تو اسے فوری طور پر دیکھا جانا ممکن نہیں تھا جبکہ وہ آنے والے کو بہ آسانی عقب سے دبوچ سکتا تھا۔ چند لمحوں کے بعد سب کچھ اس کی سوچ کے مطابق ہی ہوا۔ دبے پاؤں چلتا ہوا لڑکا جیسے ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، اس نے جھپٹ کر اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ لڑکے کے لیے وہاں کسی کی موجودگی قطعی غیر متوقع تھی اس لیے وہ بری طرح بھڑکا لیکن مشابرم خان نے اس کا منہ پہلے ہی اپنی ہتھیلی کی مدد سے بند کر دیا تھا اس لیے سوائے معمولی سی غراہٹ کے کوئی آواز بلند نہ ہو سکی۔

"میرے پاس پستول ہے، اگر تم نے کوئی بھی غلط حرکت کی تو تمہاری کھوپڑی میں سوراخ بنا دوں گا۔" مشابرم خان دھیمی آواز کے باوجود خوفناک لہجے میں غرایا جس کے جواب میں لڑکے نے تیزی سے اپنے سر کو دائیں بائیں نفی میں جنبش دیتے ہوئے کسی بھی قسم کی غلطی نہ کرنے کی یقین دہانی کروائی۔ اس کی خوف سے ابلی ہوئی آنکھیں بھی اس بات کی تصدیق کر رہی تھیں کہ وہ کسی قسم کی مزاحمت نہیں کر سکے گا۔ مشابرم خان نے اس کا حال دیکھ کر اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اور اسے اپنے پستول کی زد میں لینا کافی سمجھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے لڑکے سے سوال کیا۔

"عثمان۔" لڑکے نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

"کہاں سے آئے ہو؟" مشابرم خان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر پوچھا۔

"ادھر ہی گاؤں کا ہوں جی۔ آپ اے سی صاحب کے ڈرائیور ہو نا، میں آپ کو پہچانتا ہوں۔" لڑکے نے اس کی شناخت بتا کر گویا اپنے گاؤں کے رہائشی ہونے کا یقین دلانا چاہا۔

"یہاں اس گھر میں اس طرح کیوں گھسے ہو؟" ان لوگوں کے سامنے حالات جس طرح آئے تھے اس کی روشنی میں یہی اندازہ تھا کہ شہزادی سے ہڈیاں وصول کرنے گاؤں کے باہر کا کوئی آدمی آئے گا لیکن یہ تو کوئی گاؤں کا ہی رہائشی تھا اس لیے مشابرم خان کے سوال میں حیرت کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔

"بس جی، وہ متھا خراب ہو گیا تھا۔ بندہ بشر ہوں نا اس لیے لالچ میں آ کر مت ماری گئی۔" لڑکے نے آنکھیں جھکا کر جواب دیا اور چہرے کے تاثرات سے بھی شرمندہ سا نظر آنے لگا۔

"صاف صاف جواب دو کہ ادھر کیا کر رہے تھے؟" مشابرم خان نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

"میں ادھر چوری کے ارادے سے آیا تھا جی۔ بالا اتنے عرصے چودھری صاحب کا خاص کارندہ رہا ہے، میرے دماغ میں تھا کہ اس کے گھر میں کچھ نہ کچھ قیمتی سامان تو ہوگا۔ اصل میں جی میری مالی حالت آج کل وڈی پتلی ہے تو ادھر گھر خالی دیکھ کر میں نے سوچا کہ کچھ چرا لوں لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ پہلے ہی ادھر موجود ہوں گے۔" لڑکے نے جو کہانی سنائی اسے سن کر مشابرم خان ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ یہاں کسی جعل ساز پیر سائیں کے مرید کو پکڑنے کے لیے بیٹھا تھا اور لالچ کے مارے اس نوجوان سے ملاقات ہو گئی تھی۔

"تمہیں ایسی حرکت کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے تھی۔ ایک گاؤں میں رہنے والے لوگ تو ایک دوسرے کی جان و مال کے محافظ ہوتے ہیں اور تم موقع دیکھ کر یہاں لوٹ مار کرنے آ گھسے۔" اس نے لڑکے کو لتاڑا۔

"معاف کر دو جی۔ تہاڈی وڈی مہربانی ہوگی۔ میں نے بتایا نا کہ بس مجبوری کی وجہ سے دل میں لالچ آ گیا تھا۔ پر

اب میں توبہ کرتا ہوں کہ دوبارہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔" لڑکے نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر وعدہ کیا۔

"دوبارہ تم کیا کرو گے کیا نہیں، اس کا تو مجھے معلوم نہیں لیکن ابھی تم نے میرے موڈ کا ستیاناس کر دیا ہے۔ میں یہاں ایک آدمی کا انتظار کر رہا تھا، اسے شہزادی سے ملنے کے لیے آنا تھا اور میرے خیال میں اسے اب تک آ جانا چاہیے تھا لیکن پتا نہیں کیوں وہ اب تک نہیں آیا۔" مشابرم خان نے اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔

"اوہو۔۔۔ میرے خیال میں تو وہ آدمی آ کر واپس جا چکا ہے۔" عثمان نامی لڑکا اس کی بات سن کر چونکا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟ کیا تم نے اسے دیکھا تھا؟" مشابرم خان نے عجلت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"میں اس سے ملا تھا۔ وہ کہیں باہر سے آیا تھا۔ اس نے مجھ سے بالے کے گھر کا پتا پوچھا تھا اور اپنے بارے میں بتایا تھا کہ وہ اس کا دوست ہے۔ میں نے سوچا بھابی جی مشکل میں ہے۔ اکیلی عورت ذات تھانے کچہری کے چکر کیسے کرے گی؟ پنڈ میں تو سب کے دل میں اس کے لیے اتنا غصہ ہے کہ اگر اے سی صاحب ہور ان کی بیگم بیچ میں نہ پڑتے تو سارے مل کر اس کے ٹوٹے ٹوٹے کر ڈالتے۔ مجھے لگا کہ بالے کا دوست ان کے کام آ سکتا ہے اس لیے میں نے اسے سارا قصہ سنا دیا۔ پر وہ تو سن کر ایسا گھبرایا جیسے بھابی جی کی جگہ اسی کو سزا ملنے والی ہو۔ الٹے پیروں ہی واپس پلٹ گیا۔" عثمان کی زبانی سارا قصہ سن کر مشابرم خان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ نادانستگی میں مجرموں کے ایک ہرکارے کو فرار ہونے کا موقع فراہم کر بیٹھا ہے۔ وہ اجنبی شخص جو بالے کا پتا پوچھتا ہوا وہاں آیا تھا، یقیناً پیر سائیں کا بھیجا ہوا آدمی تھا جو شہزادی کے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا سن کر سمجھ گیا کہ بازی الٹ چکی ہے اور اب کچھ بھی ہاتھ آنے والا نہیں بلکہ وہ اگر زیادہ دیر گاؤں میں ٹھہرا تو خود بھی پھنس سکتا ہے اس لیے فوراً واپسی کی راہ اختیار کی۔

"یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟" مبہم سی امید کے سہارے اس نے عثمان سے دریافت کیا۔

"تقریباً آدھا گھنٹا گزرا ہوگا۔"

"وہ آدمی اپنی سواری پر آیا تھا یا بس سے؟" پیر آباد سے مختلف علاقوں کی طرف جانے والی گاڑیاں خاصے وقفے سے چلتی تھیں اس لیے اس نے اس امید پر کہ اگر وہ آدمی بس سے آیا تھا تو ممکن ہے ابھی یہاں سے نہ نکل سکا ہو، عثمان سے تفتیش کی۔

"میرے خیال سے بس سے ہی آیا تھا۔"

"چلو پھر بس اڈے چلتے ہیں۔ تم نے اس آدمی کو دیکھا ہوا ہے۔ اگر وہ اڈے پر موجود ہو تو تم پہچان کر مجھے بتا دینا۔" مشابرم خان نے اس کا بازو تھام کر فوراً ہی باہر کا رخ کیا۔ اس وقت اس کے لیے سب سے اہم اس آدمی تک پہنچنا تھا اس لیے اس نے اس بات کو قطعی نظر انداز کر دیا تھا کہ عثمان وہاں چوری کی نیت سے آیا تھا۔ وہ دونوں ممکنہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بس اڈے تک پہنچے۔ اڈے پر ایک بس ابھی ابھی آ کر رکی تھی اور اس سے مسافر اتر رہے تھے۔ اس بس کے علاوہ وہاں دوسری کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اصل میں پیر آباد کا بس اڈا وہ روایتی بس اڈا نہیں تھا جہاں مسلسل کوئی نہ کوئی گاڑی موجود رہے۔ اس اڈے سے براہ راست کوئی بس چلتی بھی نہیں تھی بلکہ لاہور اور دوسرے شہروں تک آنے جانے والی بسیں اس طرف سے گزرتے ہوئے بس تھوڑی دیر کے لیے رکتی تھیں۔ اس مختصر وقت میں اگر کسی کو بس میں سوار ہونا ہو یا اس سے اترنا ہو تو یہ کام نمٹا لیا جاتا تھا ورنہ بعض اوقات تو بس بغیر رکے بھی گزر جاتی تھی۔ وہ دونوں بس اسٹاپ پر پہنچے تو انہیں بس سے اترنے والے مسافروں اور روزگار کے سلسلے میں مستقل اڈے پر بیٹھنے والوں کے سوا کوئی اور فرد نظر نہیں آیا جس سے یہی مطلب اخذ کیا جا سکتا تھا کہ مطلوبہ آدمی ان کے وہاں پہنچنے سے قبل ہی کسی دوسری بس میں سوار ہو چکا ہے۔

مشابرم خان کف افسوس ملتے ہوئے اڈے پر بیٹھے ہوئے افراد کی طرف بڑھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ عثمان کی مدد سے پیر آباد کے گرو کا حلیہ بتا کر یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ اس حلیے کا آدمی کس روٹ کی بس میں سوار ہوا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ لمبے روٹ پر سفر کرنے والی ان بسوں کے مسافر راستے میں پڑنے والے قصبوں اور دیہاتوں میں بس رکوا کر بھی اتر جاتے ہیں لیکن کچھ نہ کرنے سے ممکنہ کوشش کر لینا بہتر تھا، ورنہ دوسری صورت میں اسے شہریار کے سامنے مکمل ناکامی کی خبر لے جاتے ہوئے شدید شرمندگی کا احساس ہوتا۔

"ڈبل ہے استاد۔" وہ تین چار قدم ہی چلا تھا کہ اڈے پر چند لمحے قبل آنے والی بس کے کنڈیکٹر کی پکار سنائی دی۔ جس کا مطلب تھا کہ بس مسافروں کو اتارنے کے بعد وہاں سے روانہ ہو رہی ہے۔ مشابرم خان نے یونہی بے ارادہ پلٹ کر بس کی طرف دیکھا تو اس کی نظر میں وہ آدمی آ گیا جو جانے اب تک کس کونے میں چھپا ہوا تھا اور اب

دوڑتا ہوا بس میں سوار ہونے کی کوشش میں تھا۔
"یہی ہے۔" شان بھی اتنی دیر میں اس شخص کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ اسے دیکھتے ہی ہانک لگائی جسے سنتے ہی مشابرم خان کے پیروں میں پہیے لگ گئے۔ وہ برق رفتاری سے اس شخص کے پیچھے لپکا لیکن وہ بھی اپنی بچاؤ کی جدوجہد کر رہا تھا اس لیے اس کی رفتار بھی کچھ کم نہیں تھی۔ مشابرم خان کے دیکھتے دیکھتے وہ اچھل کر بس کے پائیدان پر پیر رکھ چکا تھا۔ اسی لمحے بس حرکت میں آ گئی۔ مشابرم خان کے لیے یہ ایک فیصلہ کن گھڑی تھی اگر وہ پیچھے رہ جاتا تو اس شخص کو فرار کا موقع مل جاتا۔ اسے فرار ہونے سے روکنے کے لیے اس نے ایک لمبی جست لگائی اور بس کا ڈنڈا پکڑ کر پائیدان پر کھڑے شخص کو پشت پر سے قمیص پکڑ کر رینگتی بس سے گھسیٹ لیا۔ اس کی اس حرکت پر کئی لوگوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ مشابرم خان کے کھینچنے کی وجہ سے وہ شخص نیم پختہ سڑک پر گر گیا تھا اور یقینی طور پر اسے کئی چوٹیں بھی آئی تھیں لیکن پھر بھی اس نے کوشش کی کہ خود کو مشابرم خان کی گرفت سے چھڑا کر بھاگ سکے مگر وہ اسے ایسا موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اسے اپنے گھونسوں کی زد پر رکھ لیا۔ اس ساری کارروائی میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ بس اڈے پر موجود لوگوں کے بھاگ کر ان تک پہنچنے تک مشابرم خان اس شخص کی ٹھیک ٹھاک پٹائی کر چکا تھا۔

"چھوڑو یار! کیا کر رہے ہو تم؟ کیوں اس بیچارے کو مار رہے ہو؟" کئی افراد بولتے ہوئے ایک ساتھ بیچ بچاؤ کروانے کے لیے میدان میں اتر آئے۔ روانہ ہونے والی بس بھی ذرا سا آگے جا کر رک گئی تھی اور اس کے مسافر بھی اتر کر ان دونوں کے اطراف جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ یہ صورت حال ایسی تھی جس کا فائدہ فرار ہوتے شخص کو پہنچ سکتا تھا اور وہ مشابرم خان کی گرفت سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا لیکن وہ اس بات کے لیے تیار نہیں تھا چنانچہ اپنا پستول نکال کر ہوا میں لہرایا اور تیز آواز میں بولا۔

"خبردار! اگر کسی نے درمیان میں آنے کی کوشش کی تو اپنے نقصان کا خود ذمے دار ہوگا۔" لوگوں پر مزید دھاک بٹھانے کے لیے اس نے ایک ہوائی فائر بھی داغ دیا جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اس کے گرد جمع ہونے والا ہجوم ذرا فاصلے پر ہٹ گیا۔

"ارے، یہ تو اے سی صاحب کا ڈرائیور ہے۔ یہ ایسی حرکت کیوں کر رہا ہے؟" اس اثنا میں ہجوم میں سے کئی افراد نے اسے شناخت کر لیا تھا اور بلند آواز میں اظہارِ حیرت کرنے لگے تھے۔

"یہ آدمی اے سی صاحب کے بنگلے سے چوری کر کے بھاگا تھا۔ میں نے اس وقت بھی اسے دیکھا تھا لیکن پکڑ نہیں سکا تھا۔ آج دکھائی دیا تو پکڑ لیا۔ تم لوگ اس معاملے کے بیچ میں نہ پڑو۔ میں اسے اے سی صاحب کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ خود اس کا فیصلہ کر دیں گے۔" اس نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے ان لوگوں کو اس شخص کی حقیقت بتانے کے بجائے بہانہ تراشا۔ اگر وہ یہ بتا دیتا کہ یہ شخص اپنے پیر کے ایما پر شہزادی سے مردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے آیا ہے تو غم و غصے میں جتلا وہ لوگ شاید اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہی کر دیتے اور فی الحال اس شخص کا صحیح سلامت رہنا ضروری تھا تاکہ اس سے اس کے پیر کا حدود اربع معلوم کیا جا سکتا۔

"میں چور نہیں ہوں۔ میں تو ادھر کسی سے ملنے آیا تھا۔" مشابرم خان کی گرفت میں موجود شخص نے اپنے بچاؤ کے لیے آواز بلند کی۔

"کس سے ملنے آئے تھے اس کا نام بتاؤ؟" مشابرم خان نے اس کو گھورتے ہوئے بآوازِ بلند پوچھا تو وہ یک دم ہی چپ سادھ گیا۔ مشابرم خان کو خود بھی اندازہ تھا کہ موجودہ صورتِ حال میں وہ کبھی یہ تسلیم نہیں کر سکے گا کہ یہاں پالے کی بیوی سے ملنے کے لیے آیا تھا اور ظاہر ہے اس اجنبی گاؤں میں اس کا کوئی دوسرا شناسا بھی نہیں ہوگا کہ وہ اس کا نام لے سکے۔

"میں اسے اپنے ساتھ نور کوٹ لے جا رہا ہوں۔ وہاں اس کا فیصلہ اے سی صاحب خود کریں گے۔" اس شخص کی خاموشی نے مشابرم خان کو خود بخود ہی یہ حق دے دیا کہ وہ حتمی فیصلہ سنا دے۔ اس بار وہاں موجود لوگوں میں سے بھی کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ ایک تو ویسے بھی مشابرم خان، شہر یار کا ڈرائیور ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کے لیے شناسا اور قابلِ اعتبار تھا، دوسرے اس کے مقابل کی خاموشی نے بھی ثابت کر دیا تھا کہ اس کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے وہ غلط نہیں ہے۔

"ٹھیک ہے بھرا تم اسے لے جاؤ۔ اے سی صاحب قانون کے مطابق کام کرنے والے آدمی نہیں ہوتے تو ان کے مجرم کو ہم خود بھی ٹھیک ٹھاک سبق دے سکتے تھے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ہم نے اسے انگلی بھی لگائی تو اے سی صاحب ناراض ہوں گے اس لیے اس کا معاملہ ہم تم پر ہی چھوڑتے ہیں۔" آخر ان میں سے ایک شخص نے وہاں موجود سب لوگوں کی نمائندگی کرتے ہوئے مشابرم خان کو یہ یقین دہانی کروا دی کہ اس کے کام میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔

"بہت بہت شکریہ کہ آپ لوگوں نے اس چور کے مقابلے میں میرا اعتبار کیا۔" مشابرم خان نے ان سب کو مجموعی طور پر مخاطب کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔ اس لمحے اس کی توجہ بٹ گئی اور زیر ہو جانے والے حریف نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے یکدم ہی اس کے پستول پر ہاتھ ڈال دیا۔ یہ حملہ اتنی اچانک تھا کہ مشابرم خان کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا اور ناک پر ایک زوردار مکا کھانے کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ سے پستول نکل کر مقابل کے ہاتھ میں چلا گیا۔

"اگر کوئی بیچ میں آیا یا میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو میں گولی چلا دوں گا۔ ابھی اس پستول میں پانچ گولیاں باقی ہیں۔ تم لوگوں کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے میں تم میں سے پانچ کی لاشیں گرا دوں گا۔" کچھ دیر قبل چہرے پر مظلومیت طاری کیے کھڑے رہنے والا شخص یکدم ہی اپنے تیور بدل چکا تھا اور لوگوں کو دھمکا رہا تھا۔ گاؤں کے ان سیدھے سادے لوگوں کے لیے جن کی زندگی صرف دال روٹی کمانے کے چکر میں گزر رہی تھی اور انہیں اس سے ہٹ کر ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت نہیں تھی، ہتھیار ایک خوف ناک شے کا نام تھا جس کے مقابل آنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ غربت و افلاس کی چکی میں پسے ان لوگوں کے اندر اگر اس طرح کی کوئی جرأت ہوتی تو وہ دن رات چودھری کے مظالم نہ سہہ رہے ہوتے۔ چودھری آج تک طاقت کے بل پر ہی تو ان پر حکمرانی کرتا رہا تھا۔ اگر ان میں جرأت ہوتی تو مقابلہ کرتے اور اپنے حقوق کے خود ہی محافظ بن جاتے لیکن ان کی بزدلی نے ان کے ساتھ ساتھ ان کی آنے والی نسلوں تک کے حقوق پامال کر دیے تھے۔ اب بھی وہ سب خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے اور وہ شخص پستول کے زور پر اتنے بڑے مجمع کو روکے رکھنے میں کامیاب ہو کر خود الٹے پیروں وہاں سے دور ہٹنے لگا۔

اس کی حرکت کی سمت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بس کی طرف جانا چاہتا ہے۔ شاید وہ اس بس سمیت یہاں سے فرار ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ الٹے قدموں پیچھے کی طرف جاتے ہوئے اس نے مشابرم خان پر خاص نظر رکھی تھی جو کافی بے بس نظر آ رہا تھا۔ اس جیسے دلیر آدمی کے لیے مشکل نہیں تھا کہ وہ پستول کی پروا کیے بغیر فرار ہوتے شخص پر حملہ کر دے لیکن اسے وہاں موجود دوسرے لوگوں کا خیال تھا۔ اگر وہ شخص فائرنگ کر دیتا تو کئی بے گناہ زد میں آ جاتے۔ وہ بے بس اسے فرار ہوتا دیکھتا رہا لیکن یکدم ہی عجیب معاملہ ہوا۔ الٹے قدموں پیچھے ہٹتے شخص کو یکدم ہی ٹھوکر لگی اور وہ بری طرح پیچھے کی طرف الٹ گیا، گرتے ہی اس کے ہاتھ سے پستول بھی نکل گیا۔ اصل میں ایک تو وہ الٹے قدموں چل رہا تھا، دوسرے اس نے اپنی ساری توجہ مشابرم خان اور ہجوم پر مبذول کر رکھی تھی اس لیے اچانک ہی اس بڑے پتھر کی زد میں آ کر الٹ گیا جو راستے میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے گرتے ہی مشابرم خان چیتے کی سی پھرتی سے حرکت میں آیا اور اپنی جگہ سے جست لگا کر اسے چھاپ لیا۔ چھاپتے ہی اس نے اسے لاتوں اور گھونسوں کی زد پر رکھ لیا۔ بے دردی سے پٹتا وہ شخص واویلا کرنے لگا لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا جو اس سے ہمدردی کرتا۔ چند لمحوں میں کوئی نہیں بھول سکتا تھا کہ اس شخص نے انہیں جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔ اس وقت وہ اپنی دھمکی کا نتیجہ بھگت رہا تھا اور آنے والے وقت میں اسے

یک نہ شد

ایک بہرا ایک دکان پر گیا اور ایک چیز کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ "کتنے کا ہے؟" اتفاق سے دکان دار بھی بہرا تھا۔

اس نے کہا۔ "پانچ کا۔"

گاہک نے کہا۔ "میں یہ تھوڑی معلوم کر رہا ہوں کہ وہ کانچ کا ہے۔ قیمت بتاؤ؟"

دکان دار نے جھنجلا کر کہا۔ "پانچ کا ہے پانچ کا۔"

گاہک سمجھ کر بولا۔ "تین کا ہوگا پانچ کا نہیں ہو سکتا۔"

دکان دار نے غصے سے کہا۔ "تین کا نہیں کانچ کا ہے۔"

پٹھان خان، پشاور

نشانہ باز

ایک ماہر نشانہ باز کے پاس ایک اخباری نمائندہ انٹرویو کرنے گیا۔ کمرے میں بہت سی آنکھیں بنی ہوئی تھیں اور ہر آنکھ پر صحیح نشانہ لگا تھا۔ اخباری نمائندے نے نشانوں سے متاثر ہوتے ہوئے پوچھا۔

"آخر آپ ایسا اچھا نشانہ کس طرح لگا لیتے ہیں؟"

"یہ کون سا مشکل کام ہے پہلے ہم نشانہ لگاتے ہیں اور پھر اس نشانے پر آنکھ بنا لیتے ہیں۔"

فیصل آباد سے مختار خان کا تعاون

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک شقی القلب نام نہاد پیر کا گرگا ہونے کا مزہ چکھتا تھا۔

☆☆☆

"تم یہیں ٹھہرو۔ میں گاؤں کے اندر جاتا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ جلد از جلد واپس آسکوں لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے کچھ وقت لگ جائے گا۔ شفقت راؤ کے بہنوئی اور داماد کو مطمئن کیے بغیر میں انہیں اپنی مدد پر آمادہ نہیں کرسکوں گا اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے مجھے ان سے تفصیلی بات کرنی پڑے گی۔ تم بتاؤ تم یہاں اکیلی رکنے سے ڈرو گی تو نہیں؟" ابھی صبح نہیں ہوئی تھی اور آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ ان تاروں کی مدھم روشنی میں ماہ بانو کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسلم نے اس سے پوچھا۔

"تم جاؤ، میری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حالات کی سختیوں نے مجھے اتنا بہادر تو بنا ہی دیا ہے کہ کچھ وقت اس ویرانے میں تنہا رہ سکوں۔" ماہ بانو نے اسے تسلی دی۔ مسلسل سفر کی تھکان نے اس کا جوڑ جوڑ ہلا دیا تھا لیکن اس وقت ایک انسانی آبادی کے قریب موجود ہونے کا احساس اتنا فرحت بخش تھا کہ وہ اپنے اندر ایک نیا حوصلہ اور امنگ محسوس کر رہی تھی۔ پہاڑی سلسلے میں اتفاقاً مل جانے والا شفقت راؤ ان کے لیے ایک نجات دہندہ ثابت ہوا تھا جس نے انہیں پہاڑی بھول بھلیوں سے نکلنے کی راہ دکھادی تھی۔ اس کی راہنمائی کی وجہ سے وہ اس لائق ہوسکے تھے کہ اس وقت ایک گاؤں کے قریب موجود تھے۔

یہ شفقت راؤ کا گاؤں تالی والا تھا جس کی راہ سجھاتے ہوئے اس نے اپنے خاندان والوں سے مدد مل جانے کی بھی امید دلائی تھی لیکن ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کردی تھی کہ ماہ بانو اپنے موجودہ حلیے میں گاؤں میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرے ورنہ جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس لڑکی فوراً ہی سب کی نظروں میں آجائے گی۔ اس نے تجویز پیش کی تھی کہ ایک خاص حد پر پہنچنے کے بعد اسلم ماہ بانو کو وہیں چھوڑ کر خود گاؤں میں چلا جائے اور پھر اس کے بہنوئی تک پہنچ کر اسے شفقت راؤ کا حوالہ دے کر مدد کی درخواست کرے۔ اس کی تجویز معقول تھی اس لیے ان لوگوں نے اس پر عمل کرنا مناسب سمجھا تھا۔ شفقت راؤ سے الگ ہونے کے بعد وہ اس کی بتائی ہوئی نشانیوں کی مدد سے سفر کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ گئے تھے اور یہاں سے آگے اسلم کو تنہا سفر کرنا تھا لیکن وہ ماہ بانو کو اس ویرانے میں چھوڑ کر جاتے ہوئے تذبذب کا بھی شکار تھا البتہ ماہ بانو اب کوئی عام لڑکی نہیں رہی تھی۔ مسلسل ہونے والے تجربات نے اسے عام لڑکیوں کے مقابلے میں کافی بہادر اور باہمت بنا دیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار کرنے کے بجائے اسلم کو اپنی طرف سے بھرپور تسلی دے ڈالی۔

"ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں لیکن تم ارد گرد سے ہوشیار رہنا۔ ہتھیار تمہارے پاس ہے۔ اگر کوئی مشکل سر پر آن پڑے تو اس کے استعمال میں جھجکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بعد میں جو بھی ہوگا، میں اس سے نمٹ لوں گا۔ بس تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔" اس کے لفظ لفظ سے ماہ بانو کے لیے محبت جھلک رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہاری ساری ہدایات یاد رکھوں گی لیکن اب تم جلدی سے روانہ ہو جاؤ۔ گاؤں دیہاتوں میں ویسے ہی اس پہر کھیتوں کے رکھوالے جاگ رہے ہوتے ہیں۔ کچھ دیر اور گزر گئی تو کھیتوں پر کام کرنے والے دوسرے لوگ بھی اپنے گھروں سے نکل آئیں گے اور تمہارا خاموشی سے شفقت راؤ کے داماد کے گھر پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔" اس نے نرمی سے اسلم کو ٹوکا تو وہ آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ یہاں سے وہ ماہ بانو کو اسی صورت میں آگے لے جاسکتا تھا جب شفقت راؤ کے بہنوئی سے مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا کیونکہ وہی شخص اسے ماہ بانو کے لیے مقامی زنانہ لباس فراہم کرسکتا تھا۔ شفقت راؤ کے بہنوئی کا بھی عجیب معاملہ تھا۔ بہنوئی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اس کا کزن بھی تھا اور دوست بھی۔ ان رشتوں کے علاوہ اس سے اس کا ایک رشتہ بھی تھا۔ شفقت راؤ کی بیٹی کو اپنے بیٹے سے بیاہ کر وہ اس کا سمدھی بھی بن بیٹھا تھا لیکن رشتوں کی اس بھیڑ میں دوستی کا رشتہ سب سے نمایاں اور مضبوط تھا اور اسی رشتے پر بھروسا کرتے ہوئے اس نے اسلم کو اجازت دے دی تھی کہ وہ اس کے بہنوئی کو ان تمام حالات و واقعات سے بھی آگاہ کردے جن سے اس نے اسے مطلع آگاہ نہیں کیا تھا۔

اسلم اسی مقصد کے لیے اس کے گھر جا رہا تھا۔ راستے یا گھر کے پتے کی اسے فکر نہیں تھی۔ ان دونوں چیزوں کے بارے میں بھی راؤ نے واضح نشانیاں سمجھا دی تھیں۔ وہ دونوں سفر کا پہلا مرحلہ بغیر بھٹکے طے کر لینے کے بعد خاصے پُراعتماد ہو گئے تھے اور امید تھی کہ دوسرے مرحلے میں قطعی نہیں بھٹکیں گے۔ ماہ بانو سے جدا ہو کر شفقت راؤ کے بہنوئی کے گھر جاتے ہوئے اسے وہ درد بھری داستان بھی یاد آرہی جو راؤ شفقت نے اپنے بیٹے کی موت کے سلسلے میں سنائی تھی۔ اب وہ ایک ایسے گھرانے سے مدد مانگنے جا رہا تھا جہاں مرنے والے بدنصیب لڑکے صداقت کی ماں بھی موجود تھی اور بہن بھی۔ وہ لوگ اس کی مدد پر آمادہ ہوتے یا نہیں، اسے ان لوگوں سے دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی اور اس کا دل چاہتا تھا کہ اس ماں سے ضرور ملے جو اپنے بیٹے کو کھو کر ہوش و حواس گنوا بیٹھی تھی۔ صداقت کی ماں کی ان بے تحاشا محبت نے اسے اپنی ماں کی یاد دلا دی تھی۔ وہ بھی تو اس سے بہت محبت کرتی تھی اور اس کے حوالے سے ڈھیروں خواب آنکھوں میں سجائے بیٹھی تھی۔ حالات کے جبر نے اسے کچھ اس طرح سے مجبور کیا کہ اس کی ماں کی آنکھوں میں سجے سارے خواب بکھر کر رہ گئے اور مایوس و دل گرفتہ ماں اس سے روٹھ گئی لیکن اتنا تو اسے بھی معلوم تھا کہ روٹھنے کے باوجود اس کی ماں کا دل اس کے لیے تڑپتا ہوگا اور آنکھیں اسے دیکھنے کے لیے ترستی ہوں گی۔

اپنی اور صداقت کی ماں کی تڑپ اس کے لیے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ ایک کا بیٹا منوں مٹی کے نیچے دفن ہو کر ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا تھا تو دوسرا جرائم کی دلدل میں پھنس کر ماں کے سامنے جانے کے لائق نہیں رہا تھا۔ لیکن اب ایک موہوم سی امید جاگی تھی۔ ماہ بانو وہ لڑکی تھی جس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اس دلدل سے باہر کھینچ لیا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ اس کے ساتھ ایک صاف ستھری زندگی شروع کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی روٹھی ہوئی ماں کو بھی منا سکے گا۔ اس کی اصول پرست اور ضدی ماں بے شک اس کے معافی مانگنے پر نہیں پسیجی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ ماہ بانو اسے منا لے گی۔ وہ اس کے لیے معافی کا در وا کروا دے گی اور وہ ایک بار پھر ماں کی محبت کی چھاؤں میں بیٹھ سکے گا۔ اسے ماہ بانو کی اثر پذیری کا اندازہ تھا۔ اس لڑکی کو دلوں کے قفل کھولنے کا ہنر آتا تھا لیکن یہ سب ہونے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اسے یہاں سے نکال کر لے جانے میں کامیاب ہو جاتا۔ اسی مقصد کے لیے وہ شفقت راؤ کے بہنوئی حامد راؤ کے گھر جا رہا تھا۔ راستے میں نظر آنے والی نشانیوں سے ظاہر تھا کہ اس کے سفر کی سمت بالکل درست ہے۔ وہ بہت محتاط ہو کر چل رہا تھا اور اس کی پوری کوشش تھی کہ کھیتوں میں کام کرتے رکھوالوں میں سے کسی کی نظر میں نہ آسکے۔ اکیلے ہونے کی وجہ سے اسے اپنے مقصد میں آسانی بھی تھی۔ جہاں ذرا سا اندیشہ محسوس ہوتا وہ خود کو زمین پر گرا لیتا۔ بالآخر تقریباً بیس پچیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ سبز پینٹ والے لوہے کے دروازے کے سامنے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک منزلہ مکان اچھا خاصا بڑا تھا اور مکان کی پختہ تعمیر سے اندازہ ہو رہا تھا کہ مکین خاصے خوش حال ہیں۔ مکان کے سرسری سے جائزے کے بعد ہی یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ وہ بالکل صحیح جگہ پہنچا ہے، اس نے لوہے کے دروازے کی کنڈی بجا کر اندر والوں کو اپنی آمد سے باخبر کیا۔ اندر سے فوراً ہی ردعمل ظاہر ہوا۔

"کون ہے بھائی؟ آرہا ہوں۔" قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی مردانہ آواز سنائی دی اور پھر بے دھڑک دروازہ کھول دیا گیا کہ شہروں کی طرح گاؤں کے اس مکان کے مکین کو اس پہر اپنے دروازے پر دستک سن کر یہ تشویش تو ضرور ہوئی ہوگی کہ اس کا کوئی پڑوسی مشکل میں نہ ہو لیکن یہ خدشہ نہ رہا ہوگا کہ کوئی لٹیرا یا ڈاکو اسے لوٹنے کے لیے آیا ہوگا۔

"میں حامد راؤ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔" دروازہ کھول کر باہر آنے والا ایک جواں سال مرد تھا جو اپنے دروازے پر ایک اجنبی کو پا کر حیران نظر آرہا تھا۔ اس کی عمر دیکھ کر اسلم نے اندازہ لگا لیا کہ وہ حامد راؤ کا بیٹا اور شفقت کا داماد مقصود ہے لیکن شفقت راؤ نے اسے حامد سے مل کر حالات بیان کرنے اور مدد مانگنے کی ہدایت کی تھی اس لیے اس نے مقصود سے اپنا تعارف کروانے کے بجائے براہِ راست اس کے باپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

"آپ اندر آجائیں۔ ابا جی تہجد پڑھ رہے تھے۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ فارغ ہو گئے ہیں تو آپ کے آنے کی اطلاع دیتا ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے؟" مقصود کافی سعادت مند قسم کا برخوردار محسوس ہوتا تھا جس نے باپ کے ملاقاتی سے اس پہر ملاقات کا سبب دریافت کرنے کے بجائے عزت و احترام سے اندر لے جانا پسند کیا تھا۔

"میرا نام اسلم ہے لیکن تمہارے والد صاحب مجھے نام سے نہیں پہچانتے ہوں گے۔ میں ملاقات ہونے پر ہی ان سے اپنا تعارف کروا سکوں گا۔" اس نے جواب دیا جس پر کوئی بھی تبصرہ کیے بغیر مقصود اسے ایک ڈرائنگ روم کی طرز پر سجے کمرے میں بٹھا کر باہر نکل گیا۔ یہاں بیٹھ کر اسلم کو چند منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور دروازے سے ایک باریش آدمی اندر داخل ہوا۔ اس آدمی کے چہرے میں شفقت راؤ کی ہلکی سی جھلک تھی لیکن وہ عمر میں اس سے چند سال بڑا معلوم ہوتا تھا۔

"السلام علیکم، میرے بیٹے نے مجھے بتایا کہ کوئی اجنبی آدمی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ فرمایئے میں آپ کی کیا مدد یا خدمت کرسکتا ہوں؟" شفقت راؤ کی طرح وہ بھی ستھرے لہجے میں ہی بات کر رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"سب سے پہلے تو میں ناوقت آپ کو زحمت دینے پر معذرت چاہتا ہوں لیکن حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ مجھے آپ کو یہ تکلیف دینی پڑی۔" اسلم کے لہجے میں حقیقی شرمساری تھی۔

"ہمارے ہاں مہمان کو کبھی زحمت نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی اس کے آنے پر تکلیف محسوس کی جاتی ہے۔ ہم مہمان کو اللہ کی رحمت سمجھتے ہیں اس لیے اس کی آمد پر ہمیشہ خوش ہوتے ہیں۔" حامد راؤ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا۔

"شکریہ حامد راؤ صاحب! مجھے آپ کے بارے میں شفقت راؤ صاحب نے ایسی ہی یقین دہانی کروائی تھی جب ہی میں یہاں اس وقت آنے کی ہمت کر سکا ہوں۔"

"اوہ! تو آپ کو شفقت نے میرے پاس بھیجا ہے۔ کیسا ہے وہ؟ اس کے جانے کے بعد ہم لوگوں نے بہت کوشش کی لیکن اس سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ اس نے اپنا موبائل بند کر رکھا تھا اور دفتر کے نمبر پر فون کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ وہاں پہنچا ہی نہیں۔ سب گھر والے اس کے لیے پریشان ہیں۔ آج میرا بیٹا مقصود اس کی خیر خبر لینے کے لیے جانے والا تھا۔" اس کی زبان سے شفقت راؤ کا نام سن کر حامد مضطرب ہوا تھا۔ اس کے اس انداز سے ظاہر تھا کہ شفقت راؤ کا اس کی دوستی پر مان یونہی نہیں ہے۔ وہ واقعی اس سے شدید محبت کرتا ہے جب ہی اتنا پریشان بھی نظر آ رہا ہے۔

"وہ ٹھیک ہیں لیکن ان کی تلاش میں مقصود کا شہر جانا بے کار ہوگا۔ وہ شہر میں موجود نہیں ہیں۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ اسی پل مقصود کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنے والد کو اطلاع دینے کے لیے گیا تھا تو ان کے ساتھ دوبارہ اندر نہیں آیا تھا اور اب اس کے ہاتھ میں موجود ٹرے کو دیکھ کر سمجھ آ رہا تھا کہ وہ کس مقصد کے تحت رک گیا تھا۔

"چاچا جی شہر نہیں گئے تو پھر کہاں ہیں؟" ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے مقصود نے بے چینی سے پوچھا۔

"اس کے لیے مجھے ذرا تفصیل سے سارے حالات بتانے ہوں گے۔" اس نے باری باری دونوں باپ بیٹے کی شکل دیکھی۔

"تو پھر بہتر ہے کہ پہلے تم کچھ کھا پی لو پھر ہمیں تفصیلات بتاؤ۔ تمہارے چہرے اور حلیے سے ظاہر ہے کہ تم بہت تھکے ہوئے اور بھوکے ہو۔" اس نازک موقع پر بھی حامد راؤ نے وضع داری کا دامن نہیں چھوڑا اور اس کی توجہ ٹرے کی طرف مبذول کرواتے ہوئے اسے کھانے کی دعوت دی۔

"آپ کا ہر انداز درست ہے لیکن میں اس وقت تک کچھ بھی نہیں کھا پی سکتا جب تک میری عزیز ترین ہستی بھی میرے ساتھ یہاں موجود نہ ہو اور اسے یہاں تک لانے کے لیے مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔" اس نے قطعیت کے ساتھ انکار کیا۔

"آپ بلاتکلف بتائیں کہ ہم کیسے آپ کی مدد کر سکتے ہیں؟" اس کا جواب سن کر مقصود نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"میں کوشش کرتا ہوں کہ اختصار کے ساتھ آپ کو حالات سے آگاہ کر دوں تاکہ آپ میری بات سمجھ سکیں۔" اس نے کہا اور پھر ان لوگوں کو اپنی اور شفقت راؤ کی ملاقات سے لے کر شفقت راؤ کے ڈیرے میں آگ لگانے تک سب کچھ بتاتا چلا گیا۔

اپنے اور ماہ بانو کے بارے میں اس نے وہی کچھ بتایا تھا جو اس سے قبل شفقت کو بتا چکا تھا۔ وہ لوگ حیرت بھری پریشانی کے ساتھ سب کچھ سنتے چلے گئے۔ ظاہر ہے وہ گاؤں میں رہتے تھے اور آگ لگنے کا واقعہ ان کے علم میں بھی تھا لیکن اس حادثے کا ذمے دار شفقت راؤ ہے، یہ سن کر یقیناً انہیں شاک لگا تھا۔ اسلم ساری تفصیل سنا چکا تو حامد راؤ نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر بڑے وقار سے بولا۔ "ان سارے حالات پر ہم بعد میں غور و فکر کریں گے، بہتر ہے کہ سب سے پہلے تمہاری بیوی کو گھر لانے کا انتظام کیا جائے۔ تنہا عورت کا اتنی دیر تک ویرانے میں رہنا کسی طور مناسب نہیں۔" اس کا جملہ سن کر اسلم نے اپنے اندر ایک گہرا اطمینان سا اترتا ہوا محسوس کیا۔

"مقصود بیٹا! جاؤ جا کر اپنی لا کا کوئی جوڑا اور چادر لے آؤ۔ تمہاری بہن کو گھر لانے کا انتظام کرتے ہیں۔" وہ اپنا فیصلہ سنا کر فوراً ہی اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اپنے باپ کا حکم سن کر وہ فوراً ہی باہر نکل گیا۔ پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں وہ لوگ گھر سے باہر موجود تھے اور اس سمت میں جا رہے تھے جہاں وہ ماہ بانو کو چھوڑ کر آیا تھا۔ جب وہ لوگ اس مقام پر پہنچے تو صبح کا اجالا نمودار ہو چکا تھا اور منظر بہت واضح تھا لیکن اس منظر میں ماہ بانو کا نام و نشان نہیں تھا۔ اسلم بے قراری سے اسے پکارتے ہوئے ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔

یہ پرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہ بانو کو وہاں نہ پا کر اس پر قیامت سی گزر گئی تھی۔ ماہ بانو کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ اس کے لیے وہ دنیا کی سب سے قیمتی اور اہم لڑکی تھی جس کے بغیر وہ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے نہ پا کر اسے یوں لگا تھا جیسے ہوا میں آکسیجن کا تناسب یک دم ہی کم ہونے لگا ہو اور اسی کی سے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔

"پریشان نہ ہو نوجوان! ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کہاں ہے؟" اس کی غیر ہوتی حالت کو دیکھ کر حامد راؤ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی لیکن ماہ بانو کا غیاب ایسا معاملہ نہیں تھا کہ کسی کے تسلی دلاسوں سے اس کا اضطراب کم ہو جاتا۔ وہ بے چین سا ہو کر اس کی تلاش میں چل پڑا۔ حامد راؤ اور اس کا بیٹا مقصود بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے دو مختلف سمتوں میں بڑھ گئے۔ اسلم ماہ بانو کو یہاں چھوڑ کر گیا تھا اس لیے سب سے پہلے اسے قرب و جوار میں تلاش کرنا ضروری تھا۔ آس پاس دیکھنے پر اگر وہ نہ بھی ملتی تو کچھ نہ کچھ ایسی علامات ضرور نظر آ جاتیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ اگر وہ خود اپنی مرضی سے کہیں گئی تھی تو لازمی بات ہے کہ وہاں کسی قسم کی گڑبڑ نظر نہیں آتی۔ کسی حادثے کا شکار ہونے کی دو ہی صورتیں تھیں، ایک یہ کہ کوئی اتفاقاً اس طرف نکل آیا اور ایک جوان خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی، دوسرا امکان یہ تھا کہ وہ کسی آوارہ وحشی جانور کا نشانہ بن گئی ہو گی۔

خیال میں آنے والا ہر امکان اتنا خوف ناک تھا کہ برسوں ڈاکوؤں کے ساتھ رہ کر بے جگری سے زندگی گزارنے والا اسلم بھی اندر سے تھرا کر رہ گیا۔ ڈیرے کی تاریک زندگی میں اس نے عزتیں لٹتی بھی دیکھی تھیں اور بکتی بھی۔ وہ انسانی خون کی ارزانی سے بھی واقف تھا اور انسان کی بلبلے جیسی حیثیت سے بھی۔ اسے معلوم تھا کہ کسی چلتے پھرتے، ہنستے مسکراتے شخص کو مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہونے میں چند منٹ بھی نہیں لگتے، ہاں پیچھے رہ جانے والے ضرور زندہ درگور ہو جاتے ہیں۔ اگر اسے ماہ بانو نہ ملتی تو وہ خود بھی بے روح مٹی کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ وہ اس کی زندگی تھی، سو وہ اپنی زندگی کی تلاش میں دیوانہ وار ادھر ادھر دوڑ رہا تھا۔ اس دوڑ دھوپ میں اچانک ہی وہ ایک چٹان کی دوسری طرف گیا تو اس کے حلق سے عجیب لایعنی سی آواز نکل گئی۔ یہ ایک بے حد پریشان شخص کی خوشی کا اظہار تھا۔ ماہ بانو بالکل سامنے ایک بڑے سے پتھر سے ٹیک لگائے سو رہی تھی۔ اس کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بلا ارادہ صرف نیند سے مغلوب ہو کر اچانک ہی سو گئی ہے ورنہ دانستہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

ایک نظر میں یہ سب کچھ جانچ لینے کے بعد اسلم کے وجود میں یک دم ہی غصے کی لہر دوڑ گئی۔ ابھی اس کو سامنے پا کر جو خوشی محسوس ہوئی تھی، وہ بہت تیزی سے غصے میں تبدیل ہو گئی۔ یہ پریشانی کی انتہا پر پہنچ جانے والے شخص کا ایک فطری ردعمل تھا ورنہ پتھر سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندے ماہ بانو کا مخروطی انگلیوں والا ہاتھ جس طرح اس کے دائیں رخسار پر ٹکا ہوا تھا، اس انداز میں وہ سنگ مرمر سے تراشا ہوا حسین مجسمہ لگ رہی تھی جس پر ایک خاص رخ سے پڑتی سورج کی شعاعیں حسن میں مزید جگمگاہٹ پیدا کر رہی تھیں۔ غصے میں جلا اسلم اس حسین منظر سے متاثر ہوئے بغیر آگے بڑھا اور ماہ بانو کا بازو پکڑ کر اسے جھنجوڑ ڈالا۔ وہ ہڑبڑا کر نیند سے جاگی۔

"تم واپس آ گئے۔ مجھے معلوم ہی نہیں چلا کہ کب آنکھ لگ گئی۔" اسے سامنے پا کر وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

"تم تو یوں آرام سے سو رہی تھیں جیسے شہزادی صاحبہ اپنے محل میں ہوں۔ ابھی میری جگہ کوئی اور یہاں پہنچ جاتا تو تمہارے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا تھا، اس کا تم خود بھی اندازہ لگا سکتی ہو۔ مانا کہ کم عمر ہو لیکن جن حالات سے گزر رہی ہو، وہ انسان کو عقل سکھانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ اور یہ تو بتاؤ کہ تم اپنی جگہ سے ہٹیں کیوں؟ تمہیں اندازہ ہے کہ تمہیں وہاں نہ پا کر میرا کیا حال ہوا؟ قیامت گزر گئی تھی مجھ پہ۔ آدمی کسی کی چاہت سے واقف ہو تو کیا اسے ستانا ضروری سمجھتا ہے؟" وہ غصے میں بولتا چلا گیا۔ ماہ بانو اس کی اپنے لیے چاہت سے بھی واقف تھی اور موجودہ کیفیت کا بھی اندازہ کر سکتی تھی اس لیے اس کے غصے کا ذرا برا نہیں مانا اور نرمی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

"سوری اسلم! میری وجہ سے تمہیں بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ مجھے یاد تو تھا کہ تم نے اپنی جگہ سے ہٹنے سے منع کیا تھا لیکن مجھے اذان کی آواز سنائی دی تو میں رہ نہیں سکی۔ جہاں تم مجھے چھوڑ کر گئے تھے، وہاں نماز پڑھنے کی جگہ نہیں تھی اس لیے میں یہاں آ گئی۔ یہاں آ کر مجھے احساس ہوا کہ میرے پاس تو کوئی دوپٹا یا چادر ہی نہیں ہے جسے اوڑھ کر میں نماز ادا کر سکوں۔ اپنی اس بے بسی پر مجھے شدید رونا آیا۔ تم سوچو کہ میرے لیے کتنی بدقسمتی کا مقام تھا کہ رب نے پکارا تھا اور میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس پکار کے جواب میں اپنے رب کی بارگاہ میں جانے کی اہل نہیں تھی۔ تھوڑی دیر تک میں اس صورتِ حال پر روتی رہی پھر میرے دل میں خیال آیا کہ میں بے بس اور لاچار ہوں۔ اللہ تعالیٰ میری نیت بھی جانتا ہے اور میری معذوری کو بھی دیکھ رہا ہے۔ اس کے ہاں حالات کے تحت بہت سی رعایتیں دینے کا بھی اصول ہے۔ جیسے پانی دستیاب نہ ہونے یا کسی بیماری کی صورت میں تیمم کی اجازت ہے۔ حالتِ خوف میں نماز قصر کرنے کی اجازت ہے اسی طرح وہ میرے عذر کو بھی قبول کرلے گا۔ میں نے اپنے دل کی گواہی پر جس حال میں تھی، اسی حال میں نماز قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد میرے دل کو جو سکون ملا، اسے میں تمہارے سامنے لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی۔ میں نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور تسبیحات پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے جانے کب اور کیسے اتنی گہری نیند لگی کہ مجھے کچھ پتا ہی نہیں چلا اور اب تمہارے اٹھانے پر جاگی ہوں۔ یقین کرو، میں چند منٹ سے زیادہ نہیں سوئی ہوں گی لیکن اتنا سکون محسوس کررہی ہوں جیسے رات بھر کی نیند لے کر جاگی ہوں۔" وہ جیسے جیسے اپنی بپتا سناتی گئی، اسلم کے چہرے کے تاثرات بدلتے چلے گئے۔ اس نے پہلی بار ماہ بانو کا چہرہ غور سے دیکھ کر یہ بات نوٹ کی کہ اس کے رخساروں پر اب بھی آنسوؤں کے مٹے مٹے سے نشانات موجود ہیں جن سے اس کے بیان کی تصدیق ہورہی تھی۔

"آئی ایم ویری سوری۔ بس میں بہت زیادہ پریشان ہوگیا تھا اس لیے مجھے غصہ آگیا۔" اس کی ماہ بانو کے لیے محبت میں کوئی کلام ہی نہیں تھا۔ بس وقتی طور پر غصے سے مغلوب ہوکر اسے چند سخت جملے کہہ بیٹھا تھا جن پر اب شرمندہ بھی ہورہا تھا۔

"تمہیں سوری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا غصہ فطری تھا۔ بہت زیادہ پریشانی میں انسان اس طرح ری ایکٹ کرجاتا ہے۔ تم میرے حالات سے واقف نہیں تھے اس لیے تھوڑا سخت بول گئے۔ فکر مت کرو، میں نے قطعی برا نہیں مانا۔" وہ ویسے بھی عام طور پر نرمی سے ہی بات کرتی تھی اور اس وقت تو اس کے لہجے کی نرمی بہت ہی زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ وہ سکون جو اس نے اپنی انوکھی نماز سے حاصل کیا تھا، اس کی آواز اور چہرے کے تاثرات سے چھلکا پڑ رہا تھا۔ خاص طور پر گفتگو کے اختتام پر اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ دوڑی تھی، اس نے تو اس کے چہرے کو بالکل ہی الوہی سا تاثر دے دیا تھا۔ اسلم مبہوت سا اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ اسے اس کیفیت سے مقصود کی آواز نے نکالا۔ وہ اس کا نام لے کر اسے پکار رہا تھا۔ وہ اور اس کا باپ حامد راؤ، ماہ بانو کی تلاش میں مخالف سمت میں گئے تھے اور شاید ناکام ہونے کے بعد واپس پلٹ آئے تھے۔ مقصود کی آواز سن کر وہ تیزی سے پلٹا۔

"کہو بھائی، تمہیں کامیابی ملی یا نہیں؟ میں اور ابا تو کافی دور تک دیکھ آئے ہیں۔ ابا جی تو اور بھی آگے جانا چاہتے تھے لیکن میں نے ان سے کہا کہ ہوسکتا ہے بھائی اسلم کو بھابی جی مل گئی ہوں اور وہ لوگ ہماری راہ دیکھ رہے ہوں اس لیے خوامخواہ اِدھر اُدھر بھٹکنے سے بہتر ہے کہ پہلے یہاں کا حال معلوم کرلیں۔" اس سے سامنا ہوتے ہی مقصود نے بولنا شروع کردیا۔

"تم نے اچھا کیا۔ تمہاری بھابی جی مل گئی ہے۔ وہ اس طرف آڑ میں ہوکر بیٹھی ہوئی تھی۔ اتفاق سے آنکھ لگ گئی اسی لیے اسے ہم لوگوں کے آنے کا پتا نہیں چل سکا۔" اسلم نے اسے اطلاع دی۔ ماہ بانو جان بوجھ کر اس کے ساتھ یہاں تک نہیں آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اسلم اس کے لیے زنانہ لباس کا بندوبست کرنے گیا تھا اور اس کی کسی کے ساتھ وہاں آمد کا مطلب تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے اس لیے اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ چست جینز اور ٹی شرٹ میں کسی کے سامنے آئے۔ وہ اپنی جگہ رک کر کپڑوں کا انتظار کررہی تھی اسی لیے اسلم اور مقصود کے درمیان سوال و جواب کی یہ نوبت پیش آئی۔ بہ صورتِ دیگر مقصود خود اسے دیکھ لیتا تو کسی سوال کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

"چلو یہ تو اچھی خبر ہے۔ تم بھابی جی کو یہ جوڑا پہنچاؤ، تب تک میں ابا جی کو دیکھتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ ہی واپس پلٹے تھے لیکن یہاں تک سیدھے آنے کے بجائے اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے میں مصروف ہوگئے اس لیے یہاں نظر نہیں آرہے۔" اسلم کے ہاتھ میں اپنی بیوی کے لباس والا تھیلا تھما کر مقصود وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اسلم بھی اس طرف پلٹ گیا جہاں ماہ بانو موجود تھی۔ اسے تھیلا تھمانے کے بعد وہ خود اسی پہلے والی جگہ پر آکر مقصود اور حامد راؤ کا انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد وہ دونوں وہاں آتے نظر آئے۔ اسی وقت ماہ بانو بھی لباس تبدیل کرکے وہاں پہنچ گئی۔ مقصود کی بیوی انیلا کا لباس لمبائی کے اعتبار سے اسے بالکل ٹھیک آیا تھا البتہ چوڑائی زیادہ ہونے کی وجہ سے قمیص ڈھیلی ہورہی تھی جس سے یہ بھی ثابت تھا کہ انیلا قدوقامت میں تقریباً ماہ بانو کے برابر ہی ہے لیکن اس کا جسم ذرا فربہ ہے۔

ماہ بانو نے لباس تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ انیلا کی چادر بھی اوڑھ لی تھی۔ میرون رنگ کی رنگ برنگے دھاگوں سے کڑھی وہ چادر جس میں جابجا ننھے ننھے شیشے بھی ایک خاص ترتیب سے لگے ہوئے تھے، اس پر خوب جچ رہی تھی۔ اسلم نے اپنے دل میں اعتراف کیا کہ کہ اگر مغربی لباس میں ماہ بانو کا حسن آنچ دے رہا تھا تو اس بڑی سی چادر کے ہالے نے اسے جو تقدس عطا کیا تھا، اس سے اس کی خوب صورتی میں چار چاند لگ گئے تھے۔ اس کا مغربی انداز اگر اسے شعلہ جوالہ بنا گیا تھا تو خالص مشرقی پہناوے نے چاندنی کی سی ٹھنڈک اور سنہری پن عطا کردیا تھا۔

"السلام علیکم چاچا جی!" حامد راؤ کو دیکھ کر وہ فوراً آگے بڑھی اور اسے سلام کرنے کے ساتھ ہی اس کے سامنے سر بھی جھکا دیا۔

"جیتی رہ دھی رانی!" حامد راؤ نے فوراً ہی اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی پھر مزید بولا۔ "آج سے تو بھی میری دھی ہی ہے۔ میں نے تجھے اپنی بہو کی چادر صرف اوڑھنے کے لیے نہیں دی ہے بلکہ اس چادر کو اوڑھتے ہی تو بھی میری ذمے داری ہوگئی ہے۔ زندگی میں جب بھی کوئی ضرورت پڑے اپنے چاچے کو آواز دے کر دیکھ لینا۔ ہاتھ پیروں سے سلامت ہوتے ہوئے میں کبھی تیری مدد کرنے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

"شکریہ چاچا جی! آپ نے مجھے اپنا سمجھ کر بڑا مان دیا۔" ماہ بانو کی آواز بھرّا گئی۔

"جھلی نہ ہو تو۔۔۔ ایک طرف مجھے چاچا جی بھی کہتی ہے اور پھر غیروں کی طرح شکریہ بھی ادا کرتی ہے۔ دھی کے منہ سے شکریے کا لفظ سننا ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ الٹا تکلیف ہوتی ہے۔" حامد راؤ نے اسے محبت سے جھڑکا جس پر وہ دھیرے سے مسکرا کر رہ گئی۔

"میرے خیال میں اب گھر چلتے ہیں ابا جی! باقی باتیں آپ لوگ وہاں پہنچ کر کر لیجیے گا۔" مقصود نے انہیں ٹوک کر وقت کی نزاکت کا احساس دلایا تو ان کا مختصر سا قافلہ چل پڑا۔ وہاں سے روانہ ہوتے ہی ماہ بانو نے چادر کا پلو اس طرح منہ پر ڈال لیا تھا کہ اس کا آدھا چہرہ چھپ گیا تھا۔ پہاڑی سلسلے سے نکل کر گاؤں کے آباد حصے تک انہوں نے خاموشی سے سفر طے کیا۔ وہ گاؤں کی حدود میں پہنچے تو توقع کے مطابق وہاں معمول کی چہل پہل شروع ہوچکی تھی اور لوگ اپنے کاموں کے سلسلے میں اِدھر اُدھر آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ کئی نظریں ان کی طرف بھی اٹھیں۔ ان نظروں میں حیرت و تجسس تھا۔ آخر ایک موڑ پر ایک ادھیڑ عمر آدمی ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"کی حال ہے راؤ صاحب! سویرے سویرے کدھر سے آرہے ہو؟" اس شخص نے ماہ بانو اور اسلم کے بارے میں براہِ راست سوال کرنے کے بجائے حامد راؤ سے بے تکلفانہ انداز میں خیریت دریافت کی البتہ اس کی نظریں مسلسل اپنے پنڈ میں نظر آنے والی دو اجنبی شکلوں کا طواف کر رہی تھیں۔

"سب خیر ہے شریف صاحب! شہر سے یہ پروہنے آئے ہوئے تھے۔ انہیں پہاڑ دیکھنے کا شوق چڑھا تو میں اور پتر مقصود منہ اندھیرے انہیں ادھر لے گئے۔ انہیں سیر کرا کر ادھر ہی سے آرہے ہیں۔"

حامد راؤ نے ایک ایسا معقول جواب دیا جسے سن کر شریف کے نام سے مخاطب کیے جانے والے شخص کے پاس مزید سوال جواب کی گنجائش نہیں رہی ورنہ یقینی طور پر اسلم کا حلیہ جوڑے سے فرار ہونے کے بعد پہاڑی سلسلے میں بھٹکتے رہنے کی وجہ سے بہت زیادہ خراب ہوگیا تھا، اس کے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا کررہا ہوگا۔ لیکن مہمان کے بارے میں اس قسم کا استفسار اس کی بے عزتی تصور کیا جاتا اس لیے اس نے تجسس کے باوجود کچھ پوچھنے سے گریز کیا اور ایک خوش دلانہ مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے اسلم کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "تسی راؤ صاحب دے پروہنے ہو تو سمجھو سارے پنڈ دے پروہنے ہو۔ جی بھر کر ادھر کی سیریں کرو۔ کھاؤ پیو۔ میں راؤ صاحب نال درخواست کروں گا کہ اپنے پروہنوں نال ایک وقت کی روٹی میرے گھر پر بھی کھائیں۔" اسلم جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر بس مسکراتا رہا۔ اس بندے سے حامد راؤ کے تعلقات کس نوعیت کے ہیں، اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی دعوت کو قبول یا رد کرنے کا فیصلہ کرسکتا۔ ویسے بھی وہ یہاں دعوتیں کھانے نہیں آیا تھا۔ یہ تو بس ایک اتفاق ہی تھا کہ قسمت اسے تاپلی والا لے آئی تھی اور یہاں کچھ مہربان میزبان میسر آگئے تھے لیکن وہ ان میزبانوں سے زیادہ خاطر مدارات کروانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اسے جلد از جلد یہاں سے نکل کر کسی دوسرے محفوظ مقام کی طرف جانا تھا جہاں وہ ماہ بانو کے ساتھ اپنی نئی زندگی کا آغاز کرسکے۔

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM

"مہلت ملی تو آپ کی دعوت ضرور قبول کریں گے شریف صاحب! ابھی آپ اجازت دیں۔ گھر پر ناشتا تیار ہو گا اور ہمارا انتظار ہو رہا ہو گا۔" حامد راؤ نے بہت خوب صورتی سے اس کی دعوت ٹالنے کے ساتھ ساتھ فوری طور پر جان بھی چھڑانے کا بندوبست کیا۔ وہ یہ جان کر کہ ابھی ان لوگوں کو ناشتا کرنا ہے، فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گیا۔

"یہ بندہ پیر سائیں کے عقیدت مندوں میں سے ایک ہے۔ اگر اسے بھنک بھی پڑ گئی ہوتی کہ تم ایک ایسے شخص کی طرف سے بھیجے گئے ہو جو پیر سائیں کی خانقاہ میں آگ لگانے کا ذمے دار ہے تو اس کا رویہ بالکل مختلف ہوتا۔" شریف کی روانگی کے بعد ان لوگوں نے قدم آگے بڑھائے تو مقصود نے سرگوشی میں اسلم کو بتایا۔

"دیکھنے میں تو یہ خاصا معقول آدمی لگتا ہے پھر پیر سائیں جیسے جعلساز کے چکر میں کیسے پڑ گیا؟" اسلم نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ان جعلی پیروں فقیروں کا یہی تو کمال ہوتا ہے کہ یہ اپنے داؤ پیچ سے معقول سے معقول آدمی کی عقل بھی ماؤف کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور پھر شریف صاحب کا ہی کیا ذکر، یہاں تو کبھی کسی نے پیر سائیں کو غلط آدمی نہیں سمجھا۔ خانقاہ کو آگ لگائے جانے کے واقعے پر تقریباً پورا پنڈ ہی سخت مشتعل ہے۔ سب ہی چاہتے ہیں کہ مجرم کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔ خانقاہ کے جلنے کے بعد ہر ایک نے پیر سائیں کو اپنے گھر قیام کی دعوت دی تھی لیکن قسمت شریف صاحب کی جاگی۔ اب پیر سائیں انہی کے گھر پر رہ رہے ہیں اور یہ خانقاہ کی تعمیر و مرمت کے سلسلے میں چندہ جمع کرنے کی مہم میں مصروف ہیں۔ کل اباجی کے پاس بھی آئے تھے اور دس ہزار کا چندہ وصول کر کے گئے ہیں۔" مقصود نے اس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ دیگر معلومات بھی فراہم کیں جنہیں سن کر اسے خیال آیا کہ شفقت راؤ کی ساری دوڑ دھوپ بیکار گئی۔ اس نے پیر سائیں کا قلع قمع کرنے کی نیت سے خانقاہ میں آگ لگائی تھی لیکن پیر سائیں زندہ تھا اور اس کی خانقاہ بھی دوبارہ تعمیر کی جانے والی تھی۔ ان خیالات میں کھو کے باقی کا راستہ بھی طے ہو گیا اور وہ حامد راؤ کے مکان پر پہنچ گئے۔ گھر کی فضا میں چکراتی پراٹھوں کی خوشبو نے انہیں بتایا کہ حامد راؤ نے ناشتے کی تیاری کے سلسلے میں شریف سے غلط بیانی نہیں کی تھی، وہاں واقعی ان کے ناشتے کا بندوبست ہو رہا تھا۔

"تم لوگ نہا دھو کر اپنا حلیہ درست کر لو تو پھر ناشتا لگواتے ہیں۔" حامد راؤ نے پہلے اس سے کہا اور پھر فوراً ہی مقصود کی طرف رخ کر لیا۔

"بہن کو اندر زنان خانے میں پہنچا دو پتر۔۔۔ اور اسلم کے لیے اپنا کوئی جوڑا لے آؤ۔ تم دونوں کا ناپ الگ ہے لیکن اپنے کپڑے دھل کر سوکھنے تک اسلم کے لیے تمہارے کپڑوں پر گزارا کرنا مجبوری ہے۔" مقصود نے باپ کے حکم پر فرماں برداری سے عمل کیا۔ ماہ بانو کو اندر زنان خانے میں پہنچا دیا گیا جبکہ اسلم کی مقصود نے شلوار قمیص پر مشتمل لباس سمیت ایک غسل خانے کی طرف راہنمائی کر دی۔ وہ دیہات میں موجود ایک گھر کا غسل خانہ تھا لیکن مکینوں کی خوش حالی اور شہر آمدورفت کی وجہ سے کسی شہری غسل خانے جیسی جدت لیے ہوئے تھا۔ اسلم کو بہت عرصے بعد اس قسم کی کسی جگہ پر غسل کرنے کی عیاشی میسر آئی تھی چنانچہ اس نے دل بھر کر غسل کیا۔

غسل کرنے سے اس کی آدھی تھکن کافور ہو گئی اور جسم ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔ ایک فرحت بخش احساس کے ساتھ اس نے مقصود کا فراہم کردہ شلوار قمیص زیب تن کیا اور اپنے کپڑے وہیں ایک کھونٹی پر ٹنگے چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ کپڑوں کی تبدیلی کے ساتھ اس نے اپنے لباس میں موجود سامان بھی منتقل کر لیا تھا جس میں سب سے اہم اس کا پستول اور پنڈلی پر بندھا رہنے والا خنجر تھا۔ اگرچہ اپنے طور پر وہ مجرمانہ زندگی کو خیرباد کہہ کر ایک شریفانہ زندگی گزارنے جا رہا تھا لیکن اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ اس جیسے لوگوں کے لیے شریفانہ زندگی کا آغاز اتنا آسان ثابت نہیں ہوتا بلکہ قدم قدم پر مشکلوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کسی بھی غیر معمولی صورت حال سے نمٹنے کے لیے وہ مسلح رہنا ضروری سمجھتا تھا اس لیے اب تک مسلسل اپنے اسلحے کی حفاظت کا خیال رکھتا رہا تھا۔ ایک رائفل بھی ان کی تحویل میں تھی جسے وہ پچھلی بار اکیلے حامد راؤ کے گھر کی طرف آتے ہوئے ماہ بانو کے پاس چھوڑ کر آیا تھا اور بعد میں ماہ بانو اسے اپنی بڑی سی چادر میں چھپا کر یہاں لے آئی تھی۔ وہ رائفل اب بھی ماہ بانو کے پاس موجود تھی۔

اس نے غسل خانے سے قدم باہر رکھا تو مقصود کو اپنا منتظر پایا۔ وہ اسے اپنی معیت میں لے کر ایک بار پھر اس بیٹھک میں پہنچ گیا جہاں منہ اندھیرے پہنچنے پر اسے بٹھایا گیا تھا۔ وہاں میز پر ناشتے کے لوازمات سجے ہوئے تھے اور ان سے اٹھتی اشتہا انگیز خوشبو صبر کا پیمانہ لبریز کر رہی تھی۔ اس نے باقاعدہ اپنے منہ میں پانی آتا ہوا محسوس کیا اور دل ہی دل میں ہنس دیا۔ مشکل سے چند گھنٹے ہی گزرے تھے جب اسی بیٹھک میں اس کے سامنے کھانے پینے کے لوازمات رکھے گئے تھے لیکن اس نے کسی شے کو چھونا تو درکنار نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا کیونکہ اس وقت اسے اپنی ہر ضرورت سے بڑھ کر ماہ بانو کی فکر دامن گیر تھی۔ بیٹھک میں پہلے سے موجود حامد راؤ نے اسے دیکھ کر کھانا شروع کرنے کی دعوت دی تو اس بار وہ بلاتکلف کھانے پینے میں مصروف ہو گیا اور ایک ایک شے سے انصاف کرنے لگا۔ شہری اور دیہاتی امتزاج کا یہ ناشتا بے حد لذیذ تھا اور اسے اس لیے اور بھی زیادہ مزے کا لگا کہ وہ ایک طویل عرصے بعد کسی گھر کی فضا میں بیٹھ کر کھانے پینے کا شغل کر رہا تھا۔ شکم سیر ہو کر اس نے کھانے کی چیزوں سے ہاتھ کھینچا تو مقصود نے تھرماس سے گرما گرم چائے کا بڑا سا کپ لبالب بھر کر اسے تھما دیا۔ پیٹ بھرا ہوا ہونے کے باوجود وہ اس بھاپ اڑاتی، خوشبودار چائے کے کپ کے لیے ہاتھ بڑھنے سے نہ روک سکا۔ مقصود نے خود اپنے لیے بھی اسی طرح کا ایک کپ تیار کیا تھا البتہ حامد راؤ اس شغل میں ان کے ساتھ شامل نہیں ہوا تھا۔ وہ کافی سنجیدہ اور متفکر نظر آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے راؤ صاحب! آپ کچھ چپ چپ سے ہیں؟" اس نے چائے کا ایک گھونٹ اندر اتار کر ان سے دریافت کیا۔

"حالات ہی کچھ اس طرح سے سامنے آئے ہیں کہ دل و دماغ الجھ کر رہ گئے ہیں۔ تم نے مجھے شفقت کے بارے میں جو کچھ بتایا، اسے سن کر بھی یقین کرنے کا دل نہیں چاہ رہا لیکن یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ بس میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شفقت نے خانقاہ میں آگ لگا کر شدید حماقت اور جذباتیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہم دونوں بھائی بھی ہیں، سمدھی بھی اور سب سے بڑھ کر بچپن کے دوست بھی۔ اگر اسے کسی طرح سن گن مل گئی تھی کہ صداقت کی موت کا تانا بانا خانقاہ سے جڑا ہوا ہے اور پیر سائیں اس کا مجرم ہے تو اسے کسی بھی اقدام سے پہلے مجھ سے مشورہ تو کر لینا چاہیے تھا۔ لیکن مشورہ کرنا تو درکنار اس نے مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔" حقائق سامنے آنے کے بعد سے اب تک کا وقت مصروفیت میں گزرا تھا اس لیے حامد راؤ کو اپنے جذبات کے اظہار کا موقع نہیں ملا تھا، اب موقع ملتے ہی اس نے اپنے دل میں پیدا ہونے والے شکوے اور رنجیدگی کا اظہار کر دیا۔

"ممکن ہے کہ وہ اس معاملے میں آپ کو ملوث کر کے آپ لوگوں کو کسی مشکل میں نہ ڈالنا چاہتے ہوں پھر ان کی ذہنی کیفیت کے بارے میں بھی تو سوچیے۔ جس شخص کا اکلوتا ہونہار بیٹا اس سے چھن گیا ہو، اس کے غم و غصے کی تو کوئی انتہا ہی نہ رہی ہو گی۔ ہو سکتا ہے غصے میں انہیں آپ کی مدد لینے کا خیال ہی نہ آیا ہو۔۔۔ یا آیا ہو تو وہ یہ سوچ کر آپ سے ذکر کرنے سے گریزاں رہے ہوں کہ آپ انہیں ایسا کچھ کرنے سے روکنے کی کوشش کریں گے جبکہ وہ اپنے طور پر مجرم کو سزا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔" اس نے حامد راؤ کی تسلی و تشفی کے لیے حالات کا ہر رخ اس کے سامنے رکھ دیا۔

"لیکن افسوس تو یہی ہے کہ اس کی کارروائی کے نتیجے میں اصل مجرموں کا بال بھی بیکا نہیں ہوا اور کسی دوسرے پنڈ سے علاج کے لیے آیا ہوا ایک معذور شخص آگ میں جھلس کر مر گیا۔" حامد راؤ کی افسردگی سے دی ہوئی یہ اطلاع سن کر خود اسے بھی دھچکا لگا۔

"وہ کیسے؟ شفقت صاحب کا تو یہی کہنا تھا کہ رات کے وقت خانقاہ پر پیر سائیں اور اس کے چیلوں چانٹوں کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔"

"اس نے درست کہا تھا لیکن اتفاق سے جو آدمی آگ میں جھلس کر مر گیا، اس کے یہاں موجود رشتے داروں نے اس کے ساتھ آئی ہوئی اس کی ماں کو تو اپنے گھر پر ٹھہرا لیا تھا لیکن جگہ کی تنگی کی وجہ سے اسے رکھنے سے معذرت کر لی تھی۔ اس آدمی کی ماں کی درخواست پر پیر سائیں نے اسے خانقاہ میں رکھنے کی خصوصی اجازت دی تھی۔" حامد راؤ نے بتایا۔

"اس واقعے میں پیر سائیں اور اس کے چیلوں کو کچھ نہیں ہوا؟" اسلم نے دریافت کیا۔

"نہیں، وہ سب بخیریت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اصل میں آگ لگتے ہی ایک مجاور کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے شور مچایا تو سب جاگ گئے اور بحفاظت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ خانقاہ میں ٹھہرے ہوئے اس معذور آدمی کا افراتفری میں کسی کو خیال ہی نہیں آیا اور ظاہر ہے وہ بے چارہ خود تو وہاں سے نکلنے کا اہل نہیں تھا اس لیے اندر ہی پھنسے رہنے کی وجہ سے جھلس کر مر گیا۔" حامد راؤ نے افسردگی سے بتایا۔ یقیناً وہ اس خیال سے رنجیدہ تھا کہ اس کے جگری دوست کے ہاتھوں ایک بے بس آدمی موت کا شکار ہو گیا اور اس نے جنہیں جہنم واصل کرنے کے لیے یہ سارا کھڑاگ کیا تھا وہ اب بھی دندناتے پھر رہے تھے۔

"آگ لگنے کے واقعے کے بعد پولیس نے اس معاملے کی تفتیش تو کی ہو گی۔ کیا انہیں خانقاہ کی جلی ہوئی

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM

عمارت کا جائزہ لینے کے دوران وہاں ایسی کوئی علامت نہیں ملی جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ وہاں منشیات کا دھندا بھی کیا جاتا ہے؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" حامد راؤ نے شانے اچکائے۔ "علاقے کا تھانے دار خود پیر سائیں کا معتقد ہے اور اکثر خانقاہ میں حاضری دیتا رہتا ہے۔ اب معلوم نہیں یہ سچ مچ کی عقیدت مندی ہے یا وہ زبان بندی کے لیے پیر سائیں سے بھتا وصول کرتا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں اس کے زبان کھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ایک دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پولیس کی تفتیش شروع ہونے سے قبل خود پیر سائیں کے آدمی خانقاہ میں داخل ہو گئے ہوں اور انہوں نے سارے شواہد مٹا ڈالے ہوں۔ فی الحال تو صورتِ حال یہ ہے کہ پیر سائیں اور اس کے مریدوں کے ساتھ پورے پنڈ کی ہمدردیاں موجود ہیں اور وہ دل و جان سے اس شخص کو سزا دینے کے خواہش مند ہیں جس نے ان کے خیال میں یہ گستاخانہ حرکت کی۔ حقیقت نہ تو کوئی جانتا ہے اور نہ ہی سننا پسند کرے گا۔ شفقت سے بے پناہ قربت اور انسیت کے باوجود میں خود اس کے اقدام کی مذمت کرتا ہوں۔ اسے چاہیے تھا کہ اس معاملے کو پولیس کے سامنے رکھتا اور پھر وہ لوگ قانون کے مطابق جو بھی کارروائی کرتے، وہ سب کے حق میں بہتر ہوتی۔" حامد راؤ نے اس کے سوال کے جواب میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"لیکن ابھی آپ نے خود ہی تو بتایا تھا کہ تھانے دار خود پیر سائیں کا معتقد ہے۔ شفقت صاحب بھی یہ بات جانتے ہوں گے اس لیے انہوں نے تھانے کا رخ ہی نہیں کیا۔" اسلم نے فوراً اپنی رائے پیش کرتے ہوئے شفقت راؤ کی حمایت کی۔

"شاید یہی بات ہو لیکن میری اب بھی رائے ہے کہ شفقت کو انسانوں سمیت خانقاہ جلانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے تھی۔" حامد راؤ اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا اور اس پوائنٹ پر مزید بات کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ گفتگو میں دخل دیے بغیر سب کچھ چپ چاپ سنتے مقصود کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے بولا۔

"دیکھ پتر! ابھی تک کوئی جھوٹے برتن اٹھانے کے لیے نہیں آیا۔ کہیں تیری ماں اور اپنا مہمان کو بھول تو نہیں گئے؟"

"جی اچھا ابا جی۔" مقصود فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی سعادت مندی قابلِ تعریف تھی۔ جوان اور شادی شدہ مرد ہوتے ہوئے بھی وہ باپ کے ساتھ کچھ اس طرح سے پیش آتا تھا کہ اس پر کسی نمک خوار ملازم کا گمان ہوتا تھا۔ باپ کا حکم ملنے کے بعد وہ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ دروازے کے پٹ کھل گئے اور ایک دبلی پتلی، درمیانی قامت کی قبول صورت عورت اندر داخل ہوئی۔

"مجھے اماں بی بی نے برتن لانے کے لیے بھیجا ہے۔"

اس نے مقصود کو بتایا تو وہ اس کا راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو گیا۔ عورت نے اندر آتے ہی تیزی سے برتن سمیٹنا شروع کر دیے۔ اس کام کو نمٹا کر جب اس نے چائے کا خالی کپ اسلم کے سامنے سے اٹھایا تو اسے احساس ہوا کہ عورت کی انگلیاں کانپ رہی ہیں اور وہ کچھ عجلت کا شکار نظر آتی ہے۔ فوری طور پر اسے اس کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آئی۔ وہ حامد راؤ کی آواز پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میرے خیال میں اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ لمبی نیند لے کر اٹھو گے تو ساری تھکن اتر جائے گی۔" حامد راؤ اس سے کہہ رہا تھا اور وہ اس کی رائے سے سو فیصد متفق تھا۔ طویل بھاگ دوڑ کے بعد میسر آنے والے غسل اور بھرپور ناشتے نے طبیعت پر گہرا اثر ڈالا تھا اور اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اسے آمادہ پا کر مقصود اسے اپنے ہمراہ بیٹھک سے باہر لے گیا اور ایک آرام دہ کمرے تک پہنچا دیا۔ کمرے میں ایک ڈبل بیڈ پڑا ہوا تھا جس پر خوب صورت پرنٹ والی صاف ستھری بیڈ شیٹ بچھی ہوئی تھی۔

"یہاں تم دل بھر کر بغیر ڈسٹرب ہوئے آرام کر سکتے ہو۔ پانی اور ضرورت کی دیگر چھوٹی موٹی چیزیں یہاں موجود ہیں۔ مزید کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ بھی مجھے بتا سکتے ہو۔" اسے کمرا دکھا کر مقصود نے فراخ دلانہ پیشکش کی۔

"اس وقت تو نیند کے علاوہ کسی شے کی طلب نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو مقصود بھی خوش دلی سے مسکرا دیا اور مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی اسلم نے بستر سنبھال لیا۔ نرم تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موندتے ہی نیند نے اس کے دماغ پر یلغار کر دی۔ لیکن نیند کے ہاتھوں بے بس ہوتے ہوئے بھی اس کے ذہن کا ایک گوشہ اضطراب کا شکار تھا۔ کوئی بات ایسی تھی جو مسلسل اس کے دماغ میں کھٹک رہی تھی لیکن اس وقت وہ اپنے اس احساس کا تجزیہ کرنے کے قابل نہیں تھا چنانچہ منٹوں میں گہری نیند میں ڈوب کر اپنے اردگرد سے غافل ہو گیا۔

☆☆☆

"ہاں بھئی مشابرم خان! کل جو بندہ تم پیر آباد سے پکڑ

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرلائے تھے اس نے اپنے اور اپنے بچے کے بارے میں کچھ اگلا یا نہیں؟" دفتر پہنچ کر چند ضروری نوعیت کے کام نمٹاتے ہوئے اس نے مشابرم خان کو طلب کیا اور اس سے پوچھا۔

"بہت ڈھیٹ بندہ ہے سر! بڑی مار کھانے کے بعد اب تک صرف اپنا نام بتایا ہے اور یہ تسلیم کیا ہے کہ وہ شہزادی سے مردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے آیا ہے لیکن اپنے علاقے یا پیر کا اتا پتا دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ میں نے بھی ضرورت سے زیادہ سختی اس لیے نہیں کی کہ آگے اگر آپ بندہ پولیس کے حوالے کرنا چاہو تو اس کے جسم پر تارچر کے نشان دیکھ کر مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔" مشابرم خان نے جواب دیا۔

"ہوں۔۔۔" شہریار نے ایک پُرخیال ہنکارا بھرا۔ وہ مشابرم خان کی احتیاط پسندی کو سمجھتا تھا۔ بالے کی بیوی شہزادی اسپتال میں زیرِعلاج تھی اور اس کا کیس پولیس کے علم میں تھا۔ اصولاً تو اسے چاہیے تھا کہ پیرآباد سے پکڑے جانے والے بندے کو پولیس والوں کے حوالے کرکے خود بری الذمہ ہو جاتا لیکن اسے اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ یہ کوئی بہت ہی خاص معاملہ ہے جسے پولیس کی سرسری تفتیش کی نذر کرکے اطمینان سے نہیں بیٹھا جاسکتا۔ ضرورت پڑنے پر وہ پولیس کو بھی اس معاملے میں شامل کرلیتا لیکن فی الحال یہ چاہتا تھا کہ خود بھی لاعلم نہ رہے کیونکہ اس کے باعلم ہونے کی صورت میں پولیس اپنی روایات کے مطابق کاہلی کا مظاہرہ کرنے یا کسی مک مکا کی پالیسی پر عمل کرنے سے گریز کرتی۔ بہ صورتِ دیگر کوئی بہت ہی گھناؤنا دھندا جاری و ساری رہ سکتا تھا۔

"نام کیا بتایا ہے اس نے اپنا؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے دریافت کیا۔

"کالے میاں نام بتاتا ہے اپنا۔ اس کے پاس سے ایک موبائل فون اور بٹوا ملا ہے۔ بٹوے میں صرف رقم ہے۔ شناختی کارڈ وغیرہ موجود نہیں ہے جس سے اس کے بیان کی تصدیق ہوسکے۔"

"کل سے اب تک اس کے موبائل فون پر کوئی کال وصول ہوئی ہے یا نہیں؟" کالے میاں کے پاس موبائل کی موجودگی کا سن کر وہ چونکا اور پوچھا۔

"نہیں، کوئی کال نہیں آئی اور اب تو اس کے موبائل کی بیٹری بھی ڈاؤن ہوگئی ہے۔ اگر کوئی کال کربھی رہا ہوگا تو اسے کامیابی نہیں ہورہی ہوگی۔" مشابرم خان نے بتایا۔

"تم اس کے موبائل کی بیٹری چارج کرواؤ پھر آدھے گھنٹے بعد مجھ سے آکر ملو۔ میں خود تمہارے ساتھ کالے میاں کی مزاج پرسی کے لیے چلوں گا۔" اس نے حکم دیا جسے سن کر مشابرم خان فوراً ہی واپس پلٹ گیا۔ اس کے جاتے ہی شہریار نے بھی اپنی توجہ زیرِمطالعہ فائل کی طرف مبذول کرلی۔ اس کے لیے اس فائل کا فوری مطالعہ کرنا ضروری نہیں تھا اور وہ تھوڑا سا انتظار بھی کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ موبائل کی بیٹری چارج ہونے کے بعد اس پر کوئی نہ کوئی کال ضرور موصول ہوگی۔۔۔ کیونکہ اس کے پاس موبائل کی موجودگی کا مطلب تھا کہ اسے جن لوگوں نے بھیجا ہے، وہ خود بھی اس سہولت سے لیس ہوں گے اور اپنے آدمی کی بروقت واپسی نہ ہونے پر تشویش میں مبتلا ہوکر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اپنے اس قیاس کی بنیاد پر وہ موبائل فون کے کارآمد ہونے کا منتظر تھا۔ آدھے گھنٹے کا وہ دورانیہ تیزی سے ختم ہوگیا اور مشابرم خان حسبِ ہدایت اس کے پاس آموجود ہوا۔

"چلو چل کر اس سورما کو دیکھتے ہیں۔" وہ اپنی سیٹ چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

"کالے میاں کا موبائل کہاں ہے؟" دفتر سے باہر نکلتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔

"میرے پاس ہے سر۔" مشابرم خان نے اپنی بائیں جانب کی جیب تھپتھپائی تو اس نے اظہارِاطمینان کے لیے اپنا سر ہلا دیا۔ دفتر کی عمارت سے نکل کر وہ دونوں گاڑی میں سوار ہوئے اور مشابرم خان نے تین چار منٹ میں ہی اسے اس مکان تک پہنچا دیا جس میں قیدی کو رکھا گیا تھا۔ یہ ایک ایسا خالی مکان تھا جسے محکمے کے ملازمین کو الاٹ کیا جاتا تھا۔ اتفاق سے سیوریج کی گڑبڑ اور بجلی کی خراب وائرنگ کی وجہ سے فی الحال یہ مکان کسی کے زیرِاستعمال نہیں تھا اور ان دونوں مسائل کے حل تک اسے خالی ہی رہنا تھا اس لیے اس نے پکڑے جانے والے شخص کو اس مکان میں رکھنے کی ہدایت دی تھی۔

مکان کے سامنے گاڑی روکنے کے بعد مشابرم خان پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور شہریار کے اترنے کے لیے عقبی نشست کے ساتھ والا دروازہ کھولا۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد دروازہ بند کرکے وہ مکان کی طرف دوڑا اور اس پر لگے تالے کو چابی کی مدد سے کھول دیا۔ اس کی یہ پھرتی اور چابک دستی قابلِ رشک تھی۔ غیر معمولی حالات ہونے کے باوجود وہ ڈیوٹی کو نہیں بھولا تھا ورنہ شہریار سے اس کی جتنی ذہنی ہم آہنگی ہوچکی تھی اور وہ اس کا جس قدر ہم راز بن چکا تھا، وہ ان کے درمیان تکلف کی دیواریں گرانے کے لیے کافی تھا۔ لیکن مشابرم خان خود ایک اصول پرست اور کھرا آدمی تھا جس نے اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی اور افسر کو افسر ہی سمجھتا تھا۔ مکان کا دروازہ کھلنے کے بعد وہ دونوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ مختصر سے دھول اڑاتے برآمدے کے بعد ایک دروازہ اور تھا جس پر بھی تالا لگا ہوا تھا۔ مشابرم خان نے وہ تالا بھی کھول دیا اور اسے اپنی معیت میں ایک کمرے تک لے گیا۔ اس کمرے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں چھت سے ذرا نیچے موجود ایک چھوٹے سے روشن دان کے سوا کوئی کھڑکی وغیرہ موجود نہیں تھی اور کمرے کا دروازہ باہر سے بند کردینے کے بعد باہر نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے دیکھا کہ مشابرم خان نے کالے میاں کے ہاتھ پیر رسی کی مدد سے نہایت مضبوطی سے باندھ رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے پٹی بھی باندھ دی گئی تھی۔ یہ سارا بندوبست یقیناً اس لیے تھا کہ کہیں وہ شور مچا کر لوگوں کو اس طرف متوجہ نہ کرلے۔ مکان کے آبادی میں ہونے کی وجہ سے یہ ساری احتیاطی تدابیر ضروری بھی تھیں۔ شہریار نے دیکھا کہ کمرے میں بیٹری سے چلنے والا ایک ٹیپ ریکارڈر بھی موجود ہے۔ دھول مٹی سے اٹے اس کمرے میں چمکتے دمکتے ٹیپ ریکارڈر کی موجودگی کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ اس نے استفسار طلب نظروں سے مشابرم خان کو دیکھا۔

"اس سے پوچھ گچھ کرتے وقت ہم نے یہ ٹیپ ریکارڈر بلند آواز سے چلا دیا تھا تاکہ اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں باہر نہ جائیں۔" اس نے جواب دیا۔

"اور خالی گھر میں بلند آواز سے چلنے والے گانوں پر کسی کو کوئی تشویش نہیں ہوئی؟" اس نے مشابرم خان کو گھورا۔

"ہوئی تھی۔ مجھ سے ایک آدمی نے پوچھا بھی تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ میں یہ مکان اپنے نام پر الاٹ کروانے والا ہوں اس لیے یہاں کا جائزہ لینے آیا تھا۔ اب اے سی صاحب کو بھی اپنے ساتھ یہاں لاؤں گا تاکہ وہ اس جگہ کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور مرمت وغیرہ کا انتظام کروائیں۔" اس نے فخر سے بتایا اور داد طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"گڈ! یہ تم نے اچھا بہانہ بنایا۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی خفیہ ٹھکانا موجود نہیں ہے جسے ہم اس قسم کی کسی صورتِ حال میں استعمال کرسکیں۔ میں عبدالمنان سے کہوں گا کہ ایسی کوئی جگہ تلاش کرے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ ہمیں اب اس طرح کے کسی ٹھکانے کی ضرورت پڑتی رہے گی۔ قانون کی پاسداری اور احترام دل میں رکھنے کے باوجود مجھے شدت سے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ جس طرح قانون کے محافظ مجرموں کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں، میرے لیے مکمل طور پر قانون کے دائرے میں رہ کر کام کرنا ممکن نہیں ہے۔" وہ خاصا بے بس اور جھنجلایا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ بیوروکریسی کی الجھنوں سے واقف ہونے کے باوجود جب وہ خود اس میدان میں داخل ہوا تھا تو اس کے ذہن میں کچھ اس طرح کے خیالات تھے کہ وہ خود کو ہر طرح سے ایک ایمان دار، امن پسند اور قانون کی حدود میں رہنے والا افسر ثابت کرے گا لیکن مختصر سے عرصے میں اس نے اپنے خیالات کو بکھرتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہاں جس قدر گندگی پھیلی ہوئی ہے، اسے صاف کرنے کے لیے اپنے ہاتھ میلے کیے بغیر کام چلنا ممکن نہیں ہے۔ بس اسے اگر کوئی اطمینان تھا تو یہ کہ وہ اپنے ہاتھ گندگی کو صاف کرنے کے لیے میلے کر رہا تھا، اس کا اس گندگی میں اضافہ کرنے والوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

"اسے ہوش میں لاؤ۔" خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے خاموش کھڑے مشابرم خان کو حکم دیا تو اس نے بے ہوش کالے میاں کے دائیں رخسار پر ایک زناٹے دار تھپڑ جڑ دیا۔ تھپڑ کھاتے ہی اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ یقیناً گہری بے ہوشی میں نہیں تھا اس لیے آنکھ کھلتے ہی اپنے اردگرد کے ماحول کو سمجھنے لگا جس کا اندازہ اس کی آنکھوں سے جھلکتی نفرت سے لگایا جاسکتا تھا۔

"کہو کالے میاں! تم اپنی زبان کھولنے کے لیے تیار ہو یا ہمیں اسے کھلوانے کا کچھ انتظام کرنا پڑے گا؟" شہریار نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا جس کے جواب میں اس نے یوں گردن کو جھٹکا دے کر رخ موڑا جیسے اگر بس میں ہوتا تو اس دھمکی آمیز سوال کے جواب میں اس کے منہ پر تھوک دیتا۔

"او کے۔۔۔ جیسا تم پسند کرو۔ میرے پاس ایسی بہت سی ترکیبیں ہیں جن کے استعمال سے تمہارے جسم پر ایک خراش تک نہیں آئے گی لیکن تم خود کو سچ بولنے پر مجبور پاؤ گے۔" اس نے اپنے لہجے میں سفاکی سموتے ہوئے کہا اور پھر مشابرم خان کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"گاڑی کی ڈکی میں ایک آئرن راڈ اور رسی کا گچھا پڑا ہے، وہ یہاں لے آؤ۔" اس نے حکم دیا تو مشابرم خان

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM

تیزی سے باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دونوں مطلوبہ چیزیں موجود تھیں۔

”ذرا مجھے اس کا موبائل فون تو دینا۔“ کسی قسم کی کارروائی شروع کرنے سے قبل اسے کالے میاں کا موبائل یاد آیا تو وہ مشابرم خان سے بولا۔ اس نے فوراً ہی بائیں جیب سے موبائل نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ وہ موبائل ہاتھ میں لے کر اس کی فون بک چیک کرنے لگا۔ فون بک میں چند ایک ہی نمبر موجود تھے جو مختلف ناموں سے فیڈ کیے گئے تھے اور ان میں ایک نام پیر سائیں کا بھی تھا۔ اس نے پہلے اس نمبر پر کال کرنے کا سوچا پھر ارادہ بدل کر ان کمنگ اور آؤٹ گوئنگ کالز کا ریکارڈ چیک کرنے لگا۔ کالے میاں کے موبائل پر آخری کال واجد کی آئی تھی اور اس کال کو آئے ہوئے بھی تقریباً بیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ خود اس نے چند گھنٹوں کے فرق سے آخری نمبر واجد کا ہی ملایا تھا لیکن ریکارڈ سے ظاہر تھا کہ اس کی واجد سے بات نہیں ہو سکی۔

یہ صورتِ حال ذرا سی عجیب تھی اور یوں لگتا تھا کہ واجد نامی وہ شخص کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے پیر سائیں سے پہلے اسے ہی ٹٹولنے کا فیصلہ کیا اور نمبر ری ڈائل کر دیا لیکن اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری طرف خاموشی تھی اور سرے سے بیل ہی نہیں جا رہی تھی۔ اس نے دو بار مزید کوشش کی لیکن صورتِ حال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے پیر سائیں کا نمبر ڈائل کیا۔ ادھر بھی بالکل ویسی ہی صورتِ حال تھی۔ اسے شدید الجھن محسوس ہوئی۔ نہ جانے یہ کیا راز تھا کہ کسی سے رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ان دونوں کو چھوڑ کر ”کاکا“ کے نام سے محفوظ کیا گیا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے گھنٹی کی آواز سنائی دینے لگی اور پھر تیسری گھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی۔ ریسیو کرنے والی کوئی عورت تھی جس نے شاید اپنی فون اسکرین پر آنے والا نام دیکھ کر براہِ راست ہی بے تکلفی سے گفتگو شروع کر دی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”ہاں کاکے وے پیو، سب چنگا ہے نا؟ خیر نال ڈیوٹی پر پہنچ گئے ہو؟“ عورت کے جملوں سے ظاہر تھا کہ وہ کالے میاں کی بیوی ہے اور اس نے بیوی کا نمبر اپنے بیٹے کے حوالے سے محفوظ کر رکھا ہے۔

”معاف کیجیے گا خاتون میں آپ کا خاوند نہیں ہوں۔“ اس نے یہ بات کہتے ہوئے سامنے موجود کالے میاں کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے وہ عملی طور پر اس کی کارروائی میں کسی قسم کی مداخلت کرنے کا اہل نہیں تھا لیکن سب دیکھ اور سن سکتا تھا۔ شہریار کو اپنی بیوی سے بات کرتا دیکھ کر اس کے چہرے پر تھوڑا سا اضطراب ظاہر ہوا تھا تاہم اس نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”فیر تسی کون بول رہے ہو؟“ عورت کی آواز میں حیرانی اتر آئی۔

”میں آپ کے لیے اجنبی ہوں اور آپ کو آپ کے خاوند کے متعلق ایک اطلاع دینا چاہتا ہوں۔“ اس نے بہت نپے تلے انداز میں گفتگو کو آگے بڑھایا تھا اور جان بوجھ کر کالے میاں کا نام استعمال نہیں کیا تھا کہ مبادا اس کے سامنے بندشوں میں جکڑے شخص نے غلط بیانی سے کام لیا ہو اور اس کا نام کالے میاں نہ ہو۔

”کیسی اطلاع جی؟“ عورت واضح طور پر پریشان محسوس ہونے لگی۔

”مجھے افسوس ہے کہ اطلاع زیادہ اچھی نہیں ہے۔ یہاں نورکوٹ میں آپ کے خاوند کو ایک حادثہ پیش آ گیا ہے اور وہ شدید زخمی حالت میں اسپتال میں داخل ہیں۔“

”ہائے میرے ربا۔۔۔“ عورت نے پریشانی سے یہ کہتے ہوئے شاید اپنے سینے پر ہاتھ بھی رکھا ہوگا۔ ”پر وہ نورکوٹ کیسے پہنچ گئے؟ وہ تو چھٹی گزار کر اپنے سیٹھ کے پاس لاہور گئے تھے۔“ عورت کے وہ جملے خاصے غور طلب تھے۔ اس کی بات سے یہ ظاہر تھا کہ کالے میاں مستقل اپنی بیوی بچوں کے ساتھ نہیں رہتا چنانچہ اس بات کا بھی امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ پیر سائیں کا تعلق اس علاقے سے ہو جہاں اس کی بیوی موجود تھی کیونکہ وہ جس مقصد کے لیے پیرآباد آیا تھا، اس کی تکمیل کے بعد اسے واپس اپنے پیر صاحب کے پاس لوٹنا تھا اور اس کی بیوی کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کسی اور جگہ نوکری کرنے کی وجہ سے گھر سے کافی کافی دنوں تک دور رہتا ہے۔

”دیکھیے خاتون، مجھے آپ کے سوالوں کے جواب نہیں معلوم۔ مجھے آپ کو جو اطلاع دینی تھی، وہ میں دے چکا ہوں۔ اب آپ یہ بتائیں کہ آپ کو نورکوٹ پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا تاکہ آپ خود اپنے خاوند کی دیکھ بھال کر سکیں؟“ اس نے جان بوجھ کر ذرا بے رخی برتی۔

”میں ادھر فیصل آباد میں ہوں۔ ادھر سے آنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ ابھی تو میرے پیو اور بھرا بھی گھر میں نہیں ہیں۔ میں ان کی دکان پر فون کر کے انہیں گھر بلاتی ہوں، فیر آپ کو فون کرتی ہوں۔ مجھے خود تو نورکوٹ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے، آپ میرے بھرا کو اتا پتا سمجھا دینا کہ کالے میاں کس اسپتال میں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے مختصر جواب دے کر سلسلہ منقطع کرنے کے ساتھ ہی فون بھی آف کر دیا۔ وہ دوبارہ کالے میاں کی بیوی یا اس کے بھائی سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا البتہ اس کی بیوی سے بات کرنے سے کالے میاں کے نام کی تصدیق ہو گئی تھی لیکن یہ بہرحال ظاہر نہیں ہو سکا تھا کہ کالے میاں کا پیر سائیں کہاں پایا جاتا ہے۔ اس گفتگو میں دو مقامات کے نام سامنے آئے تھے۔ ایک فیصل آباد اور دوسرا لاہور۔ فیصل آباد کو وہ اپنے اندازوں کی بنیاد پر پہلے ہی رد کر چکا تھا اور لاہور کے بارے میں بھی شک و شبہے کا شکار تھا کیونکہ شہزادی نے اسے بتایا تھا کہ اس کی ساس بالے کو علاج کے لیے اپنے کسی عزیز کے گاؤں لے گئی ہے۔ شہزادی کے بچے بھی وہ ساتھ لے گئی تھی چنانچہ یہ امر ذرا مشکل ہی نظر آتا تھا کہ ایک اکیلی عورت نے ایک معذور آدمی اور بچوں سمیت لاہور تک کا سفر کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ پھر بات تھی بھی کسی گاؤں جانے کی، اس لیے لاہور والی بات ذرا مشکل ہی تھی۔

”ہاں بھئی مشابرم خان! ایسا کرو کہ اپنے کالے میاں کے دونوں پیر رسی سے باندھ کر انہیں پنکھے کے ساتھ الٹا لٹکا دو۔ اس کے بعد میں تمہیں سکھاؤں گا کہ اس نے اپنے پیٹ میں جو باتیں چھپا رکھی ہیں وہ کیسے باہر نکلتی ہیں۔“ سارا حساب کتاب جوڑ لینے کے بعد وہ ایک بار پھر مشابرم خان کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی طرف سے اشارہ ملتے ہی وہ فوراً حرکت میں آ گیا اور چند منٹوں میں ہی کالے میاں پنکھے کے ساتھ الٹا لٹکا ہوا نظر آنے لگا۔ اکیلے شخص کے لیے یہ کام اتنا آسان نہیں تھا لیکن مشابرم خان نے اسے اپنی زبردست جسمانی طاقت اور تکنیک کی بنیاد پر ممکن کر دکھایا تھا۔

”اب اس راڈ پر کپڑا لپیٹ لو اور اتنی قوت سے اس کے جسم پر ضربیں لگاؤ کہ اندر کے سارے اعضا ہل کر رہ جائیں۔“ ایک طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے مشابرم خان کو دوسری ہدایت دی اور خود دیوار سے ٹیک لگا کر یوں اطمینان سے کھڑا ہو گیا جیسے کوئی دلچسپ تماشا شروع ہونے والا ہو۔ مشابرم خان نے اس کی دوسری ہدایت پر بھی من و عن عمل کیا اور آئرن راڈ پر کپڑا لپیٹ کر کالے میاں کے جسم کو نشانہ بنانے لگا۔ اس نے شہریار کی ہدایت کو پوری طرح سمجھ لیا تھا چنانچہ بہت نپی تلی ضربات لگا رہا تھا۔ راڈ پر کپڑے کی تہ ہونے کی وجہ سے اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ کالے میاں کے جسم پر کوئی زخم تو کجا خراش بھی آ سکے البتہ اندرونی طور پر اس کا حشر ہو جاتا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ کام شروع ہو چکا ہے۔ وہ سخت اذیت میں محسوس ہو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ناک سے خون کی لکیر بہتی ہوئی نظر آئی۔ شہریار نے اشارہ کر کے مشابرم خان کو مزید ضربات لگانے سے روکا اور کالے میاں کی طرف متوجہ ہوا۔

”پھر کیا خیال ہے؟ تم ہمارے سوالوں کا جواب دینے کے لیے راضی ہو یا ابھی اندر کچھ دم خم باقی ہے اور میں اسے بھی نکلوانے کا بندوبست کر دوں؟“ اس کا لہجہ بے پناہ سرد تھا۔ مشابرم خان کو یاد نہیں تھا کہ اس نے اس سے قبل شہریار کو کبھی ایسے خوفناک موڈ میں دیکھا ہو۔ لیکن شہریار خود جانتا تھا کہ اس پر ایسا جنون ایک بار اس وقت بھی طاری ہوا تھا جب اس کی کراچی کے ایک فلیٹ میں را کے ایجنٹ ورما سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ اس وقت بھی اس نے ورما کی زبان کھلوانے کے لیے غیر انسانی تشدد کا سہارا لیا تھا اور یہ اس لیے تھا کہ وہ ورما جیسے شخص کو جو ملک دشمن ہونے کے ساتھ ساتھ بے شمار بے گناہوں کی زندگی ختم اور برباد کرنے کا ذمے دار تھا اسی طرح کے سلوک کا حق دار سمجھتا تھا۔ اب کالے میاں کے ساتھ وہ اتنی سختی برت رہا تھا تو وہ بھی اس لیے کہ وہ ایک ایسے جعلی پیر کا چیلا تھا جس کا کردار شہزادی والے کیس سے ہی کافی حد تک کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ ایک طرف اس کی وجہ سے شہزادی اپنے بچوں سے دور ہوئی تھی تو دوسری طرف ایک معصوم بچے کی لاش کی بے حرمتی کے ارتکاب پر مجبور ہو گئی تھی۔ جس مردود آدمی نے بالے کے علاج کے لیے مردہ بچے کی ہڈیوں کا مطالبہ کیا تھا، وہ جانے اپنے مریدوں اور چیلوں سے کون کون سے گھناؤنے کام کرواتا ہوگا۔ کوئی دین دار اور نیک آدمی تو ہرگز بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یقیناً شیطان کا کوئی چیلا تھا جس نے پیر کے بہروپ میں اپنا شیطانی دھندا جاری رکھا ہوا تھا۔ وہ اس شیطان تک پہنچ کر اس کی بیخ کنی کرنا ضروری سمجھتا تھا ورنہ معلوم نہیں وہ شخص کتنوں کی دین و دنیا برباد کر ڈالتا۔

کالے میاں کی حالت کافی تباہ ہو گئی تھی۔ اس کے استفسار پر اس نے تیزی سے سر کو جنبش دیتے ہوئے اپنی رضامندی کا عندیہ دیا۔

”اس کے منہ سے کپڑا نکال دو۔“ اس نے مشابرم خان کو حکم دیا جس پر اس نے فوراً ہی عمل کیا۔ کپڑا نکلتے ہی کالے میاں کے منہ سے خون کا فوارہ سا نکلا۔

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اسے نیچے اتارو۔" اس نے فوراً ہی تیز آواز میں مشابرم خان کو حکم دیا۔ مشابرم خان کی لگائی گئی ضربیں اس کے اندازے سے زیادہ خوفناک ثابت ہوئی تھیں اور صاف ظاہر تھا کہ کالے میاں کے پھیپھڑے بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ کالے میاں کو پنکھے سے اتار کر فرش پر لٹایا گیا تو وہ خود بھی مشابرم خان کے ساتھ اس کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ ذرا دیر میں وہ اسے سنبھالنے میں کامیاب ہو گئے اور اس کی ناک اور منہ سے بہنے والا خون بند ہو گیا۔ اندرونی زخموں سے زیادہ خون کا وہ اخراج شاید الٹا لٹکے رہنے کی وجہ سے تھا جس پر انہوں نے قابو پالیا تھا اور اب کالے میاں کسی بے جان جسم کی طرح فرش پر پڑا ہولے ہولے ہانپ رہا تھا۔

"ہاں بھئی۔ اب بولنا شروع ہو جاؤ ورنہ یہ بات تم خود بھی سمجھ سکتے ہو کہ اگر ایک بار پھر الٹے لٹکا دیے گئے تو تمہارا انجام کیا ہوگا۔ تم خون اگل اگل کر یہیں مر جاؤ گے اور باہر کسی کو خبر بھی نہیں ہو سکے گی۔ تمہارا پیر بھی ٹاک ٹوئیاں مارتا رہ جائے گا کہ اس کا چیلا کہاں گیا۔" اس کے لہجے میں سفاکی نمایاں تھی جسے محسوس کر کے نڈھال کالے میاں کانپ کر رہ گیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ خاموش رہ کر وہ اپنی جان پر مزید تشدد سہنے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں کر سکے گا چنانچہ زبان کھولنے پر آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کمزور سی آواز میں بولا۔

"میں تم لوگوں کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں لیکن پہلے مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔" اس کی اس فرمائش پر شہریار نے زبان سے کچھ نہیں کہا البتہ مشابرم خان کو آنکھ سے اشارہ کر دیا۔ اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے مشابرم خان نے کالے میاں کے منہ سے پانی کی بوتل لگا دی۔ پانی پی کر اس کی حالت میں کافی بہتری آ گئی اور وہ مشابرم خان کی مدد سے ایک دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔

"اب بتاؤ کہ تمہارا پیر سائیں کون ہے؟ کہاں رہتا ہے اور تم اس کے لیے کیا کام کرتے ہو؟" اس کو جواب دینے کی پوزیشن میں پا کر شہریار نے پہلے سے کئی گنا زیادہ سخت لہجے میں سوال کیا۔

"پیر سائیں کا نام عبدالحق ہے لیکن کوئی بھی ان کا نام لینے کی جرأت نہیں کرتا اور سب انہیں پیر سائیں ہی کہتے ہیں۔ ان کی خانقاہ تاندلیانوالہ چنڈ میں ہے۔ میں بھی وہیں رہتا ہوں اور خانقاہ کا کام کاج دیکھتا ہوں یا پھر اگر پیر سائیں کبھی کسی کام سے کہیں بھیج دیں تو وہاں چلا جاتا ہوں۔ ادھر پیر آباد بھی پیر سائیں کے کہنے پر ہی آیا تھا۔ ادھر خانقاہ پر ایک مریض بالا علاج کے لیے آیا ہوا ہے۔ اس کے علاج کے لیے کسی چیز کی لوڑ تھی اور بالے کی ماں کا کہنا تھا کہ وہ چیز اس کی نوں کے پاس سے ملے گی۔ میں ادھر وہی لینے آیا تھا۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے اپنا بیان دیا۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خود کو اس بات سے لاعلم ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ شہزادی سے مردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے کے لیے آیا تھا۔

"بالے کی بیوی سے تمہیں کیا چیز لے جانی تھی؟" شہریار بھی اسے بخشنے کو تیار نہیں تھا۔

"مینوں خبر نہیں جی۔" اس نے نظریں کچھ اور بھی جھکاتے ہوئے پست لہجے میں جواب دیا۔

"سچ بول ورنہ دوبارہ الٹا لٹکا دوں گا۔" مشابرم خان کا ہتھوڑے جیسا ہاتھ پوری قوت سے اس کے منہ پر پڑا جس کے نتیجے میں اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے اور دہانے سے ایک بار پھر خون خارج ہونے لگا۔ اس بار کالے میاں اتنا خوف زدہ ہوا کہ اس نے فوراً ہی اس بات کا اعتراف کر لیا کہ وہ شہزادی سے مردہ بچے کی ہڈیوں کی وصولی کے لیے آیا تھا۔

"ان ہڈیوں سے تمہارا پیر سائیں کس طرح بالے کا علاج کرتا؟" شہریار نے اس سے پوچھا۔

"معلوم نہیں جی۔ پیر سائیں وڈا پہنچا ہوا آدمی ہے۔ اس کے پاس وڈا علم ہے۔ جب وہ اپنے خاص حجرے میں ہوتا ہے تو وہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہیں وہ اپنا عمل کرتا ہے۔ ہم سب نے دیکھا ہے کہ اس عمل کے بعد وہ جس کسی کو بھی دوا تیار کر کے دیتا ہے، وہ چنگا بھلا ہو جاتا ہے۔" کالے میاں کے لہجے میں اعتقاد تھا۔ یقیناً اس نے خانقاہ پر اپنے قیام کے عرصے میں اس طرح کے کئی کرشمے دیکھے ہوں گے جبھی وہ پیر سائیں کا معتقد تھا۔ لیکن خود شہریار کو شک ہو رہا تھا کہ عبدالحق نامی وہ پیر حق سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ہوگا اور اس کے پاس جو بھی کرشمے موجود تھے، وہ کسی سفلی علم کی بدولت تھے کیونکہ حق کی راہ پر چلنے والے کسی شخص سے کسی طور یہ امید ہی نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ وہ کسی کے علاج کے لیے ایسا کوئی طریقۂ کار استعمال کرے جس سے شرعی قوانین اور انسانیت کی نفی ہوتی ہو۔ مردہ بچے کے جسم کی ہڈیوں کا مطالبہ ایک ایسا ہی معاملہ تھا جس سے اس شخص کے کالے کرتوتوں کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس نے یہی بات کالے میاں سے بھی پوچھ ڈالی، جواباً وہ نہایت عالمانہ لہجے میں بولا۔

"پیر سائیں کا فرمان ہے کہ زندہ شخص کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اگر بالے کے علاج کے لیے وہ کسی مردہ بچے کی ہڈیاں استعمال کرنا چاہتے ہیں تو اس سے اس بچے کے مردے کی کوئی بے حرمتی نہیں ہوئی بلکہ ایک طرح سے یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ مرنے کے بعد بھی کسی کے کام آ سکا اور اس کے اجر میں اللہ تعالیٰ اسے جنت کے باغوں کا سب سے خوش نما اور خوشبودار پھول بنا دیں گے۔" کالے میاں کے جواب سے صاف عیاں تھا کہ پیر سائیں نے اپنے عقیدت مندوں کے ذہنوں کو کس بری طرح اپنے قابو میں کر کے ان کے عقیدوں کو مسخ کر رکھا تھا۔ وہ نیکی اور بدی کی اصل روح کو بھول کر اپنے پیر سائیں کے فرمودات کی روشنی میں حق اور ناحق کے اپنے ذاتی اصول بنائے بیٹھے تھے جن سے انہیں ہٹانا شاید اتنا آسان بھی نہیں تھا۔

"ابھی میں نے تمہاری بیوی سے فون پر بات کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ تم لاہور میں کسی سیٹھ کے پاس نوکری کرتے ہو اور اس کے خیال کے مطابق اس وقت تمہیں لاہور میں ہونا چاہیے تھا۔ کیا تم نے اپنی بیوی کو یہ بات نہیں بتائی کہ تم تاندلیانوالہ میں رہ کر کسی پیر کی خدمت انجام دے رہے ہو؟ یا اس جھوٹ کے لیے بھی تمہارے پیر سائیں نے کوئی فرمان جاری کر رکھا ہے؟" اس کا لہجہ خود بخود ہی طنز اور زہر میں ڈوب گیا۔

"آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔ مجھے اور دوسرے مجاوروں کو اپنے گھر والوں کو سچ بتانے کی اجازت نہیں ہے۔ پیر سائیں کا کہنا ہے کہ اگر ہمارے بیوی بچوں کو خانقاہ کے بارے میں معلوم ہو گیا تو وہ وہاں بہانے بہانے سے آنا شروع ہو جائیں گے اور پیر سائیں کے علاوہ ہم سارے مجاور بھی اپنے گھر والوں کے مسائل میں الجھ کر خدمتِ خلق کو بھول جائیں گے۔ پیر سائیں وڈے اللہ لوک آدمی ہیں جی۔ انہوں نے اللہ کے بندوں کے کام سنوارنے کے لیے خود بھی ویاہ نہیں کیا اور اپنی خانقاہ کے مجاوروں میں بھی یہ خوبی دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے بیوی بچوں سے بڑھ کر خدمتِ خلق میں دل لگائیں۔ ہم سب پیر سائیں کے نقشِ قدم پر چلنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ خانقاہ پر آنے سے پہلے جن لوگوں کا ویاہ نہیں ہوا تھا، انہوں نے پیر سائیں کی دیکھا دیکھی ساری حیاتی تنہا رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جو بال بچے والے ہیں، وہ بھی احتیاط کرتے ہیں اور کبھی کبھار ہی چھٹی لے کر اپنے بال بچوں سے ملنے جاتے ہیں۔ ہم میں سے ایک نے اپنی گھر والی کو طلاق دے کر اس جھنجٹ سے جان چھڑا لی ہے اور اب آرام سے دن رات خانقاہ میں رہتا ہے۔ میں ذرا کمزور ایمان کا بندہ ہوں اس لیے اتنی ہمت نہیں کر سکا۔ پھر یہ گل بھی ہے کہ میری گھر والی کے بھرا سے میری بہن کا ویاہ ہوا ہے۔ اگر میں نے اپنی گھر والی کو چھوڑا تو میری بہن بھی اجڑ جائے گی اس لیے بھی میں خاموش ہوں۔" ابتدائی مزاحمت کے بعد اب وہ رواں ہو چکا تھا اور ہر سوال کا جواب تفصیل سے دے رہا تھا۔ یہ تفصیل ایسی تھی کہ سن کر شہریار دنگ رہ گیا اور دل میں سوچنے لگا کہ انسان کی جہالت بھی کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ اس دور میں جبکہ انسان خلاؤں میں سفر کر رہا تھا اور ستاروں پر کمند ڈال رہا تھا، اس کے ملک کے بعض دیہاتوں میں یہ حال تھا کہ جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم سے بھی محروم لوگ اندھے عقیدوں میں پھنس کر سچائی اور حق کو سمجھنے کی اہلیت کھو بیٹھے تھے۔ پہلے اس نے شاہنواز نامی شخص کا کھوج لگایا تھا جو را کا ایجنٹ تھا بعد میں آفتاب کی مخبری پر غلام محمد نامی شخص جس کا اصل نام اشیش کمار تھا، کو قانون کی گرفت میں لیا تھا۔ ان دو کرداروں کے بعد اب اس کے سامنے پیر عبدالحق کا کردار آیا تھا جو تاندلیانوالہ چنڈ میں اپنی خانقاہ بنائے بیٹھا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا وہاں کافی اثر رسوخ ہے۔ ایک دوسرا مسئلہ یہ بھی تھا کہ تاندلیانوالہ چنڈ شہریار کے زیرِ انتظام ضلع میں واقع نہیں تھا اس لیے اسے اپنی اے سی کی حیثیت کو استعمال کر کے وہاں کوئی براہِ راست کارروائی کرنے کی سہولت حاصل نہیں تھی۔ اسے پیر عبدالحق کے خلاف جو بھی قدم اٹھانا تھا، وہ بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا تھا ورنہ اس کی مشکلات میں بہت زیادہ اضافہ ہو سکتا تھا۔

"تمہارا خاندان فیصل آباد میں رہتا ہے تو پھر تم تاندلیانوالہ کیسے پہنچ گئے؟" کالے میاں کی بیوی سے ہونے والی گفتگو یاد آئی تو اس نے چونک کر کالے میاں سے پوچھا۔

"یہ بھی بس ایک اتفاق ہی تھا۔ میری گردن پر ایک پھوڑا ہو گیا تھا جو کسی طرح ٹھیک نہیں ہوتا تھا۔ ان دنوں میں سچ مچ لاہور میں ایک سیٹھ کے پاس نوکری کرتا تھا۔ پھوڑے کی تکلیف کی وجہ سے میں نے تنگ آ کر سیٹھ سے چھٹی لی اور فیصل آباد کے لیے نکل گیا کہ گھر جا کر آرام کروں گا اور کسی پرانے حکیم سے علاج کرواؤں گا لیکن گڈی میں مجھے پیر سائیں کا ایک مجاور مل گیا۔ اس نے میرا پھوڑا دیکھا تو اس کے بارے میں پوچھا۔ میں تو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا، اسے بتا دیا کہ کب سے اور کتنا پریشان ہوں۔ میری داستان سن کر وہ بولا کہ میرے ساتھ میرے پیر سائیں کی خانقاہ پر چلو، تمہارا شرطیہ علاج ہو جائے گا۔ میں پریشان تو تھا اس لیے فوراً ہی اس کے ساتھ جانے پر راضی ہو گیا۔ اور بس پھر میری زندگی بدل گئی۔ پیر سائیں نے تین دن کے اندر اپنی کرامت سے میرے پھوڑے کا علاج کر دیا۔ علاج کے دنوں میں مجھے

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساتھ لے جانے والے مجاور نے مجھے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ تین دن میں اس نے میرا بہت خیال رکھا۔ وہ پیر سائیں کا وڈا ماننے والا تھا۔ اس کے ساتھ رہتے ہوئے میرے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی اسی کی طرح خانقاہ پر رہوں اور دن رات پیر سائیں کی خدمت کروں۔ میں نے اپنی یہ خواہش پیر سائیں کے سامنے بیان کی تو انہوں نے وہاں رہنے کی شرائط بتا کر فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا۔ میں نے ہر شرط مان لی۔ اب میں دن رات خانقاہ میں رہتا ہوں اور بہت خوش ہوں۔ جب پیر صاحب حکم دیتے ہیں تو بال بچوں سے ملنے چلا جاتا ہوں اور انہیں خرچہ پانی دے آتا ہوں۔"

وہ واقعی اتنا مطمئن لگ رہا تھا کہ ان کی طرف سے کیے گئے تشدد کے نتیجے میں بگڑ جانے والے چہرے پر بھی اس اطمینان کا عکس جھلکنے لگا تھا۔ شہریار حیران تھا کہ یہ انسانی نفسیات کا کون سا پہلو ہے کہ وہ نہایت مکاری کے ساتھ کسی کا آلۂ کار بنا لیا جاتا ہے اور اپنے ساتھ ہونے والی اس کارروائی سے بے خبر، خوش اور مطمئن رہتا ہے۔

"بیوی بچوں کو خرچہ پانی دینے کے لیے رقم کہاں سے آتی ہے تمہارے پاس؟" اس نے کالے میاں سے ایک اور چبھتا ہوا سوال کیا۔

"رقم پیر سائیں دیتے ہیں۔ ان پر اللہ کی خاص رحمت ہے۔ اللہ غیب کے خزانوں میں سے انہیں نوازتا ہے اور وہ اس میں سے ہمیں عطا کرتے رہتے ہیں۔" وہاں وہی جہالت بھری عقیدت تھی لیکن شہریار کا تجسس مزید بڑھ گیا تھا کہ آخر پیر سائیں کیا شے ہے کہ اس کے پاس خفیہ طریقے سے دولت آتی رہتی ہے۔ ہوسکتا تھا کہ خانقاہ پر چڑھاووں وغیرہ کا بھی سلسلہ ہو جس سے آمدنی ہوتی ہو لیکن کالے میاں نے جس طرح غیب کے خزانوں کا ذکر کیا تھا، اس سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ پیر سائیں کی آمدنی کے کچھ خفیہ ذرائع بھی ہیں۔ بہرحال اس نے اس سلسلے میں کالے میاں کو مزید کریدنے سے گریز کیا اور شہزادی کے کیس پر توجہ مرکوز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"تم تو پچھلی بار فیصل آباد گئے ہوئے تھے پھر تمہیں شہزادی سے چڑیاں لانے کا کام کیسے سونپا گیا؟"

"بول بول کر میرا حلق خشک ہوگیا ہے۔ پہلے مجھے تھوڑا سا پانی ہو پلوا دیں۔" اپنے خون آلود ہونٹ پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے مطالبہ کیا۔ ہونٹ کو آلودہ کرنے والا یہ خون مشابرم خان کے تھپڑ کے نتیجے میں دانت ٹوٹنے سے نکلا تھا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے دو دانت اب بھی فرش پر پڑے صاف نظر آ رہے تھے۔ اس نے اپنے ٹوٹے ہوئے دانتوں پر ایک حسرت زدہ سی نظر ڈالی اور پھر مشابرم خان کا بڑھایا ہوا پانی منہ سے لگا لیا۔ پانی پی کر اس کی توانائی خاصی بحال ہو گئی تھی شاید اسی وجہ سے وہ مشابرم خان کو کینہ توز نظروں سے گھورنے کے قابل ہو سکا لیکن بہرحال اس سے آگے کچھ کرنے کی اس میں جرأت نہیں تھی۔ وہ مکمل طور پر زیردست ہو چکا تھا اور اسے اپنی اس پوزیشن کا احساس تھا اس لیے شہریار کے اشارے پر ایک بار پھر شروع ہوگیا۔

"مجھے واجد نے پیر سائیں کی طرف سے موبائل فون پر اس کام کا حکم دیا تھا۔ ان کا حکم ملنے پر میں فیصل آباد سے سیدھا پیر آباد پہنچا تھا لیکن وہاں ایک لڑکے کی زبانی مجھے بالے کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی یہ معلوم ہوگیا کہ بالے کی گھر والی رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہے۔ میں الٹے قدموں واپس لوٹ گیا، پر اڈے پر گاؤں سے باہر جانے والی کوئی گاڑی ہی نہیں تھی اس لیے مجھے انتظار کرنا پڑا۔ فیر گاڑی آنے سے پہلے ہی میں نے اس لڑکے کے ساتھ آپ کے ڈرائیور کو آتے دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا اور میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ میری ہی تلاش میں آئے ہیں۔ میں چھپ گیا، فیر اس سے آگے جو کچھ ہوا وہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گیا ہوگا۔" کالے میاں نے اپنا بیان مکمل کر کے خاموشی اختیار کرلی۔ ویسے اس کا نام بھی خوب تھا۔ اس کی افریقیوں کو شرماتی کالی رنگت کی وجہ سے یہ نام جانے اس کے ماں باپ نے ہی رکھا تھا یا پھر یہ لوگوں کا کارنامہ تھا۔

"تمہارے موبائل پر آنے والی واجد نامی شخص کی کال میں نے بھی نوٹ کی ہے لیکن اس نمبر پر کوشش کرنے پر کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا۔ ایسا لگتا ہے کہ نمبر کسی کے استعمال میں ہی نہیں ہے۔ تمہارے خیال میں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟" اس نے ذہن میں چبھتا ہوا سوال کالے میاں سے کر ڈالا۔

"میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آ رہا۔ پیر آباد سے میں نے خود بھی اسے حالات بتانے کے لیے فون کرنے کی کوشش کی تھی لیکن معلوم نہیں کیوں نمبر ہی نہیں ملا۔ بعد میں آپ کے ساتھی نے میرا موبائل چھین لیا تو میں کوشش بھی نہیں کر سکا۔" اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

"ہوسکتا ہے کہ واجد کا موبائل خراب ہوگیا ہو یا پھر کوئی دوسرا مسئلہ ہو تو اس سے رابطہ نہ ہو سکنے کی صورت میں تم کس سے بات کر سکتے ہو؟" اس نے کالے میاں کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کرنے کو تو میں پیر سائیں سے بھی گل کر سکتا ہوں لیکن ان کی عبادت میں حرج نہ ہو، اس خیال سے ہم میں سے کوئی بھی انہیں فون نہیں کرتا۔ ہم میں سے واجد ہی سب سے زیادہ ان کے قریب ہے اس لیے ہم اسی سے رابطہ کرتے ہیں۔" اس نے بتایا پھر گویا اچانک خیال آنے پر بولا۔

"واجد کا چھوٹا بھرا خالد بھی پیر سائیں کے اعتماد کا بندہ ہے۔ میں اسے بھی فون کر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے تو پھر اسی کو فون کر کے دیکھتے ہیں بلکہ ایسا کرو کہ تم فون پر خالد سے بات کرو۔ ذرا دیکھیں تو سہی کہ تمہارے واپس نہ لوٹنے پر ان لوگوں کے ذہن میں کس قسم کے خیالات گردش کر رہے ہیں۔ لیکن خبردار اسے اصل حالات کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔ اسے بھی تم وہی کچھ بتانا جو میں نے تمہاری بیوی کو بتایا ہے۔" کالے میاں کو ہدایات دیتے ہوئے اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہوگیا۔ کالے میاں نے جس طرح کا تشدد سہا تھا، اس نے اس کے سارے کس بل نکال دیے تھے چنانچہ وہ مسلسل تعاون کر رہا تھا۔ اب بھی شہریار کی دھمکی کو محسوس کر کے اس کے چہرے پر پستی برسنے لگی۔ درحقیقت وہ ایک عام سا آدمی تھا جو اپنی اندھی عقیدت کے ہاتھوں پیر سائیں کے چنگل میں پھنس گیا تھا، ورنہ اس میں پیشہ ور مجرموں جیسا دم خم نہیں تھا کہ سخت تشدد سہہ کر بھی ڈھٹائی پر قائم رہیں اور زبان پر پڑا قفل کھولنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ شہریار نے موبائل آن کر کے اسے تھمایا تو اس نے بڑی فرماں برداری سے تھام کر خالد کا نمبر ملا دیا۔ ایک طرح سے وہ یکسر مزاحمت نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ شاید اس نے اپنے دل میں یہ بھی سوچ لیا ہو کہ پیر سائیں اپنی کرامات کے سہارے خود ہی اس ناہنجار سے نمٹ لیں گے چنانچہ خود مکمل طور پر ہتھیار ڈال چکا تھا اور شہریار کے لیے یقیناً کسی ناگہانی آفت کا منتظر تھا۔

"کیا بات ہے، کیا خالد سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا؟" وہ کئی بار نمبر ڈائل کرنے کے باوجود بھی دوسری طرف کسی سے بات نہیں کر سکا تو اس کے الجھن زدہ تاثرات دیکھ کر شہریار نے پوچھا۔

"خالد کے نمبر پر بھی واجد کے نمبر جیسی ہی خاموشی ہے۔ لگتا ہے ان کے گھر کوئی پریشانی پڑ گئی ہے۔" اس نے مایوسی سے جواب دیا۔

"تو پھر ایسا کرو کہ اپنے پیر سائیں سے ہی رابطہ کرو۔ یہ کوئی نماز کا وقت تو ہے نہیں کہ تمہارے پیر سائیں کی عبادت میں خلل پڑے گا۔" اس نے سرد لہجے میں حکم صادر کیا۔ حقیقتاً کالے میاں سے معلومات حاصل کرنے کے بعد اسے پیر سائیں یا اس کے کسی کارندے سے بات کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی لیکن پھر بھی وہ وہاں والوں سے رابطہ کرنے پر مصر تھا۔ جانے یہ اس کی دماغی رو بہکنے کا نتیجہ تھا یا چھٹی حس جاگ کر کسی غیر معمولی صورت حال کا احساس دلا رہی تھی۔ بہرحال جو بھی تھا لیکن بے چارے کالے میاں کو تو حکم کی تعمیل کرنی تھی، سو وہ ایک بار پھر موبائل کی طرف متوجہ ہوگیا لیکن اس کے نمبر ملانے سے قبل ہی کوئی کال آنے لگی۔

"لائن کاٹ دو۔" وہ اس کے عین سر پر سوار تھا اس لیے اسکرین پر نمودار ہونے والے "کاکا" کے الفاظ دیکھ کر سمجھ گیا کہ کالے میاں کی بیوی فون کر رہی ہے۔ وہ شاید اپنے شوہر کے ساتھ حادثہ پیش آنے کی خبر ملنے کے بعد مسلسل ہی اس کے نمبر پر ٹرائی کرتی رہی تھی لیکن پہلے موبائل بند ہونے اور بعد میں مصروف ہونے کی وجہ سے اس کی کوششیں بارآور نہیں ہو سکی تھیں۔ اب جو ذرا سا وقفہ آیا تو وہ موبائل کی گھنٹیاں بجانے کی حد تک کامیاب ہوگئی لیکن شہریار کی طرف سے لائن کاٹ دینے کا حکم ملنے کے بعد کالے میاں میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ کال ریسیو کر کے بیوی کی تشفی تسلی کا کام کرے چنانچہ اس نے نہایت شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیوی کی کال منقطع کر کے پیر سائیں کا نمبر ملا لیا۔ اس بار بھی اس کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات نظر آئے۔ ان تاثرات میں مایوسی کے ساتھ ساتھ کچھ حیرانی اور پریشانی بھی شامل تھی۔ اپنے دو قریبی ساتھیوں سمیت پیر سائیں سے بھی رابطہ نہ ہو سکنے کی صورت میں یقیناً اس کے اندر بھی یہی احساس جاگا ہوگا کہ وہاں کوئی گڑبڑ ہے جب ہی ایک ساتھ اس کا سب لوگوں سے رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔

"او کے۔ لاؤ یہ موبائل مجھے دے دو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے پیر سائیں کے ہاں کیا مسئلہ ہوگیا ہے کہ تمہارا کسی سے رابطہ ہی نہیں ہو پا رہا۔" اس کے چہرے کے تاثرات سے صورت حال کا اندازہ لگاتے ہوئے شہریار نے پُرسوچ لہجے میں حکم دیا تو کالے میاں نے موبائل اس کے حوالے کر دیا۔ حکم عدولی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ مشابرم خان محض ایک اشارے کا منتظر بالکل تیار کھڑا تھا۔ اب بھی شہریار نے موبائل اپنے قبضے میں لیتے ہوئے اسے کوئی خفیف سا اشارہ کر دیا تھا جس کے نتیجے میں کالے میاں ایک بار پھر بندشوں میں جکڑا گیا اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر وہ زبان بھی بند کر دی گئی جسے کچھ دیر قبل بعد اصرار کافی جدوجہد کے بعد کھلوایا گیا تھا۔

☆☆☆

اسلم کی آنکھ کھلی تو گھڑی کی سوئیاں چار بجنے کا اعلان کر

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہی تھیں۔ یعنی وہ کافی طویل نیند لینے کے بعد جاگا تھا۔ کئی دن کی بھاگ دوڑ کے بعد میسر آنے والے آرام دہ بستر نے اسے اس طرح بے سدھ کیا تھا کہ درمیان میں ایک بار بھی اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ اب بھی وہ آنکھ کھل جانے کے باوجود کچھ دیر کسلمندی سے بستر پر ہی پڑا رہا لیکن پھر خیال آیا کہ وہ اس گھر میں مہمان ہے اور مستقل ڈیرا ڈالنے کے لیے یہاں نہیں آیا ہے اس لیے بہتر ہے کہ اب حامد راؤ اور اس کے بیٹے سے رخصت کی اجازت لی جائے۔ یہاں سے نکل کر کسی شہر تک پہنچنے میں انہیں اچھا خاصا وقت لگ جاتا پھر یہ سفر بھی ایسا نہیں تھا جس کی منزل پہلے سے طے شدہ ہو۔ وہ لوگ ٹالی والا سے نکل کر جہاں بھی پہنچتے، بے گھر ہی ہوتے اور قیام کے لیے کسی نہ کسی ہوٹل کا رخ کرنا پڑتا چنانچہ اس کی خواہش تھی کہ بہت زیادہ رات نہ ہو کیونکہ رات گئے ہوٹلوں میں پہنچنے والے جوڑے عموماً مشکوک قرار پاتے ہیں۔ اس نے حامد راؤ کے سامنے ماہ بانو کو اپنی بیوی کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ماہ بانو اس کی بیوی نہیں بلکہ ہونے والی بیوی تھی اور یہ رشتہ کوئی ایسا رشتہ نہیں تھا جو انہیں قانونی تحفظ فراہم کر سکتا۔ ہوٹلوں میں اگرچہ کسی جوڑے کو کمرا دیتے وقت نکاح نامہ دکھانے کی شرط نہیں رکھی جاتی تھی لیکن بات وہی تھی کہ ناموزوں وقت پر کسی ہوٹل میں پہنچ کر وہ خواہ مخواہ کسی کی نظر میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ آدمی کو کب کہیں کوئی سرپھرا ٹکرا جائے، اس بات کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا اور وہ اپنے موجودہ حالات میں کسی نئے مسئلے سے نمٹنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ان کے ڈیرے سے فرار ہونے کے بعد وہاں سے سنائی دینے والی فائرنگ کی آوازیں پولیس ریڈ کا نتیجہ تھیں۔ اس ریڈ میں اس کے جانے کتنے ساتھی مارے گئے تھے اور کتنے زخمی یا مفرور تھے۔ البتہ یہ بات طے تھی کہ پولیس نے گرفتار شدگان کی مدد سے مفروروں کی فہرست ضرور تیار کی ہوگی اور اب ان کی راہ پر لگی ہوگی۔ ایسے حالات میں وہ کسی بھی طرح پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی خواہش میں اتنا محتاط تھا کہ کسی معمولی سے معمولی بات کو بھی نظرانداز کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اب بھی ذہن میں آنے والے خیال نے اس کی ساری کسلمندی اور سستی کو سیکنڈوں میں اڑن چھو کر دیا اور وہ مزید سونے کی ترغیب دیتے آرام دہ بستر کو چھوڑ کر ایک چھلانگ میں غسل خانے میں پہنچ گیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو مقصود کو کمرے میں اپنا منتظر پایا۔

"میں پہلے بھی دو بار آپ کے کمرے کا چکر لگا کر جا چکا ہوں لیکن آپ اتنی گہری نیند میں تھے کہ مجھے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں لگا۔" اسے دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے... بولا۔

"بس تھکن ہی ایسی تھی لیکن اگر کوئی کام تھا تو تم مجھے جگا سکتے تھے۔" مقصود کے پہلے بھی دو بار آنے کا سن کر اسے بھی لگا کہ وہ کسی کام سے یہاں آیا ہوگا اس لیے کچھ فکر اور گہری سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

"ارے نہیں۔" مقصود اس کے تاثرات بھانپ کر دھیرے سے ہنسا۔ "میں تو بس یہ دیکھنے آیا تھا کہ اگر آپ جاگ رہے ہوں تو دوپہر کے کھانے کے بارے میں پوچھ لوں لیکن آپ نے تو اٹھنے میں تقریباً شام ہی کر دی۔ ڈھائی تین گھنٹوں میں یہاں رات کے کھانے کا وقت ہو جائے گا اور آپ ابھی تک دوپہر کا کھانا ہی نہیں کھا سکے جس پر میری والدہ کو سخت تشویش ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مہمان نے دوپہر کا کھانا ابھی تک نہیں کھایا تو پھر رات کا کھانا کب کھائے گا۔"

مقصود کے ہلکے پھلکے انداز میں سنائی گئی تفصیل نے اسے بے ساختہ ہی اپنی ماں کی یاد دلا دی۔ دوران تعلیم کراچی میں رہائش کے عرصے میں اس کے کھانے پینے کے معمولات بہت زیادہ تبدیل ہو گئے تھے۔ عموماً یونیورسٹی سے واپس آنے میں ہی تین سے اوپر کا وقت ہو جاتا تھا اور وہ دوپہر کا کھانا دیر سے کھانے کے باعث رات کا کھانا بھی تاخیر سے کھانے کا عادی ہو گیا تھا۔ اس معمول کی وجہ سے جب وہ ملاقات کے لیے گاؤں جاتا تو وہاں ماں اور بہن کے معمول کا ساتھ نہ دے پاتا اور ماں تشویش میں مبتلا رہتی کہ اس کے بیٹے نے کس قسم کی عادات اپنائی ہیں۔ جلدی سونے اور جلدی جاگنے والے گاؤں دیہاتوں کے رہائشیوں کے لیے اس طرز زندگی کا تصور ہی محال تھا جو کراچی جیسے بڑے شہر میں رائج تھا۔

"آپ کس سوچ میں ڈوب گئے؟ کہیں میری بات کا برا تو نہیں مان گئے؟ میں نے تو صرف آپ کو اپنی والدہ کے خیالات سے آگاہ کیا تھا۔ اس بات کا یہ مقصد نہیں تھا کہ ہمارے گھر میں آپ پر کوئی زبردستی کی جائے گی۔ آپ اپنے سونے جاگنے اور کھانے پینے کے معمولات کے لیے بالکل آزاد ہیں۔ اب بھی مجھے صرف آپ کے جاگنے کا انتظار تھا۔ آپ چند منٹ کے لیے انتظار کریں تو میں کھانا لگوا دیتا ہوں۔ رات کا کھانا آپ جب خواہش محسوس کریں گے، تب فراہم کر دیا جائے گا۔" اس کی خاموشی سے کچھ اور ہی معنی اخذ کرتے ہوئے مقصود تھوڑا سا گھبرا گیا اور وضاحتیں پیش کرنے لگا۔ ایک تو مہمان داری ان کی روایت تھی اور وہ مہمان کو ناراض کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، دوسرے وہ جتنا برخوردار قسم کا لڑکا تھا، اسے فوراً ہی یہ فکر لاحق ہو گئی ہوگی کہ اسلم کے ماتھے پر پڑنے والی کوئی شکن کہیں اس کے والد ماجد کا مزاج برہم نہ کر دے اس لیے فوراً صفائیاں پیش کرنے پر اتر آیا۔

اس کی کیفیت کو محسوس کر کے اسلم کے ہونٹوں پر ایک بے ساختہ سی شوخ مسکراہٹ دوڑ گئی پھر وہ فوراً ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "میں اتنا کند ذہن نہیں ہوں کہ مذاق نہ سمجھ سکوں۔ مجھے بس یہ خیال آ گیا تھا کہ تمہاری والدہ بہت دور کی سوچ رہی ہیں۔ رات کا کھانا ہم کب اور کہاں کھائیں گے، یہ تو میں خود بھی ابھی طے نہیں کر سکا ہوں۔ البتہ یہ طے کر لیا ہے کہ تھوڑی دیر میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ تم مجھے یہاں سے شہر کی طرف جانے والی گاڑیوں کے روٹ اور اوقات وغیرہ بتا دو اور ساتھ ہی اندر زنان خانے میں میری بیوی کو بھی یہ پیغام بھیج دو کہ وہ سفر کے لیے تیار ہو جائے تاکہ ہم شام کے سائے گہرے ہونے سے پہلے یہاں سے نکل سکیں۔"

اس کا پروگرام سن کر مقصود ہکا بکا رہ گیا۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی؟"

"یقین کرو میں نے کسی ناراضی کی وجہ سے یہ فیصلہ نہیں سنایا بلکہ تمہارے یہاں اس کمرے میں آنے سے پہلے ہی میں اپنا پروگرام طے کر چکا تھا۔" اس نے فوراً ہی مقصود کی دل جوئی کے لیے وضاحت پیش کی۔

"لیکن اباجی نے تو کچھ اور ہی سوچا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر آپ کی طرف سے روانگی کا کوئی عندیہ ملے گا تو وہ اپنی پیشکش آپ کے سامنے رکھ دیں گے۔"

"کیسی پیشکش؟" وہ حیران ہوا۔

"اصل میں آپ نے شفقت چاچا کے بارے میں جو تفصیلات بتائی ہیں انہیں سن کر اباجی تشویش میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ان کا اندازہ ہے کہ چاچاجی کا کافی دنوں تک منظر پر آنا ممکن نہیں ہوگا۔ ان حالات میں ان کا محنت سے جمایا ہوا کاروبار ٹھپ ہونے کا خدشہ ہے اس لیے اباجی کی خواہش ہے کہ میں شہر جا کر ان کا دفتر سنبھال لوں۔ وہاں سب لوگ مجھے پہچانتے ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ میں چاچاجی کا بھتیجا ہونے کے علاوہ ان کا داماد بھی ہوں اس لیے مجھے وہاں کا کام سنبھالنے میں مشکل نہیں ہوگی۔ میں کل صبح شہر کے لیے روانہ ہوں گا اور اباجی کا خیال تھا کہ اگر آپ بھی چاہیں تو میرے

…ed And Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساتھ جا سکتے ہیں۔ اس طرح آپ بسوں اور ویگنوں کے دھکے کھانے سے بھی بچ جائیں گے۔'' مقصود نے اپنا پورا پروگرام اس کے سامنے رکھ دیا جسے سن کر وہ خوش ہو گیا۔ وہ تو اپنے میزبانوں پر بوجھ نہ بننے کے خیال سے یہاں سے روانگی میں اتنی جلدی دکھا رہا تھا لیکن اگر صرف ایک رات کی تاخیر سے وہ لوگ زیادہ سہولت سے سفر کر سکتے تو تھوڑا سا انتظار کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا چنانچہ خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''تمہاری تجویز کافی اچھی اور قابلِ عمل ہے ورنہ سچ پوچھو تو میں یہ سوچ کر کہ تمہیں اپنے بِن بلائے مہمان وبالِ جان نہ لگیں، یہاں سے جلد از جلد روانہ ہونا چاہتا تھا۔''

''ہم مہمان کو وبالِ جان نہیں بلکہ اللہ کی رحمت سمجھنے والے لوگ ہیں۔ آپ چاہیں تو غیر معینہ مدت کے لیے بھی یہاں رک سکتے ہیں۔ ہماری طرف سے آپ کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔'' مقصود کے لہجے اور الفاظ میں خلوص کی جھلک تھی جسے محسوس کر کے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ فی زمانہ جس قدر نفسانفسی کا عالم تھا اس میں حامد راؤ کے گھرانے جیسے وضع دار گھرانے بس انگلیوں پر گنے چنے ہی باقی رہ گئے ہوں گے۔ اس طرح کے لوگ قابلِ قدر بھی تھے اور قابلِ ستائش بھی چنانچہ اس نے کسی بھی قسم کی کنجوسی سے کام لیے بغیر مقصود کے سامنے تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ اس کی تعریفیں سن کر مقصود کے چہرے پر خفت بھرے تاثرات ابھر آئے۔ اس جیسے روایت پرست گھرانے کے لڑکے کے لیے وہ تعریفیں یقیناً کھسیاہٹ کا سبب بن رہی تھیں چنانچہ اسے درمیان میں ہی روک کر شرمیلے پن سے بولا۔

''آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ ہم نے آپ کے لیے ایسی کون سی زحمت اٹھائی ہے۔ بس جیسے خود کھاتے پیتے اور رہتے سہتے ہیں، اس میں آپ کو بھی شامل کر لیا۔'' مقصود کے لہجے میں وہی روایتی عاجزی تھی جو اس جیسے لوگوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ پھر اس نے تیزی سے موضوعِ سخن تبدیل کر لیا اور کچھ عجلت سے بولا۔

''باتوں میں لگ کر اصل کام تو رہ ہی گیا۔ آپ بس دو منٹ انتظار کریں، میں آپ کے لیے کھانا لے کر آتا ہوں۔''

''میرے خیال میں اب کھانے کو رہنے ہی دو۔ اس وقت کھانا کھا لیا تو پھر رات کے کھانے پر تم لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ بہتر ہے کہ میں ابھی چائے پر گزارہ کر لوں تاکہ رات کا کھانا صحیح وقت پر کھا سکوں۔'' اس نے مقصود کو کھانے کے لیے منع کر کے بے تکلفی سے چائے کی فرمائش کر دی۔ جب مہمان اتنا مخلص ہو تو پھر میزبان کے لیے بھی غیر ضروری تکلف بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے البتہ مقصود اس کے ایک وقت کا کھانا گول کر دینے کے خیال سے تذبذب میں پڑ گیا لیکن پھر کچھ سوچ کر اعتراض نہیں کیا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''ذرا میری بیگم تک بھی کل صبح روانگی کا پیغام پہنچا دینا۔'' اس نے ماہ بانو کے بروقت تیار رہنے کے خیال سے اس کے لیے پیغام نوٹ کروایا۔

''جی بہتر ہے۔ ویسے اگر آپ کہیں تو میں بھابی جی کو یہاں بھجوا دوں؟ اماں اور انیلا نے تو دوپہر میں بھی انہیں پیشکش کی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو آپ والے کمرے میں سونے کے لیے جا سکتی ہیں لیکن انہوں نے سونے کے مقابلے میں خواتین کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرنا زیادہ پسند کیا۔'' فرماں برداری کے مظاہرے کے ساتھ ہی ماہ بانو کو بھیجنے کی پیشکش کے علاوہ اس نے باقی تفصیلات بھی فراہم کر دیں۔

''میرے خیال میں اب بھی وہ خواتین کے ساتھ گپ شپ کو انجوائے کر رہی ہوگی۔ اسے ڈسٹرب کرنے کے بجائے صرف پیغام بھجوانے پر اکتفا کر لیا جائے تو یہ بھی مناسب ہی رہے گا۔'' وہ سمجھ سکتا تھا کہ ماہ بانو تنہا اس کے ساتھ اس کمرے میں سونے سے گریزاں ہوگی اس لیے ہلکے پھلکے انداز میں مقصود کی پیشکش مسترد کر دی جس پر وہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے واپس آنے تک اسلم فارغ تھا چنانچہ اپنے ہتھیاروں کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا اور پہلے اپنی ٹانگ کے ساتھ بندھا دھاردار خنجر نکال کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ خنجر کے چند منٹ کے معائنے میں ہی وہ اس کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔ خنجر کے بعد پسٹل کی باری آئی۔ سونے سے پہلے اس نے اپنا پسٹل تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا تاکہ وقت ضرورت کام آ سکے۔ پسٹل بھی بالکل صحیح حالت میں تھا اور ایمرجنسی میں بس سیفٹی کیچ ہٹا کر لبلبی دبانے کی کسر باقی تھی۔

اس طرف سے مطمئن ہو کر اس نے پسٹل واپس تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ اس وقت وہ ایک محفوظ اور معزز گھرانے میں موجود تھا اور یہاں ان ہتھیاروں کی اسے چنداں ضرورت نہیں تھی لیکن اپنے ہتھیاروں کی روزانہ دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کرنے کی برسوں سے ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ اس معمول کو ترک کرنا ذرا مشکل تھا۔ وہ تو اس کی رائفل اس کے بجائے ماہ بانو کے پاس تھی ورنہ وہ اسے بھی ضرور چیک کرتا۔ پہاڑوں پر سے آبادی میں داخل ہوتے وقت ماہ بانو نے رائفل اپنی چادر میں چھپا کر ساتھ لے لی تھی اور وہ ابھی تک اسی کے قبضے میں تھی۔ اسلم کو اندازہ نہیں تھا کہ اس رائفل کے بارے میں اس نے حامد راؤ کے گھر کی خواتین کو کیا بتایا تھا اور کس طرح مطمئن کیا تھا کیونکہ بہرحال یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ رائفل ان لوگوں کی نظر میں نہ آ سکی ہو۔ بہت کارآمد ہتھیار ہونے کے ساتھ رائفل میں یہی خرابی تھی کہ اسے چھپانا آسان نہیں تھا۔

مقصود کی واپسی تقریباً دس بارہ منٹ بعد ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں اسٹیل کی ایک بڑی سی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ یہ ٹرے جب اسلم کے سامنے رکھی گئی تو اس نے دیکھا کہ ٹرے میں چائے کے برتنوں کے ساتھ ساتھ دیگر کئی لوازمات بھی موجود ہیں۔ شاید مقصود نے اس کی بھوک کا خیال کر کے چائے کے ساتھ یہ اہتمام کروایا تھا اور ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہی مصر ہو گیا تھا کہ اسے ٹرے میں موجود ہر شے اس کے معدے میں منتقل ہو جائے۔ ان لوازمات میں بازاری نمکو وغیرہ کے علاوہ گھر کے بنے ہوئے شامی کباب اور بیسن کا حلوہ بھی شامل تھا اور یہ دونوں ہی چیزیں اتنی مزیدار تھیں کہ اسے تکلف برطرف رکھنا پڑا۔ اس کے باوجود مقصود اسے مزید کھلانے پر بضد تھا۔

''بس میرے بھائی! میرے معدے پر رحم کرو۔ یہ سب چیزیں بے شک بہت مزے کی ہیں لیکن ابھی سے سیر ہو کر میں رات کے کھانے سے ہرگز بھی محروم نہیں ہونا چاہتا۔'' اس نے باضابطہ دونوں ہاتھ مقصود کے سامنے باندھ دیے تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا اور یوں اس کی کھانے پینے سے گلوخلاصی ہو گئی۔

''اگر آپ مزید آرام کرنا چاہیں تو اسی کمرے میں کر سکتے ہیں ورنہ اگر گپ شپ کا موڈ ہو تو بیٹھک میں چلے جائیں، اباجی وہیں ہیں۔ میں بھی یہ برتن اندر پہنچا کر وہیں آتا ہوں۔'' مقصود نے اس کے سامنے دونوں آپشن رکھ دیے جس میں سے اس نے بیٹھک میں جانے والی پیشکش قبول کر لی۔ جتنا آرام وہ کر چکا تھا، اس کے بعد یہ محسوس ہو رہا تھا کہ رات کو نیند دیر سے ہی آ سکے گی۔ مزید آرام کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر ضرورت محسوس بھی ہوتی تو وہ اپنے مخلص میزبانوں کی محبت پر اسے قربان کر دیتا کہ ایسے نادر روزگار لوگوں کا ساتھ روز روز میسر نہیں آتا۔

''اخاہ۔۔۔ نیند پوری ہو گئی تمہاری۔ آؤ یہاں میرے پاس چلے آؤ۔'' وہ دستک دے کر بیٹھک میں داخل ہوا تو حامد راؤ نے اس کا خوش دلی سے استقبال کیا۔ وہ مسکراتا ہوا اس کے سامنے جا بیٹھا۔ حامد راؤ کے سامنے بساط بچھی ہوئی تھی اور وہ اس پر مہرے سجائے بڑے مصروف نظر آ رہے تھے۔

''کچھ کھایا پیا بھی یا سیدھے یہیں چلے آ رہے ہو؟'' نظریں مہروں پر جمی ہونے کے باوجود وہ اس کی طرف سے غافل نہیں تھے۔

''آپ کے فرماں بردار صاحب زادے کی موجودگی میں بھلا میرا بھوکا رہنا کیسے ممکن تھا۔ آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ اس دور میں اتنا فرماں بردار اور وضع دار بیٹا ملا ہے۔'' وہ حامد راؤ کے سامنے مقصود کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا جسے سن کر ان کے ہونٹوں پر بس لمحہ بھر کے لیے فخریہ سی مسکراہٹ جھلکی لیکن انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اسلم بھی ان کے مزاج کو کسی حد تک سمجھ گیا تھا۔ وہ ایک سیدھے سادے اور کھرے آدمی تھے جن سے یہ امید کی ہی نہیں جا سکتی تھی کہ وہ اپنی اولاد کی ذرا سی تعریف سن کر سینہ پھلا کر بیٹھ جاتے اور اپنی اچھی تربیت کے گن گانے لگتے۔

''آپ کیا اکیلے ہی شطرنج کھیلنے کے شوقین ہیں؟'' اتنی دیر میں وہ دیکھ چکا تھا کہ حامد راؤ دونوں طرف کی چالیں خود ہی چل رہے تھے اس لیے یہ سوال کر بیٹھا ورنہ بیٹھک میں داخل ہوتے وقت تو وہ یہی سمجھا تھا کہ باپ بیٹے مل کر کھیل رہے ہوں گے اور مقصود اس کی خاطر تواضع کے لیے درمیان سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ اپنے اس خیال میں وہ اس لیے بھی حق بجانب تھا کہ مقصود نے واپس بیٹھک میں آنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

''مجبوری ہے، اکیلے ہی کھیلنا پڑتا ہے۔ مقصود ہر معاملے میں بے حد لائق ہونے کے باوجود شطرنج میں حد سے زیادہ نکما ہے۔ بہت کوشش کی کہ کسی طرح اسے شطرنج کھیلنی آ جائے لیکن نالائق کو آج تک ڈھنگ کی ایک چال چلنی نہیں آئی اور اناڑی بندے کے ساتھ کھیلنے میں مجھے مزہ نہیں آتا۔ اس سے بہتر مجھے یہی لگتا ہے کہ دونوں طرف سے خود ہی کھیل لوں۔ کم از کم مقابلہ تو برابری کا رہتا ہے۔'' وہ دیکھ رہا تھا کہ حامد راؤ نے خود کو سنبھال لیا ہے اور اس موڈ سے نکل آئے ہیں جو صبح ان پر طاری تھا۔ شاید انہوں نے شفقت راؤ کے اقدام پر جلنے کڑھنے کے بجائے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا اور اطمینان اور صبر سے وقت گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شفقت راؤ منظر پر آتا تو ان لوگوں کی بہت سی الجھنیں خودبخود ہی دور ہو جاتیں اور وہ دونوں دوست مل کر یقیناً آئندہ کا کوئی لائحہ عمل طے کر لیتے۔ حامد راؤ کی سوچ جو بھی

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی، اس نے جاننے کے لیے دوبارہ اس ناخوشگوار موضوع کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور گلا کھنکھارتے ہوئے ذرا شوخی سے بولا۔

''اگر آپ پسند کریں تو ایک گیم میرے ساتھ کھیل لیں۔ مجھے مہارت کا تو دعویٰ نہیں لیکن پھر بھی آپ اتنا اناڑی نہیں پائیں گے کہ کھیل سے لطف اندوز نہ ہو سکیں۔ تھوڑی بہت اس کھیل کی سوجھ بوجھ مجھے بھی ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ کے تھوڑا بہت کھیل جاننے سے یہ فائدہ ہوگا کہ بازی بوریت سے بھی بچ جائیں گے اور جیت بھی انہی کی ہوگی۔'' مقصود جو ابھی ابھی اس بیٹھک یا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا، شوخی سے بولا جس پر حامد راؤ نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر منہ پھیر کر مسکراہٹ پر قابو پالینے کے بعد رعب دار لہجے میں بولے۔

''تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہے؟ کیا تم مجھ پر یہ الزام لگانا چاہ رہے ہو کہ میں صرف جیتنے کے لیے کھیلتا ہوں؟''

''تو اس میں غلط کیا ہے؟ ہر کھلاڑی جیتنے کی نیت سے ہی میدان میں اترتا ہے۔'' انتہائی اطمینان سے جواب دیتے ہوئے مقصود نے ایک کرسی سنبھال لی۔ اس وقت اس کا اپنے باپ سے رویہ ایسا تھا جیسے کوئی بڑا کسی بچے کو کوئی بات سمجھا رہا ہو۔ پہلی بار اسلم کو احساس ہوا کہ باپ بیٹے میں صرف احکامات کے اجرا اور فرماں برداری کا تعلق ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسرے کے اچھے دوست بھی ہیں۔ البتہ مقصود کے اندر حالات کی نزاکت کو سمجھنے اور موقع محل دیکھ کر بات کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ صبح حامد راؤ کے چہرے پر پریشان کن تاثرات تھے تو مقصود بھی خول میں سمٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اب ان کا موڈ بحال ہو گیا تو اس کی بھی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔

''اس نالائق کی باتوں کو رہنے دو اسلم میاں! آؤ ہم بساط سجاتے ہیں۔'' حامد راؤ نے مصنوعی غصے کے اظہار کے لیے منہ بنایا اور مقصود کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر جو ان دونوں کے درمیان کھیل شروع ہوا تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ کھیلنے کے دوران وہ آپس میں گفتگو بھی کرتے جا رہے تھے۔ اس گفتگو کے ذریعے اسے معلوم ہوا کہ مقصود نے ایگری کلچر میں گریجویٹ کیا ہوا ہے لیکن کہیں شہر میں رہ کر نوکری کرنے کے بجائے باپ کی فرمائش پر گاؤں میں رہ رہا ہے اور اپنے علم کی روشنی میں اپنی زمینوں پر کام کرنے والے مزارعوں کی راہنمائی کرتا ہے۔ حامد راؤ بیٹے کی اس فرماں برداری پر بہت خوش تھے کیونکہ ان کے خیال میں علم اور محنت جب ہوں تو زیادہ بہتر نتائج سامنے آتے ہیں اور ان کے اس خیال پر مہرِ تصدیق اس لیے ثبت ہو گئی تھی کہ واقعی جب سے مقصود نے ان کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کیا تھا، پیداوار بڑھ گئی تھی۔ ان کے کھیتوں اور باغوں میں اگنے والی سبزیاں اور پھل اتنے عمدہ معیار کے ہوتے کہ خریدار پیشگی بکنگ کروا دیتے تھے۔

مقصود کے حوالے سے حامد راؤ کی آنکھوں میں چمکتے فخر اور ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ نے جہاں اسلم کو خوش کیا، وہیں دل کی اتھاہ گہرائیوں میں درد کی لہریں بھی اٹھنے لگیں۔ حامد راؤ کو دیکھ کر اسے بے ساختہ ہی اپنے باپ کی یاد آ گئی تھی۔ اس کا سادہ لوح باپ بھی تو اس کے حوالے سے ایسے ہی کچھ خواب دیکھتا تھا۔ اس کے دل میں بھی یہی خواہش تھی کہ اسلم پڑھ لکھ کر کسی اونچے عہدے پر فائز ہو جائے تاکہ اپنے پسماندہ گاؤں کی ترقی اور خوش حالی کے لیے کچھ کر سکے۔ بدقسمتی سے اس کے باپ کو اتنی مہلت ہی نہیں ملی کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنے زیرِ سایہ تربیت دیتا۔ باپ کی وفات کے بعد ماں اور بہن نے ان تھک محنت سے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوشش کی لیکن یہاں ایک بار پھر قسمت انہیں مات دے گئی اور حالات کی ستم ظریفی سے وہ کتاب اور قلم کا ساتھ چھوڑ کر ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی زندگی کے کئی قیمتی برس حالات کے انہی تھپیڑوں کو سہتے ہوئے گزر گئے تھے۔ اور اسے جس گاؤں کی خوش حالی کے لیے کام کرنا تھا، وہاں قدم رکھنے سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ اب ماہ بانو کے زندگی میں آ جانے سے اسے یہ سنہری موقع ملا تھا کہ وہ ایک بار پھر اپنی زندگی کو بدل سکے چنانچہ وہ ہر حال میں اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے کوشاں تھا۔ ابتدا میں ہی حامد راؤ جیسے شخص سے واسطہ پڑنے کی وجہ سے اس کے دل میں یہ خوش امیدی بھی پیدا ہو گئی تھی کہ آگے بھی قدرت اس کے لیے آسانیاں پیدا کر دے گی۔

''آپ دونوں کا کھیل دیکھ کر تو مجھے لگ رہا ہے کہ رات بھر میں بھی ہار جیت کا فیصلہ نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے میرے خیال میں بہتر ہے کہ پہلے کھانا کھا لیا جائے پھر اگر آپ لوگ چاہیں تو اپنا کھیل جاری رکھ سکتے ہیں۔'' خیالات میں ڈوبے ہونے کے باوجود اس کا کھیل پر ارتکاز کم نہیں ہوا تھا، جب ہی مقصود کے ٹوکنے پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے پیٹ میں مروڑ اٹھنے کے باوجود وہ بس جم کر بیٹھنے پر مجبور ہو۔ اسے بے ساختہ ہی ہنسی آ گئی۔

''چلو اسلم میاں! اس کے کہنے پر کھانا کھا لیتے ہیں ورنہ یہ اسی طرح یہاں بیٹھ کر جلتا رہے گا۔'' حامد راؤ نے بھی بیٹے کے تاثرات ملاحظہ کیے تھے اور اب اسے چھیڑنے والے انداز میں اسلم سے مخاطب تھے۔

''مجھے جلنے کڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے صرف اس خیال سے آپ لوگوں کو ٹوکا ہے کہ اسلم بھائی نے دوپہر کا کھانا کھانے کے بجائے صرف چائے پر اکتفا کیا تھا۔ پھر صبح ہی انہیں سفر پر نکلنا ہے اس لیے بہتر ہے کہ رات کا کھانا وقت پر کھا لیا جائے۔'' مقصود نے فوراً ہی وضاحت پیش کی جسے سن کر حامد راؤ بوکھلا گئے۔

''ارے بھئی یہ کیا؟ تم نے دوپہر کا کھانا کیوں نہیں کھایا؟ اور تم بھی یہ بات اب بتا رہے ہو۔ اگر ایسا کوئی معاملہ تھا تو کھانا اور بھی جلدی لگوا لینا چاہیے تھا۔'' وہ اسلم سے بات کرتے کرتے بیٹے کی طرف متوجہ ہو گئے اور اسے سرزنش کرنے لگے۔

''آپ فکر نہیں کریں، میں نے بے شک کھانا نہیں کھایا لیکن چائے کے ساتھ بھی مقصود نے اتنا کچھ کھلا دیا تھا کہ پیٹ اچھا خاصا بھر گیا ہے۔ البتہ مقصود کا یہ خیال بالکل ٹھیک ہے کہ ہمیں رات کا کھانا کھا لینا چاہیے۔ صبح سفر کے لیے نکلنا ہے اس لیے مقصود کا بھرپور نیند لینا ضروری ہے ورنہ اسے ڈرائیو کرنے میں مشکل ہوگی۔'' اسلم نے فوراً ہی مقصود کی حمایت کی ذمے داری سنبھال لی جس پر حامد راؤ کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ کھانا کھانے کا پروگرام طے ہو جانے کے بعد بساط سمیٹ لی گئی کیونکہ حامد راؤ نے اس کے ساتھ کھیل کا لطف آنے کا اعتراف کرنے کے ساتھ ہی یہ کہہ کر کہ سفر تو اسلم کو بھی کرنا ہے اس لیے رات کو جاگ کر کھیلنے کے بجائے اس کا آرام کرنا بھی ضروری ہے، کھیل جاری رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ بساط سمیٹ کر وہ لوگ منہ ہاتھ وغیرہ دھو کر واپس وہاں آ کر بیٹھے تو مقصود کھانے کے برتن وغیرہ سجانے کا آغاز کر چکا تھا۔ کھانے پر اچھا خاصا اہتمام کیا گیا تھا چنانچہ زنان خانے سے یہاں تک کھانا لانے کے لیے اسے کئی چکر لگانے پڑے۔ اسلم کو اندازہ تھا کہ وہ بے چارہ اس کی وجہ سے اس مشقت میں پڑ گیا ہے ورنہ وہ اور حامد راؤ تو ظاہر ہے گھر والوں کے ساتھ ہی کھاتے پیتے ہوں گے اور اس صورت میں دسترخوان پر کھانا چننے کی ذمے داری خواتین کے سر ہی ہوتی ہوگی۔ اس نے زبان سے بھی مقصود کو اپنی وجہ سے ہونے والی اس زحمت کا اظہار کر دیا جسے سن کر حامد راؤ فوراً ہی بول پڑے۔

''زحمت کیسی؟ یہ میرا بیٹا ہے اور مہمان نوازی کی روایت اسے مجھ سے ورثے میں ملی ہے۔ تم یہ گمان نہ کرو کہ صرف تمہاری خاطر یہاں کچھ انوکھا ہو رہا ہے۔ اللہ کے فضل سے اکثر و بیشتر ہی ہمارے دسترخوان پر کوئی نہ کوئی مہمان موجود ہوتا ہے۔ ہاں، اتنا ضرور ہے کہ عام دنوں میں یہ سارے کام جو اس وقت تمہیں مقصود کرتا ہوا نظر آ رہا ہے، ایک ملازمہ انجام دیتی ہے۔ صبح ناشتے کے وقت تم نے اس ملازمہ کو دیکھا بھی ہوگا۔ گھر کی خواتین کی مدد اور زنان خانے سے مردانے تک بھاگ دوڑ کی ذمے داری صبح سے شام تک اسی کے سر ہوتی ہے لیکن آج اتفاق سے اس بے چاری کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ صبح ناشتے کے فوراً بعد ہی چھٹی لے کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔'' حامد راؤ کے اس جواب نے اس کی ہر الجھن دور کر دی ورنہ اس کے دل میں بھی یہ خیال آیا تھا کہ صبح نظر آنے والی ملازمہ دوبارہ کیوں نظر نہیں آئی اور مقصود کو ہی سارے کام کیوں انجام دینے پڑ رہے

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر وہ اپنے میزبانوں کی دعوت پر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کھانا خوش رنگ، خوشبودار اور خوش ذائقہ تھا۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ کھانے کے بعد لیمو والی سبز چائے کی پیالیاں پیش کی گئیں جس سے کھانے کا لطف دوبالا ہو گیا۔ وہ فارغ ہو کر اس محفل سے اٹھا تو بہت سرشار تھا اور سرشاری کے اس احساس کے ساتھ بے حد مگن سا اپنے لیے مخصوص کیے گئے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا اباجی کہ اچانک اماں کو کیا ہو گیا تھا۔ میری جب ان سے آخری بار بات ہوئی تھی تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں۔ انہوں نے مجھ سے اپنی کسی تکلیف کا ذکر نہیں کیا تھا پھر بالکل اچانک ہی ایسا کیا ہو گیا کہ انہیں علاج کے لیے لندن بھجوانا پڑا اور وہ وہاں بھی جانبر نہیں ہو سکیں۔ اتنے قابل ڈاکٹر ہیں لندن میں، ان میں سے کسی کو اماں کی بیماری سمجھ نہیں آئی۔ آپ کو مجھے پہلے سے بتانا تو چاہیے تھا۔ میں خود لندن آتا اور وہاں آ کر ڈاکٹروں سے بات کرتا۔" یہ مراد شاہ تھا، چوہدری افتخار عالم شاہ کا بڑا بیٹا اور وارث جو ماں کے اچانک چل بسنے کی خبر سن کر فون پر باپ سے شکوے کر رہا تھا۔

"بس پتر۔۔۔ کیا کر سکتے ہیں۔ بیماری اور موت پر آدمی کا زور تھوڑی چلتا ہے۔ تیری ماں کو اچانک ہی بیماری نے اس طرح لپیٹ میں لیا کہ دنوں میں ہی اس کا حال خراب ہو گیا۔ میں نے تو اسے بچانے کے لیے اپنی پوری کوشش کر ڈالی۔ جھٹ پٹ لندن بھی بھجوا دیا لیکن جب آدمی کا وقت پورا ہو جائے نا تو ساری دنیا کی طاقتیں مل کر بھی اس کی زندگی نہیں بڑھا سکتیں۔ ملک الموت جب روح قبض کرنے آ جائے تو پھر خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔" وہ بڑے فلسفیانہ انداز میں بیٹے کو سمجھا رہا تھا۔ لندن کے چند روز قیام میں اس نے اپنے لیے دل بھر کر خوشیاں کشید کی تھیں۔ مسز الفا کی وجہ سے وہ ایک بار ضرور لنڈا سے محروم ہوا تھا لیکن اس کے بعد لنڈا نے پوری دو راتیں اس کے ساتھ گزاری تھیں۔ لنڈا کی لندن سے روانگی کے بعد بھی وہاں حسن و شباب کی کوئی کمی نہیں تھی چنانچہ وہ خوب جی بھر کر عیش کرتا رہا تھا۔ ادھر پاکستان اور امریکا میں اس کے بچے اپنی ماں کی طرف سے فکرمند تھے لیکن اس نے چالاکی یہ کی تھی کہ روانگی والے دن تک کسی کو وڈی چوہدرائن کے مرنے کی اطلاع نہیں دی تھی اور کوشش کرتا تھا کہ کم ہی کسی کی فون کال اٹینڈ کرے۔ کبھی کسی سے بات کر بھی لیتا تھا تو طفل تسلیاں دے ڈالتا تھا۔ اب اچانک اس کی طرف سے چوہدرائن کے مرنے کی اطلاع پہنچنے پر سب ہی صدمے میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مراد شاہ نے اس اطلاع کا سب سے گہرا اثر لیا تھا کیونکہ وہ بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے ماں کا بہت لاڈلا بھی تھا اور پھر اسے یہ خلش بھی تھی کہ طویل عرصے سے دیارِ غیر میں قیام کی وجہ سے وہ جیتی جاگتی ماں کی شکل بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔

"آپ کی ہر بات ٹھیک ہے اباجی لیکن دل میں خلش سی ہے کہ کچھ نہیں تو کاش آخری دنوں میں مجھے اماں کی خدمت کا موقع ہی مل جاتا۔ آپ نے مجھ پر یہ بڑا ظلم کیا کہ آخر تک اصل صورت حال سے آگاہ ہی نہیں کیا۔" مراد شاہ اس سے شکوے کر رہا تھا۔ اب وہ اسے کیسے بتاتا کہ اس نے خصوصیت کے ساتھ اسے بے خبر رکھنے کی کوشش کی تھی کیونکہ اسے علم تھا کہ ایک مراد شاہ ہی تھا جو اصل صورت حال جاننے کے لیے لندن پہنچنے کی کوشش کرتا اور اس کے لندن آنے کا مطلب تھا کہ چوہدری کے جھوٹ کا سارا پول کھل جاتا چنانچہ آواز پر رقت طاری کرتے ہوئے مکاری سے بولا۔

"تو جسے ظلم کہہ رہا ہے نا پتر وہ میری محبت تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جس تکلیف سے میں دن رات گزر رہا ہوں، میری اولاد بھی اس میں مبتلا ہو۔ مجھے تو تیرا اور تیری بہنوں کا اتنا خیال ہے کہ میں نے تیری ماں کے مرنے کے بعد بھی فوراً اطلاع اس لیے نہیں دی کہ میت کے پاکستان پہنچنے تک تم لوگ انتظار کی سولی پر لٹکے رہو گے۔ میں تنہا اپنی جان پر سب سہتا رہا لیکن تم لوگوں کو پریشان کرنا گوارا نہیں کیا۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ برسوں سے زندگی کے دکھ سکھ میں شریک رہنے والی کے بچھڑ جانے پر میرا کیا حال ہے۔ جی تو بھی چاہتا تھا کہ دن رات بس بستر پر پڑا روتا رہوں لیکن تیری ماں کو پاکستان لے جانے کے لیے دوڑ دھوپ بھی تو کرنی تھی۔ روتے بلکتے دل کے ساتھ میں نے یہ کام کیسے نبیڑا، یہ میں ہی جانتا ہوں۔" اپنی بات میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے وہ آخر میں بلک بلک کر رونے کی اداکاری بھی کرنے لگا۔ فون کے دوسری طرف موجود بیٹا اس کی آواز ہی سن سکتا تھا، تصویر تو اس کے سامنے تھی نہیں جو حقیقت جان سکتا چنانچہ اس صورت حال پر بوکھلا گیا اور وضاحتیں پیش کرنے لگا۔

"میرا مقصد یہ نہیں تھا اباجی! اگر میری کسی بات سے آپ کا دل دکھا ہے تو میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ میں تو بس اپنے دل کی خلش کی بات کر رہا تھا ورنہ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ آپ سے بڑھ کر کسی کو اماں کا خیال نہیں ہو سکتا تھا۔"

"چل چھڈ اس گل کو۔ یہ بتا کہ تو حویلی کب تک پہنچے گا؟ تو آئے گا، جب ہی تیری ماں کی تدفین ہو گی۔ کچھ نہیں تو بدنصیب بیٹے کے ہاتھوں قبر میں ہی اتر جائے گی۔ تیرے ولایت رہنے پر ہمیشہ یہی خوف رہتا تھا اسے کہ جانے پتر جنازے کو کندھا دینے بھی آئے گا یا نہیں۔" بیٹے کے بوکھلا جانے پر اسے اطمینان ہو گیا کہ اب وہ اس سے مزید بازپرس نہیں کر سکے گا چنانچہ بے حد ہوشیاری سے ایک ایسی بات کہہ ڈالی جسے سن کر اس کے دل کا بوجھ مزید بڑھ جائے، ورنہ حقیقت یہ تھی کہ بے حد دبنگ اور ظالم وڈی چوہدرائن کو بھی مرنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا جو وہ اس قسم کی باتیں کرتی۔ وہ تو بڑے ٹھسے سے حویلی پر حکمرانی کر رہی تھی کہ اچانک ہی اپنی ایک غلط چال کے نتیجے میں چوہدری کے عتاب کا شکار ہو کر دنوں میں اپنی جان سے چلی گئی۔ اس نے تو اپنی طرف سے بڑی عقلمندی دکھائی تھی کہ بہزاد شاہ کی نام نہاد بیوی فریدہ کو حمل کے انتہائی نازک موڑ پر حادثاتی طور پر مروانے کی کوشش کی تھی تاکہ اس کے بطن سے حویلی کا کوئی نیا وارث جنم نہ لے سکے اور ساری جائداد اس کی اولاد کے حصے میں ہی آئے۔ اتفاق سے اس کی یہ سازش ناکام رہی اور فریدہ سیڑھیوں سے گرائے جانے کے باوجود نہ صرف خود زندہ رہی بلکہ اس کا بچہ بھی بچ گیا۔ ادھر وڈی چوہدرائن کے ستارے گردش میں تھے کہ چوہدری کو اس سازش کی خبر مل گئی اور اس نے اسے فریدہ کے ساتھ ظلم سے زیادہ اپنے ساتھ دھوکا دہی پر محمول کرتے ہوئے چوہدرائن کو تہ خانے کی ہولناک قید میں ڈال دیا جہاں ناقص غذا، آلودہ پانی، سیلن اور بے آرامی نے اسے فوراً ہی بیمار کر ڈالا۔

غیظ و غضب میں اس کے ساتھ یہ ہی سلوک کرنے والے چوہدری کو ذرا ہوش آیا تو یہ احساس ہوا کہ قید خانے سے آزادی ملنے کی صورت میں چوہدرائن اس کے ساتھ بغاوت پر اتر آئے گی اور اپنے میکے والوں کی مدد سے اس کا ناک میں دم کر دے گی۔ اس پریشانی سے بچنے کا بہترین حل یہی تھا کہ چوہدرائن کی زندگی ختم کر دی جائے۔ چنانچہ اس نے بہت ہوشیاری سے سارا کھیل کھیلا۔ چوہدرائن کے حویلی سے غیاب کو چھپانے کے لیے وہ پہلے ہی اس کے لاہور اور پھر وہاں سے لندن منتقل ہونے کی کہانی سنا چکا تھا چنانچہ جب زیلدا کی طرف سے اسے لندن جانے کا حکم ملا تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے لندن میں چوہدرائن کے مرنے کا ڈراما بھی رچانے کا فیصلہ کر ڈالا۔ اس طرح حویلی کے تہ خانے میں ہلاک کی جانے والی چوہدرائن کو نہایت رازداری سے ایک مردہ خانے میں منتقل کرنے کے بعد یہ ظاہر کرنے کا بندوبست کر لیا گیا کہ چوہدری افتخار عالم شاہ بہ نفسِ نفیس اپنی بیوی کے تابوت کے ساتھ لندن سے پاکستان واپس آ رہا ہے۔ اس کا دستِ راست منشی اللہ رکھا اس سازش میں پوری طرح اس کے ساتھ شامل تھا اور اتنی بھرپور معاونت کر رہا تھا کہ اسے کسی گڑبڑ کا اندیشہ نہیں تھا۔

"میں کوشش میں تو لگا ہوا ہوں کہ جلد سے جلد گاؤں پہنچ جاؤں لیکن پھر بھی مجھے پہنچنے میں دو سے تین دن تو لگ ہی جائیں گے۔" اس کی مکاریوں سے بے خبر مراد شاہ نے دھیرے سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ چوہدری نے اس پر جو نفسیاتی دباؤ ڈالا ہے، وہ پوری طرح اس کے زیرِ اثر آ گیا ہے اور فی الحال باپ کے ساتھ کسی قسم کی جرح نہیں کر سکتا۔

"تو پھر ٹھیک ہے پتر! اب حویلی میں ہی تجھ سے ملاقات ہو گی۔ مجھے یقین ہے کہ تیری [illegible] ماں کی روح تجھے حویلی میں دیکھ کر بہت خوش ہو گی۔" نرمی سے بولتے ہوئے وہ بیٹے کو ایک اور چرکا لگانے سے باز نہیں آیا۔ اگرچہ جوان بیٹے سے اس موضوع پر بات کرنے میں اسے ہاتھوں پسینا آ گیا تھا لیکن تجربے اور عیاری سے اس نے بیٹے کو اس طرح قابو کیا تھا کہ اس کی بنائی گئی کہانی میں کئی جھول ہونے کے باوجود وہ اس سے زیادہ بحث نہیں کر سکا تھا اور آئندہ بھی وہ ایسا کوئی موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

رنجیدہ اور شرمسار مراد شاہ نے جب اس سے اختتامی جملے بول کر فون بند کیا تو کچھ دیر قبل رقت زدہ نظر آنے والے چوہدری کے ہونٹوں پر بڑی جاندار سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اسی مسکراہٹ کے ساتھ اس برطانوی کال گرل کی طرف واپس پلٹا جو اردو سے ناواقفیت اور بوریت کے باعث وسکی سے شغل میں مصروف تھی۔ کال گرل اسے فارغ ہوتے دیکھ کر فوراً ہی اپنی پیشہ ورانہ اداؤں کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو گئی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر بیٹھنے کے ساتھ ایک ہاتھ کی انگلیوں سے اس کے رخساروں اور ٹھوڑی پر بڑھے ہوئے شیو کو سہلانے لگی۔ یہ شیو اس نے قصداً بڑھائی تھی تاکہ جب وہ پاکستان پہنچے تو زیادہ الم زدہ اور تھکا ہوا محسوس ہو۔ اس بڑھے ہوئے شیو کے ساتھ جب وہ سرخ آنکھوں اور مضمحل کیفیت میں پاکستان پہنچتا تو اس کی اولاد کو کیسے یقین نہیں آتا کہ ان کا باپ ان کی ماں کی دیکھ بھال میں دن رات مصروف رہا تھا اور اب اس کے مرنے پر غم سے بے حال تھا۔ اب یہ الگ بات تھی کہ آنکھوں کی یہ

...And Uploaded By Muhammad N...

WWW.PAKSOCIETY.COM

سرخی بے تحاشا شراب نوشی اور حسین کال گرلز کے ساتھ گزری راتوں کا تحفہ تھی۔

اب بھی اس کی روانگی میں محض چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ پھر بھی وہ اس کال گرل کے ساتھ مصروف تھا۔ شاید لندن سے روانہ ہونے سے قبل وہ یہاں سے کیف و سرور کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر پی لینا چاہتا تھا کیونکہ اسے علم تھا کہ اب حویلی میں بہت سے بے کیف دن اور راتیں اس کی منتظر ہوں گے۔ وڈی چودھرائن کی تدفین کے بعد بھی وہاں افسوس کے لیے آنے والوں کا جوتا تا بندھا تھا، اس سے آسانی سے جان چھوٹنی مشکل تھی۔ پھر دوسرا مسئلہ مراد شاہ کا بھی تھا۔ جو ..... چودھریوں سے کافی مختلف مزاج رکھنے والے بیٹے کی موجودگی میں وہ مکمل کر عیش نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے آنے والے دنوں کا سوچ کر خوب خوب موجیں کر رہا تھا۔ اس وقت اس کے کمرے میں موجود حسینہ کچھ ایسی خاص حسین نہیں تھی لیکن وہ اس کی گوری چمڑی اور سنہری زلفوں کے باعث اس پر نثار ہوا جا رہا تھا۔ اپنی پیشہ ورانہ مہارت اور صلاحیت کا مظاہرہ کرتی وہ کال گرل جو اس سے خود ہی آ چپکی تھی، اسے من مانیوں کے لیے خوب ہی چھوٹ دے رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ اس کمرے سے رخصت ہوگی تو طے شدہ معاوضے کے علاوہ بھی ایک بڑی رقم اس کے پرس میں منتقل ہو چکی ہوگی۔ اس کے تجربے نے اسے سکھایا تھا کہ ان مشرقی جاگیرداروں کے لیے سفید چمڑی والی عورتیں کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتیں۔ وہ ان پر جی بھر کر لٹاتے ہیں۔ وہ بھی اپنی اداؤں سے کام لے کر چودھری کو زیادہ سے زیادہ لوٹنے کی کوشش میں تھی۔ اگر ادائیں کم پڑ جاتیں تو عقل خبط کرنے کے لیے شراب کی بھری ہوئی بوتل بھی وہاں موجود تھی۔ یعنی شکار اس کے سامنے پوری طرح بے بس تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ دن رات اپنے مزارعوں کا خون پی کر اپنی تجوریاں بھر لینے والے ہوس پرست چودھری کو اس پر چند ہزار پاؤنڈ خرچ کرنے کے بعد کوئی دکھ نہیں ہونے والا تھا کیونکہ اب تو اس کالے دھن میں ہیروئن سے حاصل ہونے والی خطیر آمدنی بھی شامل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

شکم پری کے بعد اسلم بڑی موج میں اپنے لیے مخصوص کمرے کی طرف بڑھا تھا لیکن کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اسے بڑی زور کا جھٹکا لگا۔ وہ ڈبل بیڈ جس پر اب تک وہ سوتا رہا تھا، اس وقت ماہ بانو کے زیر تصرف تھا اور وہ سر سے سینے تک چادر تانے وہاں سو رہی تھی۔ اس کی یہاں موجودگی پر وہ آنکھیں پل پل حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے شک ہو رہا تھا کہ خمارِ گندم کہیں اس کے دماغ پر تو طاری نہیں ہو گیا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے بھی ماہ بانو کو اپنے بستر پر دیکھ رہا تھا ورنہ خواب میں تو خیر وہ ہر روز اس کے پہلو میں سوتی ہی تھی۔ اب اس کی اس بے یقینی کا خاتمہ اس وقت ہوا جب ماہ بانو ہڑبڑا کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔ یقیناً دروازہ کھولے جانے کی آواز پر اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اب وہ خود حیران پریشان سی اپنے سامنے موجود اسلم کو دیکھ رہی تھی۔

"تم یہاں اس کمرے میں کیا کر رہی ہو؟" آخر اسلم نے اپنے قدم آگے بڑھائے اور اس سے حیرت کے ساتھ دریافت کیا۔

"سو رہی ہوں اور کیا کر رہی ہوں؟" کچی نیند سے جاگنے کے باعث اس کی سیاہ آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے اور وہ کچھ جھنجلائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ تم یہاں کیوں سو رہی ہو؟ یہ کمرا تو میرے لیے مخصوص ہے۔" اسلم نے اپنے سوال کو مزید واضح کیا۔

"لیکن انیلا نے تو یہ کمرا مجھے سونے کے لیے دیا ہے۔ وہ خود مجھے اس کمرے تک چھوڑ کر گئی ہے۔" اس نے ترشی سے جواب دیا۔

"حیرت ہے۔" اسلم نے اپنی پیشانی کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے مسلا۔ "یہ کمرا میرے لیے مخصوص ہے، ناشتے کے بعد میں شام تک اسی کمرے میں سوتا رہا ہوں اور اب بھی کسی نے کوئی ذکر نہیں کیا کہ کوئی تبدیلی کر دی گئی ہے۔ پھر میرا کمرا تمہیں کیوں دے دیا گیا؟" وہ واقعی حیران تھا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" ماہ بانو بھی بے یقینی سے بس اتنا ہی کہہ سکی۔

"تم دن میں کہاں آرام کر رہی تھیں؟ ایسا کرو کہ اب بھی واپس وہیں جا کر سو جاؤ۔" اسلم کے ہاتھ گویا اس مسئلے کا حل آ گیا۔

"دن میں زیادہ دیر سوئی ہی نہیں، صرف ڈھائی تین گھنٹے کی نیند لی تھی اور اس کے لیے انیلا نے مجھے اپنا بیڈ روم دے دیا تھا۔ اب میں وہاں جا کر تو نہیں سو سکتی۔ ظاہر ہے اس وقت بیڈ روم میں اس کے ساتھ اس کا شوہر بھی موجود ہوگا۔" نیند خراب ہونے پر برے برے منہ بناتے ہوئے ماہ بانو نے رکھائی سے جواب دیا جسے سن کر یکدم ہی اسلم کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور ساری کہانی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے ان لوگوں سے ماہ بانو کو اپنی بیوی کی حیثیت سے متعارف

کروایا تھا اور اس تعارف کے بعد ان دونوں کو شب بسری کے لیے ایک کمرا مہیا کیا جانا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ان کے میزبانوں نے تو ایک طرح سے انہیں بہترین سہولت فراہم کی تھی لیکن وہ دونوں مشکل میں پڑ گئے تھے۔ اس نے اپنے ذہن میں آنے والا خیال ماہ بانو کے بھی گوش گزار کرایا۔

"تمہیں اس قسم کا جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" وہ سن کر جھلائی۔

"ضرورت یہ تھی کہ میں حقیقت بتا کر تمہیں اور خود کو ان لوگوں کے سامنے مشکوک نہیں ٹھہرانا چاہتا تھا، ورنہ تم خود ہی سوچو کہ کسی غیر مرد کے ساتھ ماری ماری پھرنے والی عورت کے بارے میں یہ لوگ کس انداز میں سوچتے؟ میرے خیال میں کسی مشکوک کردار کی عورت کو اپنے زنان خانے تک جانے کی اجازت دینا تو دور کی بات، یہ تمہیں اپنی چھت کے نیچے ایک رات بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اس وقت ہم یہاں معزز مہمانوں کی حیثیت سے رہ رہے ہیں تو شفقت راؤ کی سفارش کے علاوہ ہمارا غیر مشکوک کردار بھی اس سلسلے میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔" اس بار وہ اپنے لہجے میں تلخی در آنے سے نہ روک سکا۔ ماہ بانو نے اس تبدیلی کو فوراً ہی محسوس کر لیا اور شرمندہ سی ہو گئی۔ ویسے بھی نیند کے خمار میں ہونے کی وجہ سے اس کا ذہن وہ حقائق سمجھنے سے قاصر رہا تھا جو اسلم نے فوراً ہی اخذ کر لیے تھے چنانچہ فوراً ہی اپنے رویے کی خرابی کے لیے اس سے معذرت طلب کر لی۔

"معذرت کی ضرورت نہیں، مجھے تمہاری کٹ حجتی سے بس یونہی ذرا سا غصہ آ گیا تھا ورنہ میرے لیے تمہاری طرف سے دل میں کدورت رکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔" وہ فوراً ہی نرم پڑ گیا۔

"اب یہ سوچو کہ ہم کیا کریں۔ میں تو اس طرح یہاں نہیں سو سکتی۔" اس کا موڈ بحال ہوتے دیکھ کر وہ تیزی سے فوری درپیش مسئلے کی طرف آ گئی۔ حقیقت یہ تھی کہ اسلم کے مقابلے میں اس نے دن میں بہت کم آرام کیا تھا اور جاذر راؤ کی بیوی اور بہو کے ساتھ گپ شپ میں مصروف رہی تھی اس لیے اس وقت اسے بہت زوروں کی نیند آ رہی تھی۔

"ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں بیٹھک میں جا کر سو جاؤں لیکن گھر کے کسی فرد نے مجھے وہاں سوتے ہوئے دیکھ لیا تو کوئی اچھا تاثر نہیں ہوگا۔ وہ لوگ یہی گمان کریں گے کہ ہم اتنے جاہل اور اجڈ میاں بیوی ہیں کہ دوسروں کی چھت کے نیچے بھی جھگڑنے اور پھر اپنے جھگڑے کو کمرے کی چار دیواری تک محدود رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔" اسلم نے معاملے کی نزاکت کی طرف اس کی توجہ مبذول کروائی۔

"لیکن میں تمہارے ساتھ تنہا اس کمرے میں نہیں سو سکتی۔" وہ اپنی بات پر قائم تھی۔

"کیوں؟ کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟ اتنے دنوں کے ساتھ میں تمہیں میرے کردار کے بارے میں اتنا تو یقین ہو ہی جانا چاہیے کہ میں دھوکے سے تمہاری آبرو پر ہرگز بھی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ اگر مجھے ایسے کرنا ہوتا تو ڈیرے پر مجھے مکمل چھوٹ حاصل تھی۔ پھر ان ویران پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے بھی کئی ایسے موقع آئے کہ میں تم پر قابو پا سکتا تھا۔ اس ویرانے میں میرا ہاتھ روکنے والا کون تھا؟ تم خود بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتی ہو کہ اگر میں من مانی پر آ جاتا تو تمہارے اندر میرے مقابلے میں مزاحمت کی طاقت نہیں تھی۔ اگر اتنے عرصے تک میں نے اپنی طاقت اور خود مختاری کے باوجود تمہارے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی تو اس ایک رات میں کیا قیامت آ جائے گی؟ تم مجھ سے شادی کے لیے ہامی بھر چکی ہو اور آج نہیں تو کل مجھے تمہارے ساتھ ہی زندگی گزارنی ہے پھر مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ جائز طریقے سے حاصل ہو جانے والی چیز کو حرام کر کے کھاؤں۔" اس نے غصے میں بولنا شروع کیا تو بولتا ہی چلا گیا۔ اس بار ماہ بانو نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور سر سے پیر تک چادر اوڑھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اسے اسلم کے اس کمرے میں سونے پر اعتراض نہیں ہے اور وہ اس کے دیے ہوئے دلائل سے قائل ہو گئی ہے۔ اس کی اس حرکت پر اسلم نے اسے گھور کر دیکھا لیکن سر سے پیر تک چادر میں محصور ماہ بانو کے لیے یہ گھورنا بیکار تھا۔ وہ زمین پر دھپ دھپ پیر مارتا ہوا غسل خانے میں چلا گیا۔ وہاں اپنے چہرے پر پانی کے کئی چھپاکے مارنے کے بعد اس کا مزاج اعتدال پر آیا تو وہ واپس کمرے میں آ گیا۔

کمرے میں اس ڈبل بیڈ کے علاوہ جس پر ماہ بانو محو استراحت تھی، کوئی دوسرا ایسا فرنیچر نہیں تھا جسے وہ شب بسری کے لیے استعمال کر سکتا۔ بس فرش پر ایک پتلا سا کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ اس نے اسی کارپیٹ پر شب بسری کا فیصلہ کیا کیونکہ اسے اپنے کردار کی مضبوطی پر لاکھ یقین سہی، وہ ماہ بانو کے ساتھ بیڈ پر سونے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے خود بھی معلوم تھا کہ آگ اور تیل کی اس قدر قربت کسی ارادی

WWW.PAKSOCIETY.COM

عمل کے بغیر بھی تباہی لا سکتی ہے۔ اس نے بیڈ پر موجود دوسرا تکیہ اٹھایا اور نیچے کارپیٹ پر رکھ کر لیٹ گیا۔ وہ جب کمرے میں آیا تھا تو وہاں کی روشنیاں پہلے ہی سے گل تھیں اور نائٹ بلب کی ہلکی سی خواب آور روشنی نے ماحول کو سحر انگیز بنا رکھا تھا۔ اس سحر نے پہلے مرحلے پر اسے اس لیے نہیں گھیرا تھا کہ وہ بالکل غیر متوقع طور پر ماہ بانو کو وہاں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا اور ان کا سارا وقت صورتِ حال پہ تبادلہ اور بحث مباحثہ کرتے ہوئے گزر گیا تھا۔ اب جو وہ ذرا سکون سے لیٹا تو کمرے کے خوابیدہ ماحول نے اسے اپنے سحر میں جکڑنا شروع کر دیا۔ ابھی تک وہ کارپیٹ پہ چت لیٹا ہوا تھا۔ تبدیل ہوتی ذہنی و قلبی کیفیت نے اسے اکسایا کہ وہ کروٹ لے کر ماہ بانو کی طرف رخ کر لے۔

کروٹ لینے کے بعد اس نے آنکھوں کی جھری سے جائزہ لینے کی کوشش کی۔ نیچے لیٹے ہونے کی وجہ سے وہ واضح طور پر ماہ بانو کو نہیں دیکھ پا رہا تھا لیکن اتنا بہرحال پتا چل رہا تھا کہ وہ اب تک سر سے پیر تک اوڑھی گئی چادر کے حصار میں چھپی ہوئی ہے اور اس احتیاطی تدبیر کے باوجود اعصابی بے کلی کے باعث سونے سے محروم ہے۔ اس بار اس نے غصے میں مبتلا ہونے کے بجائے ٹھنڈے دل سے ماہ بانو کی کیفیت پر غور کیا تو وہ اسے اپنے طرزِ عمل میں حق بجانب نظر آئی۔ کسی بھی عورت کے لیے اس کی عزت کے آب دار موتی سے زیادہ قیمتی شے کوئی نہیں ہوتی۔ یہ موتی کسی زبردستی، مجبوری یا حادثے کے نتیجے میں اپنا آپ کھو بیٹھے تو عورت پل میں انمول سے بے مول ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو اگر اپنے بے مول ہو جانے سے ڈر رہی تھی تو یہ ایسی کوئی بات نہیں تھی جسے محسوس کر کے وہ اس پر غصہ کرتا۔

اس نے اپنے جن دلائل کی مدد سے اسے یہاں سونے رہنے پر آمادہ کر لیا تھا، اس کمرے کی نیلگوں اور خوابیدہ فضا میں خود اسے ہی بودے معلوم ہونے لگے تھے۔ یہ آرام دہ بند کمرا ڈاکوؤں کے ڈیرے یا پہاڑی سلسلے سے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ ڈاکوؤں کے ڈیرے پہ اگر آزادی اور خواہش کے باوجود اس نے ماہ بانو کو نہیں چھوا تھا تو اس عمل میں ماہ بانو کی عزت و تکریم کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی کارفرما تھا کہ اس کے ساتھی ڈاکوؤں پر عرصے سے اس کی راست بازی اور اعلیٰ کرداری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی جسے وہ مٹانا نہیں چاہتا تھا۔ رہا پہاڑی سلسلے میں سفر کا معاملہ تو ایسے مخدوش حالات میں جبکہ بندے کی اپنی جان پر بنی ہوئی ہو ایسی خرمستیاں کب سوجھتی ہیں؟ اس کا اصل ماحول تو یہاں اس پُرتعیش کمرے میں شروع ہوا تھا جہاں کی رومان پرور فضا مسلسل اس کے اندر میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کے لیے اس نے فوراً ہی مخالف سمت کروٹ لے لی۔ اب ماہ بانو اس کی نظروں سے اوجھل تھی پھر بھی وہ کمرے میں اس کی مہک کو محسوس کر سکتا تھا۔ خود پر بے انتہا جبر کرتے ہوئے وہ اپنا دھیان اس کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کوشش میں کتنا وقت گزرا اس کا تو اسے اندازہ نہیں ہوا لیکن یہ طے تھا کہ ایک ایک پل بڑی مشکل سے گزر رہا تھا اور وہ باوجود کوشش کے ایک بار بھی پلک تک نہیں جھپکا سکا تھا۔ شاید اس میں کچھ دخل دن میں لی جانے والی بھرپور نیند کا بھی تھا۔ بہرحال جو بھی بات تھی، اب اس کے لیے ایک ہی پہلو پہ لیٹے رہنا ممکن نہیں رہا تھا چنانچہ وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ پہ اٹھ بیٹھا۔ اٹھتے ہی اس کی نظر ماہ بانو کے بستر کی طرف گئی جو وہ بالکل بے خبر سو رہی تھی۔ شاید بے چینی اور اضطراب پہ نیند کی شدت غالب آ گئی تھی جس نے اسے مزید جاگنے نہیں دیا تھا اور سوتے میں وہ چادر کی قید سے بھی آزاد ہو گئی تھی۔ اسلم اسے اس حالت میں دیکھ کر ٹھٹک رہ گیا۔ ڈبل بیڈ پہ پڑے اس کے جسم کے سارے نشیب و فراز اور خال و خد نیلگوں روشنی کی انعکاس کے ساتھ عجب ہی سحر پیدا کر رہے تھے۔ اس کا دل بہت شدت سے ماہ بانو کے قرب کے لیے مچلا مگر اس سے قبل کہ ضبط کے بندھن ٹوٹتے وہ بدحواس سا کمرے سے باہر نکل گیا۔ کسی بدترین جرم سے بچنے کے لیے فی الحال یہی مناسب تھا۔ باہر نکلنے کے بعد وہ یونہی برآمدے میں آگے بڑھ رہا تھا کہ سیڑھیوں پہ نظر پڑ گئی۔ مقصود پہلے اس کے استفسار پر اسے بتا چکا تھا کہ یہ سیڑھیاں چھت پہ جاتی ہیں جہاں ان کے پالتو آسٹریلین طوطوں کے پنجرے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ بنا سوچے سمجھے سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا جہاں رات کی لحظہ بہ لحظہ ٹھنڈی ہوتی ہوا نے اس کے تپتے بدن پر حیرت انگیز اثر کیا اور وہ خود کو قدرے ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے چھت پہ ہی ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ چند منٹ کے لیے چھت پہ بنی باؤنڈری وال کے ساتھ جا کھڑا ہوا اور دیوار کی منڈیر پہ ہتھیلیاں جما کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی اسے کھڑے چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ وہ بری طرح چونک گیا۔ یقینی طور پر وہ کچھ انسانی سائے ہی تھے جو حامد راؤ کے مکان کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسے لگا کہ اس کی بصارت اسے دھوکا دے رہی ہے۔ وہ جس قسم کے حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچا تھا، اس میں اس قسم کا فریب نظر ناممکنات میں سے بھی نہیں تھا۔ زندگی کی بقا کے لیے دشمنوں سے بھاگتا شخص تو اپنے سائے سے بھی بھڑکنے لگتا ہے اور ہر ہر آہٹ پہ چونک جاتا کہ جانے دشمن کس طرف سے وار کرنے آ کھڑا ہوا ہے۔ چنانچہ حامد راؤ کے مکان کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرتے وہ سائے بھی اسے اگر اپنا بصری دھوکا لگ رہے تھے تو کچھ غلط نہیں تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اردگرد دیکھتا خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ جو وہ محسوس کر رہا ہے وہ درست نہیں ہے لیکن سایوں کی بڑھتی تعداد نے اسے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ جو کچھ اسے دکھائی دے رہا ہے، وہی حقیقت ہے اور وہ کسی قسم کے اشتباہ نظر کا شکار نہیں ہوا ہے۔ اس یقین کے بعد اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جانے وہ کون لوگ تھے اور ان کے عزائم کیا تھے؟ اگر وہ حامد راؤ سے کسی دشمنی کے باعث اسے یا اس کے اہل خانہ کو نشانہ بنانا چاہتے تھے تو تب بھی وہ خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ حامد راؤ اس کا محسن تھا۔ اس شخص نے اسے اور ماہ بانو کو اپنی چھت کے نیچے پناہ دی تھی۔ وہ خود کو اس کے نمک کا مقروض سمجھتا تھا، چنانچہ یہ تو کسی طور ممکن ہی نہیں تھا کہ اپنے محسن کو مشکل حالات میں تنہا چھوڑ دے۔

چار دیواری سے دور ہٹ کر وہ تیزی سے واپس پلٹا اور سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ کوئی بھی قدم اٹھانے سے قبل حامد راؤ اور مقصود کو آگاہ کرنا اور ان سے مشورہ لینا ضروری تھا۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچنے کے بعد اس کے قدم ٹھٹک سے گئے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ حامد راؤ اور مقصود کی خواب گاہیں کون سی ہیں اور ایک ایسے گھر میں جہاں کی خواتین نے اس کے سامنے آنے سے مکمل طور پر گریز کیا تھا، وہ آزادانہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس مسئلے پر ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے اپنے اور ماہ بانو کے لیے مخصوص کی گئی خواب گاہ کا رخ کیا۔ ماہ بانو اب بھی اپنے سابقہ انداز میں سو رہی تھی لیکن اب اس کی اندرونی کیفیات بدل چکی تھیں۔ سر پر منڈلاتے خطرے کے بادلوں نے ساری لطیف حسیات کو سلب کر کے بقا کی جدوجہد کرنے پر مجبور کر دیا تھا چنانچہ ماہ بانو کے ہوش ربا وجود نے اس کے اندر کوئی ہلچل پیدا نہیں کی اور اس نے بیڈ کے قریب پہنچ کر ماہ بانو کا بازو پکڑ کر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اس طرح جگائے جانے پہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور خوف زدہ نظروں سے اسلم کے چہرے کو دیکھنے لگی جہاں عجیب سا ہیجان نظر آ رہا تھا۔

"کک... کیا ہوا؟" وہ بہ مشکل ہی اس سے یہ سوال کر سکی۔

"کچھ لوگ اس مکان کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تم جا کر حامد راؤ اور مقصود کو جگا دو۔" اس نے خوفناک لہجے میں اسے اطلاع دینے کے ساتھ ہدایت بھی دی۔

"کون لوگ...؟ کون ہیں وہ لوگ؟" وہ قدرتی طور پر سراسیمہ ہو گئی۔

"مجھے نہیں معلوم؟ نہ ہی میں اس وقت ان سوالوں کا جواب دے سکتا ہوں۔ بس تم سے جو کہا ہے اس پہ عمل کرو۔ میں واپس چھت پہ جا کر حالات کا جائزہ لیتا ہوں۔" اس نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں جواب دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ ماہ بانو بھی اب پوری طرح نیند کے خمار سے باہر نکل آئی تھی چنانچہ اپنا دوپٹا سنبھالتی ہوئی گھر کے اندرونی حصے کی طرف دوڑی۔ اس کا رخ انیلا اور مقصود کے کمرے کی طرف تھا کیونکہ دن کے وقت اس نے کچھ دیر اسی کمرے میں آرام کیا تھا، اس لیے اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ خواب گاہ ان دونوں کے زیر تصرف ہے۔ خواب گاہ کے دروازے پہ پہنچ کر اس نے زوردار دستک دی۔ اندر سے فوراً ہی ردعمل ظاہر ہوا۔

"کون؟" نیند کے خمار میں ڈوبی یہ آواز انیلا کی تھی۔

"میں ماہ بانو ہوں انیلا۔ ذرا مقصود بھائی کو جلدی سے باہر بھیج دو۔" اس نے وقت ضائع کیے بغیر اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ جواب میں اندر سے کچھ آہٹیں سنائی دیں اور ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں دروازہ کھول دیا گیا اور مقصود کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں نیند کی سرخی تھی۔ یقینی طور پر وہ گہری نیند سے جاگا تھا۔ مقصود کے پیچھے ہی حیران پریشان سی انیلا کھڑی تھی۔

"مجھے اسلم نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کچھ لوگ آپ کے گھر کو گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" دونوں میاں بیوی کے کوئی سوال کرنے سے قبل ہی اس نے انہیں اطلاع دی جسے سن کر مقصود کے چہرے پہ سراسیمگی کے تاثرات پھیل گئے۔

"اسلم خود کہاں ہے؟" اس نے بوکھلائے ہوئے

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM

انداز میں پوچھا۔

"اوپر چھت پر۔" اس نے مختصراً بتایا۔

"میں بھی وہیں جاتا ہوں۔ تم اماں کو جگا کر انہیں بھی وہیں بھیج دو۔" مقصود نے انیلا کی طرف دیکھ کر کہا اور عجلت میں چھت پر جانے والے راستے کی طرف دوڑ گیا۔

انیلا اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے آگے بڑھ گئی۔ اس کا رخ اس کمرے کی طرف تھا جہاں آج کل حامد راؤ نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ جب سے انیلا کی ماں یعنی شفقت راؤ کی بیوی یہاں رہ رہی تھی، اس کی خواب گاہ اس کے اور اس کی اپنی بیوی کے زیر استعمال تھی۔ ذہنی ابتری کا شکار انیلا کی ماں کو اتنا ہوش نہیں تھا کہ خود اپنا خیال رکھ سکے یا اپنے معمول کے کام انجام دے سکے، اس لیے حامد راؤ نے اپنی بیوی کو مستقل طور پر اس کے ساتھ متعین کر دیا تھا۔ ان کی آپس کی رشتے داریاں اور محبتیں اتنی گہری تھیں کہ اس کی بیوی کو یہ ذمے داری بری نہیں لگی تھی اور وہ بڑی محبت اور خلوص سے اپنی نند کا خیال رکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے انیلا پتر۔ تو کچھ پریشان لگ رہی ہے۔ تیری ماں کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" انیلا کو رات کے اس پہر اپنے دروازے پر دیکھ کر حامد راؤ نے پریشانی سے پوچھا۔

"اماں ٹھیک ہیں ماموں جان لیکن ایک دوسری گڑبڑ ہے۔ کچھ لوگ ہمارے گھر کو گھیرے میں لے رہے ہیں۔ ماہ بانو کا شوہر اور مقصود اوپر چھت پر سے جائزہ لینے گئے ہیں اور آپ کو بھی وہیں بلایا ہے۔" اس نے تیز تیز بولتے ہوئے ایک ہی سانس میں اطلاع دی جسے سن کر حامد راؤ کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ البتہ وہ زبان سے کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے چل پڑا۔ گھبرائی ہوئی انیلا بھی واپس پلٹ گئی۔ آج کل جو کچھ ہو رہا تھا، انوکھا ہی ہو رہا تھا۔ صداقت کی موت کے بعد ان کی زندگیوں میں کچھ بھی نارمل نہیں رہا تھا۔ نوجوان بھائی کی موت کے بعد اس نے ماں کے پاگل پن کا صدمہ بھی کس طرح سہا تھا، یہ وہ خود ہی جانتی تھی۔ ان مشکل حالات سے نمٹتے اچانک ہی اسلم اور ماہ بانو سے ملاقات ہو گئی اور ان کی آمد کے ساتھ ہی ایک اور تکلیف دہ انکشاف ہوا کہ پیر سائیں کے ٹھکانے کو آگ لگانے میں اس کے اپنے باپ کا ہاتھ تھا۔ یہ خبر آج ہی چند گھنٹے قبل مقصود نے سونے سے پہلے اسے سنائی تھی اور اب وہ آدھی رات کو اس اطلاع کے ساتھ جگائی گئی تھی کہ ان کے گھر کو کچھ لوگ گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ گھر جس کی چار دیواری میں وہ خود کو محفوظ و مامون سمجھتی آئی تھی، اچانک ہی غیر محفوظ ہو گیا تھا تو اس کا گھبرانا بجا تھا۔ گھبراہٹ اور سراسیمگی کی اس کیفیت میں گھری وہ اپنے کمرے کے سامنے پہنچی تو ماہ بانو اب بھی وہیں کھڑی تھی۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ مجھے اپنی رائفل چاہیے۔" انیلا کی شکل دیکھتے ہی اس نے مطالبہ کیا۔ اس گھر میں داخل ہوتے وقت وہ رائفل کو بڑی سی چادر میں چھپا کر لائی تھی لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ اتنے بڑے ہتھیار کو گھر کے مالکان سے پوشیدہ رکھا جا سکتا۔ اس نے یہ بہانہ بناتے ہوئے کہ لمبے سفر میں اپنی حفاظت اور جانوروں کے شکار کے لیے یہ رائفل ساتھ رکھی گئی ہے، رائفل امانتاً انیلا کے پاس رکھوا دی تھی۔ موجودہ حالات واضح نہیں تھے لیکن رات کے اندھیرے میں چوری چھپے ہونے والے محاصرے نے اس کے دل میں یہ خدشہ ضرور پیدا کر دیا تھا کہ یہاں محاذ آرائی کی ضرورت پیش آسکتی ہے چنانچہ دستیاب ہتھیاروں کا تیار رکھنا مناسب تھا۔

"کیا یہاں لڑائی جھگڑا ہونے والا ہے؟" اس کے مطالبے پر انیلا نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ارے نہیں، بس میں احتیاطاً ہی تم سے رائفل مانگ رہی ہوں۔" انیلا کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر اسے ہمت نہیں ہو سکی کہ اسے اپنے خدشات سے آگاہ کرے چنانچہ نظر چراتے ہوئے اسے جھوٹی تسلی دینے کی کوشش کی ورنہ خود اس کے اپنے اندر جانے کون کون سے اندیشے سر ابھار رہے تھے۔ وہ مسلسل محاصرین کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ کون ہو سکتے ہیں۔ ایک امکان تو یہی تھا کہ وہ ان کے میزبان حامد راؤ کے کوئی دشمن رہے ہوں جبکہ دوسرا امکان اس سے زیادہ خوف ناک تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اسلم کی ڈاکو والی حیثیت ان کے لیے مصیبت نہ بن گئی ہو۔ وہ ایک ایسا مفرور ڈاکو تھا جو صرف پولیس ہی سے نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں سے بھی بھاگا ہوا تھا اور ان میں سے کوئی بھی ایک اس کی تلاش میں یہاں پہنچ سکتا تھا۔ پولیس سے تو خیر مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اگر آنے والے اسلم کے پرانے ساتھی تھے تو پھر ان سے مقابلہ کرنا ضروری ہو جاتا۔ ان لوگوں سے زیر ہو جانے کا نتیجہ ہلاکت یا اسلم کی گروہ میں واپسی کی صورت میں ہی نکل سکتا تھا اور یہ دونوں ہی صورتیں ناقابل قبول تھیں۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ایسا کچھ نہیں ہونے دے گی اور اپنے حوصلے کی آخری حد تک مقابلہ کرے گی۔

"یہ لو۔" اپنے خیالوں میں گم اسے خبر بھی نہیں ہو سکی کہ انیلا کب وہاں سے گئی اور رائفل لے آئی۔ اس کے تخاطب کرنے پر وہ چونکی اور رائفل دونوں ہاتھوں سے تھام لی۔ ٹھنڈے لوہے کے لمس نے اس کے اندر عجیب سی آگ بھر دی۔ اس وقت وہ مار دو یا مر جاؤ والی کیفیت میں مبتلا تھی۔ زندگی میں در آنے والے قرار۔۔۔ نے اسے تھکا کر رکھ دیا تھا۔ مصائب تھے کہ کسی طور ختم ہونے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ایک امتحان ختم نہیں ہوتا تھا کہ دوسرا سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔ اب بھی جبکہ وہ ایک بہت بڑا سمجھوتا کرنے کے بعد اسلم کے ساتھ سکھ کی زندگی گزارنے کا خواب دیکھنے لگی تھی، ایک اور مصیبت سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس مشکل کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گی۔ اس عزم کے بعد اپنے اندر ایک نیا جوش و ولولہ سا محسوس کرتی وہ کسی سپاہی کی شان سے چل پڑی۔ اندھیرے کے باوجود اس نے چھت پر جانے والی سیڑھیاں بڑے اعتماد سے طے کیں اور کھلی چھت پر پہنچ کر تاروں کی چھاؤں میں نظر آنے والے تینوں سایوں کا جائزہ لینے لگی۔ اگرچہ اسلم اس وقت مقصود کے کپڑوں میں ملبوس ہونے کی وجہ سے ان دونوں باپ بیٹے کی طرح شلوار قمیص ہی پہنا ہوا تھا پھر بھی اسے اسلم کو پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ سیدھی اس کی طرف بڑھتی گئی۔

"کچھ معلوم ہوا کہ کون لوگ گھر کو گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟" اسلم کے قریب پہنچ کر اس نے سرگوشی میں استفسار کیا۔

"یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ روشنی نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے کسی کی شکل دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ ہم لوگ یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ وہ تعداد میں بیس بائیس کے قریب ہیں اور حامد راؤ کے مطابق اپنے لباس اور چال ڈھال سے اسی گاؤں کے رہائشی لگتے ہیں۔ ہم نے فی الحال ان میں سے کسی کو چھیڑنے کی کوشش نہیں کی ہے اور خاموشی سے یہ دیکھتے رہے ہیں کہ وہ کس کس پوزیشن پر موجود ہیں۔" اس نے ماہ بانو کے قدموں کی موہوم کی چاپ محسوس کر لی تھی اس لیے قریب پہنچ کر اس کے استفسار کرنے پر بنا چونکے اسے جواب دینے لگا۔

"گاؤں کے رہائشی۔۔۔" اس کا جواب سن کر ماہ بانو نے ایک پُرخیال ہنکارا بھرا۔ "اس کا مطلب ہے کہ وہ ہمارے دشمن نہیں ہیں۔"

"وہ ہمارے دشمن ہیں۔" اسلم نے پُرزور لہجے میں اس کی تردید کی۔ "میں اپنے محسن کے دشمن کو بھی اپنا ہی دشمن سمجھتا ہوں۔"

"تمہیں سمجھنا بھی چاہیے۔ میں نے جو بات کہی تھی اس کا مقصد خود کو صورت حال سے الگ رکھنا نہیں تھا۔ میں بس اس بات پر اطمینان کا اظہار کر رہی تھی کہ ہمیں گھیرے میں لینے والوں کا تعلق پولیس یا ڈکیتوں سے نہیں ہے۔" اس نے اپنی صفائی پیش کی۔ اس سے قبل کہ اسلم جواب میں کچھ کہتا، نیچے دروازے پر زوردار دستک ابھری۔ دستک اتنی زوردار تھی جیسے دستک دینے والا سوتے ہوؤں کے بجائے مردوں کو جگانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"اوپر سے جواب مت دینا۔ نیچے جا کر معلوم کرو کہ کون ہے؟ انہیں معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ان کی نقل و حرکت سے پہلے ہی واقف ہو چکے ہیں۔" اسلم نے مقصود کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے سرگوشی میں ہدایات دیں جنہیں سن کر وہ تابع داری سے سر ہلاتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ دوسری طرف حامد راؤ کسی زخمی شیر کی طرح چھت پر ٹہل لگا رہا تھا۔

"میں ان میں سے کسی کو چھوڑوں گا نہیں۔ یہ جو بھی لوگ ہیں، انہوں نے حامد راؤ کے گھر کی طرف نظر ڈال کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔" ایک دیوار کی منڈیر پر ٹکی جالیوں میں سے اطراف کا جائزہ لینے کے بعد دوسری دیوار کی طرف جاتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔ اس کا مخاطب کوئی نہیں تھا لیکن اسلم اور ماہ بانو دونوں ہی نے اس کے الفاظ سنے تھے۔ اسلم کے لیے حامد راؤ کا وہ روپ حیرت انگیز تھا۔ اس گھر میں قدم رکھنے کے بعد اس نے ہر لمحے اسے بہت نرم خو اور صلح جو انسان پایا تھا جسے اپنے دوست، کزن اور بہنوئی شفقت راؤ سے تمام تر محبت کے باوجود اس کے اقدام سے اختلاف تھا۔ جو سمجھتا تھا کہ شفقت راؤ کو انتقام کی اندھی راہ پر چلتے ہوئے براہ راست ٹھکانے پر آگ لگانے کے بجائے انصاف کے لیے قانون سے رجوع کرنا چاہیے تھا۔ اب وہی قانون پسند حامد راؤ غیظ و غضب میں مبتلا تھا۔

"میں گاؤں والوں کا نمائندہ بن کر آیا ہوں۔ گاؤں والوں کا مطالبہ ہے کہ شفقت راؤ کی بیوی اور بیٹی کو ان کے حوالے کیا جائے تاکہ ہم ان سے شفقت راؤ کے جرم کا حساب لے سکیں۔" نیچے مقصود دروازے پر پہنچ چکا تھا اور یقیناً اس نے آنے والے سے اس کی آمد کے بارے میں استفسار کیا تھا جس کے جواب میں انہیں یہ مطالبہ سننے کو مل رہا تھا۔

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم اپنے ہوش میں تو ہو۔" مقصود نے یقینی طور پر دروازہ کھولنے کی حماقت نہیں کی تھی لیکن وہ باہر موجود شخص کے مطالبے پر اتنی بری طرح چراغ پا ہوا تھا کہ اس کی بلند غصیلی آواز انہوں نے اوپر چھت تک سنی تھی۔ باہر کھلے میں موجود شخص کی آواز تو چھت پر سنائی دینا

WWW.PAKSOCIETY.COM

کچھ بڑی بات نہیں تھی لیکن گھر کے دروازے کے اندر موجود مقصود کی آواز سنائی دینا اس کے غصے کا گراف بلند ترین ہونے کی نشانی تھی۔

"ہوش میں تو ہم اب آئے ہیں۔ ہمیں علوم ہی نہیں تھا کہ ہم خانقاہ کو آگ لگانے والے جس خبیث شیطان کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں، وہ اپنے ہی گاؤں کا اتنا عزت دار آدمی نکلے گا۔ شفقت راؤ نے جو جرم کیا ہے، اسے ہم کسی صورت ماف (معاف) نہیں کر سکتے۔ اسے تو خیر ہم بعد میں ڈھونڈ کر سخت سزا دیں گے ہی لیکن پہلے اس کی دھی اور گھر والی کو ہمارے حوالے کرو۔ جب ہم اس کے گھر کی عورتوں کو ننگا کر کے سرعام ان کے سروں پر جوتے برسائیں گے تو شفقت راؤ کی ساری عزت داری مٹی میں مل جانے گی۔ اسے علوم ہو جائے گا کہ جس پنڈ کے لوگوں نے اسے عزت دے رکھی تھی، ان کے ساتھ دھوکا کرنے کا کیا نتیجہ..." باہر موجود شخص شاید کوئی پرجوش سی تقریر کرنے کے موڈ میں تھا لیکن فضا میں گونجنے والی فائر کی آواز نے اسے اس کا جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔ یہ حامد راؤ تھا جو اوپر آنے سے پہلے اپنا بڑے بور کا ریوالور ساتھ لے کر چڑھا تھا۔

"اپنی زبان بند رکھ کتے۔ اب اگر تو نے اپنی ناپاک زبان سے اس گھر کی عورتوں کا ذکر کیا تو اگلی گولی تیرے بھیجے میں لگے گی۔" حامد راؤ کی آواز میں قہر برس رہا تھا۔

"تسی اس معاملے سے الگ رہو حامد راؤ صاحب! ہمیں علوم ہے کہ شفقت نے جو کچھ کیا تسی اس میں شامل نہیں تھے۔ ہم آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو کچھ نہیں کہیں گے۔ ہماری دشمنی شفقت اور اس کے گھر والوں سے ہے۔ اور انہیں ہم کسی صورت میں ماف نہیں کریں گے۔ آپ کے لیے بہتر ہے کہ آپ خاموشی سے ایک طرف ہو جاؤ ورنہ خاخواہ (خواہ مخواہ) زد میں آجاؤ گے۔" وہ کوئی بہت ہی منہ پھٹ اور بدتمیز آدمی تھا جو نہایت اجڈ لہجے میں حامد راؤ سے کہہ رہا تھا۔

"تم بالکل الو کے پٹھے ہو جسے یہ بھی نہیں معلوم کہ جن عورتوں کا مطالبہ کر رہے ہو، وہ صرف شفقت ہی کی نہیں میرے گھر کی بھی عزت ہیں۔ اپنی بہن اور بہو کو میں کیسے بے عزتی کے لیے تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔ اور اگر ان سے میرا رشتہ نہ ہوتا تب بھی میں اپنے دوست کی عزت تمہارے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ اگر شفقت نے کوئی جرم کیا ہے تو جا کر اسے تلاش کرو اور سزا دو لیکن اس طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا ورنہ اپنی آنکھیں کھو بیٹھو گے۔" بوڑھا شیر پوری قوت کے ساتھ گرج رہا تھا۔

"تہاڈی مرضی راؤ صاحب! اب ہم سے کوئی شکوہ نہ کرنا۔" اس اجڈ آدمی نے جواب دیا لیکن پھر فوراً ہی فضا میں اس کی زوردار چیخ گونجی۔ حامد راؤ نے اسے مزید کوئی موقع دیے بغیر اس کی گستاخی کا مزہ چکھا دیا تھا۔ یقینی طور پر وہ بڑھ چڑھ کر بولنے والا اس وقت خاک و خون میں لوٹ رہا تھا۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی حامد راؤ کے شکار کی حالت دیکھنے کی مہلت نہیں رہی تھی۔ پہلا فائر ہوتے ہی دوسری طرف سے گولیوں کی برسات کر دی گئی تھی۔ وہ تعداد میں کئی تھے اور متفرق اسلحے سے لیس تھے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں انہیں صرف ایک برتری حاصل تھی کہ وہ چار دیواری میں محفوظ ہونے کے علاوہ حملہ آوروں کی پوزیشنز سے اچھی طرح واقف تھے۔ اپنی دانست میں تو وہ بے خبری میں ان پر شب خون مارنے آئے تھے لیکن محض اتفاقاً اسلم کے چھت پر پہنچ جانے کی وجہ سے ان کی سازش قبل از وقت بے نقاب ہو گئی اور ان لوگوں کو مقابلے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہونے کی مہلت مل گئی۔

فائرنگ شروع ہونے کے بعد مقصود بھی اوپر چھت پر ہی چلا آیا تھا۔ دروازے کی طرف سے دونوں باپ بیٹے کو اطمینان تھا کہ وہ اتنا مضبوط ہے کہ اسے توڑ کر گھر میں گھسنا ممکن نہیں ہوگا۔ پھر وہ لوگ کسی کو دروازے کے قریب پھٹکنے کی مہلت دیتے تو کوئی دروازہ توڑنے کی کوشش کرتا بھی۔ تعداد میں کم ہونے کے باوجود ان کی طرف سے بہت تلے فائر کیے جا رہے تھے جس کا ثبوت وہ چیخیں اور کراہیں تھیں جو باہر سے وقتاً فوقتاً سنائی دے رہی تھیں۔ فائرنگ کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے اسلم نے اپنا پسٹل ماہ بانو کے حوالے کر کے اس سے رائفل لے لی تھی۔ اس کی آزمودہ رائفل اس وقت سب سے زیادہ قہر اگل رہی تھی۔ وہ چن چن کر کمین گاہوں میں چھپے دشمنوں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ اچھا خاصا نقصان اٹھانے کے بعد محاصرہ کرنے والوں کو اندازہ ہو سکا کہ ان کی کمین گاہیں پوشیدہ نہیں ہیں اور انہیں تاک تاک کر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ وہ بوکھلاہٹ میں اپنی پوزیشن تبدیل کرنے کی کوشش کرنے لگے اور اس کوشش میں مزید ایکسپوز ہو گئے۔ ان لوگوں نے حملہ آوروں کی اس بوکھلاہٹ سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا لیکن بہرحال وہ تعداد میں زیادہ تھے اور انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ جن میں پچیس کو وہ دیکھ سکے تھے، ان کے علاوہ بھی مزید کمک پہنچ چکی تھی چنانچہ کئی کو نشانہ بنا لینے کے باوجود ان کا پلڑا بھاری نہیں ہو سکا تھا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ قلیل تعداد اور محدود اسلحے کے باوجود بہترین دفاع کر رہے تھے۔

"ہم بہت زیادہ دیر تک ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں اپنی جانیں بچانے کے لیے یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔ کیا تمہارے پاس ایسی کوئی ترکیب ہے جس کی مدد سے ہم یہاں سے نکل سکیں؟" اسلم کو مسلح مقابلوں کا تجربہ تھا اس لیے وہ اس مقابلے میں اپنی پوزیشن کا اندازہ کر سکتا تھا۔ مقابلے پر موجود لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اسے تشویش میں مبتلا کیا تو وہ کھسکتا ہوا مقصود کے قریب پہنچ گیا اور اس خیال سے اس سے پوچھا کہ گھر کا مالک و مکین ہونے کی وجہ سے وہ یہاں سے فرار کا راستہ جانتا ہوگا۔

"مکان کی پچھلی دیوار سے ملا ہوا ہمارا گودام ہے۔ وہاں ایک سوزوکی پک اپ بھی موجود ہے۔ مکان اور گودام کے درمیان دروازہ بھی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم یہاں کا محاذ چھوڑ کر وہاں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ یہاں فائرنگ رکے گی تو وہ لوگ گھر پر چڑھ دوڑیں گے؟" مقصود نے چڑھے ہوئے سانس کے ساتھ اس کے سوال کا جواب دیا جو بڑا حوصلہ بخش تھا۔

"ہم یہ محاذ ایک ساتھ نہیں چھوڑیں گے بلکہ ایک ایک کر کے یہاں سے جائیں گے۔" اسلم نے پہلے ایک فائر داغا پھر اس کی بات کا جواب دیا۔

"ایسا کرو کہ پہلے تم نیچے جاؤ اور گھر کی خواتین کو لے کر گودام میں پہنچو۔ وہاں پہنچ کر گاڑی میں بیٹھنے میں تمہیں کتنی دیر لگے گی؟" اسے ہدایت دینے کے ساتھ ساتھ اس نے سوال بھی کیا۔

"زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔" اس نے جواب دیا۔

"اوکے تو پھر جاؤ اور اپنا ہتھیار بھی میرے حوالے کر دو۔ پانچ منٹ بعد میں ماہ بانو کو بھیجوں گا۔ البتہ جاتے سے پہلے ہمیں گودام کے دروازے کی لوکیشن بتا دو تا کہ ہم بھٹکیں نہیں۔" اس کی عقابی نظریں مسلسل باہر کا جائزہ لے رہی تھیں پھر بھی وہ مقصود کی طرف متوجہ تھا۔

"اگر میں پہلے اباجی کو نیچے بھیج دوں تو...؟" مقصود تذبذب کا شکار تھا۔

"میں نے سوچ سمجھ کر تمہارا نام لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم گودام میں پہنچتے ہی اپنی پک اپ کا انجن اسٹارٹ کر دو اور بالکل ریڈی رہو کہ جیسے ہی ہم میں سے آخری فرد بھی وہاں پہنچتا ہے، فوراً گاڑی باہر نکال لو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان حالات میں راؤ صاحب کے لیے ڈرائیونگ کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ وہ اس وقت طیش میں ہونے کی وجہ سے بے شک بہت پرجوش نظر آ رہے ہیں لیکن کسی بھی لمحے ان کی ہمت جواب دے سکتی ہے۔" اس نے مقصود کو دلیل دی تو وہ اس کی ہدایات پر عمل کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مقصود کے بعد ماہ بانو کی باری تھی جس نے بنا کسی حیل و حجت کے پانچ منٹ بعد نیچے کا رخ کر لیا۔ راستہ تو انہیں مقصود بتا ہی چکا تھا۔ ماہ بانو کی روانگی کے بعد اس نے حامد راؤ سے نیچے جانے کو کہا۔ اس دوران وہ چھت پر ادھر ادھر گھوم کر مختلف سمتوں سے فائر کر چکا تھا۔ فائرنگ کرتے ہوئے اس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اپنے اور مقصود دونوں کے ہتھیار باری باری استعمال کرے تا کہ اگر حملہ آوروں میں کوئی اسلحے کا ماہر ہو تو اسے چھت پر موجود نفری میں کمی کا احساس نہ ہو۔ فائر وہ پہلے ہی سنبھل کر محدود تعداد میں کر رہے تھے اس لیے فائرنگ کے سلسلے میں کمی کا احساس کرنا مشکل تھا۔ ان کی نپی تلی فائرنگ نے حملہ آوروں کو ٹھیک ٹھاک نقصان پہنچایا تھا لیکن اب وہ بھی سنبھل چکے تھے اور نئی پوزیشنز لے لی تھیں اس لیے کوئی نقصان نہیں اٹھا رہے تھے۔

"میں آخر میں جاؤں گا، تم پہلے جاؤ۔" اس کی طرف سے نیچے جانے کی ہدایت سن کر حامد راؤ نے جواب دیا۔ یقیناً وہ اپنی روایات اور وضع داری نبھانے کے لیے مہمان کے تحفظ کو مقدم رکھ رہا تھا۔

"یہ وقت بحث کا نہیں ہے راؤ صاحب! آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مجھے اسلحہ استعمال کرنے میں آپ سے زیادہ مہارت حاصل ہے۔ آپ نہ تو میری طرح بیک وقت دو ہتھیار استعمال کر سکتے ہیں اور نہ ہی میری جیسی پھرتی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ آپ میری فکر کیے بغیر آرام سے نیچے جائیں اور گاڑی میں بیٹھیں۔ میں انشاء اللہ دو تین منٹ میں آپ تک پہنچ جاؤں گا۔" اس نے بنا کسی لگی لپٹی کے صورت حال حامد راؤ کے سامنے رکھ دی جس سے وہ یقیناً انکار نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ سر جھکا کر نیچے کا رخ کر لیا۔ اب چھت پر صرف اکیلا اسلم موجود تھا جو دوڑ کر کبھی ایک دیوار کے عقب سے فائر کرتا تھا، کبھی دوسری۔ اس کی یہ ترکیب کارگر تھی اور حملہ آور ہر طرف سے فائر آتا دیکھ کر گھر کے زیادہ نزدیک آنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ آخر تیسرے منٹ پر اس نے بھی چھت چھوڑ دی اور تیزی سے سیڑھیاں عبور کر کے گودام کی طرف جانے والے راستے پر دوڑ پڑا۔ تیسرا منٹ ختم ہونے سے پہلے وہ گودام میں موجود تھا جہاں مقصود نے پک اپ کا انجن اسٹارٹ کر رکھا تھا اور وہ لوگ اندر بیٹھے اسی کی راہ دیکھ رہے تھے۔

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM

’’میں گودام کا دروازہ کھولتا ہوں، تم گاڑی نکالتے چلے جاؤ۔ میں چلتی گاڑی میں ہی سوار ہو جاؤں گا۔‘‘ اس نے مقصود کی طرف دیکھتے ہوئے اسے ہدایت دی اور پھر حامد راؤ کی طرف متوجہ ہوا۔

’’آپ ہتھیار تیار رکھیے گا راؤ صاحب! اگر دروازے کے باہر کوئی موجود ہوا تو آپ کو ہی اس سے نمٹنا پڑے گا۔‘‘ اس نے اپنی رائفل پک اپ کے فرش پر پھینک دی لیکن پسٹل ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دیکھا جاتا تو اس وقت اس کی جان سب سے زیادہ خطرے میں تھی لیکن وہ غیر معمولی جرأت مندی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ آج وہ کسی کو لوٹنے کے بجائے ایک بے گناہ خاندان کی حفاظت کے خیال سے میدانِ کارزار میں اترا تھا۔ حامد راؤ نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ سر ہلا کر اس کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کا اشارہ دیا تو وہ گودام کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ یہ دروازہ بھی کافی بھاری اور مضبوط تھا اور خاصی آواز کے ساتھ کھلا تھا لیکن امید کی جا سکتی تھی کہ باہر بپا فائرنگ کے شور میں یہ آواز سنائی نہیں دی گئی ہوگی۔

اس کے دروازہ کھولتے ہی مقصود تیزی سے پک اپ لے کر باہر نکلا۔ وہ بے مثال پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا پچھلے حصے سے لٹک گیا۔ آگے حامد راؤ مقصود کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پک اپ کے باہر نکلتے ہی بدترین خدشات سچ ہو کر سامنے آ گئے۔ اس طرف بھی حملہ آور موجود تھے چنانچہ گاڑی کے باہر نکلتے ہی ان پر فائر کیا گیا۔ اس فائر کا حامد راؤ نے فوراً جواب دیا۔ دوسری طرف اسلم بھی پیچھے نہ رہا اور بے پناہ مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف ایک ہاتھ کی مدد سے لٹکے لٹکے دوسرے ہاتھ سے جوابی فائر داغ دیا۔ اس موقع پر مقصود کی کارکردگی بھی لائقِ تحسین تھی۔ اس نے کسی بھی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر ڈرائیونگ جاری رکھی اور گاڑی کو وہاں سے نکالتا چلا گیا۔ خوش قسمتی سے اس جانب ایک دو سے زیادہ افراد موجود نہیں تھے اس لیے انہیں وہاں سے نکلنے میں بہت زیادہ مشکل پیش نہ آئی اور سوزوکی اپنے مسافروں کو لیے رات کے اندھیرے میں آگے بڑھتی چلی گئی۔

☆☆☆

حویلی میں صفِ ماتم بچھی تھی۔ صنوبر اور تاجور اپنی ماں کی موت کے غم میں پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ کشور کی ماں چودھرائن ایک جانب ساکت سی بیٹھی تھی۔ اصولاً اسے آج اپنی سوکن اور حویلی میں سب سے بڑی حریف کی موت پر آسودہ ہونا چاہیے تھا لیکن وہ سکتہ زدہ تھی اور اس قابل بھی نہیں رہی تھی کہ چودھری کی واحد زندہ بیوی کی حیثیت سے سارے کاموں کی نگرانی کر سکے۔ اپنی اس بے نیازی پر اسے بعد میں چودھری کے عتاب کا نشانہ بھی بننا پڑ سکتا تھا، اس کے باوجود اس میں حوصلہ نہیں تھا کہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کچھ کر سکے۔ وہ تو زبانی احکامات جاری کرنے سے بھی معذور تھی اور ایسا شاید اس لیے تھا کہ آج اس کے سامنے وڈی چودھرائن کا تابوت میں بند بے جان جسم رکھا ہوا تھا۔ وہ وڈی چودھرائن جس کے حکم کا سکہ پوری حویلی پر چلتا تھا، آج بے بسی کی تصویر بنی لوگوں کے کندھوں پر اپنی آخری آرام گاہ تک پہنچائے جانے کی منتظر تھی۔

چودھرائن ناہید نے حویلی میں وڈی چودھرائن کے اقتدار کا سورج پوری طرح جگمگاتا اور پھر ڈوبتا ہوا دیکھا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ حویلی کی کوئی عورت وڈی چودھرائن کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی یہاں تک کہ وہ خود چودھری کی بیوی ہونے کے باوجود اپنی سوکن کے برابر حقوق کی حق دار نہیں تھی۔ لیکن پھر اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ وڈی چودھرائن، چودھری کے زیرِ عتاب آئی تو کس بری طرح رگڑی گئی۔ وڈی چودھرائن کے حویلی کے تہ خانے میں قید کیے جانے کا واقعہ خود اس کے اپنے علم میں بھی تھا لیکن اس سے آگے وہ وہی کہانیاں سنتی رہی تھی جو چودھری حویلی میں پھیلا رہا تھا۔ اسے ان میں سے کسی ایک کہانی پر بھی یقین نہیں تھا لیکن یہ بھی نہیں سمجھتی تھی کہ وہ اس حد تک پہنچ جائے گا کہ وڈی چودھرائن کی جان ہی لے لے گا۔ وہ وڈی چودھرائن کے قتل کی ایک طرح سے واقعاتی گواہ تھی لیکن لب کشائی کی ہمت نہیں رکھتی تھی اور مہر بہ لب بیٹھی اس بڑے سے ہال میں ہوتی گریہ وزاری سن رہی تھی۔ تاجور اور صنوبر کے علاوہ بھی وہاں رونے والی عورتوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ ان میں سے کچھ رشتے دار عورتیں تھیں اور بہت سی گاؤں کی وہ بے حیثیت و عسرت زدہ عورتیں جنہوں نے وڈی چودھرائن کی زندگی میں جانے اس کی کتنی جھڑکیاں سنی تھیں اور اس کے بے رحمانہ فیصلوں کا شکار ہوئی تھیں۔ ان مظلوم عورتوں کو اس کی موت پر مغموم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ پھر بھی رو رہی تھیں کہ صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ذہن یہی جانتا تھا کہ انہیں اپنے آقاؤں کی موت پر غم کا اظہار کرنا ہے، پھر ایک پہلو یہ بھی تھا کہ انہیں معلوم تھا کہ اس اہم موقع پر جبکہ حویلی کی جملہ خواتین غم سے نڈھال نظر آ رہی ہیں، کچھ نادیدہ نگاہیں ان پر نگراں ہوں گی اور بعد میں کسی وقت وہ صرف اس وجہ

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

سے بھی معتوب قرار دی جا سکیں گی کہ انہوں نے وڈی چودھرائن کی موت پر آنسو نہیں بہائے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی قلبی کیفیات کی پروا کیے بغیر پوری شد و مد سے اظہارِ غم میں مصروف تھیں۔ گاؤں کی ان نادار عورتوں کو مستقل طور پر ہال میں رکنے کی اجازت نہیں تھی بلکہ وہ ٹولیوں کی صورت میں وہاں آتی تھیں اور تھوڑی دیر آہ و بکا کرنے کے بعد باہر روانہ کر دی جاتی تھیں۔

اس ماتمی فضا کا رنگ اس وقت اور بھی گہرا ہو گیا جب مراد شاہ اور اس کی بیوی اپنی بیٹی سمیت وہاں پہنچے۔ بہنیں، بھائی اور بھاوج کو سامنے پا کر ان سے لپٹ گئیں اور دھاڑیں مارنے لگیں۔ وہ دونوں خود بھی غم زدہ تھے لیکن پھر بھی روتی بلکتی بہنوں کو سنبھالنے لگے۔ دور دیس سے آنے والے بھائی کو اپنا اتنا قرض تو ادا کرنا ہی تھا۔ کہنے کو تو اس حویلی میں ایک بھائی بھاوج اور بھی تھے لیکن ذہنی معذور بہزاد شاہ کی بساط ہی کیا تھی کہ بہنیں اس سے اپنا غم بانٹتیں۔ رہی اس کی نام نہاد بیوی فریدہ تو اسے بھی حویلی میں کوئی قابلِ ذکر مقام حاصل نہیں تھا۔ وہ اچھوتوں کی طرح حویلی کی بالائی منزل تک محدود رکھی جاتی تھی اور بظاہر بہزاد شاہ کی بیوی ہوتے ہوئے چودھری کے ہاتھوں کھلونا بنی رہی تھی۔ اس وقت فریدہ بھی اس وسیع و عریض ہال میں موجود تھی لیکن اس کے چہرے پر غم کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ جس عورت نے اسے اس کی کوکھ میں موجود بچے سمیت ہلاک کرنے کی سازش کی تھی، اس کی موت پر اسے مصنوعی دکھ کا اظہار کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یہاں بیٹھ کر بھی وہ اپنے بچے میں مگن تھی اور چودھرائن کی گریہ وزاری کرتی اولاد سے قطعی بے نیاز تھی۔ اس نے ان میں سے کسی سے اظہارِ تعزیت نہیں کیا تھا۔ تاجور اور صنوبر نے اس کی اس بے نیازی کو تو بلی محسوس کیا تھا اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی تھیں۔ فی الوقت اسے کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔ نہ ہی وہ اسے یہاں سے اٹھا سکتی تھیں، البتہ یہ بات خوب محسوس کر رہی تھیں کہ فریدہ درحقیقت وڈی چودھرائن کی میت میں شرکت کے لیے نہیں بلکہ خود کو حویلی کی بہو باور کروانے کے لیے وہاں موجود ہے اور افسوس کے لیے آنے والی ہر قابلِ ذکر عورت سے خاص طور پر یوں بڑھ چڑھ کر مل رہی ہے جیسے وہ حویلی میں بڑا خاص مقام رکھتی ہو۔

دل ہی دل میں دونوں بہنیں فریدہ سے بعد میں نمٹنے کا عزم باندھ کر موجودہ صورتِ حال کو نبھا رہی تھیں۔ دیکھنے والی ہر آنکھ نے دیکھا تھا کہ ماں کی موت بیٹیوں کے لیے کتنے غم کا سبب بنی ہے۔ اللہ اللہ کر کے آخر میت اٹھنے کا وقت آیا۔ چودھرائن کا تابوت اپنی آخری آرام گاہ کے لیے روانہ کیا گیا تو گویا کہرام سا مچ گیا۔ غم زدہ تاجور اور صنوبر ایسی بے حال ہوئیں کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ تاجور تو شدتِ غم سے بے ہوش ہی ہو گئی۔ عورتوں نے بڑی تدبیریں کر کے اسے ہوش دلایا پھر کسی کے مشورے پر انہیں آرام کے لیے الگ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس موقع پر شاہدہ نے رشتے دار خواتین سے درخواست کی کہ انہیں کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیا جائے تو دونوں بہنوں کو آرام کا موقع مل جائے گا۔ اپنی بھاوج پر اس لمحے دونوں بہنوں کو بڑا پیار آیا۔ وہ خود بھی دل سے تنہائی کی متمنی تھیں کہ رو رو کر سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور اب دل شدت سے آرام کا خواہاں تھا۔ مراد شاہ کی بیوی شاہدہ انہیں بند کمرے میں چھوڑ کر باہر نکلی تو دونوں نے سکون کا سانس لیا۔

’’توبہ ہے ربا۔ رو رو کر حلق خشک ہو گیا۔ ذرا فریج میں سے جھانک کر دیکھ کہ کوئی جوس وغیرہ پڑا ہو تو مجھے دے۔ اتنی دیر کی محنت سے جان آدھی ہو کر رہ گئی ہے۔‘‘ تاجور نے فوراً ہی نرم گرم بستر پر دراز ہوتے ہوئے چھوٹی بہن سے فرمائش کی جسے سن کر اس نے منہ تو بنایا لیکن انکار نہیں کر سکی اور روم ریفریجریٹر کھول کر اس میں جھانکا۔ اندر ایپل جوس کا ڈبا رکھا ہوا تھا۔ اس نے ایک گلاس بھر کر بہن کو دیا اور دوسرا خود لے کر بیٹھ گئی۔

’’تو نے جنازہ اٹھتے وقت ابا جی کی شکل دیکھی تھی؟ ایسی رونی صورت بنائی ہوئی تھی جیسے وہ خود ہی سب سے زیادہ غم زدہ ہوں۔‘‘ جوس کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر تاجور نے صنوبر سے دریافت کیا۔

’’تم تو اس وقت بے ہوش ہو گئی تھیں تمہیں کیسے معلوم؟‘‘ صنوبر نے حیرت سے پوچھا۔

’’ابا جی کی صورت دیکھ کر ہی تو مجھے بے ہوش ہونے کا خیال آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب ابا جی جیسا آدمی اماں کی موت پر ایسی غم ناک شکل بنا کر بیٹھا ہے تو میں تو خیر دھی ہوں۔ میرے صرف رونے دھونے سے کام نہیں بنے گا اس لیے بے ہوش ہو گئی۔‘‘ تاجور نے مزے سے بتایا۔

’’ہائیں... تو تو اداکاری کر رہی تھی؟‘‘ صنوبر کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

’’تو ابا جی بھی تو اداکاری کر رہے تھے، ورنہ سچ بتا کہ ایسے آدمی کو جو بیوی پر دو دو سوکنیں لایا ہو اور آئے دن بازاری عورتوں کے ساتھ راتیں گزارتا ہو، بھلا بیوی کی موت کا کیا غم ہوگا۔ وہ تو ان کو موقع نہیں مل سکا ورنہ وہ ماہ بانو کو بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

اماں کی سوکن بنا کر چھوڑتے۔" تاجور نے بے رخی سے جواب دیا۔

"سو تو ہے۔" صنوبر فوراً ہی قائل ہو گئی۔ "اباجی کو کبھی بھی اماں سے محبت نہیں رہی۔ اگر اماں کا ٹیکا مضبوط نہ ہوتا تو جانے اباجی اور کون کون سے گل کھلاتے۔ کسر تو خیر انہوں نے اب بھی کوئی نہیں چھوڑی تھی۔ بس اتنا تھا کہ اماں کا حویلی میں راج تھا اور ان کے ہوتے کسی سوکن میں اتنا دم نہیں تھا کہ ان کے مقابلے پر کھڑی ہو سکتی۔ ہماری ایسی دبنگ اماں کیسے چٹ پٹ ہو گئی، ذرا خبر نہیں ہو سکی۔ مجھے تو اس معاملے میں کوئی گڑبڑ ہی لگتی ہے۔" صنوبر نے دھیمی آواز میں اپنے شبہات کا اظہار کیا۔

"گڑبڑ تو خیر ہے۔ اباجی، اماں سے ناراض تھے۔ یہ اطلاع تو پکی ہے، یہ اطلاع دینے والی کو ساری تفصیلات معلوم نہیں تھیں۔ اماں کب بیمار ہوئیں، اس کو یہ بھی خبر نہیں۔ نہ ہی اس نے انہیں علاج کے لیے حویلی سے باہر جاتے دیکھا۔ اس کا یہی کہنا ہے کہ سارے نوکر چاکر حیران ہیں کہ وڈی چودھرائن کو ایسی کون سی بیماری ہو گئی تھی کہ انہیں کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی اور انہیں علاج کے لیے حویلی سے روانہ کر دیا گیا۔" تاجور نے اس کے شبہات کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا۔ وہ دونوں ہی بہنیں اپنے گھر کی تھیں لیکن حویلی میں ان کا جاسوسی کا کچا پکا سا نیٹ ورک موجود تھا۔ حویلی کی بعض ملازماؤں کے ذریعے انہیں یہاں کے حالات کی خبر ملتی رہتی تھی۔ چودھرائن کے علاج کے لیے بیرونِ ملک مقیم ہونے کا سن کر انہوں نے بہت کوشش کی کہ اصل صورتِ حال سامنے آ جائے لیکن وہ کوئی قابلِ ذکر یا ٹھوس معلومات حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ اباجی کی ناراضی کا فریدہ والے معاملے سے تعلق ہے۔ وہ جب اسپتال میں داخل تھی، تب اس کا بھرا حویلی بھی آیا تھا۔ اس کے واپس جانے کے بعد ہی ملازموں نے اباجی کو غصے میں دیکھا تھا۔ اور پھر اچانک اماں حویلی سے غائب ہو گئیں۔" صنوبر کا دماغ بہتر کام کر رہا تھا اس لیے اس نے حالات کا بہت واضح نہ سہی لیکن ٹھیک ٹھاک تجزیہ کر ڈالا۔

"تیری گل دل کو لگتی ہے۔ میرا تو دل ہول رہا ہے۔ اگر اباجی کو اس گل کی بھنک پڑ گئی ہے کہ اماں نے جان بوجھ کر فریدہ کو سیڑھیوں سے گروایا تھا تو پھر اور بھی بہت کچھ معلوم ہو گیا ہو گا۔ یوں سمجھ لے کہ اب اماں کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں کی بھی خیر نہیں ہے۔"

"ایسے ہول بھی نہ دلا وڈی آپا!" صنوبر بہن کی بات سن کر گھبرائی۔

"ہول تو خود میرے اٹھ رہے ہیں۔ چلو اماں کی تو کوئی گل نہیں۔ اس نے تو دنیا میں سب دیکھ لیا تھا، خوب جی بھر کر حویلی پر راج بھی کیا تھا اور اولادوں کی اولادیں تک دیکھ لی تھیں۔ ہمارے تو ابھی اپنے بچے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ تیرے کاکے نے تو ابھی دودھ پینا بھی نہیں چھوڑا۔ ذرا سوچ ایسی بھری جوانی میں دنیا چھوڑنی پڑی تو کتنا دل دکھے گا۔" وہ اپنی متوقع موت کے خیال سے اتنی رنجیدہ ہو گئی تھی کہ گلاس میں موجود سیب کے جوس کا آخری گھونٹ پینا بھی بھول گئی تھی۔ سنجیدگی اور رنجیدگی کی اس ملی جلی کیفیت میں دونوں بہنوں کے چہرے خاصے مضحکہ خیز لگ رہے تھے لیکن انہیں ہوش نہیں تھا۔ البتہ اوپر کہیں وڈی چودھرائن کی روح تڑپ تڑپ کر بے حال تھی کہ جس اولاد کی خاطر اس نے سازشوں کے جال بنے، اپنی راج دھانی سے محروم ہوئی اور اذیت ناک موت کو گلے لگایا، وہ اولاد خود غرضی کی اس انتہا پر پہنچی ہوئی تھی کہ ماں کے مرنے کا سرے سے کوئی غم نہیں تھا۔ جتنے آنسو بہائے گئے تھے دنیا دکھاوے کے لیے بہائے گئے تھے اور اب اپنی فکر دامن گیر تھی۔

☆☆☆

کاغذ پر قلم چلاتے چلاتے اس نے نظر اٹھا کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔ اس کے اندازے کے مطابق اب تک مشابرم خان کو واپس آ جانا چاہیے تھا۔ مشابرم خان اس کے حکم پر کالے میاں سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں تابلی والا کی صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ تابلی والا کے پیر سائیں کا جو مشکوک کردار سامنے آیا تھا، اس نے شہریار کے دل میں تجسس پیدا کر دیا تھا۔ اسے شک تھا کہ پیر سائیں بھی کہیں شاہنواز اور مولوی غلام محمد جیسے لوگوں میں سے نہ ہو جو مذہبی شخصیت کا مقدس لبادہ اوڑھ کر سیدھے سادے معصوم لوگوں کے ذہنوں کو تباہ کرنے کے مشن پر مامور تھے۔ اپنے اس شک اور تجسس کی وجہ سے اس نے مشابرم خان کو تابلی والا روانہ کر دیا تھا کہ وہ وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر خاموشی سے واپس آ جائے۔ مشابرم خان ایک عام زائر کی طرح وہاں گیا تھا اس لیے اس نے ذاتی گاڑی کے بجائے بس سے سفر کیا تھا۔ اسے پیر سائیں کی خانقاہ پہنچ کر صرف اتنا کرنا تھا کہ خود کو مصیبت میں مبتلا ایسا شخص ظاہر کرے جو پیر سائیں کی شہرت سن کر حاجت روائی کے لیے وہاں آیا ہو۔ کچھ دیر خانقاہ میں رکنے کا انتظام

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرلے۔ اپنے قیام کے اس مختصر عرصے میں اسے زبان بند رکھ کر صرف آنکھیں اور کان کھلے رکھنے تھے۔ اگر وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاتا کہ خانقاہ کی آڑ میں کوئی غیر قانونی کام کیا جا رہا ہے تو پھر شہریار اپنا آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ اپنے علم میں آجانے والے ایسے کسی فرد کو جو ملک و قوم کا دشمن ہو، ڈھیل دینے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ پیری فقیری کی آڑ میں چھوٹی موٹی جعلسازیاں کرنے والوں کو طرح دے جانا اور بات تھی لیکن ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی نہ کرنا یا ان سے صرف نظر کر جانا اس کی دانست میں ایک ایسا جرم تھا کہ جس کے بعد وہ خود اپنے آپ سے نظر ملانے کے قابل نہ ہو پاتا، چنانچہ ذرا سا شبہ ہونے پر ٹاہلی والا کے پیر سائیں کی بو پر لگ گیا تھا۔

پیر سائیں کے معاملے میں اسے آئندہ فیصلے مشابرم خان کی رپورٹ پر کرنے تھے اور اسے لگتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ بہت سی سنسنی خیز خبریں لے کر آنے والا ہے۔ صبح سویرے موبائل فون پر ہونے والی گفتگو میں اس نے ہیجان زدہ لہجے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ بہ خیریت ہے اور جلد واپس لوٹ کر اسے بہت سی حیرت انگیز باتیں بتائے گا۔ اپنے گرد و پیش سے مطمئن نہ ہونے کی وجہ سے اس نے تفصیلی گفتگو کرنے سے معذرت کر لی تھی، چنانچہ اب وہ شدت سے مشابرم خان کے واپس لوٹنے کا منتظر تھا۔ سوئے اتفاق اس وقت عبدالمنان بھی دفتر میں موجود نہیں تھا ورنہ وہ اس کے ساتھ صورت حال پر تبادلۂ خیال کر کے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتا۔ عبدالمنان کو اس نے خود چودھری افتخار کی بیوی کے جنازے میں شرکت کے لیے پیر آباد بھیجا ہوا تھا۔ چودھری سے اس کی نفرت اپنی جگہ لیکن بہرحال وہ اس علاقے کا سب سے زیادہ بااثر شخص تھا چنانچہ اس کے ساتھ ہونے والے کسی المیے کو مکمل طور پر نظر انداز کر دینا مناسب نہیں تھا۔ وہ خود شاید اتنی مصلحت پسندی سے کام نہ بھی لیتا لیکن عبدالمنان نے صبح اس سے اچھی خاصی بحث کر کے اس معاملے میں قائل کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ صرف اس حد تک قائل ہو سکا تھا کہ عبدالمنان اس کے نمائندے کی حیثیت سے اظہار افسوس کے لیے پیر آباد چلا جائے۔ اس کام کے لیے اس نے خاص طور پر اس کا انتخاب اس لیے بھی کیا تھا کہ بے شک وہ خود تو کبھی نہ کبھی تبادلہ ہو کر یہاں سے کسی دوسرے ضلع میں چلا جاتا لیکن عبدالمنان کو تو بہرحال یہیں رہنا اور کام کرنا تھا اس لیے اس کا یہاں کسی سے مکمل بگاڑ مناسب نہیں تھا۔

انہی سوچوں میں غلطاں اس نے اپنی توجہ دوبارہ کام کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔ ابھی اس کے قلم نے کاغذ پر مزید کسی نئے لفظ کا اضافہ بھی نہیں کیا تھا کہ انٹرکام بج اٹھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے مشابرم خان کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ اسے فوری طور پر اندر بھیج دینے کی ہدایت کرنے کے بعد وہ فائل بند کر کے کرسی پر سیدھا ہو بیٹھا۔ مشابرم خان کے آنے کی اطلاع ملی تو طبیعت بالکل ہی اچاٹ ہو گئی چنانچہ اس نے اسے ایک طرف رکھ دیا۔ مشابرم خان کو اس کے کمرے تک پہنچنے میں ڈیڑھ دو منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا۔ کمرے کے دروازے پر دستک دے کر اجازت ملنے کے بعد وہ اندر آیا تو شہریار نے اس کی آنکھوں کی سرخی دیکھ کر ہی اندازہ کر لیا کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے۔ یعنی گزشتہ شب جو اس نے ٹاہلی والا میں گزاری تھی، کافی سنسنی خیز رہی تھی اور مشابرم خان کسی ایسے کام میں مصروف رہا تھا کہ اسے ذرا دیر بھی سونے کا موقع نہیں ملا تھا ورنہ وہ ایسا مضبوط آدمی تھا کہ اگر ایک ڈیڑھ گھنٹے کی نیند بھی لے لیتا تو تازہ دم ہوتا۔ اب بھی صرف اس کے چہرے پر رت جگے کے آثار تھے ورنہ اپنی حرکات و سکنات سے وہ پوری طرح چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔

”لگتا ہے خاصی گرما گرم خبریں لے کر آئے ہو۔“ اس نے سلام کا جواب دینے کے ساتھ ہی اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے معنی خیز لہجے میں تبصرہ کیا۔

”بالکل سر! گرما گرم خبریں ہیں اور آپ کے اندازے سے بھی زیادہ حیرت ناک۔“ مشابرم خان کے جواب نے اس کے تجسس کو مزید بھڑکا دیا۔

”تو پھر شروع ہو جاؤ اور بلا کم و کاست سب بتا ڈالو۔“

”انکشافات کا سلسلہ ٹاہلی والا میں قدم رکھتے ہی ہو گیا تھا اور کچھ سوالوں کے جواب بھی مل گئے تھے۔ ٹاہلی والا پنڈ میں ٹاہلی کے بہت سے درخت ہیں جن کی وجہ سے اس پنڈ کو یہ نام دیا گیا ہے۔ آبادی کے اعتبار سے وہ گاؤں پیر آباد سے چھوٹا ہے۔ کالے میاں کے پیر سائیں کی خانقاہ پنڈ میں داخل ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی سامنے آ گئی تھی لیکن میں اس خانقاہ کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا اور شک ہوا کہ کسی غلط جگہ پہنچ گیا ہوں۔ حالانکہ میں ٹھیک انہی نشانیوں کے مطابق وہاں تک پہنچا تھا جو کالے میاں نے مجھے بتائی تھیں۔“ مشابرم خان نے بڑے ڈرامائی انداز میں تفصیلات کا آغاز کیا۔

”غیر ضروری سنسنی پھیلانے کے بجائے ٹو دی پوائنٹ بات کرو۔“ مشابرم خان کے طرز بیان پر الجھن محسوس کرتے ہوئے اس نے فوراً ہی اسے ٹوکا۔

”معافی چاہتا ہوں صاحب۔“ وہ فوراً ہی سنبھل گیا اور مزید تفصیلات بتانے لگا۔

”کالے میاں نے مجھے خانقاہ کا جو پتا سمجھایا تھا، وہاں خانقاہ کی جگہ ایک جلی ہوئی عمارت کا ڈھانچا موجود تھا۔ میں نے وہاں موجود افراد میں سے ایک سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ چند روز قبل کسی نے رات کی تاریکی میں پیٹرول چھڑک کر اسے آگ لگا دی تھی جس کی وجہ سے عمارت کے ساتھ ساتھ وہاں موجود ایک پیروں سے معذور زائر بھی جل کر خاک ہو گیا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ معذور شخص بالا ہو گا۔“ اختصار کی کوشش کرنے کے باوجود وہ خود کو ایک زائد جملے سے نہیں روک سکا جس پر شہریار نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور خاموشی اختیار رکھی۔ مشابرم خان اپنی سناتا رہا۔ ”حادثے کا سن کر میں نے اس شخص کے سامنے گہرے دکھ کا اظہار کیا اور بتایا کہ میں بہت دور سے صرف پیر سائیں کی شہرت سن کر اپنے مسئلے کے حل کے لیے یہاں آیا ہوں۔ میں نے خود کو اتنا غریب آدمی ظاہر کیا جس کے پاس کرائے کی رقم کے علاوہ مزید کسی خرچ کے لیے رقم موجود نہ ہو۔ میری اداکاری نے اس شخص پر بڑا اثر کیا اور اس نے مجھے بتایا کہ بے شک خانقاہ جل گئی ہے لیکن پیر سائیں اور ان کے تمام مرید محفوظ ہیں۔ وہ خود بھی پیر سائیں کا مرید تھا جو خانقاہ کی ازسرنو تعمیر کے لیے جائزہ لینے آنے والی ایک ٹیم کے ساتھ وہاں تک آیا تھا۔ اس نے مجھ سے رہائش اور پیر سائیں سے ملاقات کا وعدہ کیا اور اپنے ساتھ ایک ایسے گھر میں لے گیا جو اپنی تعمیر کی وجہ سے پنڈ کے چند گنے چنے گھروں میں سے ایک تھا اور جسے دیکھتے ہی یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ گھر کے مالکان خاصے صاحب حیثیت لوگوں میں سے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ گھر شریف نامی ایک آدمی کی ملکیت ہے جس نے خانقاہ کی بربادی کے بعد پیر صاحب اور ان کے مریدوں کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے۔ مجھے بھی اس گھر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں جگہ مل گئی۔ مجھے لے جانے والے آدمی نے کھانا پینا بھی فراہم کر دیا لیکن پیر سائیں سے فوری ملاقات کروانے سے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ فی الحال پیر سائیں کسی بہت اہم معاملے میں الجھے ہوئے ہیں اس لیے اگلے دن ہی میری ان سے ملاقات ہو سکے گی۔ اس کا جواب سن کر میں افسردگی کا اظہار کرتے ہوئے چارپائی پر لیٹ گیا اور یوں ظاہر کیا کہ جیسے شدید تھکن کی وجہ سے مجھے نیند آ رہی ہے۔ میرا میزبان میری حالت دیکھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں بستر سے اتر گیا اور دروازے کی جھری سے جھانک کر باہر کا جائزہ لینے لگا۔ میں جب وہاں پہنچا تھا تو بھی کافی ہلچل سی محسوس کی تھی لیکن صرف اس لیے نظر انداز کر دیا تھا کہ مریدوں کی بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے وہ ہلچل کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی لیکن دوبارہ چھپ کر جائزہ لینے پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں کچھ غیر معمولی حالات ہیں۔ احاطے میں موجود لوگوں میں سے اکثر کے ہاتھوں میں ہتھیار نظر آ رہے تھے اور چہروں پر ایسا جوش تھا جیسے وہ کسی مہم کے لیے روانہ ہو رہے ہوں۔ میں سن گن لینے کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا لیکن باہر نکلتے ہی ایک آدمی نے مجھے سختی سے ٹوک کر واپس اندر جانے کا حکم دیا۔ میں نے حاجت کا بہانہ بنا کر تھوڑی دیر کی مہلت حاصل کر لی لیکن مسلح افراد کو دیکھنے کے سوا کچھ اور معلوم نہیں کر سکا۔ مجھے کمرے میں واپس جانے کا حکم دینے والا سائے کی طرح مسلسل میرے ساتھ ساتھ تھا اس لیے مجھے شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے واپس کمرے میں جانا پڑا۔ کچھ دیر بعد میں نے دروازہ چیک کیا تو معلوم ہوا کہ اسے باہر سے کنڈی لگا کر بند کر دیا گیا ہے۔ یعنی عملی طور پر میں وہاں قید ہو چکا تھا اور آپ کے لیے کارآمد معلومات حاصل کرنے سے قاصر تھا۔ بے بسی کی اس کیفیت میں بھی میں نے اپنے کان کھلے رکھے اور جھری سے باہر کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا رہا۔ رات گئے مجھے گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور آہستہ آہستہ وہاں موجود لوگوں کی آوازیں بھی معدوم ہوتی چلی گئیں۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ گھر میں موجود تمام افراد اچانک ہی کہیں روانہ ہو گئے ہوں اور گھر میں چند ایک افراد کے علاوہ کوئی باقی نہ ہو۔ مجھے خیال آیا کہ دروازہ بجا کر کسی کو بلاؤں اور اس سے اس وقت روانگی کے بارے میں پوچھوں لیکن پھر میں نے انجان بنا رہنا ہی مناسب سمجھا۔ مسلح افراد کی روانگی کو مشکل سے آدھا گھنٹا ہی گزرا تھا کہ پنڈ کی فضا دھماکوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی مسلح گروپ نے اچانک ہی پنڈ پر حملہ کر دیا ہو۔ کافی دیر تک فائرنگ کا سلسلہ جاری رہا پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مکان میں دوبارہ ہلچل شروع ہو گئی۔ آوازوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ مہم پر جانے والے واپس آ گئے ہیں اور اپنے ساتھ مردوں اور زخمیوں کو بھی لے کر لوٹے ہیں۔ بہت دیر تک مکان میں چیخ و پکار، بھاگ دوڑ اور ایک دوسرے کو ہدایات دینے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ میں کمرے میں قید بے بس سا اصل معاملے کی سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن پھر صبح کے قریب مجھے نیند آ ہی گئی۔ تقریباً گھنٹے سوا گھنٹے کی نیند لینے کے بعد میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو وہاں تک پہنچانے والے کو اپنے کمرے میں پایا۔ وہ مجھے نیند سے جگانے اور ناشتے کا پوچھنے آیا تھا۔

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem